قصص القرآن

قصص القرآن

جلد چہارم

تالیف

مولانا محمد حفظ الرحمٰن سیوہاروی

ندوۃ المصنفین دہلی

سلسلہ ندوۃ المصنفین (۳۶)

إِنَّ هَٰذَا لَهُوَ الْقَصَصُ الْحَقُّ

بے شبہ یہ بیانِ حق ہے

قصص القرآن

جلد چہارم

حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور خاتم الانبیاء حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

کے واقعات و حالات کا مبصرانہ اور محققانہ بیان

تالیف

مولانا محمد حفظ الرحمٰن صاحب سیوہاروی

رفیقِ اعلیٰ ندوۃ المصنفین دہلی

باہتمام منیجر ندوۃ المصنفین دہلی

طبع دوم ۱۳۶۹ھ / ۱۹۴۹

قیمت ۸؍

مجلد ۸؍
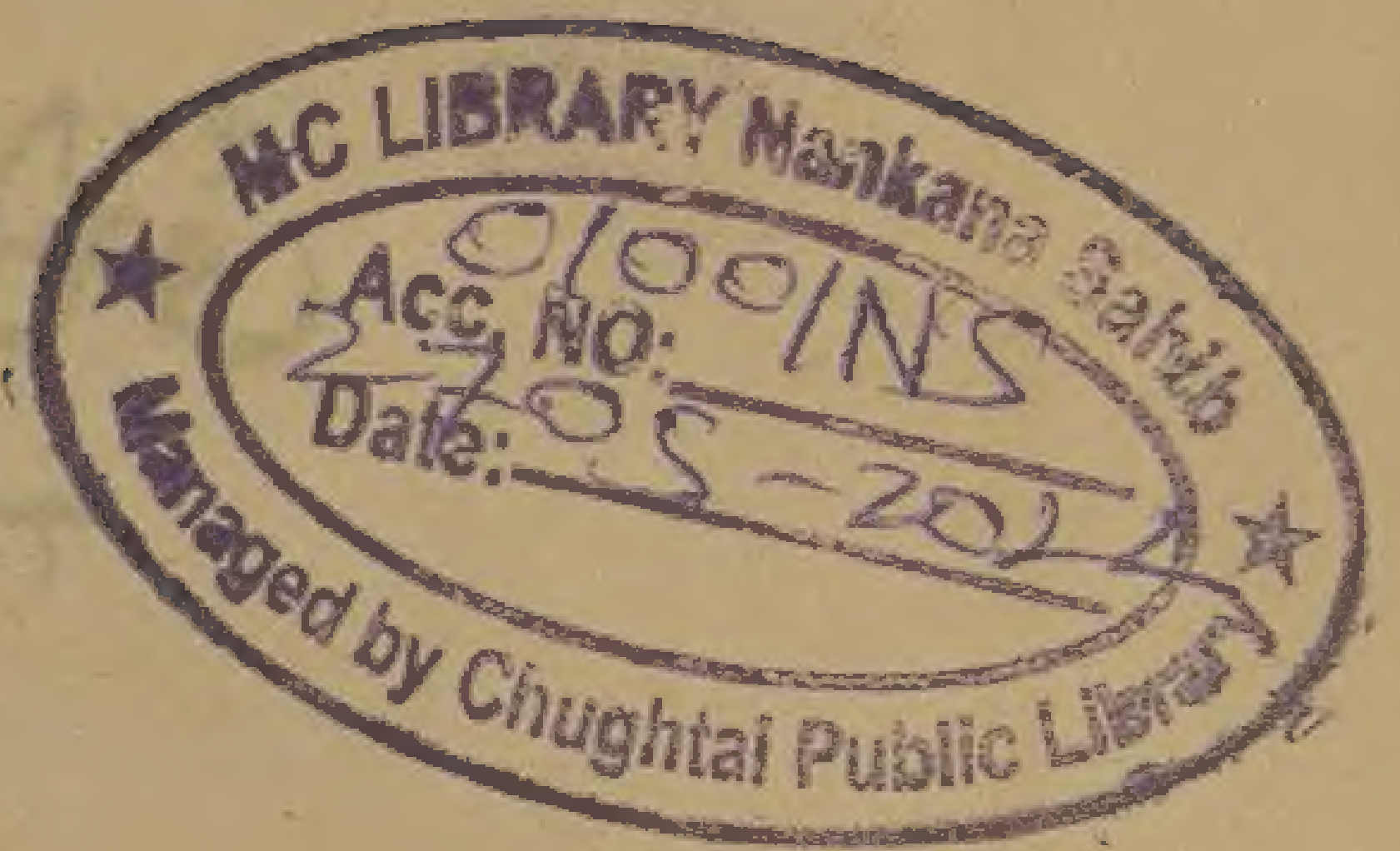
باہتمام منیجر فاروقی پریس لال کنواں دہلی طبع ہوئی

فہرست مضامین قصص القرآن جلد چہارم

دیباچہ طبعِ ثانی

اللہ رب العزت کا شکر کس زبان سے ادا کیا جائے کہ اُس نے آج قصص القرآن کی چوتھی جلد کے دوسرے ایڈیشن کو شائقین کی خدمت میں پیش کرنے کا موقعہ عطا فرمایا۔

بلا شبہ یہ مؤلف کی اپنی کوششوں کا نتیجہ نہیں ہے کہ یہ کتاب بحمداللہ مقبول خاص و عام ہوئی بلکہ یہ تو قرآن حکیم کا اپنا معجزہ ہے کہ ایک سطر یا ایک لفظ بھی اس کی سچی خدمت سے اگر وابستہ ہو جائے تو وہ لفظ اور وہ سطر بھی مخدوم و مقبول بن جاتی ہے۔

پہلا ایڈیشن جب طبع ہو کر سامنے آیا تو یہ دیکھ کر حیرانی ہوئی کہ کافی کنج وکاؤ کے باوجود "ختم نبوت" کے اہم عنوان سے کتاب خالی ہے۔ بار بار غور کیا لیکن سمجھ میں نہ آیا کہ عنوان کی اہمیت کس طرح نظر انداز ہو گئی۔ یہ کمی ایسی نہ تھی جو قلب کو خلش سے آزاد کر سکتی، اس لیے ایڈیشن کے ختم ہونے کا بے چینی کے ساتھ انتظار رہا اور اب بحمداللہ نقش ثانی میں اس کی تلافی کر سکا۔ فالحمد للہ علیٰ ذٰلک۔

۴ ستمبر ۴۷ء کے خونی حادثہ نے ندوۃ المصنفین کو بھی بھڑکتے ہوئے شعلوں کی لپیٹ میں لیے بغیر نہ چھوڑا اور تقریباً پونے دو لاکھ قیمت کے بہترین علمی اسٹاک کو نذرِ آتش کر دیا گیا۔

اب نہ وہ فرد لباغ کی خاموش فضا رہی ہے اور نہ قلب و دماغ کو پہلا سا سکون نصیب

ایک قرولباغ اور ندوۃ المصنفین کا بہترین آفس ہی کیا سرے سے وہ دلی ہی نہ رہی اب تو اس "مرحوم دلی" کا ذکر افسانوں ہی میں سُنیے گا۔ مگر لوگ کہتے ہیں کہ دلی پھر دلی ہے۔ سترہ مرتبہ اُجڑ کر بھی نئی بہار کے ساتھ اپنا جوبن دکھا رہی ہے۔ خدا اس کو نظر بد سے بچائے۔

بہر حال اس نازک اور ناسازگار ماحول کے باوجود قصص القرآن جلد رابع کا دوسرا ایڈیشن طبع ہو کر آپ کو دعوت مطالعہ دے رہا ہے اب یہ آپ کا علمی و دینی فرض ہے کہ اس قیمتی ادارہ کو اس قابل بنائیں کہ وہ سابق کی طرح آج بھی علمی، ادبی اور دینی خدمات انجام دیتا رہے اور دنیا کی نئی ترقیوں کے ساتھ وہ بھی عروج کی آخری منزل تک پہنچ سکے۔ واللہُ غالبٌ علیٰ امرِہٖ۔

محمد حفظ الرحمٰن صدیقی کان اللہ لہ

۲۱۔ ذی الحجہ ۱۳۶۹ھ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

پیش لفظ

الحمد للّٰہ الذی نزّل الفرقان علیٰ عبدہٖ لیکون للعالمین نذیرا۔
والصلوٰۃ والسلام علیٰ محمد المبعوث کافۃ للناس بشیرا و نذیرا۔ اما بعد خدائے تعالیٰ کا احسانِ عظیم ہے کہ آج قصص القرآن کی تالیف اپنی آخری منزل پر پہنچ کر کامیابی کے ساتھ مکمل ہو گئی ہیں کیا اور میری لیاقت اور میرا قلم کیا؟ یہ جو کچھ بھی ہوا خدا کے فضل اور قرآنِ حکیم کی برکت کی بدولت ہوا۔ فالحمد للّٰہ علیٰ ذٰلک۔

یہ جلد حضرت عیسیٰ (علیہ الصلوٰۃ والسلام) اور خاتم الانبیاء محمد رسول اللّٰہ (صلی اللّٰہ علیہ وسلم) کی بعثت و دعوت اور حیوٰۃ طیبہ اور دیگر مباحثِ متعلقہ پر مشتمل، اور پہلی تین جلدوں کی خصوصیات و امتیازات کی حامل ہے۔

حضرت عیسیٰ (علیہ الصلوٰۃ والسلام) کے مقدس حالات میں خصوصیت کے ساتھ وہ مباحث لائقِ مراجعت ہیں جو قرآنِ حکیم کے حکیمانہ دلائل و براہین کی روشنی میں "حیوٰۃ عیسیٰ علیہ السلام" سے متعلق ہیں یا عہدِ قدیم و عہدِ جدید (توراۃ و انجیل) کے مضامینِ الٰہیات سے تعلق رکھتے ہیں۔

خاتم الانبیاء محمد رسول اللّٰہ (صلی اللّٰہ علیہ وسلم) کی "حیاتِ طیبہ" تو وہ مخدوم

شے ہے کہ از سلف تا خلف مسلسل ہر زندہ زبان اس خدمت پاک کو اپنا فرض یقین کرتی اور ادائے فرض سے سبکدوشی کا شرف حاصل کرتی رہی ہے خصوصاً عربی زبان کے بعد اُردو زبان میں اس خدمت نے بہترین ذخیرہ پیش کر دیا ہے اور مختصر، متوسط مطول ہر نوع کی تالیفات اس سلسلہ میں موجود ہیں اس لیے اس تالیف میں کوشش کی گئی ہے کہ صرف ان ہی واقعات کو سپردِ قلم کیا جائے جن کا قرآنِ حکیم سے براہِ راست تعلق ہے۔ ورنہ ظاہر ہے کہ ذاتِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ہر شعبۂ حیات قرآنِ حکیم کی جیتی جاگتی تصویر، اور آپ کا ہر اُسوۂ حسنہ آیاتِ قرآن کی تفسیر ہے۔

قصص القرآن کی تالیف اپنی افادیت اور مقصدِ تالیف کے لحاظ سے کیا درجہ رکھتی ہے اس کا فیصلہ اربابِ ذوق کی نگاہِ بصیرت کے سپرد ہے۔ خدائے تعالیٰ سے دست بدعا ہوں کہ وہ اس خدمت کو قبول فرمائے۔ وما توفیقی اِلّا باللّٰہ وھو حسبی ونعم الوکیل۔

خادمِ ملّت

محمد حفظ الرحمٰن صدیقی کان اللہ لہٗ

۹ صفر المظفر ۱۳۶۵ھ مطابق ۱۲ جنوری ۱۹۴۶ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حضرتِ عیسیٰ (علیہ السلام)

قرآن عزیز اور
حضرت عیسیٰ علیہ السلام

حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) جلیل القدر اور اولوالعزم پیغمبروں میں سے ہیں اور جس طرح نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) خاتم الانبیاء و رسل ہیں اُسی طرح عیسیٰ (علیہ السلام) خاتم الانبیاء بنی اسرائیل ہیں، اور جمہور کا اس پر اجماع ہے کہ محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) اور عیسیٰ (علیہ السلام) کے درمیان کوئی نبی مبعوث نہیں ہوا اور درمیان کا یہ زمانہ جس کی مدت تقریباً پانچ سو ستر سال ہے فترۃ (انقطاع وحی) کا زمانہ رہا ہے۔

عیسیٰ (علیہ السلام) کی جلالت قدر اور عظمتِ شان کا ایک امتیازی نشان یہ بھی ہے کہ اگر انبیاء بنی اسرائیل میں حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کو نبوت و رسالت کا "مقامِ امامت" حاصل ہے تو عیسیٰ (علیہ السلام) مجددِ انبیاء بنی اسرائیل ہیں، اس لیے کہ قانونِ ربانی (تورات) کے بعد بنی اسرائیل کی رشد و ہدایت کے لیے انجیل (بائبل) سے زیادہ عظیم المرتبہ دوسری کوئی کتاب نازل نہیں ہوئی اور یہ ایک حقیقت ہے کہ انجیل کا نزول قانونِ تورات کی تکمیل ہی کی شکل میں ہوا ہے یعنی نزولِ تورات کے بعد یہود نے جو قسم قسم کی گمراہیاں دینِ حق میں پیدا کر لی تھیں انجیل نے تورات کی شارح بن کر بنی اسرائیل کو ان گمراہیوں سے بچنے کی دعوت دی اور اس طرح تکمیلِ تورات کا فرض انجام دیا اور بنی اسرائیل میں حضرت موسیٰ کا فراموش شدہ پیغامِ ہدایت عیسیٰ (علیہ السلام) ہی نے دوبارہ یاد دلایا اور تازہ بارانِ رحمت کے ذریعہ اس خشک کھیتی کو دوبارہ زندگی بخشی۔

مزید برآں یہ کہ عیسیٰ (علیہ السلام) سرورِ کائنات محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے سب سے بڑے منادی اور مُبشر ہیں اور ہر دو مقدس پیغمبروں کے درمیان ماضی اور مستقبل دونوں زمانوں میں خاص رابطہ اور علاقہ پایا جاتا ہے[1]۔

---

[1] تفصیل اپنے موقعہ پر آئیگی۔

قرآنِ عزیز نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مماثلت کے سلسلہ میں جن پاک ہستیوں کے واقعات سے بہت زیادہ بحث کی ہے اُن میں حضرت ابراہیمؑ حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ (علیہم الصلوٰۃ والسلام) کی مقدس ہستیاں زیادہ نمایاں نظر آتی ہیں۔

حضرت ابراہیمؑ کی شخصیت قرآن کے "تذکیر بایام اللہ" میں اس لیے زیادہ اہمیت رکھتی ہے کہ جس دین قویم اور ملتِ بیضا کا عروج و کمال محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی تقدیس کے ساتھ وابستہ تھا اور جس ملت کی دعوت و تبلیغ کا محور و مرکز ذات اقدس بننے والی تھی "وہ ملتِ ابراہیم" کے نام سے موسوم ہے "مِلَّةَ اَبِیْكُمْ اِبْرٰهِیْمَ" کیونکہ یہی وہ بوڑھے پیغمبر ہیں جنہوں نے شرک کے مقابلہ میں سب سے پہلے توحیدِ الٰہی کو حنیفیت کا لقب دیا اور آئندہ ہمیشہ کے لیے خدا کی راہِ مستقیم کے لیے "ملۃ حنیفیہ" کا امتیاز قائم کر دیا یعنی جو خدا کی پرستش کے لیے مظاہرِ کائنات کی پرستش کو وسیلہ بناتا ہے وہ "مشرک" ہے اور جو خالقِ کائنات کی یکتائی کا قائل ہو کر براہ راست اُسی کی پرستش کرتا ہے وہ "حنیف" ہے، پس اس مقدس پیغمبر نے خدا پرستی کے اس حقیقی تصور کو عملی حیثیت میں اس درجہ نمایاں کیا کہ مستقبل میں ادیانِ حق کے لیے اس کی پیروی حق و صداقت کا معیار بن گئی اور خدائے برتر کی جانب سے قبولیت کا یہ شرف عطا ہوا کہ یہ مقدس پیغمبر کائناتِ رشد و ہدایت کا امام اکبر اور مجددِ اعظم قرار پا گیا۔ "واتبعوا ملۃ ابراھیم حنیفا" اور پیروی کرو ابراہیم کی ملت کی جو سب سے کٹ کر صرف خدا کی جانب جھکنے والا ہے۔

مِلَّةَ اَبِیْكُمْ اِبْرٰهِیْمَ هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِیْنَ مِنْ قَبْلُ وَفِیْ هٰذَا — یہ ملت ہے تمہارے باپ ابراہیم کی اس نے تمہارا نام مسلم[1] رکھا نزول قرآن سے قبل اور اس قرآن میں بھی تمہارا نام "مسلم" ہے۔
(حج)

[1] مسلم اور حنیف مفہوم میں متحد ہیں مسلم خدا کا تابعدار اور حنیف سب سے مُنہ پھیر کر صرف خدا کا ہو جانیوالا۔

اور موسیٰ (علیہ السلام) کی مقدس زندگی کا تذکرہ اس لیے اہمیت کا حامل ہو کہ ان کی دعوت و تبلیغ کے واقعات یعنی قوم کی جہالت و نافرمانی، دشمنانِ خدا سے نبرد آزمائی، پیہم مصائب و آلام پر صبر و استقلال کا دوام و ثبات، اور اسی قسم کے دوسرے کوائف و حالات میں اُن کے اور نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کے درمیان بہت زیادہ مشابہت و مناسبت پائی جاتی ہو اور اس لیے وہ واقعات و حالات قبول و انکارِ حق اور ان سے پیدا شدہ نتائج کے سلسلہ میں بصیرت و عبرت کا سامان مہیا کرتے اور نظائر و شواہد کی حیثیت رکھتے ہیں۔

اور عیسیٰ (علیہ السلام) کی حیاتِ طیبہ کا مقدس ذکر مسطورۂ بالا خصوصیات و امتیازات کی بنا پر خاص اہمیت رکھتا ہے۔

غرض قرآن عزیز نے حضرتِ عیسیٰ (علیہ السلام) کے حالات و واقعات کو بسط و تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہو اور ان کی حیاتِ طیبہ کے دیباچہ کے طور پر ان کی والدہ حضرت مریم (علیہا السلام) کے واقعاتِ زندگی کو بھی روشن کیا ہو تاکہ قرآن کا مقصد "تذکیر بایام اللہ" پورا ہو۔

یہ ذکرِ پاک قرآن عزیز کی تیرہ سورتوں میں ہوا ہے، ان میں سے کسی جگہ نام مبارک عیسیٰ (یسوع) سے یاد کیا گیا ہو اور کسی جگہ "مسیح" اور "عبداللہ" کے لقب سے اور کسی مقام پر کنیت "ابن مریم" کے اظہار کے ساتھ۔

نقشۂ ذیل اس حقیقت کا کاشف اور اربابِ مطالعہ کی بصیرت کے لیے ممد و معاون ہے،

شمار	سورہ	آیات	عیسیٰ	مسیح	عبداللہ	ابن مریم	تعداد آیات
۱	البقرۃ	۸۷-۱۳۶-۱۳۷-۱۳۸-۲۵۳	۳	۰	۰	۲	۵
۲	آل عمرن	۴۲-۴۲-۶۴-۸۴	۵	۱	۰	۱	۲۴

شمار	سورہ	آیات	عیسیٰ	مسیح	عبداللہ	ابن مریم	تعداد آیات
۳	النساء	۱۵۶-۱۵۹-۱۷۱-۱۷۲	۳	۳	۰	۲	۶
۴	المائدہ	۱۷-۴۶-۷۲-۷۵-۷۸-۱۱۰-۱۲۰	۶	۵	۰	۱۰	۱۸
۵	الانعام	۸۵	۱	۰	۰	۰	۱
۶	التوبہ	۳۰-۳۱	۰	۱	۰	۱	۲
۷	مریم	۱۶-۳۵	۱	۱	۱	۱	۱۹
۸	المؤمنون	۵۰	۱	۰	۰	۱	۱
۹	الاحزاب	۷-۸	۱	۰	۰	۱	۲
۱۰	الشوریٰ	۱۳	۱	۰	۰	۰	۱
۱۱	الزخرف	۵۷-۶۳	۱	۰	۰	۱	۲
۱۲	الحدید	۲۷	۱	۰	۰	۱	۱
۱۳	الصف	۶-۱۴	۲	۰	۰	۲	۲

عمران وحنہ

حضرت زکریا اور حضرت یحییٰ (علیہما السلام) کے حالات میں گذر چکا ہے کہ بنی اسرائیل میں عمران ایک عابد و زاہد شخص تھے اور اسی زہد و عبادت کی وجہ سے نماز کی امامت بھی ان ہی کے سپرد تھی اور ان کی بیوی حنہ بھی بہت پارسا اور عابدہ تھیں اور اپنی نیکی کی وجہ سے وہ دونوں بنی اسرائیل میں بہت زیادہ محبوب و مقبول تھے[1]

محمد بن اسحٰق صاحبِ مغازی نے عمران کا نسب نامہ اس طرح بیان کیا ہے

عمران بن یاشم بن میشا بن حزقیا بن ابراہیم بن عزریا بن ناوش بن اجر بن یہوا بن ناذم بن ماسط بن ایشا بن ایاز بن رحبعم (رحبعام) بن سلیمان بن داؤد (علیہما الصلوٰۃ والسلام) اور حافظ

[1] تفسیر ابن کثیر جلد ۱ (آل عمران)

ابنِ عساکر نے ان ناموں کے علاوہ دوسرے نام بیان کیے ہیں اور ان دونوں بیانات میں کافی اختلاف پایا جاتا ہے تاہم اس پر تمام علماءِ انساب کا اتفاق ہے کہ عمران حضرت سلیمان (علیہ السلام) کی اولاد میں سے ہیں اور حنہ بنتِ فاقوذ بن قبیل بھی داؤد (علیہ السلام) کی نسل سے ہیں۔[1]

عمران صاحبِ اولاد نہیں تھے اور ان کی بیوی حنہ بہت زیادہ متمنی تھیں کہ ان کے اولاد ہو، وہ اس کے لیے درگاہِ الٰہی میں دست بدعا، اور قبولیتِ دعا کے لیے ہر وقت منتظر رہتی تھیں۔

کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ حنہ صحنِ مکان میں چہل قدمی کر رہی تھیں، دیکھا کہ ایک پرند اپنے بچہ کو بھرا رہا ہے، حنہ کے دل پر یہ دیکھ کر سخت چوٹ لگی اور اولاد کی تمنا نے بہت جوش مارا اور حالتِ اضطراب میں بارگاہِ الٰہی میں دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیے اور عرض کیا "پروردگار اسی طرح مجھ کو بھی اولاد عطا کر کہ وہ ہماری آنکھوں کا نور اور دل کا سرور بنے" دل سے نکلی ہوئی دعا نے قبولیت کا جامہ پہنا اور حنہ نے چند روز بعد محسوس کیا کہ وہ حاملہ ہیں، حنہ کو اس احساس سے اس درجہ مسرت ہوئی کہ انہوں نے نذر مان لی کہ جو بچہ پیدا ہوگا اس کو ہیکل (مسجد اقصیٰ) کی خدمت کے لیے وقف کر دونگی۔[2]

بہرحال اللہ تعالیٰ نے عمران کی بیوی حنہ کی دعا کو شرفِ قبولیت بخشا اور وہ مسرت و شادمانی کے ساتھ اُمید بر آنے کی گھڑی کا انتظار کرنے لگیں۔

بشر بن اسحٰق کہتے ہیں کہ حنہ ابھی حاملہ ہی تھیں کہ ان کے شوہر عمران کا انتقال ہو گیا۔[3]

---

[1] البدایہ والنہایہ ج ۲ ص ۵۶ [2] بنی اسرائیل کی مذہبی رسوم میں سے یہ رسم بہت مقدس سمجھی جاتی تھی کہ وہ اپنی اولاد کو ہیکل کی خدمت کے لیے وقف کریں۔ البدایہ والنہایہ جلد ۲

[3] فتح الباری ج ۶ ص ۳۶۴۔

مریم علیہا السلام کی ولادت	جب مدتِ حمل پوری ہوگئی اور ولادت کا وقت آپہنچا تو حنہ کو معلوم ہوا کہ اُن کے بطن سے لڑکی پیدا ہوئی ہے، جہاں تک اولاد کا تعلق ہے حنہ کے لئے یہ

لڑکی بھی لڑکے سے کم نہ تھی مگر اُن کو یہ افسوس ضرور ہوا کہ میں نے جو نذر مانی تھی وہ پوری نہیں ہو سکے گی اس لئے کہ لڑکی کس طرح مقدس ہیکل کی خدمت کر سکے گی؟ لیکن اللہ تعالیٰ نے اُن کے افسوس کو یہ کہہ کر بدل دیا کہ ہم نے تیری لڑکی کو ہی قبول کیا اور اس کی وجہ سے تمہارا خاندان بھی معزز اور مبارک قرار پایا، حنہ نے لڑکی کا نام مریم رکھا، سریانی میں اس کے معنی "خادم" کے ہیں، چونکہ یہ ہیکل کی خدمت کے لئے وقف کر دی گئیں اس لئے یہ نام موزوں سمجھا گیا۔[۱]

قرآنِ عزیز نے اس واقعہ کو معجزانہ اختصار کے ساتھ اس طرح بیان کیا ہے۔

اِنَّ اللّٰہَ اصْطَفٰٓی اٰدَمَ وَ نُوْحًا	بیشک اللہ نے آدم اور نوح اور آلِ ابراہیم اور آلِ عمران
وَّاٰلَ اِبْرٰھِیْمَ وَاٰلَ عِمْرٰنَ	کو (اپنے اپنے زمانہ میں) جہان والوں پر بزرگی عطا فرمائی
عَلَی الْعٰلَمِیْنَ ۝ ذُرِّیَّۃً بَعْضُھَا	(ان میں سے) بعض، بعض کی ذریت ہیں۔ اور اللہ
مِنْۢ بَعْضٍ وَاللّٰہُ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ ۝	سننے والا، جاننے والا ہے (وہ وقت یاد کرو) جب
اِذْ قَالَتِ امْرَاَتُ عِمْرٰنَ	عمران[۲] کی بیوی نے کہا: "خدایا! میں نے نذر مان لی ہے
رَبِّ اِنِّیْ نَذَرْتُ لَکَ مَا فِیْ	کہ میرے پیٹ میں جو (بچہ) ہے وہ تیری راہ میں آزاد ہے،
بَطْنِیْ مُحَرَّرًا فَتَقَبَّلْ مِنِّیْ	پس تو اس کو میری جانب سے قبول فرما۔ بیشک تو سننے
اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ۝	والا جاننے والا ہے"۔
فَلَمَّا وَضَعَتْھَا قَالَتْ رَبِّ	پھر جب اُس نے جنا تو کہنے لگی "پروردگارا میرے لڑکی

[۱] فتح الباری ج ۶ ص ۳۶۵۔ [۲] عمران، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے والد کا نام بھی ہے اور حضرت مریم علیہا السلام کے والد کا بھی۔ یہاں والدِ مریم علیہا السلام مراد ہیں۔

اِنِّیْ وَضَعْتُهَآ اُنْثٰیؕ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا وَضَعَتْؕ وَلَیْسَ الذَّكَرُ كَالْاُنْثٰیۚ وَاِنِّیْ سَمَّیْتُهَا مَرْیَمَ وَاِنِّیْۤ اُعِیْذُهَا بِكَ وَذُرِّیَّتَهَا مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ۝	پیدا ہوئی ہے اور اللہ خوب جانتا ہے جو اس نے جنا ہے اور لڑکا اور لڑکی یکساں نہیں ہیں (یعنی ہیکل کی خدمت لڑکی نہیں کر سکتی لڑکا کر سکتا ہے) اور میں نے اس کا نام مریم رکھا ہے، اور میں اس کو اور اس کی اولاد کو شیطانِ رجیم کے فتنہ سے تیری پناہ میں دیتی ہوں۔
فَتَقَبَّلَهَا رَبُّهَا بِقَبُوْلٍ حَسَنٍ وَّ اَنْۢبَتَهَا نَبَاتًا حَسَنًاۙ وَّكَفَّلَهَا زَكَرِیَّاؕ (آل عمران)	پس مریم کو اس کے پروردگار نے بہت اچھی طرح قبول فرمایا اور اس کی نشو ونما اچھے طریق پر کی اور زکریا کو اس کا نگرانِ کار بنا دیا۔

حضرت مریم (علیہا السلام) جب سنِ شعور کو پہنچیں اور یہ سوال پیدا ہوا کہ مقدس ہیکل کی یہ امانت کس کے سپرد کی جائے تو کاہنوں[۱] میں سے ہر ایک نے یہ خواہش ظاہر کی کہ اس مقدس امانت کا کفیل مجھ کو بنایا جائے مگر اس امانت کی نگرانی کا اہل حضرت زکریا سے زیادہ کوئی نہ تھا، اس لئے کہ وہ مریم (علیہا السلام) کی خالہ ایشاع (الیشبع) کے شوہر بھی تھے اور مقدس ہیکل کے معزز کاہن اور خدائے برتر کے نبی بھی تھے، اس لئے سب سے پہلے انھوں نے ہی اپنا نام پیش کیا مگر جب سب کاہنوں نے یہی خواہش ظاہر کی اور باہمی کشمکش کا اندیشہ ہونے لگا تو آپس میں طے پایا کہ قرعہ اندازی کے ذریعہ اس کا فیصلہ کر لیا جائے۔ اور بقول روایاتِ بنی اسرائیل تین مرتبہ قرعہ اندازی کی گئی وہ دریا میں اپنے قلم (پورے) ڈالتے مگر قرعہ کی شرط کے مطابق ہر مرتبہ زکریا (علیہ السلام) ہی کا نام نکلا، کاہنوں نے جب یہ دیکھا کہ اس معاملہ میں زکریا (علیہ السلام) کے ساتھ تائید غیبی ہے تو انھوں نے بخوشی اس فیصلہ کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیا

[۱] کاہن سے وہ مقدس ہستیاں مراد ہیں جو ہیکل میں مذہبی رسوم ادا کرتی اور خدمتِ ہیکل پر مامور تھیں۔

اور اس طرح یہ "سعید امانت" حضرت زکریا کے سپرد کر دی گئی۔

کہا جاتا ہے کہ مریم (علیہا السلام) کی کفالت کا یہ معاملہ اس لئے پیش آیا کہ وہ یتیم تھیں اور مردوں میں سے کوئی ان کا کفیل نہیں تھا اور بعض کہتے ہیں کہ اُس زمانہ میں قحط کا بہت زور تھا اس لئے کفالت کا سوال پیدا ہوا[1]۔ لیکن یہ دونوں باتیں اگر نہ بھی ہوتیں تب بھی کفالت کا سوال اپنی جگہ پھر بھی باقی رہتا اس لئے کہ مریم (علیہا السلام) اپنی والدہ کی نذر کے مطابق "نذرِ ہیکل" ہو چکی تھیں اور چونکہ لڑکی تھیں اس لئے ازبس ضروری تھا کہ وہ کسی مردِ نیک کی کفالت میں اس خدمت کو انجام دیتیں۔

غرض زکریا (علیہ السلام) نے حضرت مریم (علیہا السلام) کے صنفی احترامات کا لحاظ رکھتے ہوئے ہیکل کے قریب ایک حجرہ اُن کے لئے مخصوص کر دیا تاکہ وہ دن میں وہاں رہ کر عبادتِ الٰہی سے بہرہ ور ہوں اور جب رات آتی تو اُن کو اپنے مکان پر اُن کی خالہ ایشاع کے پاس لیجاتے اور وہ وہیں شب بسر کرتیں[2]۔

حنہ اور ایشاع | ابنِ کثیر فرماتے ہیں کہ جمہور کا قول یہ ہے کہ ایشاع (الیشبع) مریم (علیہا السلام)

---

[1] تفسیر ابنِ کثیر ج ۱ ص ۳۶۰۔ [2] روح المعانی سورۂ آل عمران۔

مولانا آزاد ترجمان القرآن میں لکھتے ہیں۔ قرآن میں حضرت مسیح (علیہ السلام) کے ظہور کا ذکر زیادہ تفصیل کے ساتھ دو جگہ کیا گیا ہے یہاں اور سورۂ آل عمران کی آیات (۳۵-۶۳) میں یہاں یہ ذکر حضرت زکریا کی دعا اور حضرت یحییٰ کی پیدائش کے بیان سے شروع ہوا ہے اور اناجیل اربعہ میں سے صرف لوقا کی انجیل ٹھیک اسی طرح یہ تذکرہ شروع کرتی ہے لیکن سورۂ آل عمران میں یہ تذکرہ اس سے بھی پیشتر کے ایک واقعہ سے شروع ہوتا ہے یعنی حضرت مریم کی پیدائش اور ہیکل میں پرورش پانے کے واقعہ سے اور اس بارہ میں چاروں انجیلیں خاموش ہیں لیکن انیسویں صدی میں متروک اناجیل کا جو نسخہ ویٹیکان کے کتب خانہ سے برآمد ہوا اس نے حضرت مریمؑ کی پیدائش کا یہ مفقود ٹکڑا مہیا کر دیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کم از کم چوتھی صدی عیسوی کے اوائل تک سرگذشت کا یہ ٹکڑا بھی اسی طرح الہامی یقین کیا جاتا تھا جس طرح بقیہ ٹکڑے یقین کئے جاتے ہیں۔ ج ۲ ص ۴۴۳۔

کی ہمشیر تھیں اور حدیث معراج میں نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے عیسیٰ اور یحییٰ (علیہما السلام) کے متعلق یہ فرما کر "وھما ابنا خالۃ" جو رشتہ ظاہر فرمایا ہے اس سے بھی جمہور کے قول کی تائید ہوتی ہے۔

لیکن جمہور کا یہ قول قرآن عزیز اور "تاریخ" دونوں کے خلاف ہے اس لئے کہ قرآن نے مریم (علیہا السلام) کی ولادت کے واقعہ کو جس اسلوب کے ساتھ بیان کیا ہے وہ صاف بتا رہا ہے کہ عمران اور حنہ، مریم (علیہا السلام) کی ولادت سے قبل اولاد سے قطعاً محروم تھیں یہی وجہ ہے کہ حنہ نے مریم علیہا السلام کی ولادت پر یہ نہیں کہا "خدایا! میرے تو پہلے بھی ایک لڑکی موجود تھی، اب تو نے دوبارہ بھی لڑکی ہی عطا فرمائی" بلکہ درگاہِ الٰہی میں یہ عرض کیا کہ جس شکل میں میری دعا تو نے قبول فرمائی ہے اس کو حسبِ وعدہ تیری نذر کیسے کروں؟ نیز توراۃ اور بنی اسرائیل کی تاریخ سے بھی کہیں یہ ثابت نہیں کہ عمران اور حنہ کے مریم (علیہا السلام) کے ماسوا کوئی اور اولاد بھی تھی بلکہ اس کے برعکس تاریخِ یہود اور اسرائیلیات کا مشہور قول یہ ہے کہ ایشاع، مریم (علیہا السلام) کی خالہ تھیں۔

دراصل جمہور کی جانب یہ منسوب قول صرف حدیثِ معراج کے مسطورہ بالا جملہ کے پیشِ نظر ظہور میں آیا ہے حالانکہ نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کا یہ ارشاد (وھما ابنا خالۃ) وہ دونوں خالہ زاد بھائی ہیں، مجاز متعارف کی شکل میں ہے یعنی آپ نے بطریقِ توسع والدہ کی خالہ کو عیسیٰؑ کی خالہ فرمایا ہے اور اس قسم کا توسع عام بول چال میں شائع ذائع ہے۔

علاوہ ازیں ابنِ کثیر (رحمہ اللہ) کا اس کو "قولِ جمہور" کہنا بھی محلِ نظر ہے اس لئے کہ محمد بن اسحٰق، اسحٰق بن بشر، ابنِ عساکر، ابن جریر اور ابنِ حجر (رحمہم اللہ) جیسے جلیل القدر اصحابِ حدیث و سیر کا رجحان اسی جانب ہے کہ ایشاع، حنہ کی ہمشیر اور مریم (علیہا السلام) کی

خالہ ہیں، حنّہ کی بیٹی نہیں ہیں۔

مریم علیہا السلام کا زہد و تقویٰ

مریم (علیہا السلام) شب و روز عبادتِ الٰہی میں رہتیں اور جب خدمتِ ہیکل کے لئے ان کی نوبت آتی تو اُس کو بھی بخوبی انجام دیتی تھیں حتیٰ کہ ان کا زہد و تقویٰ بنی اسرائیل میں ضرب المثل بن گیا اور ان کی زہادت و عبادت کی مثالیں دی جانے لگیں

مقبولیتِ خداوندی

زکریا (علیہ السلام) مریم (علیہا السلام) کی ضروری نگہداشت کے سلسلہ میں کبھی کبھی اُن کے حجرہ میں تشریف لیجایا کرتے تھے لیکن ان کو یہ بات عجیب نظر آتی کہ جب وہ خلوتکدہ میں داخل ہوتے تو مریم (علیہا السلام) کے پاس اکثر بے موسم کے تازہ پھل موجود پاتے[1]۔ آخر زکریا (علیہ السلام) سے نہ رہا گیا اور انھوں نے دریافت کیا: مریم! تیرے پاس یہ بے موسم پھل کہاں سے آتے ہیں؟ مریم (علیہا السلام) نے فرمایا "یہ میرے پروردگار کا فضل و کرم ہے وہ جس کو چاہتا ہے بے گمان رزق پہنچاتا ہے" حضرت زکریاؑ نے یہ سُنا تو سمجھ گئے کہ خدائے برتر کے یہاں مریمؑ کا خاص مقام اور مرتبہ ہے اور ساتھ ہی بے موسم تازہ پھلوں کے واقعہ نے دل میں یہ تمنا پیدا کردی کہ جس خدا نے اپنی قدرتِ کاملہ سے یہ پھل بے موسم پیدا کر دیئے، کیا وہ میرے بڑھاپے اور بیوی کے بانجھ ہونے کے باوجود مجھ کو بے موسم پھل (بیٹا) عطا نہ کرے گا؟ یہ سوچ کر اُنھوں نے خشوع و خضوع کے ساتھ بارگاہِ ربانی میں دعا کی اور وہاں سے شرفِ قبولیت کا مژدہ عطا ہوا۔

وَكَفَّلَهَا زَكَرِيَّا كُلَّمَا دَخَلَ عَلَيْهَا	اور اُس (مریم) کی کفالت زکریا نے کی، جب اُس
زَكَرِيَّا الْمِحْرَابَ وَجَدَ عِنْدَهَا	(مریم) کے پاس زکریا داخل ہوتے تو اُس کے پاس

[1] یہ تفصیل اگرچہ تفسیری روایات سے ماخوذ ہو اور آیت میں صرف لفظ "رزق" آیا ہے لیکن آیت سے بصراحت ثابت ہوتا ہو کہ مریم کا یہ رزق انسانی داد و دہش کا نتیجہ نہیں تھا بلکہ بطور کرامت من جانب اللہ تھا۔ (مولف)

رِزْقًا قَالَ يٰمَرْيَمُ اَنّٰى لَكِ
هٰذَا قَالَتْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ
اِنَّ اللّٰهَ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ
بِغَيْرِ حِسَابٍ ۝ (آل عمران)

کھانے کی چیزیں رکھی پاتے۔ زکریا نے کہا: "اے
مریم! تیرے پاس کہاں سے آئیں؟" مریم نے کہا
"یہ اللہ کے پاس سے آئی ہیں، بلاشبہ اللہ تعالیٰ
جس کو چاہتا ہے بے گمان رزق دیتا ہے۔"

مریم (علیہا السلام) اسی طرح ایک عرصہ تک اپنے مقدس مشاغل کے ساتھ پاک زندگی بسر کرتی رہیں اور مقدس ہیکل کا سب سے مقدس مجاور حضرت زکریا (علیہ السلام) بھی اُن کے زہد و تقویٰ سے بیحد متاثر تھے کہ اللہ تعالیٰ نے اُن کی عظمت اور جلالتِ قدر کو اور زیادہ بلند کیا اور فرشتوں کے ذریعہ اُن کو برگزیدۂ بارگاہِ الٰہی ہونے کی یہ بشارت سنائی۔

اِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ
اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰكِ وَطَهَّرَكِ
وَاصْطَفٰكِ عَلٰى نِسَآءِ
الْعٰلَمِيْنَ ۝ يٰمَرْيَمُ اقْنُتِيْ لِرَبِّكِ
وَاسْجُدِيْ وَارْكَعِيْ مَعَ
الرّٰكِعِيْنَ ۝ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ
اِذْ يُلْقُوْنَ اَقْلَامَهُمْ اَيُّهُمْ
يَكْفُلُ مَرْيَمَ وَمَا كُنْتَ
لَدَيْهِمْ اِذْ يَخْتَصِمُوْنَ۔
(آل عمران)

(اے پیغمبر وہ وقت یاد کیجئے) جب فرشتوں نے کہا
اے مریم! بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے تجھ کو بزرگی دی اور
پاک کیا اور دنیا کی عورتوں پر تجھ کو برگزیدہ کیا، اے
مریم! اپنے پروردگار کے سامنے جھک جا اور سجدہ ریز
ہو جا اور نماز پڑھنے والوں کے ساتھ نماز ادا کر" اور
تم اُس وقت اُن کاہنوں کے پاس موجود نہ تھے جب
وہ اپنے قلموں (تیروں) کو (قرعہ اندازی کیلئے) ڈال
رہے تھے کہ مریم کی کفالت کون کرے اور تم اس وقت
(بھی) موجود نہ تھے جب وہ اس کفالت کے بارہ میں
آپس میں جھگڑ رہے تھے۔

حضرت مریم (علیہا السلام) جبکہ نہایت مرتاض، عابد و زاہد اور تقویٰ و طہارت میں

ضرب المثل تھیں اور جبکہ عنقریب ان کو جلیل القدر پیغمبر حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کی والدہ ماجدہ ہونے کا شرف بھی حاصل ہونے والا تھا تو من جانب اللہ ان کی تقدیس وتطہیر کا یہ اعلان بلاشبہ حق بحقدار رسید کا مصداق ہے، تاہم علمی اور تاریخی اعتبار سے بلکہ خود قرآن واحادیث کے مفہوم کے لحاظ سے یہ مسئلہ قابلِ توجہ ہے کہ آیت "وَاصْطَفٰكِ عَلٰى نِسَآءِ الْعٰلَمِيْنَ" کی مراد کیا ہے، اور کیا درحقیقت حضرت مریم علیہا السلام کو بغیر کسی استثناء کے کائنات کی تمام عورتوں پر برتری اور فضیلت حاصل ہے؟ اور یہی نہیں بلکہ اس آیتِ فضیلت نے مریمؑ کی ذات سے متعلق علماءِ سلف میں چند اہم مسائل کو زیر بحث بنا دیا ہے مثلاً (۱) کیا عورت نبی ہو سکتی ہے؟ (۲) کیا حضرت مریمؑ نبی تھیں؟ (۳) اگر نبی نہیں تھیں تو آیت کے جملہ "وَاصْطَفٰكِ عَلٰى نِسَآءِ الْعٰلَمِيْنَ" کا مطلب کیا ہے؟

کیا عورت نبی ہو سکتی ہے؟ محمد بن اسحٰق، شیخ ابو الحسن اشعری، قرطبی، ابن حزم (نور اللہ مرقدہم) اس جانب مائل ہیں کہ عورت نبی ہو سکتی ہے بلکہ ابن حزم تو یہ دعوٰی کرتے ہیں کہ حضرت حوا، سارہ، ہاجرہ، امِ موسیٰؑ، آسیہ اور مریم (علیہن السلام) یہ سب نبی تھیں، اور محمد بن اسحٰق رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اکثر فقہاء اس کے قائل ہیں کہ عورت نبی ہو سکتی ہے اور قرطبی فرماتے ہیں کہ مریمؑ (علیہا السلام) نبی تھیں۔

ان حضرات کے اقوال کے برعکس خواجہ حسن بصری، امام الحرمین شیخ عبد العزیزؒ اور قاضی عیاض (نور اللہ مرقدہم) کا رجحان اس جانب ہے کہ عورت نبی نہیں ہو سکتی اور اس لئے مریم علیہا السلام بھی نبی نہیں تھیں، قاضیؒ اور ابن کثیرؒ یہ بھی کہتے ہیں کہ جمہور کا مسلک یہی ہے اور امام الحرمین تو اجماع تک کا دعوٰی کرتے ہیں۔ جو علماء یہ فرماتے ہیں کہ عورت نبی نہیں ہو سکتی وہ اپنی دلیل میں اس آیت کو پیش کرتے ہیں۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِیْٓ اِلَيْهِمْ (النحل) — اور تم سے پہلے ہم نے نہیں بھیجے مگر مرد کہ وحی بھیجتے تھے ہم اُن کی طرف۔

اور خصوصیت کے ساتھ حضرت مریمؑ کی نبوت کے انکار پر یہ دلیل دیتے ہیں کہ قرآنِ عزیز نے اُن کو "صدیقہ" کہا ہے، سورۂ مائدہ میں ہے۔

مَا الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ وَاُمُّهٗ صِدِّيْقَةٌ (مائدہ) — بس ابنِ مریم تو ایک پیغمبر ہیں جن سے پہلے اور بھی پیغمبر گذر چکے اور ان کی والدہ صدیقہ تھیں

اور سورۂ نساء میں قرآنِ عزیزؔ نے منعم علیہم کی جو فہرست دی ہے وہ اس کے لئے نصِ قطعی ہے کہ "صدیقیت" کا درجہ "نبوت" سے کم اور نازل ہے۔[1]

اور جو حضرات عورت کے نبی ہونے کے قائل ہیں وہ فرماتے ہیں کہ قرآنِ عزیز نے حضرت سارہ، اُمِ موسیٰ اور حضرت مریم (علیہن السلام) کے متعلق جن واقعات کا اظہار کیا ہی ان میں بصراحت موجود ہے کہ اُن پر خدا کے فرشتے وحی لے کر نازل ہوئے اور اُن کو منجانب اللہ بشارات سے سرفراز فرمایا اور اُن تک اپنی معرفت، عبادت کا حکم پہنچایا چنانچہ حضرت سارہ کے لئے سورۂ ہود اور سورۂ الذّٰریٰت اور اُمِ موسیٰ کے لئے سورۂ قصص میں اور مریم علیہا السلام کے لئے آلِ عمران اور سورۂ مریم میں بواسطۂ ملائکہ اور بلا واسطہ خطابِ الٰہی موجود ہے اور ظاہر ہے کہ ان مقامات پر وحی کے لغوی معنی (وجدانی ہدایت یا مخفی اشارہ) کے نہیں ہیں جیسا کہ آیت "وَاَوْحٰى رَبُّكَ اِلَى النَّحْلِ" میں شہد کی مکھی کے لئے وحی کا اطلاق کیا گیا ہے۔

اور خصوصیت کے ساتھ حضرت مریم (علیہا السلام) کے نبی ہونے کی یہ واضح دلیل ہی کہ سورۂ مریم میں ان کا ذکر اسی اسلوب کے ساتھ کیا گیا ہے، جس طریقہ پر دیگر انبیاء و رسل

---

[1] اُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا۔

کا تذکرہ کیا ہے مثلاً "وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ مُوسٰى" "وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ إِدْرِيسَ" "وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ إِسْمٰعِيلَ" "وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ إِبْرٰهِيمَ" "وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ مَرْيَمَ" یا مثلاً "وَقَدْ اَرْسَلْنَا اِلَيْهَا رُوْحَنَا" ہم نے مریمؑ کی جانب اپنے فرشتہ جبرئیلؑ کو بھیجا، یا مثلاً قَالَ اِنَّمَا اَنَا رَسُوْلُ رَبِّكِ۔ میں بلاشبہ تیرے پروردگار کی جانب سے پیغامبر ہوں" نیز آلِ عمران میں مریم علیہا السلام کو ملائکۃ اللہ نے جس طرح خدا کی جانب سے پیغامبر بن کر خطاب کیا ہے وہ بھی اس دعوے کی روشن دلیل ہے۔

اور مریم (علیہا السلام) کے صدیقہ ہونے سے متعلق جو سوال ہے اس کا جواب دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اگر قرآن نے حضرت مریم (علیہا السلام) کو "صدیقہ" کہا ہے تو یہ لقب اُن کی شانِ نبوت کے اُسی طرح منافی نہیں ہے جس طرح حضرت یوسف (علیہ السلام) کے مسلّم نبی ہونے کے باوجود آیت "یُوْسُفُ اَیُّهَا الصِّدِّیْقُ" میں اُن کا صدیق ہونا اُن کے نبی ہونے کو مانع نہیں ہے بلکہ ذکرِ پاک مقامی خصوصیت کی بنا پر مذکور ہوا ہے۔ کیونکہ جو "نبی" ہے وہ بہرحال "صدیق" ضرور ہے البتہ اس کا عکس ضروری نہیں ہے۔

ان علماءِ اسلام کی ترجمانی جس تفصیل کے ساتھ کتاب الفصل میں مشہور محدث ابن حزم (رحمۃ اللہ) نے کی ہے اُس تفصیل و قوت کے ساتھ دوسری جگہ نظر سے نہیں گذری اس لئے سطورِ ذیل میں اُس پورے مضمون کا ترجمہ لائقِ مطالعہ ہے۔

نبوۃ النساء اور ابن حزم	یہ فصل ایسے مسئلہ کے متعلق ہے جس پر ہمارے زمانہ میں قرطبہ (اندلس) میں شدید اختلاف برپا ہوا، علماء کی ایک جماعت کہتی ہے

لہ سورۂ ہود آیت ۷۳، ۷۱، والذریت آیۃ ۳۰۔ ۲۹۔ کہ قصص آیۃ ۷، سہ آل عمران آیۃ ۴۳-۴۲ و ۴۷۔ ۴۵۔ وسورہ مریم آیۃ ۲۶ تا ۱۹۔ کہ سورۂ یوسف

کہ عورت نبی نہیں ہو سکتی اور جو ایسا کہتا ہے کہ عورت نبی ہو سکتی ہے وہ ایک نئی بدعت ایجاد کرتا ہے اور دوسری جماعت قائل ہے کہ عورت نبی ہو سکتی ہے اور نبی ہوئی ہیں، اور ان دونوں سے الگ تیسری جماعت کا مسلک توقف ہے اور وہ اثبات و نفی دونوں باتوں میں سکوت کو پسند کرتے ہیں مگر جو حضرات عورت سے متعلق منصبِ نبوت کا انکار کرتے ہیں اُن کے پاس اس انکار کی کوئی دلیل نظر نہیں آتی البتہ بعض حضرات نے اپنے اختلاف کی بنیاد اس آیت کو بنایا ہے "وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِیْٓ اِلَیْهِمْ"

میں کہتا ہوں کہ اس بارہ میں کس کو اختلاف ہے اور کس نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ عورت کو ہدایتِ خلق کے لئے رسول بنا کر بھیجتا ہے یا اُس نے کسی عورت کو "رسول" بنایا ہے، بحث رسالت کے مسئلہ میں نہیں ہے بلکہ نبوت میں ہے، پس طلبِ حق کے لئے ضروری ہے کہ اول یہ غور کیا جائے کہ لغتِ عرب میں لفظِ "نبوت" کے کیا معنی ہیں؟ تو ہم اس لفظ کو "اِنبار" سے ماخوذ پاتے ہیں جس کے معنی "اطلاع دینا" ہیں، پس نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ جس شخص کو اللہ تعالیٰ کسی معاملہ کے ہونے سے قبل بذریعہ وحی اطلاع دے یا کسی بھی بات کے لئے اس کی جانب وحی نازل فرمائے وہ شخص مذہبی اصطلاح میں بلاشبہ "نبی" ہے۔

آپ اس مقام پر یہ نہیں کہہ سکتے کہ وحی کے معنی اس الہام کے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے کسی مخلوق کی سرشت میں ودیعت کر دیا ہے جیسا کہ شہد کی مکھی کے متعلق خدائے برحق کا ارشاد ہے "واوحیٰ ربک الی النحل" اور نہ وحی کے معنی ظن اور وہم کے لے سکتے ہیں اس لئے کہ ان دونوں کو "علم یقین" سمجھنا (جو وحی کا قدرتی نتیجہ ہے) مجنون کے سوا

اور کسی کا کام نہیں ہے اور نہ یہاں وہ معنی مراد ہو سکتے ہیں جو "باب کہانۃ" سے تعلق رکھتے ہیں (یعنی یہ کہ شیاطین، آسمانی باتوں کو سننے اور چرانے کی کوشش کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی جانب سے اُن پر شہابِ ثاقب کے ذریعہ رجم کیا جاتا ہے اور جس کے متعلق قرآن یہ کہتا ہے۔ " شیٰطین الجن والانس یوحی بعضھم الیٰ بعض زخرف القول غرورا " کیونکہ یہ "باب کہانۃ" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت کے وقت سے مسدود ہو گیا۔ اور نہ اس جگہ وحی کے معنی تجربۂ علم کے تجرباتِ علمیہ سے تعلق رکھتے ہیں جو خود انسانوں کے باہم سیکھنے سکھانے سے حاصل ہو جایا کرتے ہیں اور نہ اس کے معنی اُس رویا (خواب) کے ہو سکتے ہیں جن کے سچ یا جھوٹ ہونے کا کوئی علم نہیں ہو بلکہ ان تمام معانی سے جدا "وحی بمعنی نبوۃ" یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے قصد اور ارادہ سے ایک شخص کو ایسے امور کی اطلاع دے جن کو وہ پہلے سے نہیں جانتا اور مسطورۂ بالا ذرائع علم سے الگ یہ امور حقیقتِ ثابتہ بن کر اُس شخص پر اس طرح منکشف ہو جائیں گویا آنکھوں سے دیکھ رہا ہے اور اللہ تعالیٰ اس علم خاص کے ذریعہ اس شخص کو بغیر کسی محنت و کسب کے بداہۃً ایسا صحیح یقین عطا کر دے کہ وہ ان امور کو اس طرح معلوم کرلے جس طرح وہ حواس اور بداہتِ عقل کے ذریعہ حاصل کر لیا کرتا ہے اور اُس کو کسی قسم کے شک و شبہ کی گنجایش باقی نہیں رہتی۔ اور خدا کی یہ وحی یا تو اس طرح ہوتی ہے کہ فرشتہ آکر اُس شخص کو خدا کا پیغام سناتا ہے اور یا اس طرح کہ اللہ تعالیٰ براہِ راست اس سے خطاب کرتا ہے۔

پس اگر اُن حضرات کے نزدیک — جو عورت کے نبی ہونے کا انکار کرتے ہیں۔ نبوۃ کے معنی یہ نہیں ہیں تو وہ ہم کو سمجھائیں کہ آخر نبوت کے معنی ہیں کیا؟ حقیقت یہ ہو

کہ وہ اس کے ماسوا اور کوئی معنی بیان ہی نہیں کرسکتے۔

اور جبکہ نبوت کے معنی وہی ہیں جو ہم نے بیان کئے تو اب قرآن کے ان مقامات کو بغور مطالعہ کیجئے جہاں یہ مذکور ہے کہ اللہ عزوجل نے عورتوں کے پاس فرشتوں کو بھیجا اور فرشتوں نے اللہ تعالیٰ کی جانب سے اُن عورتوں کو "وحیِ حق" سے مطلع کیا چنانچہ فرشتوں نے اللہ تعالیٰ کی جانب سے امّ اسحٰق (سارہ علیہا السلام) کو اسحٰق (علیہ السلام) کی ولادت کی بشارت سنائی، اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے "وامرأته قائمة فضحكت فبشرنٰها باسحٰق ومن وراء اسحٰق يعقوب قالت يٰويلتیٰ أألد وانا عجوز وهٰذا بعلی شيخا ان هٰذا لشئ عجيب ٥ قالوا اتعجبين من امر الله رحمت الله وبركاته عليكم اهل البيت" ان آیات میں فرشتوں نے امّ اسحٰق کو اللہ تعالیٰ کی جانب سے اسحٰق اور اُن کے بعد یعقوب (علیہما السلام) کی بشارت سنائی ہے اور سارہؑ کے تعجب پر یہ کہہ کر دوبارہ خطاب کیا ہے "اتعجبين من امر الله" تو یہ کیسے ممکن ہے کہ والدۂ اسحٰق (سارہ) علیہا السلام نبی تو نہ ہوں اور اللہ تعالیٰ فرشتوں کے ذریعہ اس طرح اُن سے خطاب کرے۔

اسی طرح ہم دیکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ جبرئیل فرشتہ کو مریم (اُمّ عیسیٰ علیہا السلام) کے پاس بھیجتا ہے اور اُن کو مخاطب کرکے یہ کہتا ہے "وَقَالَ اِنَّمَآ اَنَا رَسُوْلُ رَبِّكِ لِاَهَبَ لَكِ غُلٰمًا زَكِيًّا" تو یہ "وحی حقیقی" کے ذریعہ نبوت نہیں تو اور کیا ہے اور کیا اس آیت میں صاف طور پر نہیں کہا گیا ہے کہ مریم (علیہا السلام) کے پاس جبرئیل (علیہ السلام) اللہ تعالیٰ کی جانب سے پیغامبر بن کر آئے؟ نیز زکریا (علیہ السلام) جب مریم (علیہا السلام) کے حجرہ میں آتے تو اُن کے پاس اللہ کا غیب سے دیا ہوا رزق پاتے تھے اور انھوں نے

اُسی رزق کو دیکھ کر بارگاہِ الٰہی میں صاحبِ فضیلت لڑکا پیدا ہونے کی دعا کی تھی، اسی طرح ہم موسیٰ (علیہ السلام) کی والدہ کے معاملہ میں دیکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اُن پر وحی نازل فرمائی کہ تم اپنے اس بچہ کو دریا میں ڈال دو اور ساتھ ہی اُن کو اطلاع دی کہ میں اس کو تمہاری جانب واپس کردوں گا اور اُس کو "نبی مرسل" بناؤں گا، پس کون شک کرسکتا ہے کہ یہ "نبوت" کا معاملہ نہیں ہے، معمولی عقل و شعور رکھنے والا آدمی بھی بآسانی یہ سمجھ سکتا ہے کہ اگر موسیٰ (علیہ السلام) کی والدہ کا یہ عمل اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ شرفِ نبوت سے وابستہ نہ ہوتا اور محض خواب کی بنا پر یا دل میں پیدا شدہ وسوسہ کی وجہ سے وہ ایسا کرتیں تو اُن کا یہ عمل نہایت ہی مجنونانہ اور متہورانہ ہوتا اور اگر آج ہم میں سے کوئی ایسا کر بیٹھے تو ہمارا یہ عمل یا گناہ قرار پائے گا اور یا ہم کو مجنوں اور پاگل کہا جائیگا اور علاج کے لئے پاگل خانہ بھیج دیا جائے گا یہ ایک ایسی صاف اور واضح بات ہے جس میں شک و شبہ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

تب یہ کہنا قطعاً درست ہے کہ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کی والدہ کا موسیٰ ؑ کو دریا میں ڈال دینا اسی طرح وحی الٰہی کی بنا پر تھا جس طرح حضرت ابراہیم ؑ نے رویا[1] (خواب) میں اپنے بیٹے (اسمٰعیل علیہ السلام) کا ذبح کرنا بذریعہ وحی معلوم کرلیا تھا اس لئے کہ اگر حضرت ابراہیم (علیہ السلام) نبی نہ ہوتے اور اُن کے ساتھ وحیِ الٰہی کا سلسلہ وابستہ نہ ہوتا اور پھر وہ یہ عمل محض ایک خواب یا نفس میں پیدا شدہ ظن کی وجہ سے کر گذرتے تو ہر شخص ان کے اس عمل کو یا گناہ سمجھتا یا انتہائی جنون یقین کرتا تو اب بغیر کسی تردد کے یہ کہا جاسکتا ہے کہ امِ موسیٰ (علیہا السلام) نبی تھیں۔

---

[1] نبی کا خواب بھی وحی ہوتا ہے، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ایک حدیث میں ایسا ہی فرمایا ہے۔

علاوہ ازیں حضرت مریم (علیہا السلام) کی نبوت پر ایک یہ دلیل بھی پیش کی جا سکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سورۂ کھیعص میں اُن کا ذکر انبیاء علیہم السلام کے زمرہ میں کیا ہے اور اُس کے بعد ارشاد فرمایا ہے" اولٰئک الذین انعم اللہ علیھم من النبیین من ذریۃ اٰدم وممن حملنا مع نوح" (یہی ہیں وہ انبیاء آدم کی نسل سے اور ان میں سے جن کو ہم نے نوح کے ساتھ کشتی میں سوار کیا جن پر اللہ کا انعام واکرام ہوا) تو آیت کے اس عموم میں مریم (علیہا السلام) کی تخصیص کر کے ان کو انبیاء کی فہرست میں سے الگ کر لینا کسی طرح صحیح نہیں ہو سکتا۔

رہی یہ بات کہ قرآن نے حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کا ذکر کرتے ہوئے حضرت مریم (علیہا السلام) کے لئے یہ کہا ہے" واُمّہ صدیقۃ" تو یہ لقب اُن کی نبوت کے لئے اسی طرح مانع نہیں جس طرح حضرت یوسف (علیہ السلام) کے نبی اور رسول ہونے کے لئے یہ آیت مانع نہیں" یوسف ایھا الصدیق" اور یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے (وباللہ التوفیق)

اب حضرت سارہ، حضرت مریم، حضرت امِ موسیٰ (علیہن السلام) کے مسئلہ نبوت کے ساتھ فرعون کی بیوی (آسیہ) کو بھی شامل کر لیجئے اس لئے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے۔ کمل من الرجال کثیر ولم یکمل من النساء الا مریم بنت عمران وآسیۃ بنت مزاحم امراءۃ فرعون (اوکما قال علیہ السلام)[1] (یعنی مردوں میں سے تو بہت سے آدمی کامل ہوئے ہیں مگر عورتوں میں سے صرف یہی دو کامل ہوئیں۔ مریم بنت عمران۔ اور

---

[1] بخاری میں الفاظ حدیث یہ ہیں۔ قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کمل من الرجال کثیر ولم یکمل من النساء الا آسیۃ امراءۃ فرعون ومریم بنت عمران وان فضل عائشۃ علی النساء کفضل الثرید علی سائر الطعام۔

آسیہ بنت مزاحم زوجۂ فرعون؟

اور واضح رہے کہ مردوں میں یہ درجۂ کمال بعض رسولوں (علیہم السلام) ہی کو حاصل ہوا ہے اور اگرچہ اُن کے علاوہ انبیاء و رسل بھی درجۂ نبوت و رسالت پر مامور ہیں لیکن ان مرسلین کاملین کے درجہ سے نازل ہیں، اس لئے حدیث کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جن عورتوں کو منصبِ نبوت سے سرفراز فرمایا ہے ان میں صرف ان دو عورتوں کو ہی درجۂ کمال تک پہنچنے کی فضیلت حاصل ہے کیونکہ حدیث میں جس درجۂ کمال کا ذکر ہو رہا ہے جو ہستی بھی اس درجہ سے نازل ہے وہ کامل نہیں ہے۔

بہر حال اس حدیث سے یہ ثابت ہوا کہ اگرچہ بعض عورتیں بہ نصِ قرآن نبی ہیں لیکن ان میں سے ان دو عورتوں کو بھی درجۂ کمال حاصل ہوا، درجات کے اس فرق کو خود قرآن نے اس طرح بیان کیا ہے "تلك الرسل فضلنا بعضهم علىٰ بعضٍ" حقیقت یہ ہے کہ کامل اُس کو کہا جاتا ہے جس کی نوع میں سے کوئی دوسرا اس کا ہمسر نہ ہو، پس مردوں میں سے ایسے کامل خدا کے چند ہی رسول ہوئے ہیں جن کی ہمسری دوسرے انبیاء و رسل کو عطا نہیں ہوئی اور بلا شبہ ان ہی کاملین میں سے ہمارے پیغمبر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اور ابراہیم (علیہ الصلوٰۃ والسلام) ہیں جن کے متعلق نصوصِ (قرآن و حدیث) نے اُن فضائل کمال کا اظہار کیا ہے جو دوسرے انبیاء و رسل کو حاصل نہیں ہیں، اسی طرح عورتوں میں سے وہی درجۂ کمال کو پہنچی ہیں، جن کا ذکر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث میں کیا ہے۔[1]

---

[1] الفصل فی الملل والاہواء والنحل مطبوعہ مصر ۱۳۲۸ھ ج ۵ ص ۱۴-۱۳-۱۲، یہ بحث فتح الباری ج ۶ ص ۳۴۸-۳۴۷ و ۳۶۸ مطبوعہ مصر میں بھی قابلِ مراجعت ہے۔

ابن حزم (رحمہ اللہ) کے اس طویل مضمون کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر وحی کے اُن معانی کو نظر انداز کرکے "جن کا اطلاق بلحاظ عمومِ لغت جبلت یا نفس میں ظن ووہم کے درجہ کا القاء و الہام پر ہوتا ہے" وہ اصطلاحی معنی لئے ہیں جن کو قرآن نے انبیاء و رسل کے لئے مخصوص کیا ہے تو اُس کی دو صورتیں ہیں ایک وہ (وحی) جس کا منشار مخلوقِ خدا کی رشد و ہدایت اور تعلیم اوامر و نواہی سے ہو، اور دوسری یہ کہ خدائے تعالیٰ کسی شخص براہِ راست یا فرشتہ کے واسطہ سے اس قسم کا خطاب کرے کہ جس سے بشارات دینا، یا کسی ہونے والے واقعہ کی ہونے سے قبل اطلاع دینا، یا خاص اس کی ذات کے لئے کوئی امر و نہی فرمانا مقصود ہو اب اگر پہلی صورت ہے تو یہ "نبوۃ مع الرسالۃ" ہے اور بالاتفاق سب کے نزدیک یہ درجہ صرف مردوں کے ساتھ ہی مخصوص ہے جیسا کہ سورۂ النحل کی آیت سے واضح ہے اور اس مسئلہ میں قطعاً دو رائے نہیں ہیں۔

اور اگر وحی الٰہی کی دوسری شکل ہے تو ابنِ حزم اور اُن کے موٗیدین علماء کی رائے میں یہ بھی نبوت ہی کی ایک قسم ہے کیونکہ قرآنِ عزیز نے سورۂ شوریٰ میں انبیاء علیہم السلام پر نزولِ وحی کے جو طریقے بیان کئے ہیں وہ اس وحی پر بھی صادق آتے ہیں۔ سورۂ شوریٰ میں ہے۔

وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ	اور کسی انسان کے لئے یہ صورت ممکن نہیں کہ اللہ تعالیٰ
اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ	اس سے (بالمشافہ) گفتگو کرے مگر یا وحی کے ذریعہ
وَّرَآءِ حِجَابٍ اَوْ يُرْسِلَ	یا پس پردہ کلام کے ذریعہ، و یا اس صورت سے
رَسُوْلًا فَيُوْحِيَ بِاِذْنِهٖ	کہ اللہ کسی فرشتہ کو پیغامبر بنا کر بھیجے اور وہ اس کی

لہ یہاں نبی اور رسولوں کے اس فرق کو نظر انداز کر دیا گیا ہے جو علمِ کلام کی خاص اصطلاح ہے کیونکہ قرآن کثرت کے ساتھ نبی اور رسول کو مرادف معنی میں استعمال کرتا ہے۔

مَا يَشَآءُ اِنَّهٗ عَلِيٌّ حَكِيْمٌ — اجازت سے جس کو کہ وہ چاہے اُس بشر کو وحی لا کر

(شوریٰ) — سنا دے بلاشبہ وہ بلند و باحکمت والا ہے۔

اور جبکہ قرآن نے وحی کی اس دوسری قسم کا اطلاق بہ نصِ صریح حضرت مریم حضرت سارہ حضرت ام موسیٰ اور حضرت آسیہ (علیہن السلام) پر کیا ہے جیسا کہ سورۂ ہود، قصص، مریم سے ظاہر ہوتا ہے تو ان مقدس عورتوں پر "نبی کا اطلاق" قطعاً صحیح ہے اور اس کو بدعت کہنا سر تا سر غلط ہے۔

ابن حزم (رحمہ اللہ) کے مؤید علماء نے اس سلسلہ میں پیدا ہونے والے اس شبہ کا جواب بھی دیا ہے "کہ قرآن نے جس طرح صاف الفاظ میں مرد انبیاء کو نبی اور رسول کہا ہے اس طرح ان عورتوں میں سے کسی کو نہیں کہا" جواب کا حاصل یہ ہے کہ جبکہ "نبوۃ مع الرسالۃ" جو کہ مردوں کے لئے ہی مخصوص ہے کائناتِ انسانی کی رُشد و ہدایت اور تعلیم و تبلیغ نوعِ انسانی سے متعلق ہوتی ہے تو اس کا قدرتی تقاضہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جس شخص کو اس شرف سے ممتاز فرمایا ہے اُس کے متعلق وہ صاف صاف اعلان کرے کہ وہ خدا کا بھیجا ہوا نبی اور رسول ہے، تاکہ امت پر اُس کی دعوت و تبلیغ کا قبول کرنا لازم ہو جائے اور خدا کی حجت پوری ہو، اور چونکہ نبوت کی وہ قسم جس کا اطلاق عورتوں پر بھی ہوتا ہے خاص اسی ہستی سے وابستہ ہوتی ہے جس کو یہ شرف ملا ہے تو اس کے متعلق صرف یہی اظہار کر دینا کافی ہے کہ جو "وحی من اللہ" انبیاء و رسل کے لئے ہی مخصوص ہے اُس سے ان چند عورتوں کو بھی مشرف کیا گیا ہے۔

عورتوں کی نبوت کے اثبات و انکار کے علاوہ تیسری رائے اُن علماء کی ہے جو اس مسئلہ میں "سکوت اور توقف" کو ترجیح دیتے ہیں ان میں شیخ تقی الدین سبکی (رحمہ اللہ)

نمایاں حیثیت رکھتے ہیں، فتح الباری میں ان کا یہ قول مذکور ہے۔

قال السبکی اختلف فی ھذہ	سُبکی فرماتے ہیں " اس مسئلہ میں علمار کی آرار
المسئلة ولم یصح عندی فی	مختلف ہیں اور میرے نزدیک اس بارہ میں اثباتاً
ذلک شئ الخ [1]	یا نفیاً کوئی بات ثابت نہیں ہے۔

کیا حضرت مریمؑ نبی ہیں

اس تفصیل سے یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ عورتوں کی نبوت کے انکار پر امام الحرمین کا دعویٰ اجماع صحیح نہیں ہے نیز یہ بھی تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ فہرستِ انبیار میں مسطورۂ بالا دوسری مقدس عورتوں کے مقابلہ میں حضرت مریمؑ کی نبوت کے متعلق قرآنی نصوص زیادہ واضح ہیں، یہی وجہ ہے کہ امام شعرانی، ابن حزم اور قرطبی (رحمہم اللہ) کے درمیان حضرت مریمؑ کے علاوہ نبیات کی فہرست کے بارہ میں خاصہ اختلاف نظر آتا ہے[2] اور حضرت مریمؑ کی نبوت کے متعلق تمام مثبتینِ نبوت کا اتفاق ہے۔

ہم کو ابن کثیر (رحمہ اللہ) کے اس دعوے سے بھی اختلاف ہے کہ جمہور، انکار کی جانب ہیں، البتہ اکثریت غالباً سکوت اور توقف کو پسند کرتی ہے۔

آیت "وَاصْطَفٰكِ عَلٰی نِسَاءِ الْعٰلَمِیْنَ" کا مطلب

جو علمار عورتوں میں نبوت کے قائل ہیں اور حضرت مریم (علیہا السلام) کو نبی تسلیم کرتے ہیں، ان کے مسلک کے مطابق تو آیت "وَاصْطَفٰكِ عَلٰی نِسَاءِ الْعٰلَمِیْنَ" کا مطلب صاف اور واضح ہے وہ یہ کہ حضرت مریمؑ کو کائنات کی تمام عورتوں پر فضیلت حاصل ہے، جو عورتیں نبی نہیں ہیں اُن پر اس لئے کہ مریم علیہا السلام نبی ہیں اور جو عورتیں نبی ہیں اُن پر اس لئے کہ وہ اُن قرآنی نصوص کے پیشِ نظر جو اُن کے فضائل و کمالات سے تعلق رکھتی ہیں باقی نبیات پر برتری رکھتی ہیں۔

---

[1] فتح الباری ج ۶ کتاب الانبیا۔ [2] ایضاً ج ۶ ص ۳۶۸۔

لیکن جو علماء عورتوں کی نبوت کا انکار فرماتے ہیں اور حضرت مریمؑ کو "نبیہ" نہیں تسلیم کرتے وہ اس آیت کی مراد میں دو جدا جدا خیال رکھتے ہیں، بعض کہتے ہیں کہ آیت کا جملہ "نساء العلمین" عام ہے اور ماضی، حال اور مستقبل کی تمام عورتوں کو شامل ہے، اس لئے بلاشبہ حضرت مریمؑ کو بغیر کسی استثناء کے کائناتِ انسانی کی تمام عورتوں پر فضیلت و برتری حاصل ہے اور اکثر کا قول یہ ہے کہ آیت کے لفظ "العلمین" سے کائنات کی وہ تمام عورتیں مراد ہیں جو حضرت مریم (علیہا السلام) کی معاصر تھیں، یعنی قرآنِ عزیز حضرت مریم (علیہا السلام) کے زمانہ کا واقعہ نقل کرتے ہوئے کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اُن کو یہ بشارت دی کہ وہ اپنے زمانہ کی تمام عورتوں میں برگزیدہ اور صاحبِ کمال ہیں اور ہم نے اُن سب میں سے اُن کو چُن لیا ہے اور "العلمین" کا یہ اطلاق وہی حیثیت رکھتا ہے جو حضرت موسیٰؑ کی امت (بنی اسرائیل) کے لئے اس آیت میں اختیار کی گئی ہے۔

وَلَقَدِ اخْتَرْنٰهُمْ عَلٰى عِلْمٍ عَلَى	اور بلاشبہ ہم نے اپنے علم سے اُن (بنی اسرائیل)
الْعٰلَمِيْنَ ۔ (دخان)	کو جہان والوں کے مقابلہ میں پسند کر لیا ہے۔

حالانکہ باتفاقِ نصوص قرآن وحدیث یہ مسلم ہے کہ امتِ محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم کو علی الاطلاق کائنات کی تمام امتوں پر برتری اور فضیلت حاصل ہے۔ ارشادِ باری ہے۔

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ	(اے امتِ محمدیہ) تم بہترین امت ہو جو کائنات انسانی
لِلنَّاسِ ۔ (آل عمران)	(کی خدمت) کے لئے پیدا کی گئی ہے۔

اور جبکہ باتفاق آراء بنی اسرائیل کی فضیلت کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ "العلمین" سے اُن کی معاصر امم و اقوام مراد ہیں کہ اُن میں سے امتِ موسیٰ علیہ السلام کو فضیلت حاصل ہے تو حضرت مریم (علیہا السلام) کی فضیلت کے باب میں بھی یہی معنی مراد لینے چاہئیں۔

حضرت مریمؑ کا تقدس اور تقویٰ و طہارت حضرت عیسیٰؑ جیسے جلیل القدر کی والدہ ہونے کا شرف، مرد کے ہاتھ لگائے بغیر معجزہ کے طور پر اُن کے مشکوئے معلّٰی سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادتِ باسعادت بلاشبہ ایسے امور ہیں جن کی بدولت ان کو معاصر عورتوں پر فضیلت و برتری حاصل تھی۔

پھر یہ حقیقت بھی فراموش نہیں ہونی چاہیئے کہ بابِ فضیلت ایک وسیع باب ہے اور جس طرح کسی شے کی حقیقت بیان کرنے میں بلیغ اور عمدہ طریقِ بیان یہ ہے کہ وہ جامع و مانع ہو یعنی اُس کی حقیقت پر اس طرح حاوی ہو کہ تمام دوسری چیزوں سے ممتاز ہو جائے نہ ایسی کمی رہ جائے کہ اصل حقیقت پوری طرح بیان نہ ہو سکے اور نہ ایسا اضافہ ہو کہ بعض دوسری حقایق بھی اُس کے ساتھ شامل ہو جائیں۔ اسی طرح اس کے برعکس بیانِ فضیلت کے لئے فصاحت و بلاغت کا تقاضا یہ ہے کہ اس کو بیانِ حقیقت کی طرح حدود و قیود میں نہ جکڑ دیا جائے کیونکہ اس مقام پر حقیقتِ شے نہیں بلکہ فضیلتِ شے کا اظہار ہو رہا ہے جو اگر اُسی طرح کے دوسرے افراد پر بھی صادق آجائے تو بیانِ حقیقت کی طرح اس میں کوئی خلل واقع نہیں ہوتا بلکہ اس موقع پر وسعتِ بیان ہی ازبس ضروری ہوتا ہے تاکہ مخاطب کے دل میں اظہارِ فضیلت سے جو نفسیاتی اثر پیدا کرنا ہے وہ دل نشین اور موثر ہو سکے۔

تو ایسی صورت میں "علیٰ نساء العلمین" کے معنی یہ نہیں ہوں گے کہ حضرت مریم علیہا السلام کے علاوہ دوسری کوئی مقدس عورت اس شرف کو نہیں پہنچ سکتی یا نہیں پہنچی، بلکہ مطلب یہ ہوگا کہ حضرت مریمؑ کو فضائل و کمالات میں بلند سے بلند مرتبہ حاصل ہے، بابِ فضائل کی یہی وہ حقیقت ہے جس کے فراموش کر دینے پر فضائلِ صحابہ وغیرہ میں اکثر ہم کو لغزش ہو جاتی اور چند مقدس اشخاص سے متعلق فضائل کے مابین تضاد و تناقض نظر آنے لگتا ہے، البتہ

اُن فضائل کی حدود سے گذر کر جب ہم صاحبِ فضائل افراد کے انفرادی و اجتماعی اعمال کا جائزہ لے کر فرقِ مراتب بیان کرتے ہیں تو وہ ضرور ایک دوسرے کے لئے حدِ فاصل ثابت ہوتے ہیں۔ مثلاً حضرات صحابہ و صحابیات کے فضائل کے پیشِ نظر فرقِ مراتب کا صحیح فیصلہ جب ہی ممکن ہو سکتا ہے کہ اُن کے اُن فضائل کے ساتھ ساتھ جو زبانِ وحی ترجمان سے نکلے ہیں اُن سے متعلق خصوصی ارشاداتِ قرآنی و حدیثی اُن کی اسلامی خدمات، اسلام سے متعلق اُن کی سرفروشیاں وجاں سپاریاں، نصرتِ حق میں مالی فداکاریاں، اسلام کے نازک ترین لمحات میں ان کے علم و تدبر کی عقدہ کشائیاں اور ان کی عملی جد و جہد کی رفیع سرگرمیاں ان سب کو سامنے رکھ کر فیصلہ کیا جائے۔

حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) اور بشاراتِ کتبِ سابقہ

ادیان و ملل کی تاریخ کا مطالعہ کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ دینِ حق اور ملتِ بیضاء کی تبلیغ و دعوت کا سلسلہ اگرچہ آدم (علیہ السلام) سے شروع ہو کر خاتم الانبیا محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک برابر جاری رہا ہے لیکن اس سلسلہ کو مزید قوت پہنچانے اور سربلند کرنے کے لئے سنۃ اللہ یہ رہی ہے کہ صدیوں بعد ایک ایسے اولوالعزم اور جلیل القدر پیغمبر کو بھیجے جو امتدادِ زمانہ کی وجہ سے پیدا شدہ عام روحانی اضمحلال کو دور کر کے قبولِ حق کے افسردہ رجحانات میں تازگی بخشے اور ضعیف روحانی عواطف کو قوی سے قوی تر بنا دے گویا مذہب کی خوابیدہ دنیا میں حق و صداقت کا صور پھونک کر ایک انقلابِ عظیم بپا کر دے اور مردہ دلوں میں نئی روح ڈال دے اور اکثر ایسا ہوتا رہا ہے کہ جن اقوام و امم میں اُس عظیم المرتبہ پیغمبر کی بعثت ہونے والی ہوتی ہے صدیوں پہلے ان کے ہادیانِ ملت اور داعیانِ حق (انبیاء علیہم السلام) اس مقدس رسول کی آمد کی بشارات وحیِ الٰہی کے ذریعہ سناتے رہتے ہیں تاکہ اس کی دعوتِ حق کے لئے زمین ہموار رہے اور جب اس نورِ حق کے روشن ہونے کا

وقت آجائے تو اُن اقوام و اُمم کے لئے اس کی آمد غیر متوقع حادثہ نہ بن جائے۔

حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) بھی اُن چند اولوالعزم، جلیل القدر اور مقدس رسولوں میں سے ایک ہیں اور اسی بنا پر انبیاء بنی اسرائیل میں سے متعدد انبیاء علیہم السلام اُن کی آمد سے قبل اُن کے حق میں منادی کرتے اور آمد کی بشارت سناتے نظر آتے ہیں۔ اور ان ہی بشارات کی وجہ سے بنی اسرائیل مدتِ مدید سے منتظر تھے کہ مسیح موعود کا ظہور ہو تو ایک مرتبہ وہ پھر حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کے زمانہ کی طرح اقوامِ عالم میں معزز و ممتاز ہوں گے۔ اور رشد و ہدایت کی خشک کھیتی میں روحِ تازہ پیدا ہوگی، اور خدا کے جاہ و جلال سے اُن کے قلوب ایک مرتبہ پھر چمک اٹھیں گے۔ بائبل (توراۃ و انجیل) اپنی لفظی و معنوی تحریفات کے باوجود آج بھی اُن چند بشارات کو اپنے سینہ میں محفوظ رکھتی ہے جو حضرت مسیح (علیہ السلام) کی آمد سے تعلق رکھتی ہیں۔ توراۃ استثناء میں ہے۔

اور اُس موسیٰ نے کہا کہ خداوند سینا سے آیا اور شعیر (ساعیر) سے اُن پر طلوع ہوا،
اور فاران کے پہاڑوں سے جلوہ گر ہوا۔ (باب ۳۳-آیت ۲)

اس بشارت میں "سینا سے خدا کی آمد" حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کی نبوت کی جانب اشارہ ہے اور "ساعیر سے طلوع ہونا" نبوتِ عیسیٰ (علیہ السلام) مراد ہے، کیونکہ ان کی ولادت باسعادت اسی پہاڑ کے ایک مقام "بیت اللحم" میں ہوئی ہے اور یہی وہ مبارک جگہ ہے جہاں سے نورِ حق طلوع ہوا اور "فاران پر جلوہ گر ہونا" آفتابِ رسالت کی بعثت کا اعلان ہے کیونکہ فاران، حجاز کے مشہور پہاڑی سلسلہ کا نام ہے[1]۔

اور حضرت یسعیاہ نبی (علیہ السلام) کے صحیفہ میں ہے:-

---

[1] تفصیل اپنے موقعہ پر آئے گی۔

"دیکھ میں اپنا پیغمبر تیرے آگے بھیجتا ہوں جو تیری راہ تیار کرے گا ۔ بیابان میں پکارنے والے کی آواز آتی ہے کہ خداوند کی راہ طیار کرو، اس کے راستے سیدھے بناؤ۔"[1]

اس بشارت میں "پیغمبر" سے حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) مراد ہیں اور بیابان میں پکارنے والے حضرت یحییٰ علیہ السلام ہیں جو حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کے منادی تھے اور ان کی بعثت سے قبل بنی اسرائیل میں ان کی بعثت و رسالت کا مژدۂ جانفزا سناتے تھے ۔

اور متی کی انجیل میں ہے :-

"جب یسوع، ہیرودیس بادشاہ کے زمانہ میں یہودیہ کے بیت لحم میں پیدا ہوا تو دیکھو کئی مجوسی پورب سے یروشلم میں یہ کہتے ہوئے آئے کہ یہودیوں کا بادشاہ جو پیدا ہوا ہے وہ کہاں ہے ؟ . . . . یہ سن کر ہیرودیس بادشاہ اور اس کے ساتھ یروشلم کے سب لوگ گھبرائے اور اس نے قوم کے سب سردار کاہنوں اور فقیہوں کو جمع کر کے اُن سے پوچھا کہ مسیح کی پیدائش کہاں ہونی چاہیئے ؟ اُنھوں نے اُس سے کہا کہ یہودیہ کے بیتِ لحم میں کیونکہ نبی (یسعیاہ علیہ السلام) کی معرفت یوں لکھا گیا ہے اے بیتِ لحم یہوداہ کے علاقہ ! تو یہوداہ کے حاکموں میں ہرگز سب سے چھوٹا نہیں ۔ کیونکہ تجھ میں سے ایک سردار نکلے گا جو میری امت اسرائیل کی گلہ بانی کرے گا ۔"[2]

اور دوسری جگہ ہے :-

اور جب وہ یروشلم کے نزدیک پہنچے اور زیتون کے پہاڑ پر بیت فگے کے پاس آئے تو یسوع نے دو شاگردوں کو یہ کہہ کر بھیجا کہ اپنے سامنے کے گاؤں میں جاؤ وہاں پہنچتے ہی ایک گدھی بندھی ہوئی اور اس کے ساتھ بچہ تمہیں ملے گا ، انھیں کھول کر میرے

---

[1] باب ۴۰ آیات ۸ - ۳ ۔ [2] باب ۲ ۔ آیات ۶ - ۱ ۔

پاس لے آؤ اور اگر کوئی تم سے کچھ کہے تو کہنا کہ یہ خداوند کو درکار ہیں وہ فی الفور انھیں بھیجدیگا یہ اس لئے ہوا کہ جو نبی کی معرفت کہا گیا تھا وہ پورا ہو کہ "صیہون کی بیٹی سے کہو کہ دیکھ تیرا بادشاہ تیرے پاس آتا ہے وہ حلیم ہے اور گدھے پر سوار ہے بلکہ لادو بچہ پر"[1]

اور یوحنا کی انجیل میں ہے:-

اور یوحنا (یحییٰ علیہ السلام) کی گواہی یہ ہے کہ جب یہودیوں نے یروشلم سے کاہن اور لاوی یہ پوچھنے کے لئے اُس (یحییٰ علیہ السلام) کے پاس بھیجے کہ تو کون ہے؟ تو اُس نے اقرار کیا اور انکار نہ کیا بلکہ اقرار کیا کہ میں تو مسیح نہیں ہوں، انھوں نے اس سے پوچھا پھر کون ہے؟ کیا تو ایلیاہ ہے، اس نے کہا میں نہیں ہوں کیا تو وہ نبی ہے؟ اس نے جواب دیا نہیں پس اُنھوں نے اُس سے کہا پھر تو ہے کون؟ تاکہ ہم اپنے بھیجنے والوں کو جواب دیں کہ تو اپنے حق میں کیا کہتا ہے؟ اُس نے کہا "میں جیسا کہ یشعیاہ نبی نے کہا ہے بیابان میں پکارنے والے کی آواز ہوں کہ تم خداوند کی راہ سیدھی کرو۔[2]

اور مرقس اور لوقا کی انجیلوں میں ہے۔

وہ لوگ منتظر تھے اور سب اپنے اپنے دل میں یوحنا (یحییٰ علیہ السلام) کی بابت سوچتے تھے کہ آیا وہ مسیح ہے یا نہیں تو یوحنا (یحییٰ علیہ السلام) نے اُن سب کے جواب میں کہا: میں تو تمہیں بپتسمہ دیتا ہوں مگر جو مجھ سے زور آور ہے وہ آنے والا ہے میں اُس کی جوتی کا تسمہ کھولنے کے لائق نہیں وہ تمہیں روح القدس سے بپتسمہ دیگا۔[3]

ان ہر دو بشارات سے بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہود اپنی مذہبی روایات کی بنا پر تین اولوالعزم پیغمبروں کی بعثت کے منتظر تھے اُن میں مسیح علیہ السلام بھی تھے،

---

[1] باب ۲۱ آیات ۱-۶۔ [2] باب ۱ آیات ۱۹-۲۳۔ [3] لوقا باب ۳ آیات ۱۵-۱۶۔

اور حضرت یحییٰ[1] (علیہ السلام) نے اُن کو بتایا کہ وہ نہ ایلیا ہیں نہ وہ نبی اور نہ مسیح (علیہم السلام) بلکہ مسیح علیہ السلام کی بعثت کے منادا اور مبشر ہیں۔

قرآنِ عزیز نے بھی حضرت زکریا اور حضرت یحییٰ (علیہما السلام) کے واقعہ کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بعثت کی تمہید قرار دیا ہے اور یحییٰ (علیہ السلام) کو حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کا مبشر اور منادا بتایا ہے۔ آلِ عمران میں ہے۔

فَنَادَتْهُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَهُوَ قَآئِمٌ	پس فرشتوں نے اُس (زکریا) کو اُس وقت پکارا جبکہ
يُّصَلِّىْ فِى الْمِحْرَابِ اَنَّ اللّٰهَ	وہ حجرہ میں کھڑا ہوا نماز پڑھ رہا تھا بیشک اللہ تعالیٰ
يُبَشِّرُكَ بِيَحْيٰى مُصَدِّقًا	تجھ کو یحییٰ (فرزند) کی بشارت دیتا ہے جو اللہ کے
بِكَلِمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ۔	کلمہ (عیسیٰ علیہ السلام) کی تصدیق کرے گا۔

ولادتِ مبارک عابد و زاہد اور عفت مآب مریم (علیہا السلام) اپنے خلوت کدہ میں مشغولِ عبادت رہتی اور ضروری حاجات کے علاوہ کبھی اُس سے باہر نہیں نکلتی تھیں۔ ایک مرتبہ مسجدِ اقصیٰ (ہیکل) کے مشرقی جانب لوگوں کی نگاہوں سے دور کسی ضرورت سے ایک گوشہ میں تنہا بیٹھی تھیں کہ اچانک خدا کا فرشتہ (جبرئیل) انسانی شکل میں ظاہر ہوا۔ حضرت مریم نے ایک اجنبی شخص کو اس طرح بے حجاب سامنے دیکھا تو گھبرا گئیں اور فرمانے لگیں اگر تجھ کو کچھ بھی خدا کا خوف ہے تو میں خدائے رحمان کا واسطہ دے کر تجھ سے پناہ چاہتی ہوں" فرشتے نے کہا: "مریم! خوف نہ کھا، میں انسان نہیں بلکہ خدا کا فرستادہ فرشتہ ہوں اور تجھ کو بیٹے کی بشارت دینے آیا ہوں" حضرت مریمؑ نے یہ سُنا تو ازراہِ تعجب فرمانے لگیں

---

[1] عہد نامہ جدید (انجیل) میں یوحنا دو جدا جدا شخصیتیں ہیں، ایک یحییٰ علیہ السلام اور دوسری عیسیٰ علیہ السلام کے حواری اور شاگرد۔

میرے لڑکا کیسے ہو سکتا ہے جبکہ مجھ کو آج تک کسی بھی شخص نے ہاتھ نہیں لگایا اس لئے کہ نہ تو میں نے نکاح کیا ہے اور نہ میں زانیہ ہوں" فرشتہ نے جواب دیا: میں تو تیرے پروردگار کا قاصد ہوں اُس نے مجھ سے اسی طرح کہا ہے اور یہ بھی فرمایا ہے کہ یہ میں اس لئے کروں گا کہ تجھ کو اور تیرے لڑکے کو کائنات کے لئے اپنی قدرتِ کاملہ کے اعجاز کا "نشان" بنا دوں اور لڑکے میں میری جانب سے "رحمۃ" ثابت ہوگا اور میرا یہ فیصلہ اٹل ہے۔ مریم! اللہ تعالیٰ تجھ کو ایک ایسے لڑکے کی بشارت دیتا ہے جو اُس کا "کلمہ"[1] ہوگا اُس کا لقب "مسیح"[2] اور اس کا نام عیسیٰ (یسوع) ہوگا۔ اور وہ دنیا اور آخرت دونوں میں باوجاہت اور صاحبِ عظمت رہے گا کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کے مقربین میں سے ہوگا وہ اللہ تعالیٰ کے نشان کے طور پر بحالتِ شیر خوارگی لوگوں سے باتیں کرے گا اور سنِ کہولت (بڑھاپے کا ابتدائی دور) بھی پائے گا تاکہ کائنات کی رشد و ہدایت کی خدمت کی تکمیل کرے اور یہ سب کچھ اس لئے ضرور ہو کر رہے گا کہ اللہ تعالیٰ کا قانونِ قدرت یہ ہے کہ جب وہ کسی شے کو وجود میں لانا چاہتا ہے تو اُس کا محض یہ ارادہ اور حکم کہ "ہو جا" اُس شئے کو نیست سے ہست کر دیتا ہے لہذا یہ یونہی ہو کر رہے گا اور اللہ تعالیٰ اس کو اپنی کتاب عطا کرے گا، اس کو حکمت سکھائے گا اور اس کو بنی اسرائیل کی رشد و ہدایت کے لئے رسول اور اولو العزم پیغمبر بنائے گا۔

قرآنِ عزیز نے اِن واقعات کا معجزانہ اسلوبِ بیان کے ساتھ سورۂ آلِ عمران اور سورۂ مریم میں اس طرح ذکر کیا ہے۔

---

[1] یعنی توالد و تناسل کے عام قانون سے جدا قانونِ اعجاز کے مطابق محض حکمِ الٰہی اور ارادہ باری سے ہی رحمِ مریم میں وجود پذیر ہو جائے گا۔ [2] مسیح یعنی مبارک یا سیاح جس کا کوئی گھر نہ ہو۔

إِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ إِنَّ اللّٰهَ
يُبَشِّرُكِ بِكَلِمَةٍ مِّنْهُ اسْمُهُ الْمَسِيْحُ
عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ وَجِيْهًا فِي الدُّنْيَا
وَالْاٰخِرَةِ وَمِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ ۝ وَ
يُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَكَهْلًا
وَّمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝ قَالَتْ رَبِّ
اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ وَلَدٌ وَّلَمْ يَمْسَسْنِيْ
بَشَرٌ قَالَ كَذٰلِكِ اللّٰهُ يَخْلُقُ مَا
يَشَآءُ اِذَا قَضٰٓى اَمْرًا فَاِنَّمَا
يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ۝ وَيُعَلِّمُهُ
الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرٰةَ وَ
الْاِنْجِيْلَ وَرَسُوْلًا اِلٰى
بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ الآیہ (آل عمران)
وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ مَرْيَمَ
اِذِ انْتَبَذَتْ مِنْ اَهْلِهَا
مَكَانًا شَرْقِيًّا ۝ فَاتَّخَذَتْ
مِنْ دُوْنِهِمْ حِجَابًا فَاَرْسَلْنَا
اِلَيْهَا رُوْحَنَا فَتَمَثَّلَ لَهَا
بَشَرًا سَوِيًّا ۝ قَالَتْ اِنِّيْٓ

(وہ وقت قابلِ ذکر ہے) جب فرشتوں نے مریمؑ سے
کہا: "اے مریم! اللہ تعالیٰ تجھ کو اپنے کلمہ کی بشارت
دیتا ہے اس کا نام مسیح، عیسیٰ ابن مریم ہوگا، وہ دنیا
و آخرت میں صاحبِ وجاہت اور ہمارے مقربین
میں سے ہوگا اور وہ (ماں کی) گود میں اور کہولت
کے زمانہ میں لوگوں سی کلام کرے گا اور وہ نکوکاروں
میں سے ہوگا، مریمؑ نے کہا، میرے لڑکا کیسے ہوسکتا ہے
جبکہ مجھ کو کسی مرد نے ہاتھ تک نہیں لگایا" فرشتہ
نے کہا: "اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے اسی طرح پیدا کر دیتا
ہے، وہ جب کسی شے کیلئے حکم کرتا ہے تو کہہ دیتا ہے
"ہوجا" اور وہ ہو جاتی ہے اور اللہ اس کو کتاب و
حکمت اور توراۃ و انجیل کا علم عطا کریگا اور وہ
بنی اسرائیل کی جانب اللہ کا رسول ہوگا۔
اور اے پیغمبر! کتاب میں مریمؑ کا واقعہ ذکر کرو اس وقت
کا ذکر جب وہ ایک جگہ کہ پورب کی طرف تھی اپنے گھر
کے آدمیوں سی الگ ہوئی پھر اس نے ان لوگوں
کی طرف سی پردہ کر لیا، پس ہم نے اس کی طرف اپنا
فرشتہ بھیجا اور وہ ایک بھلے چنگے آدمی کے روپ میں
نمایاں ہوگیا، مریمؑ اسے دیکھ کر (گھبرا گئی وہ) بولی اگر تو

أَعُوذُ بِالرَّحْمٰنِ مِنْكَ إِنْ كُنْتَ تَقِيًّا ۔ قَالَ إِنَّمَا أَنَا رَسُولُ رَبِّكِ لِأَهَبَ لَكِ غُلَامًا زَكِيًّا ۔ قَالَتْ أَنّٰى يَكُونُ لِي غُلَامٌ وَلَمْ يَمْسَسْنِي بَشَرٌ وَلَمْ أَكُ بَغِيًّا ۔ قَالَ كَذٰلِكِ قَالَ رَبُّكِ هُوَ عَلَيَّ هَيِّنٌ وَلِنَجْعَلَهُ آيَةً لِلنَّاسِ وَرَحْمَةً مِنَّا وَكَانَ أَمْرًا مَقْضِيًّا ۔

(مریم)

نیک آدمی ہے تو میں خدائے رحمان کے نام پر تجھ سے پناہ مانگتی ہوں" فرشتہ نے کہا "میں تیرے پروردگار کا فرستادہ ہوں اور اس لئے نمودار ہوا ہوں کہ تجھے ایک پاک فرزند دیدوں" مریم بولی "یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میرے لڑکا ہو حالانکہ کسی مرد نے مجھے چھوا نہیں اور نہ میں بدچلن ہوں؟" فرشتہ نے کہا: "ہوگا ایسا ہی، تیرے پروردگار نے فرمایا کہ یہ میرے لئے کچھ مشکل نہیں وہ کہتا ہے یہ اس لئے ہوگا کہ اُس (مسیح) کو لوگوں کے لئے ایک نشان بنا دوں اور میری رحمت کا اس میں ظہور ہو اور یہ ایسی بات ہے جس کا ہونا طے ہو چکا ہے۔"

جبرئیلِ امین نے مریم (علیہ السلام) کو یہ بشارات سُنا کر ان کے گریبان میں پھونک دیا اور اس طرح اللہ تعالیٰ کا کلمہ ان تک پہنچ گیا۔ مریم (علیہا السلام) نے کچھ عرصہ کے بعد خود کو حاملہ محسوس کیا تو بہ تقاضائے بشری اُن پر ایک اضطرابی کیفیت طاری ہو گئی اور اس کیفیت نے اُس وقت شدید صورت اختیار کر لی، جب انھوں نے دیکھا کہ مدتِ حمل ختم ہو کر ولادت کا وقت قریب سے قریب تر ہوتا جا رہا ہے، اُنھوں نے سوچا کہ اگر یہ واقعہ قوم کے اندر رہ کر پیش آیا تو چونکہ وہ حقیقتِ حال سے واقف نہیں ہے اس لئے نہیں معلوم وہ کس کس طرح بدنام اور بہتان طرازیوں کے ذریعہ کس درجہ پریشان کرے اس لئے مناسب یہ ہے کہ لوگوں سے دور کسی جگہ چلے جانا چاہیئے۔ یہ سوچ کر وہ یروشلم (بیت المقدس) سے تقریباً نو میل کوہِ سراۃ (ساعیر) کے ایک ٹیلہ پر چلی گئیں جو اب "بیت اللحم" کے

نام سے مشہور ہے۔ یہاں پہنچ کر چند روز بعد دردِ زِہ شروع ہوا تو تکلیف و اضطراب کی حالت میں کھجور کے ایک درخت کے نیچے تنہ کے سہارے بیٹھ گئیں اور پیش آنے والے نازک حالات کا اندازہ کر کے انتہائی قلق اور پریشانی کی حالت میں کہنے لگیں "کاش کہ میں اس سے مر چکی ہوتی اور میری ہستی کو لوگ یک قلم فراموش کر چکے ہوتے" تب نخلستان کے نشیب سے خدا کے فرشتہ نے پھر پکارا "مریم! غمگین نہ ہو تیرے پروردگار نے تیرے تلے نہر[1] جاری کر دی ہے اور کھجور کا تنہ پکڑ کر اپنی جانب ہلا تو پکے اور تازہ خوشے تجھ پر گرنے لگیں گے پس تو کھا پی اور اپنے بچہ کے نظارہ سے آنکھیں ٹھنڈی کر اور رنج و غم کو بھول جا۔"

حضرت مریم (علیہا السلام) پر تنہائی، تکلیف اور نزاکتِ حال سے جو خوف طاری اور اضطراب پیدا ہو گیا تھا فرشتہ کی تسلّی آمیز پکار اور عیسیٰ (علیہ السلام) جیسے برگزیدہ بچہ کے نظارہ سے کافور ہو گیا اور وہ عیسیٰ (علیہ السلام) کو دیکھ دیکھ کر شادکام ہونے لگیں۔ تاہم یہ خیال پہلو میں ہر وقت کانٹے کی طرح کھٹکتا رہتا تھا کہ اگرچہ خاندان اور قوم میری عصمت و پاکدامنی سے ناآشنا نہیں ہے پھر بھی ان کی اس حیرت کو کس طرح مٹایا جا سکے گا کہ بن باپ کے کس طرح ماں کے پیٹ سے بچہ پیدا ہو سکتا ہے؟

مگر جس خدائے برتر نے اُن کو یہ بزرگی اور برتری بخشی وہ کب اُن کو اس کرب و بےچینی میں مبتلا رہنے دیتا۔ اس لئے اس نے فرشتے کے ذریعہ مریم (علیہا السلام) کے پاس پھر یہ پیغام بھیجا کہ جب تو اپنی قوم میں پہنچے اور وہ تجھ سے اس معاملہ کے متعلق سوالات کرے تو خود جواب نہ دینا بلکہ اشارہ سے ان کو بتانا کہ میں روزہ دار ہوں اور اس لئے آج کسی سے بات

---

[1] سری لغتِ عرب میں نہر کو بھی کہتے ہیں اور بلند ہستی کو بھی، جمہور نے اس جگہ پہلے معنی مراد لئے ہیں اور حسن بصری، ربیع بن انس اور ابن اسلم (رحمہم اللہ) سے دوسرے معنی منقول ہیں یعنی اللہ تعالیٰ نے تیرے تلے ایک بلند ہستی پیدا کر دی ہے۔ (البدایہ والنہایہ ج ۲)

نہیں کر سکتی تم کو جو کچھ دریافت کرنا ہے اس بچہ سے دریافت کرلو تب تیرا پروردگار اپنی قدرتِ کاملہ کا نشان ظاہر کرکے اُن کی حیرت کو دور اور اُن کے قلوب کو مطمئن کردے گا حضرت مریم (علیہا السلام) وحیِ الٰہی کے ان پیغامات پر مطمئن ہو کر بچہ کو گود میں لے بیت المقدس کو روانہ ہوئیں جب شہر میں پہنچیں اور لوگوں نے اس حالت میں دیکھا تو چہار جانب سے ان کو گھیر لیا اور کہنے لگے "مریم! یہ کیا؟ تو نے تو بہت ہی عجیب بات کر دکھائی اور بھاری تہمت کا کام کر لیا، اے ہارون کی بہن! نہ تو تیرا باپ بُرا آدمی تھا اور نہ تیری ماں ہی بدچلن تھی پھر تو یہ کیا کر بیٹھی"

مریم علیہا السلام نے خدا کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے لڑکے کی جانب اشارہ کر دیا کہ جو کچھ دریافت کرنا ہے اُس سے معلوم کرلو میں تو آج روزہ[1] سے ہوں۔ لوگوں نے یہ دیکھ کر انتہائی تعجب کے ساتھ کہا "ہم کس طرح ایسے شیر خوار بچہ سے باتیں کر سکتے ہیں جو ابھی ماں کی گود میں بیٹھنے والا بچہ ہے" مگر بچہ فوراً بول اُٹھا "میں اللہ کا بندہ ہوں، اللہ نے (اپنے فیصلۂ تقدیر میں) مجھ کو کتاب (انجیل) دی ہے اور نبی بنایا ہے اور اُس نے مجھ کو مبارک بنایا خواہ میں کسی حال اور کسی جگہ بھی ہوں اور اس نے مجھ کو نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیا ہے کہ جب تک میں زندہ رہوں یہی میرا شعار رہو اور اس نے مجھ کو اپنی ماں کا خدمت گزار بنایا اور خودسر اور نافرمان نہیں بنایا اور اس کی جانب سے مجھ کو سلامتی کا پیغام ہے جس دن کہ میں پیدا ہوا اور جس دن کہ میں مروں گا اور جس دن کہ پھر زندہ اٹھایا جاؤں گا۔ اللہ تعالیٰ نے ان تفصیلات کو سورۂ انبیاء، تحریم اور سورۂ مریم میں ذکر فرمایا ہے۔

---

[1] بنی اسرائیل کے یہاں روزہ میں خاموشی بھی داخلِ عبادت تھی۔

وَالَّتِیْٓ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِیْهَا مِنْ رُّوْحِنَا وَجَعَلْنٰهَا وَابْنَهَآ اٰیَةً لِّلْعٰلَمِیْنَ۔

(انبیاء)

اور (اُس عورت (مریم) کا معاملہ جس نے اپنی پاکدامنی کو قائم رکھا، پھر ہم نے اس میں اپنی "روح" کو پھونک دیا اور اس کو اور اُس کے لڑکے کو جہان والوں کیلئے "نشان" ٹھیرایا ہے۔

وَمَرْیَمَ ابْنَتَ عِمْرٰنَ الَّتِیْٓ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِیْهِ مِنْ رُّوْحِنَا (تحریم)

اور عمران کی بیٹی مریمؑ کہ جس نے اپنی عصمت کو برقرار رکھا پس ہم نے اس میں اپنی روح کو پھونک دیا۔

فَحَمَلَتْهُ فَانْتَبَذَتْ بِهٖ مَكَانًا قَصِیًّا ۝ فَاَجَآءَهَا الْمَخَاضُ اِلٰی جِذْعِ النَّخْلَةِ قَالَتْ یٰلَیْتَنِیْ مِتُّ قَبْلَ هٰذَا وَكُنْتُ نَسْیًا مَّنْسِیًّا ۝ فَنَادٰىهَا مِنْ تَحْتِهَآ اَلَّا تَحْزَنِیْ قَدْ جَعَلَ رَبُّكِ تَحْتَكِ سَرِیًّا ۝ وَهُزِّیْٓ اِلَیْكِ بِجِذْعِ النَّخْلَةِ تُسٰقِطْ عَلَیْكِ رُطَبًا جَنِیًّا ۝ فَكُلِیْ وَاشْرَبِیْ وَقَرِّیْ عَیْنًا ۝ فَاِمَّا تَرَیِنَّ مِنَ الْبَشَرِ اَحَدًا ۙ فَقُوْلِیْٓ اِنِّیْ نَذَرْتُ لِلرَّحْمٰنِ صَوْمًا فَلَنْ اُكَلِّمَ الْیَوْمَ اِنْسِیًّا ۝ فَاَتَتْ بِهٖ

پھر اس ہونے والے فرزند کا حمل ٹھیر گیا وہ (اپنی حالت چھپانے کے لئے) لوگوں سے الگ ہوکر دور چلی گئی پھر اُسے دردِ زہ (کا اضطراب) کھجور کے ایک درخت نیچے لے گیا (وہ اس کے تنہ کے سہارے بیٹھ گئی) اُس نے کہا کاش میں اس سے پہلے مر چکی ہوتی، میری ہستی لوگ یکقلم بھول گئے ہوتے!" اس وقت (ایک پکارنے والے فرشتے نے) اُسے نیچے سے پکارا "غمگین نہ ہو تیرے پروردگار نے تیرے تلے نہر جاری کر دی ہے، اور کھجور کے درخت کا تنہ پکڑ کے اپنی طرف ہلا، تازہ اور پکے ہوئے پھلوں کے خوشے تجھ پر گرنے لگیں گے، کھا پی (اور اپنے بچہ کے نظارے سے) آنکھیں ٹھنڈی کر، پھر اگر کوئی آدمی نظر آئے (اور پوچھ گچھ کرنے لگے) تو (اشارہ سے) کہدے، میں نے خدائے رحمان کے حضور روزہ کی منت مان رکھی ہے

قَوْمَهَا تَحْمِلُهٗ ؕ قَالُوْا يٰمَرْيَمُ
لَقَدْ جِئْتِ شَيْـًٔا فَرِيًّا ۝ يٰۤاُخْتَ
هٰرُوْنَ مَا كَانَ اَبُوْكِ امْرَاَ
سَوْءٍ وَّمَا كَانَتْ اُمُّكِ
بَغِيًّا ۝ فَاَشَارَتْ اِلَيْهِ ؕ قَالُوْا
كَيْفَ نُكَلِّمُ مَنْ كَانَ فِى الْمَهْدِ
صَبِيًّا ۝ قَالَ اِنِّىْ عَبْدُ اللّٰهِ ؕ
اٰتٰنِىَ الْكِتٰبَ وَجَعَلَنِىْ نَبِيًّا ۝
وَّجَعَلَنِىْ مُبٰرَكًا اَيْنَ مَا كُنْتُ
وَاَوْصٰنِىْ بِالصَّلٰوةِ وَ
الزَّكٰوةِ مَا دُمْتُ حَيًّا ۝ وَّبَرًّۢا
بِوَالِدَتِىْ وَلَمْ يَجْعَلْنِىْ
جَبَّارًا شَقِيًّا ۝ وَالسَّلٰمُ
عَلَىَّ يَوْمَ وُلِدْتُّ وَيَوْمَ
اَمُوْتُ وَيَوْمَ اُبْعَثُ
حَيًّا ۝

(مریم)

میں آج کسی آدمی سے بات چیت نہیں کر سکتی" پھر ایسا
ہوا کہ وہ لڑکے کو ساتھ لے کر اپنی قوم کے پاس آئی
لڑکا اُس کی گود میں تھا، لوگ (دیکھتے ہی) بول اُٹھے
"مریم! تو نے عجیب ہی بات کر دکھائی اور بڑی تہمت کا
کام کر گذری، اے ہارون[1] کی بہن! نہ تو تیرا باپ بُرا آدمی تھا
نہ تیری ماں بدچلن تھی" (تو یہ کیا کر بیٹھی) اس پر مریم نے
لڑکے کی طرف اشارہ کیا (کہ یہ تمہیں بتلا دیگا کہ حقیقت
کیا ہے) لوگوں نے کہا: بھلا اس سے ہم کیا بات کریں جو
ابھی گود میں بیٹھنے والا شیر خوار بچہ ہے" مگر لڑکا بول
اٹھا "میں اللہ کا بندہ ہوں، اس نے مجھے کتاب دی
اور نبی بنایا، اُس نے مجھے بابرکت کیا خواہ میں کسی جگہ
ہوں، اس نے مجھے نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیا کہ جب
تک زندہ رہوں یہی میرا شعار ہو۔ اس نے مجھے
اپنی ماں کا خدمت گذار بنایا، ایسا نہیں کیا کہ خودسر
اور نافرمان ہوتا، مجھ پر اُس کی طرف سے سلامتی کا
پیغام ہے جس دن پیدا ہوا، جس دن مروں گا اور
جس دن پھر زندہ اٹھایا جاؤں گا۔"

[1] کہتے ہیں کہ ہارون، مریم علیہا السلام کے خاندان میں ایک عابد و زاہد انسان اور بہت نیک نفس مشہور تھا۔ (تفسیر ابن کثیر)

قوم نے ایک شیر خوار بچہ کی زبان سے جب یہ حکیمانہ کلام سُنا تو حیرت میں رہ گئی اور اس کو یقین ہو گیا کہ مریم (علیہا السلام) کا دامن بلا شبہ ہر قسم کی برائی اور تلویث سے پاک ہے اور اس بچہ کی پیدائش کا معاملہ یقیناً منجانب اللہ ایک "نشان" ہے۔

یہ خبر ایسی نہیں تھی کہ پوشیدہ رہ جاتی، قریب اور بعید سب جگہ اس حیرت زا واقعہ اور عیسیٰ (علیہ السلام) کی معجزانہ ولادت کے چرچے ہونے لگے اور طبائع انسانی نے اس مقدس ہستی کے متعلق شروع سے ہی مختلف کروٹیں بدلنی شروع کر دیں، اصحابِ خیر نے اُس کے وجود کو اگر یُمن و سعادت کا ماہتاب سمجھا تو اصحابِ شر نے اُس کی ہستی کو اپنے لئے فالِ بد جانا۔ اور بغض و حسد کے شعلوں نے اندر ہی اندر ان کی فطری استعداد کو کھانا شروع کر دیا۔

غرض اسی متضاد فضا کے اندر اللہ تعالیٰ اپنی نگرانی میں اس مقدس بچہ کی تربیت اور حفاظت کرتا رہا تاکہ اس کے ہاتھوں بنی اسرائیل کے مردہ قلوب کو حیاتِ تازہ بخشے اور اُن کی روحانیت کے شجرِ خشک کو ایک مرتبہ پھر بارآور اور مثمر بنائے۔

وَجَعَلْنَا ابْنَ مَرْيَمَ وَأُمَّهُ آيَةً وَّ	اور ہم نے عیسیٰ بن مریم اور اس کی ماں (مریم) کو (اپنی قدرت
آوَيْنَاهُمَا إِلَىٰ رَبْوَةٍ ذَاتِ[1]	کا) نشان بنا دیا اور ان دونوں کا ایک بلند مقام (بیت اللحم)

[1] عن ابن عباس فی قولہ "وآوینا ھما الی ربوۃ ذات قرار و معین" قال المعین الماء الجاری وھو النھر الذی قال اللہ تعالیٰ "قد جعل ربك تحتك سریا" وکذا قال الضحاك وقتادۃ الی ربوۃ ذات قرار و معین ھو بیت المقدس فھذا واللہ اعلم ھو الاظھر لانہ المذکور فی الآیۃ الاخری والقرآن یفسر بعضہ بعضا وھذا اولی ما یفسر بہ ثم الاحادیث الصحیحۃ ثم الآثار (تفسیر ابن کثیر ج ۳ ص ۲۴۶) یعنی حضرت عبداللہ بن عباس (رضی اللہ عنہما) سے آیت "وآوینا ھما الی ربوۃ ذات قرار و معین" کی تفسیر میں منقول ہے کہ "معین" سے نہر جاری مراد ہے اور یہ اُسی نہر کا ذکر ہے جس کو آیت "وقد جعل ربك تحتك سریا" میں بیان کیا گیا ہے اور ضحاک اور قتادہ (رحمہما اللہ) کا بھی یہی قول ہے کہ "الی ربوۃ ذات قرار و معین" سے بیت المقدس کی سرزمین مراد ہے اور یہی قول زیادہ ظاہر ہے اس لئے کہ دوسری آیت میں بیت المقدس (کی نہر) کا ہی ذکر ہے اور قرآن کا بعض حصہ خود ہی دوسرے حصہ کی تفسیر کر دیا کرتا ہے اور تفسیر آیات میں پہلی جگہ اسی طریق تفسیر کو حاصل ہے اُس کے بعد صحیح احادیث کے ذریعہ تفسیر کا اور اس کے بعد آثار کے ذریعہ تفسیر کا درجہ ہے۔ (تفسیر ابن کثیر)

قَرَارٍ ذَاتِ مَعِينٍ (المومنون) پر ٹھکانہ بنایا جو سکونت کے قابل اور چشمہ والا ہے۔

بشاراتِ ولادت | قرآن عزیز نے حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کے بچپن کے حالات میں سے صرف اسی اہم واقعہ کا ذکر کیا ہے باقی بچپن کے دوسرے حالات کو جن کا ذکر قرآن کے مقصد تذکیر وموعظت سے خاص تعلق نہیں رکھتا تھا نظر انداز کر دیا ہے لیکن اسرائیلیات کے مشہور ناقل حضرت وہب بن منبہ (رضی اللہ عنہ) سے جو واقعات منقول ہیں اور متّی کی انجیل میں بھی جن کا ذکر موجود ہے ان میں سے یہ واقعہ بھی ہے کہ جب حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کی ولادت ہوئی تو اُسی شب میں فارس کے بادشاہ نے آسمان پر ایک نیا ستارہ روشن دیکھا، بادشاہ نے درباری نجومیوں سے اس کے متعلق دریافت کیا تو اُنھوں نے بتایا کہ اِس ستارہ کا طلوع کسی عظیم الشان ہستی کی پیدائش کی خبر دیتا ہے جو ملکِ شام میں پیدا ہوئی ہے۔ تب بادشاہ نے خوشبوؤں کے عمدہ تحفے دے کر ایک وفد کو ملکِ شام روانہ کیا کہ وہ اس بچہ کی ولادت سے متعلق حالات وواقعات معلوم کریں، وفد جب شام پہنچا تو اُس نے تفتیشِ حال شروع کی اور یہودیوں سے کہا کہ ہم کو اُس بچّہ کی ولادت کا حال سُناؤ جو مستقبلِ قریب میں روحانیت کا بادشاہ ثابت ہوگا۔ یہود نے اہلِ فارس کی زبان سے یہ کلمات سُنے تو اپنے بادشاہ ہیرودیس کو خبر کی، بادشاہ نے وفد کو دربار میں بلا کر استصوابِ حال کیا اور اُن کی زبانی واقعہ کو سُن کر بہت گھبرایا اور پھر وفد کو اجازت دی کہ وہ اس بچّہ سے متعلق مزید معلومات حاصل کریں، پارسیوں کا یہ وفد بیت المقدس پہنچا اور جب حضرت یسوع (علیہ السلام) کو دیکھا تو اپنے رسم ورواج کے مطابق اوّل اُن کو سجدۂ تعظیم کیا اور پھر مختلف قسم کی خوشبوئیں اُن پر نثار کیں اور چند روز وہیں قیام کیا، دورانِ قیام میں وفد کے بعض آدمیوں نے خواب میں دیکھا کہ ہیرودیس اس بچہ کا دشمن ثابت ہوگا اس لئے

تم اب اس کے پاس نہ جاؤ اور بیت اللحم سے سیدھے فارس کو چلے جاؤ۔ صبح کو وفد نے فارس کا ارادہ کرتے وقت حضرت مریم (علیہا السلام) کو اپنا خواب سناتے ہوئے کہا کہ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ یہودیہ کے بادشاہ ہیرودیس کی نیت خراب ہے اور وہ اس مقدس بچہ کا دشمن ہے اس لئے بہتر یہ ہے کہ تم اس کو ایسی جگہ لیجا کر رکھو جو اس کی دسترس سے باہر ہو، اس مشورہ کے بعد حضرت مریم (علیہا السلام) یسوع مسیح (علیہ السلام) کو اپنے بعض عزیزوں کے پاس مصر لے گئیں اور وہاں سے ناصرہ چلی گئیں اور جب عیسیٰ علیہ السلام کی عمر مبارک تیرہ سال کی ہوئی تو ان کو ساتھ لے کر دوبارہ بیت المقدس واپس آئیں۔ یہی روایات یہ بھی ظاہر کرتی ہیں کہ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کے بچپن کے حالاتِ زندگی بھی غیر معمولی تھے اور ان سے طرح طرح کے کرامات کا صدور ہوتا رہتا تھا[۱]۔ (واللہ اعلم بحقیقۃ الحال)

حلیۂ مبارک بخاری حدیثِ معراج میں ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا میری ملاقات حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) سے ہوئی تو میں نے ان کو میانہ قد سرخ سپید پایا بدن ایسا صاف شفاف تھا معلوم ہوتا تھا کہ ابھی حمام سے نہا کر آئے ہیں، اور بعض روایات میں ہے کہ آپ کے کاکل کاندھوں تک لٹکے ہوئے تھے، اور بعض احادیث میں ہے کہ رنگ کھلتا ہوا گندم گوں تھا۔ بخاریؒ کی روایت اور اس روایت میں اداءِ تعبیر کا فرق ہے، حُسن میں اگر صباحت کے ساتھ ملاحت کی آمیزش بھی ہوتی ہے تو اس رنگ میں ایک خاص کیفیت پیدا ہو جاتی ہے، کسی وقت اگر سرخی جھلک آئی تو صباحت نمایاں ہو جاتی ہے اور اگر کسی وقت ملاحت غالب آگئی تو چہرہ پر حسن و لطافت کے ساتھ کھلتا ہوا گندم گوں رنگ چمکنے لگتا ہے۔

---

[۱] تاریخ ابن کثیر ج ۲ ص ۷۷ و انجیل متی باب ۲

بعثت و رسالت

حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) سے قبل بنی اسرائیل ہر قسم کی برائیوں میں مبتلا تھے اور انفرادی و اجتماعی عیوب و نقائص کا کوئی پہلو ایسا نہیں تھا جو اُن سے بچ رہا ہو، وہ اعتقاد و اعمال دونوں ہی قسم کی گمراہیوں کا مرکز و محور بن گئے تھے حتیٰ کہ اپنی ہی قوم کے ہادیوں اور پیغمبروں کے قتل تک پر جری اور دلیر ہو گئے تھے، یہودیہ کے بادشاہ ہیرودیس کے متعلق معلوم کر چکے ہو کہ اس نے حضرت یحییٰ (علیہ السلام) کو اپنی محبوبہ کے اشارہ پر کیسے عبرتناک طریقہ پر قتل کرا دیا تھا اور اس نے یہ سفاکانہ اقدام صرف اس لئے کیا کہ وہ حضرت یحییٰؑ کی بڑھتی ہوئی روحانی مقبولیت کو برداشت نہ کر سکا اور اپنی محبوبہ سے ناجائز رشتہ پر اُن کے نہی عن المنکر (برائی سے بچانے کی ترغیب) کی تاب نہ لا سکا اور یہ عبرتناک سانحہ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کی زندگیِ مبارک ہی میں اُن کی بعثت سے قبل پیش آ چکا تھا۔

دائرۃ المعارف (انسائیکلوپیڈیا اللبنانی) میں یہود سے متعلق جو مقالہ ہے اُس کے تاریخی مواد سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضرت مسیح (علیہ السلام) کی بعثت سے پہلے یہود کے عقائد و اعمال کا یہ حال تھا کہ وہ مشرکانہ رسوم و عقائد کو جزءِ مذہب بنا چکے تھے اور جھوٹ، فریب بغض و حسد جیسی بداخلاقیوں کو تو عملاً اخلاقِ کریمانہ کی حیثیت دے رکھی تھی اور اسی بنا پر بجائے شرمسار ہونے کے وہ اُن پر فخر کا اظہار کرتے تھے اور اُن کے علماء و احبار نے تو دنیا کے لالچ و حرص میں کتاب اللہ (توراۃ) تک کو تحریف کئے بغیر نہ چھوڑا اور درہم و دینار پر خدا کی آیات کو فروخت کر ڈالا یعنی عوام سے نذر اور بھینٹ حاصل کرنے کی خاطر حلال کو حرام اور حرام کو حلال بنانے سے بھی دریغ نہیں کیا اور اس طرح قانونِ الٰہی کو مسخ کر ڈالا۔

یہود کی اعتقادی اور عملی زندگی کا مختصر اور مکمل نقشہ ہم کو شعیا (علیہ السلام)

کی زبانی خود توراۃ نے اس طرح دکھایا ہے۔

خداوند فرماتا ہے: یہ امت (بنی اسرائیل) زبان سے تو میری عزت کرتی ہے مگر ان کا دل مجھ سے دور ہے اور یہ بے فائدہ میری پرستش کرتے ہیں کیونکہ یہ میرے حکموں کو پیچھے ڈال کر آدمیوں کے حکموں کی تعلیم دیتے ہیں۔

بہرحال ان ہی تاریک حالات میں جب حضرت یحییٰ (علیہ السلام) کے قتل کا واقعہ بھی ہو گذرا اور بنی اسرائیل نے خدا کے حکموں کے خلاف بغاوت و سرکشی کی حد کر دی تب وہ وقتِ سعید آپہنچا کہ جس مبارک بچہ نے حضرت مریمؑ کی آغوش میں پیغامِ حق سنا کر بنی اسرائیل کو حیرت میں ڈال دیا تھا، سِن رشد کو پہنچ کر اس نے یہ اعلان کر کے "کہ وہ خدا کا رسول اور پیغمبر ہے اور رشد و ہدایتِ خلق اُس کا فرضِ منصبی" قوم میں ہلچل پیدا کر دی وہ شرفِ رسالت سے مشرف ہو کر اور حق کی آواز بن کر آیا اور اپنی صداقت و حقانیت کے نور سے تمام اسرائیلی دنیا پر چھا گیا، اس مقدس ہستی نے قوم کو للکارا اور احبار کی علمی مجلسوں، راہبوں کے خلوت کدوں، بادشاہ اور امراء کے درباروں اور عوام و خواص کی محفلوں میں حتیٰ کہ کوچہ و برزن اور بازاروں میں شب و روز یہ پیغامِ حق سُنایا۔

لوگو! اللہ تعالیٰ نے مجھ کو اپنا رسول اور پیغمبر بنا کر تمہارے پاس بھیجا ہے اور تمہاری اصلاح کی خدمت میرے سپرد فرمائی ہے میں اس کی جانب سے پیغامِ ہدایت لے کر آیا ہوں اور تمہارے ہاتھ میں خدا کا جو قانون (توراۃ) ہے اور جس کو تم نے اپنی جہالت اور کجروی سے پس پشت ڈال دیا ہے میں اس کی تصدیق کرتا اور اس کی مزید تکمیل کے لئے خدا کی کتاب (انجیل) لے کر آیا ہوں، یہ کتاب حق و باطل کا فیصلہ کرے گی اور آج جھوٹ و سچ کے درمیان فیصلہ ہو کر رہے گا۔ سنو اور سمجھو اور اطاعت کے لئے خدا کے حضور جھک جاؤ کہ

یہی دین و دنیا کی فلاح کی راہ ہے۔

اب ان حقائق اور اُن کے عواقب و نتائج کو قرآن کی زبانی سُنئے اور "احقاقِ حق و ابطالِ باطل" کے لطف سے بہرہ مند ہو کر عبرت و موعظت حاصل کیجئے، کیونکہ "تذکیر بایام اللہ" سے قرآن کا مقصدِ عظیم یہی بصیرت و عبرت ہے۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوسَى الْكِتٰبَ وَ	اور بیشک ہم نے موسیٰؑ کو کتاب (توراۃ) عطا کی اور اس کے
قَفَّيْنَا مِنْ بَعْدِهٖ بِالرُّسُلِ	بعد ہم (تم میں) پیغمبر بھیجتے رہے اور ہم نے عیسیٰ بن مریم کو
وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ	واضح معجزے دے کر بھیجا اور ہم نے اس کو روحِ پاک
الْبَيِّنٰتِ وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ	(جبرئیل) کے ذریعہ قوت و تائید عطا کی، کیا جب تمہارے
الْقُدُسِ اَفَكُلَّمَا جَآءَكُمْ	پاس (خدا کا) پیغمبر ایسے احکام لے کر آیا جن پر عمل کرنے
رَسُوْلٌۢ بِمَا لَا تَهْوٰٓى اَنْفُسُكُمُ	کو تمہارا دل نہیں چاہتا تو تم نے غرور کو شیوہ (نہیں) بنا
اسْتَكْبَرْتُمْ فَفَرِيْقًا كَذَّبْتُمْ	لیا؟ پس (پیغمبروں کی) ایک جماعت کو جھٹلاتے ہو تو
وَفَرِيْقًا تَقْتُلُوْنَ ۝ وَقَالُوْا	ایک جماعت کو قتل کر دیتے ہو اور کہتے ہو کہ ہمارے دل
قُلُوْبُنَا غُلْفٌ ؕ بَلْ لَّعَنَهُمُ	(قبولِ حق کے لئے) غلاف میں ہیں (یہ نہیں) بلکہ اُن کے
اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ فَقَلِيْلًا مَّا	کفر کرنے پر خدا نے ان کو ملعون کر دیا ہے پس بہت تھوڑے
يُؤْمِنُوْنَ۔ (البقرہ)	سے ہیں جو ایمان لے آئے ہیں
وَاِذْ كَفَفْتُ بَنِیْٓ اِسْرَآءِيْلَ	اور (اے عیسیٰ!) جب ہم نے بنی اسرائیل (کی گرفت و
عَنْكَ اِذْ جِئْتَهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ	ارادۂ قتل) کو تجھ سے باز رکھا اس وقت جبکہ تو اُن کے
فَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ اِنْ	پاس کھلے معجزات لے کر آیا تو کہا بنی اسرائیل میں سے
هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ (المائدہ)	منکروں نے، یہ کچھ نہیں ہے مگر کھلا جادو ہے۔

عربی	اردو
وَمُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ	اور میں تصدیق کرنے والا ہوں توراۃ کی جو میرے سامنے
التَّوْرٰىةِ وَلِاُحِلَّ لَكُمْ بَعْضَ	ہے اور (اس لئے آیا ہوں) تاکہ تمہارے لئے بعض وہ چیزیں
الَّذِيْ حُرِّمَ عَلَيْكُمْ وَجِئْتُكُمْ بِاٰيَةٍ	حلال کردوں جو (تمہاری کجروی کی وجہ سے) تم پر حرام
مِّنْ رَّبِّكُمْ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ	کردی گئی تھیں اور میں تمہارے پاس تمہارے پروردگار کی
اِنَّ اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ	نشانی لے کر آیا ہوں پس اللہ کا خوف کرو اور میری پیروی
هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ ۝ فَلَمَّآ	کرو۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ میرا اور تمہارا پروردگار ہے۔ پس اسی
اَحَسَّ عِيْسٰى مِنْهُمُ الْكُفْرَ	کی عبادت کرو یہی سیدھی راہ ہے پس جبکہ عیسیٰ علیہ السلام
قَالَ مَنْ اَنْصَارِيْٓ اِلَى اللّٰهِ	نے ان سے کفر محسوس کیا تو فرمایا اللہ کے لئے کون میرا
قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ نَحْنُ	مددگار ہے تو شاگردوں نے جواب دیا ہم ہیں اللہ کے
اَنْصَارُ اللّٰهِ ۝ (آل عمران)	(دین کے) مددگار۔
ثُمَّ قَفَّيْنَا عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ بِرُسُلِنَا	پھر ان کے بعد (نوح وابراہیم علیہم السلام کے بعد)
وَقَفَّيْنَا بِعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ وَ	ہم نے اپنے رسول بھیجے اور ان کے بعد عیسیٰ بن مریم کو
اٰتَيْنٰهُ الْاِنْجِيْلَ (حدید)	رسول بناکر بھیجا اور اس کو کتاب (انجیل) عطا کی۔
اِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ	(وہ وقت یاد کے لائق ہے) جب اللہ تعالیٰ قیامت کے
اذْكُرْ نِعْمَتِيْ عَلَيْكَ وَعَلٰى وَالِدَتِكَ	دن کہیگا "اے عیسیٰ بن مریم! میری اس نعمت کو یاد کرو جو
اِذْ اَيَّدْتُّكَ بِرُوْحِ الْقُدُسِ تُكَلِّمُ	میری جانب سے تجھ پر اور تیری والدہ پر نازل ہوئی جبکہ
النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَكَهْلًا وَاِذْ	میں نے روح القدس (جبرئیل) کے ذریعہ تیری تائید کی
عَلَّمْتُكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَ	کہ تو کلام کرتا تھا آغوش مادر میں اور بڑھاپے میں اور
التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ (مائدہ)	جبکہ میں نے تجھ کو سکھائی کتاب حکمت توراۃ اور انجیل۔

وَاِذْ قَالَ عِیْسَی ابْنُ مَرْیَمَ یٰبَنِیْۤ	اور (وہ وقت یاد کرو) جب عیسیٰ بن مریم نے کہا "اے
اِسْرَآءِیْلَ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَیْكُمْ	بنی اسرائیل! بلاشبہ میں تمہاری جانب اللہ کا بھیجا ہوا
مُّصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ	پیغمبر ہوں، تصدیق کرنے والا ہوں توراۃ کی جو میرے
وَمُبَشِّرًۢا بِرَسُوْلٍ یَّاْتِیْ مِنْۢ	سامنے ہے اور بشارت سنانے والا ہوں ایک پیغمبر کی
بَعْدِی اسْمُهٗۤ اَحْمَدُ (الصف)	جو میرے بعد آئیگا اس کا نام احمد ہے (صلی اللہ علیہ وسلم)

آیاتِ بینات | قصص القرآن جلد اول معجزات کی بحث میں گذر چکا ہے کہ حق وصداقت کے تسلیم و انقیاد میں انسانی فطرت ہمیشہ سے دو طریقوں سے مانوس رہی ہے ایک یہ کہ "مدعیِ حق" کی حقانیت وصداقت، دلائل کی قوت اور براہین کی روشنی کے ذریعہ ثابت اور واضح ہو جائے اور دوسرا طریقہ یہ کہ دلائل وبراہین کے ساتھ ساتھ منجانب اللہ اس کی صداقت کی تائید میں عام قانونِ قدرت سے جدا بغیر اسباب ووسائل اور تحصیلِ علم وفن کے اس کے ہاتھ پر امورِ عجیبہ کا مظاہرہ اس طرح ہو کہ عوام وخواص اس کے مقابلہ سے عاجز و درماندہ ہو جائیں اور ان کے لئے اسباب ووسائل کے بغیر اُن امور کی ایجاد ناممکن ہو، پہلے طریق کے ساتھ یہ دوسرا طریق انسان کے عقل وفکر اور اس کی نفسیاتی کیفیات میں ایسا انقلاب پیدا کر دیتا ہے کہ ان کا وجدان یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ داعیِ حق (نبی وپیغمبر) کا یہ عمل دراصل خود اُس کا اپنا فعل نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ خدا کی قوت کام کر رہی ہے اور بلاشبہ یہ اس کے صادق ہونے کی مزید دلیل ہے چنانچہ قرآنِ عزیز میں آیت "وَمَا رَمَیْتَ اِذْ رَمَیْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰی"[1] میں اسی حقیقت کا اظہار مقصود ہے مگر ان ہر دو طریقوں میں سے

---

[1] اور اے پیغمبر (بدر کے غزوہ میں) جب تو نے (دشمنوں پر) مٹھی بھر خاک پھینکی تھی تو تو نے وہ مشتِ خاک نہیں پھینکی تھی لیکن اللہ تعالیٰ نے پھینکی تھی۔ مفصل بحث جلد اول میں گذر چکی ہے۔

ان اصحابِ علم ودانش پر جو قوتِ فہم وادراک میں بلند مقام رکھتے ہیں پہلا طریقہ زیادہ موثر ثابت ہوتا ہے اور وہ دوسرے طریقہ کو پہلے طریقہ کی تائید وتقویت کی حیثیت سے قبول کرتے اور داعیِ حق (نبی وپیغمبر) کے دعوئے نبوت ورسالت کی صداقت کا مزید عملی ثبوت یقین کرکے اُس پر ایمان لے آتے ہیں اور ان حضرات اربابِ عقل وفکر کے برعکس اربابِ قوت واقتدار اور ان کی ذہنیت سے متاثر عام انسانی قلوب دوسرے طریقۂ تصدیق سے زیادہ متاثر ہوتے اور نبی وپیغمبر کے معجزانہ افعال کو کائنات کی طاقت وقوت کے دائرہ سے بالاتر ہستی کا ارادہ وقوتِ فعل یقین کرنے پر مجبور ہوجاتے ہیں اور ان امور کو "خدائی نشان" باور کرکے دعوتِ حق وصداقت کے سامنے سرِ تسلیم خم کردیتے ہیں۔

قرآنِ عزیز نے اکثر وبیشتر مقامات پر پہلے طریقِ دلیل کو "حجۃ اللہ" "برہان" اور "حکمۃ" سے تعبیر کیا ہے۔ سورۂ انعام میں خدا کی ہستی، اُس کی وحدانیت، معاد وآخرت اور دین کے بنیادی عقائد کو دلائل، نظائر اور شواہد کے ذریعہ سمجھانے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کرتے ہوئے کہا گیا ہے۔

قُلْ فَلِلّٰهِ الْحُجَّةُ الْبَالِغَةُ	(اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کہہ دیجئے، اللہ کیلئے ہی ہر حجت کامل (یعنی مکمل اور روشن دلیل)

اور اس سورۃ میں دوسری جگہ حضرت ابراہیم کے تذکرہ میں ہے۔

تِلْكَ حُجَّتُنَا اٰتَيْنٰهَا اِبْرٰهِيْمَ عَلٰى قَوْمِهٖ۔	اور یہ ہماری "دلیل" ہے جو ہم نے ابراہیم کو اس کی قوم کے مقابلہ میں عطا کی

اور سورۂ نساء میں ہے۔

رُسُلًا مُّبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ	(ہم نے بھیجے) پیغمبر خوشخبری سُنانے والے اور ڈرانے والے

لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ	تاکہ لوگوں کی جانب سے خدا پر پیغمبر بھیجنے کے بعد کوئی حجت
عَلَى اللهِ حُجَّةٌ بَعْدَ	(دلیل) باقی نہ رہے (کہ ہمارے پاس دلائل کے ذریعہ راہِ مستقیم
الرُّسُلِ۔	بتانے کوئی نہ آیا تھا اس لئے ہم دینِ حق کی معرفت سے محروم رہے)
يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَكُمْ	اے لوگو! بیشک تمہارے پاس تمہارے پروردگار کی
بُرْهَانٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ (نساء)	جانب سے برہان (قرآن) آگیا۔

اور سورۂ یوسف میں ہے۔

لَوْلَا أَنْ رَّأَىٰ بُرْهَانَ	اگر نہ ہوتی یہ بات کہ دیکھ لی تھی اُس (یوسف) نے
رَبِّهٖ۔	اپنے پروردگار کی دلیل۔

اور سورۂ نحل میں ہے۔

اُدْعُ إِلَىٰ سَبِيلِ رَبِّكَ	اپنے پروردگار کے راستہ کی جانب دعوت و حکمت
بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ	اور عمدہ نصیحت کے ساتھ اور تبادلۂ خیالات کرو
وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ	اُن (مخالفین) کے ساتھ اچھے طریق گفتگو سے۔

اور سورۂ نساء میں ہے۔

وَأَنْزَلَ اللهُ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ	اور اللہ تعالیٰ نے اتارا تجھ پر کتاب کو اور حکمت کو۔

اسی طرح "حکمت" کا یہ ذکر سورۂ بقرہ، آلِ عمران، مائدہ، لقمان، ص، زخرف، احزاب اور قمر میں بہ کثرت موجود ہے اور دوسرے طریق دلیل کو اکثر "آیۃ اللہ" اور "آیات اللہ" اور بعض مقامات پر "آیات بینات" اور "بینات" کہا ہے۔

ناقۂ صالح (علیہ السلام) کے متعلق ارشاد ہے۔

هٰذِهٖ نَاقَةُ اللهِ لَكُمْ آيَةً (اعراف)	یہ اونٹنی تمہارے لئے (خدا کی جانب سے) ایک نشان ہے۔

اور حضرت مسیح اور اُن کی والدہ مریم (علیہا السلام) کے متعلق ارشاد ہے۔

وَجَعَلْنٰهَا وَابْنَهَاۤ اٰيَةً (انبیاء) — اور ہم نے کر دیا مریم اور اس کے لڑکے عیسیٰ (علیہما السلام) کو جہان والوں کے لئے "نشان" (معجزہ)

اور حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کے واقعات میں ارشادِ باری ہے۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسٰى تِسْعَ اٰيٰتٍ (بنی اسرائیل) — اور ہم نے موسیٰ کو نو نشان (معجزات) عطا کئے۔

اور حضرت مسیح (علیہ السلام) کو جو معجزات دیئے گئے تھے اُن کے متعلق ارشاد ہے۔

وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ (بقرہ) — اور دیئے ہم نے عیسیٰ بن مریم کو معجزات۔

اِذْ جِئْتَهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ اِنْ هٰذَاۤ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ۔ (مائدہ) — اس وقت جبکہ تو ان کے پاس کھلے معجزات لیکر آیا تو کہا بنی اسرائیل میں سے منکروں نے یہ تو کھلا ہوا جادو ہے۔

ہم نے اس مقام پر اکثر و بیشتر کا لفظ قصداً اختیار کیا ہے کیونکہ قرآن عزیز کے اسلوبِ بیان سے واقف و دانا اس سے بے خبر نہیں ہے کہ اُس نے ان الفاظ کے استعمال میں وسعتِ تعبیر سے کام لیا ہے یعنی جبکہ "معجزہ" بھی ایک خاص قسم کا "برہان" ہے اور قرآن اور آیاتِ قرآن جس طرح سرتاسر "علم و برہان" ہیں اُسی طرح "معجزہ" بھی ہے اس لئے معجزہ پر برہان کا اطلاق اور کتاب اللہ کے جملوں پر آیت اور آیات اللہ کا اطلاق مجاز نہیں بلکہ حقیقت ہے مثلاً حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کے دو معجزوں عصا اور ید بیضا کے متعلق سورۂ قصص میں ہے۔

فَذٰنِكَ بُرْهَانٰنِ مِنْ رَّبِّكَ — پس تیرے رب کی جانب سے یہ دو دلیلیں ہیں۔

اور کتاب اللہ اور اس کے جملوں پر آیت اور آیات کے اطلاقات سے تو قرآن کی کوئی طویل سورۃ ہی خالی ہوگی، تمام قرآن میں جگہ جگہ اس کثرت سے اس کا استعمال ہوا ہے کہ اس

کی فہرست مستقل موضوع بن سکتا ہے۔

اسی طرح "آیات بینات" کا اگرچہ بکثرت اطلاق کتاب اللہ (قرآن، توراۃ، زبور، انجیل) اور ان کی آیات پر ہوا ہے مگر مسطورۂ بالا مقامات کی طرح بعض بعض جگہ اس کو "معجزات" کے لئے بھی استعمال کیا گیا ہے۔

لائقِ توجہ بات اور حقیقتِ معجزات

نبی اور رسول کی بعثت کا مقصد کائنات کی رشد و ہدایت اور دین و دنیا کی فلاح و خیر کی رہنمائی ہے اور وہ منجانب اللہ وحی کی روشنی میں اِس فرضِ منصبی کو انجام دیتا اور علم و برہان اور حجۃ حق کے ذریعہ راہِ صداقت دکھاتا ہے، وہ یہ دعویٰ نہیں کرتا کہ فطرت اور ماورارِ فطرت امور میں تصرف و تغیر بھی اس کا کارِ منصبی ہے بلکہ وہ بار بار یہ اعلان کرتا ہے کہ میں خدا کی جانب سے بشیر و نذیر اور داعی الی اللہ بن کر آیا ہوں، میں انسان ہوں اور خدا کا ایلچی، اس سے زاید اور کچھ نہیں ہوں تو پھر اس کے دعوئے صداقت کے امتحان اور پرکھ کے لئے اس کی تعلیم، اُس کی تربیت اور اس کی شخصیت کا زیرِ بحث آنا یقیناً معقول لیکن اُس سے ماورارِ فطرت اور خارقِ عادت عجائبات و غرائب کا مطالبہ خلافِ عقل اور بے جوڑ بات معلوم ہوتی ہے اور یوں نظر آتا ہے کہ کسی طبیبِ حاذق کے دعوئے حذاقتِ طب پر اس سے یہ مطالبہ کرنا کہ وہ طلسمی کھٹکے کی ایک عمدہ الماری یا لکڑی کا ایک عجیب قسم کا کھلونا بنا کر دکھائے، طبیب نے یہ دعویٰ نہیں کیا تھا کہ وہ ماہر لوہار یا بڑھئی ہے بلکہ اس کا دعویٰ تو امراضِ جسمانی کے علاج کا ہے، اسی طرح پیغمبرِ خدا کا یہ دعویٰ نہیں ہوتا کہ وہ خدا کی طرح کائنات پر ہمہ قسم کے تصرف و تغیر کا مالک و قادر ہے بلکہ اُس کا دعویٰ تو یہ ہے کہ وہ تمام امراضِ روحانی کے لئے طبیبِ کامل اور حاذق و ماہر ہے۔

پس دعوئے نبوت اور معجزات (خارق عادات امور) کے درمیان کیا تعلق ہے؟

اور کیا اس لئے یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ "معجزہ" لوازمِ نبوت میں سے نہیں ہے؟

بلاشبہ یہ سوال بہت زیادہ قابلِ توجہ ہے اور اس لئے علمِ کلام میں اس مسئلہ کو کافی اہمیت دی گئی ہے لیکن ہم نے "آیاتِ بینات" عنوان کے ماتحت ابتداءِ کلام میں دعوئے نبوت کی صداقت سے متعلق دلائل کی جو تقسیم انسانی طبائع اور ان کے فطری رجحانات کے پیشِ نظر کی ہے وہ بھی ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے اور جوہرِ عقل کے تفاوتِ درجات نے بلاشبہ انسانوں کی قوتِ فکریہ کو جدا جدا دو طریقوں کی جانب مائل کر دیا ہے، ان حالات میں جب ایک نبی اور رسول یہ دعویٰ کرتا ہے کہ وہ خدا کی جانب سے ایک ایسے منصب پر مامور ہے جو ریاضات و مجاہدات اور نیک عملی کی قوت سے نہیں بلکہ محض خدا کی موہبت اور عطا سے حاصل ہوتا ہے اور یہ "منصب نبوت و رسالت" ہے اور اس کا مقصد کائنات کی رشد و ہدایت اور تعلیم حق و صداقت ہے تو بعض انسانی دماغ اور اُن کا جوہرِ عقل اس جانب متوجہ ہو جاتا ہے کہ اگر اس ہستی کا یہ دعویٰ صحت پر مبنی ہے تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ اس کو خدائے برتر کے ساتھ اس درجہ قربت حاصل ہے جو دوسرے انسانوں کے لئے ناممکن ہے۔ پس جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اُس کی صدائے اصلاح اور اس کی تعلیم ہمارے قدیم رسم و رواج یا مذہب و دھرم کے اُن عقائد و اعمال کے خلاف ہے جس کو ہم حق سمجھتے آئے ہیں تو ان متضاد اور متخالف تعلیمات کی صداقت و بطالت کے امتحان کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ یہ ہستی کوئی اور خارقِ فطرت یا خارق امر کر دکھائے تو ہمارے لئے یہ سمجھنا بہت آسان ہو جائے گا کہ بغیر اسباب و وسائل کے اس ہستی کے ہاتھ ایسے امر کا صدور یقیناً اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ اس کو خدائے برتر کے ساتھ خاص قرب حاصل ہے، تب ہی تو خدائے برحق نے یہ "نشان" دکھا کر اُس کی صداقت پر مہر لگا دی، نیز وہ صاحب قوت و اقتدار انسان جن کے غور و فکر

کی قوت ایسے سانچہ میں ڈھل گئی ہے کہ اُن پر کوئی امرِ حق اس وقت تک مؤثر ہی نہیں ہوتا
جب تک کہ ان کی متکبرانہ طاقت کو غیبی ٹھوکر سے بیدار نہ کیا جائے وہ بھی اس کے منتظر
رہتے ہیں کہ مدعیِ نبوت و رسالت اپنی صداقت کو دلیل و برہان کے ساتھ ساتھ ایک
ایسے "کرشمہ" کے ذریعہ ناقابلِ انکار بنادے کہ جس کا صدور دوسرے انسانوں سے یا تو ممکن
ہی نہ ہو اور یا بغیر اسباب و وسائل کے استعمال کئے وجود پذیر نہ ہو سکتا ہو تاکہ یہ باور کیا جاسکے
کہ بلاشبہ اس ہستی کی تعلیم و تبلیغ کو خدائے برتر کی تائید حاصل ہے۔ اسی لئے علماءِ کلام نے
دعوئے نبوت اور معجزہ کے درمیان تعلق پر بحث کرتے ہوئے یہ مثال بیان کی ہے کہ
ایک شخص جب یہ دعویٰ کرتا ہے کہ اس کو بادشاہِ وقت نے اپنا نائب مقرر کر کے بھیجا
ہے تو اُس ملک یا صوبہ کے باشندے خواستگار ہوتے ہیں کہ مدعیِ نیابت اپنے دعوے کی
صداقت کے لئے کوئی سند اور علامت پیش کرے چنانچہ مدعیِ نیابت ایک جانب اگر
سند دکھاتا ہے تو دوسری جانب ایسی "نشانی" بھی پیش کرتا ہے جس کے متعلق یہ یقین کیا
جاسکے کہ بادشاہ کی عطا کردہ یہ نشانی اُس کے عطیہ اور اس منصب کی تصدیق کے علاوہ
اور کسی طرح بھی حاصل نہیں کی جاسکتی۔ مثلاً بادشاہ کی انگشتری (مہرِ حکومت) یا ایسا خاص
عطیہ جو صرف اس منصب پر فائزہستی کو عطا کیا جاتا ہو۔

تو اگرچہ بظاہر دعویٰ نیابت اور انگشتری یا عطیۂ خاص کے درمیان کوئی مطابقت
نہیں ہے تاہم اُس تعلقِ خاص نے جو شاہی تصدیق سے وابستہ ہے ان دونوں کے درمیان اہم
ربط پیدا کر دیا ہے"۔

لیکن جبکہ یہ طریقِ تصدیق، معیارِ صداقت و حقانیت میں دوسرے درجہ کی حیثیت
رکھتا ہے اور حقیقۃً معیاری حیثیت صرف طریقِ اول "حجۃ و برہانِ حق" کو ہی حاصل ہے اس لئے

معجزہ کے وقوع وصدور کا معاملہ پہلے طریق کے وجود وصدور سے قطعاً جدا ہے اور وہ یہ کہ ہر ایک مدعی نبوت و رسالت کے لئے ازبس ضروری ہے کہ وہ اپنے دعویٔ حق وصداقت کو حجۃ و برہان کی روشنی اور علم یقین کی قوت کے ذریعہ ثابت کرے، اور اپنی تعلیم، تربیت، اور شخصی حیات کے ہر پہلو میں دعویٰ اور دلیل و برہان کی مطابقت کو واضح کرے اور انسانی جوہرِ عقل کے فکر و تدبر کی رہنمائی کا فرض اس طرح انجام دے کہ ہر قسم کے ظن و وہم اور فاسد و کاسد خیالات کے مقابلہ میں "یقین محکم" روزِ روشن کی طرح نمودار ہو جائے اور اس ادائے فرض کے لئے کسی کی جانب سے نہ مطالبہ شرط ہے اور نہ جستجو لازم بلکہ یہ نبی اور رسول کا براہِ راست وہ فرض ہے جس کے لئے خدائے تعالیٰ نے اس کو منتخب اور مامور کیا ہے، اور اگر ایک لمحہ کے لئے بھی وہ اس میں کوتاہی کرتا ہے تو گویا اپنے فرض کی پوری عمارت کو اپنے ہاتھ سے برباد کر دیتا ہے۔

یَآ اَیُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَیْکَ مِنْ رَّبِّکَ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ. (البقرہ)	اے پیغمبر! جو تم پر نازل کیا گیا ہے تم اُس کو پورا پورا پہنچا دو اور اگر تم نے ایسا نہ کیا تو منصبِ رسالت کو ادا نہ کیا۔

اس کے برعکس معجزہ کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ نبی اور رسول اس کو ضرور ہی دکھائے یا مخالفین کے ہر مطالبہ پر اُس کی تعمیل کرے بلکہ "معجزہ" حجت و برہان کی وہ قسم ہے جو اکثر معاندین کے مطالبہ پر وقوع پذیر ہوتا ہے اور اس سے اس کا صدور صرف عالم الغیب کی اپنی "حکمت و مصلحت" پر ہی موقوف رہتا ہے اور وہی خوب جانتا ہے کہ معجزہ کے بارہ میں کس کا سوال جویائے حق کی حیثیت میں ہے اور کس کا تعنت اور انکار مزید کے لئے کن سعید روحوں پر اس کا یہ اثر پڑے گا کہ وہ کہہ اٹھیں گی "اٰمَنَّا بِرَبِّ مُوْسٰی وَهٰرُوْنَ" اور کن بدبختوں پر اس طرح

اثر انداز ہوگا کہ یوں گویا ہوں گے" اِنْ ھٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِیْنٌ"

پس قرآنِ عزیز نے اگر ایک جانب بہ نصوصِ قطعیہ یہ ظاہر کیا ہے کہ اُس نے اپنے نبیوں اور رسولوں کو حجۃ و برہان کے ساتھ مزید تائید و تقویت کے لئے معجزات عطا کئے ہیں تو دوسری جانب یہ بھی صاف صاف نبی کی زبانی کہلا دیا ہے کہ میں خدا کی جانب سے فقط "نذیر مبین" "بشیر و نذیر" اور "رسول و نبی" ہوں۔ میں نے یہ دعویٰ ہرگز نہیں کیا کہ میں کائناتِ خداوندی کے تصرفات و تغیرات اور ماورائے فطرت امور پر قادر ہوں، ہاں خدائے برتر اگر چاہے تو وہ ایسا کر سکتا ہے اور اس نے ایسا کیا بھی ہے مگر وہ جب ہی کرتا ہے کہ اس کی حکمت و مصلحت اس کی متقاضی ہو۔

چنانچہ حضرت داؤد و سلیمان (علیہما السلام) کو منطق الطیر اور تسخیر ہوا، طیور و جن کے نشان دیئے گئے، حضرت موسیٰ علیہ السلام کو "تسع آیات بینات۔ نو کھلے نشان" عطا کئے گئے جن میں سے دو نشان عصا اور یدِ بیضاء کو قرآن نے "بڑے نشان" کہا ہے اور بحرِ قلزم میں غرقِ فرعون اور نجاتِ قومِ موسیٰ کا عجیب و غریب واقعہ مستقل ایک "نشانِ عظیم" ہے حضرت ابراہیم (علیہ السلام) پر دہکتی آگ کے شعلوں کو "بردو سلام" بنا دیا حضرت صالح (علیہ السلام) کی قوم کے لئے "ناقۂ صالح" کو نشان بنایا کہ جونہی اس کو کسی نے ستایا اُسی وقت خدا کا عذاب قوم کو تباہ و برباد کر جائے گا چنانچہ ٹھیک اُسی طرح پیش آیا۔ حضرت ہود اور حضرت نوح (علیہما السلام) سے اُن کی قوموں نے عذاب طلب کیا اور کافی سمجھانے کے بعد بھی جب اُن کا اصرار قائم رہا تو ان پیغمبروں نے عذابِ الٰہی کی جو وعیدیں سنائی تھیں، وہ ٹھیک اپنے اپنے وقت پر پوری ہوئیں حالانکہ ان سب مواقع میں بہ ظاہر اسباب نزولِ عذاب اور وقوعِ حوادث و ہلاکت کے کوئی سامان نہیں تھے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو جو مختلف نشان

(معجزات) دیئے گئے ان کو بھی قرآن نے صاف صاف بیان کر دیا ہے جو ابھی زیرِ بحث آئیں گے اور آخر میں خاتم الانبیا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو علمی معجزۂ قرآن عطا کیا جس کی تحدی (مقابلہ کے چیلنج) کا کوئی جواب نہ دے سکا، نیز بدر کے معرکہ میں فرشتوں کا نزول اور ان کے ذریعہ مسلمانوں کی نصرت و یاوری اور "وما رمیت اذ رمیت ولکن اللہ رمی" کے اعلان سے اس مشہور معجزہ کا اظہار فرمایا جس نے بدر کے میدان میں مٹھی بھر خاک کو ایک ہزار دشمنوں کی آنکھوں کا آزار بنا دیا اور "شق القمر" کا معجزہ عطا فرمایا۔

معاملۂ زیرِ بحث کا یہ ایک پہلو یا ایک رُخ ہے اور دوسرا پہلو یہ ہے کہ جب خاتم الانبیاً محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوتِ ارشاد و تبلیغِ حق کے روشن دلائل و براہین کا کوئی جواب مخالفین سے نہ بن پڑا تو ازرہِ تعنت و سرکشی عجائبات اور خارقِ عادات امور کا مطالبہ کرنے لگے تب اللہ تعالیٰ نے بذریعہ وحی پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع دی کہ ان کا مقصد طلبِ حق اور جستجوئے صداقت نہیں ہے بلکہ یہ جو کہہ رہے ہیں سرکشی، ضد، اور تعصب، کی راہ سے کہتے ہیں اس لئے ان کا جواب یہ نہیں ہے کہ خدا کے نشانات کو بھان متی کا تماشہ یا مداری کا کھیل بنا دیا جائے بلکہ اصل جواب یہ ہے کہ اُن سے کہہ دو، میں ان تصرفات کا مدعی نہیں ہوں میں تو نیک و بد امور میں تمیز پیدا کرنے، خدا کے بندوں کا خدا کے ساتھ رشتہ ملانے اور نیک و بد کاموں کے انجام کو واضح کرنے کے لئے "نذیرِ مبین" اور "نبیِ رسول" ہوں۔

وَقَالُوا لَن نُّؤْمِنَ لَكَ حَتَّىٰ تَفْجُرَ	اور انھوں نے (مشرکوں نے) کہا ہم اس وقت تک ہرگز
لَنَا مِنَ الْأَرْضِ يَنبُوعًا أَوْ	تیری بات نہیں مانیں گے کہ تو ہمارے لئے زمین سے چشمہ
تَكُونَ لَكَ جَنَّةٌ مِّن نَّخِيلٍ	اُبال دے یا تیرے واسطے کھجوروں کا اور انگوروں کا
وَعِنَبٍ فَتُفَجِّرَ الْأَنْهَارَ خِلَالَهَا	باغ ہو اور تو اس کے درمیان زمین پھاڑ کر نہریں بہا دے

تَفْجِيرًا ۙ أَوْ تُسْقِطَ السَّمَاءَ كَمَا زَعَمْتَ عَلَيْنَا كِسَفًا أَوْ تَأْتِيَ بِاللَّهِ وَالْمَلَائِكَةِ قَبِيلًا ۙ أَوْ يَكُونَ لَكَ بَيْتٌ مِّن زُخْرُفٍ أَوْ تَرْقَىٰ فِي السَّمَاءِ وَلَن نُّؤْمِنَ لِرُقِيِّكَ حَتَّىٰ تُنَزِّلَ عَلَيْنَا كِتَابًا نَّقْرَؤُهُ ۗ قُلْ سُبْحَانَ رَبِّي هَلْ كُنتُ إِلَّا بَشَرًا رَّسُولًا ۝ (الاسراء)

یا تو جیسا گمان کرتا ہے ہمارے اوپر آسمان گرا دے، یا تو اللہ اور اس کے فرشتوں کو (ہمارے) مقابل لائے یا تیرے واسطے ایک سونے کا (طلائی) مکان ہو اور یا تو چڑھ جائے آسمان پر اور ہم تیرے چڑھ جانے کو بھی ہرگز اس وقت تک نہیں تسلیم کریں گے تاوقتیکہ تو ہمارے پاس (آسمان سے) کتاب لے کر آئے کہ اس کو ہم پڑھیں۔ (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کہہ دیجئے پاکی ہے میرے پروردگار کے لئے میں اس کے سوا کچھ نہیں کہ انسان ہوں، خدا کا پیغامبر ہوں۔

وَلَوْ فَتَحْنَا عَلَيْهِم بَابًا مِّنَ السَّمَاءِ فَظَلُّوا فِيهِ يَعْرُجُونَ لَقَالُوا إِنَّمَا سُكِّرَتْ أَبْصَارُنَا بَلْ نَحْنُ قَوْمٌ مَّسْحُورُونَ ۝ (الحجر)

اور اگر کھول دیں ہم ان پر آسمان کا ایک دروازہ اور یہ اس پر چڑھنے لگیں تب بھی ضرور یہی کہیں گے کہ اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ مست کردی گئی ہیں ہماری آنکھیں بلکہ ہم پر جادو کردیا گیا ہے۔

وَإِن يَرَوْا كُلَّ آيَةٍ لَّا يُؤْمِنُوا بِهَا ۔ (الانعام)

اور اگر یہ ہر قسم کے نشان بھی دیکھ لیں تب بھی (ضد اور تعصب کی بنا پر) ایمان لانے والے نہیں ہیں۔

اب ان تفصیلات سے یہ بھی بخوبی روشن ہو گیا کہ علمِ کلام میں جن علماء کی رائے یہ ظاہر کی گئی ہے کہ "معجزہ دلیلِ نبوت نہیں ہے" ان کی مراد کیا ہے؟ وہ دراصل دعویٰ نبوت کی صداقت سے متعلق مسطورہ بالا ہر دو دلائل کے فرق کو ظاہر کرنا چاہتے ہیں اور یہ بتانا چاہتے ہیں کہ جو ہستی نبوت و رسالت کا دعویٰ کرتی ہے اس پر لازم اور ضروری ہے کہ اپنے

دعوے کی تصدیق کے لئے "حجۃ وبرہان" پیش کرے اور دلائل کی روشنی میں اپنی حقانیت کو ثابت کرے اور وحیِ الٰہی کی جو تعلیم وہ کائنات کی ہدایت کے لئے پیش کرتی ہے برہان و حجت کے ذریعہ اس کی حقیقت کو واضح کرے، تو گویا اس طرح نبوت و رسالت اور حجۃ و برہان صداقت میں لازم و ملزوم کا رشتہ ہے اس کے برعکس نبوت کے ساتھ معجزات اور آیات اللہ (نشاناتِ خداوندی) کا تعلق اس طرح کا نہیں ہے بلکہ اس میں یہ تفصیل ہے کہ اگر مخالفین کے مطالبہ پر یا بہ تقاضائے حکمتِ الٰہی نبی اور رسول از خود اپنی صداقت کی تائید میں کوئی نشان (معجزہ) دکھائے تو بلاشبہ وہ اس ہستی کے نبی و رسول ہونے کی ناقابلِ انکار "دلیل" ہی اور اُس کا انکار درحقیقت اُس رسول کی صداقت کا انکار ہے کیونکہ اس صورت میں یہ انکار، حقیقت اور واقعہ کا انکار ہے اور حقیقت کا انکار "حق" نہیں بلکہ "باطل" ہوتا ہے جو نبوت و رسالت کے مقصد کے ساتھ کسی طرح بھی جمع نہیں ہو سکتا۔ البتہ اگر حکمتِ الٰہی کا تقاضا یہ ہو کہ تعلیمِ حق کی روشنی، وحیِ الٰہی پر دلائل و براہین کا یقین، اور اصولِ دین پر حجۃ و برہان کا قیام ہوتے ہوئے اب مخالفین کے بار بار طلبِ معجزات و عجائبات کی پرواہ نہ کی جائے اور نبی و رسول، وحیِ الٰہی کی روشنی میں حجۃ و برہان کے ذریعہ تعلیمِ حق کو جاری رکھے اور مخالفین کے جواب میں صاف صاف کہہ دے کہ میں نے ماورار فطرت پر قدرت کا کبھی دعوٰی نہیں کیا تو اس صورت میں بندوں پر خدا کی حجت تمام ہو جاتی ہے اور کسی امت اور قوم کو یہ حق نہیں رہتا کہ وہ تعلیمِ حق کے دلائل و براہین اور روشن حجت و بیّنہ سے اس لئے منہ پھیرے اور اس لئے اس کا انکار کر دے کہ اس کی طلب پر اچنبھوں اور عجائبات کا مظاہرہ کیوں نہیں کیا گیا۔

پس قرآنِ عزیز نے جن انبیاء و رسل کے واقعات و حالات "تذکیر بایام اللہ" کے

سلسلہ میں بیان کرتے ہوئے نصوصِ قطعیہ کے ذریعہ صراحت و وضاحت سے یہ ثابت کیا ہے کہ ہم نے اُن کی صداقت کے نشان کے طور پر نشانات (معجزات) کو عطا اور مخالفین کے سامنے اُن کا مظاہرہ کیا تو ہمارا فرض ہے کہ ہم بے چون وچرا اُن کو قبول اور اُن کی تصدیق کریں اور عجائب پرستی کے الزام سے خائف ہو کر عالمِ غیب کی اس تصدیق سے گریز نہ کریں اور نہ رکیک و باطل تاویلات کے پردہ میں اُن کے انکار پر آمادہ ہو جائیں کیونکہ ایسا کرنا اس آیت کا مصداق بن جاتا ہے۔

وَيَقُوْلُوْنَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّنَكْفُرُ بِبَعْضٍ وَّيُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَّخِذُوْا بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيْلًا (النساء)

اور وہ کہتے ہیں کہ ہم کتاب الٰہی کے بعض پر ایمان لاتے ہیں اور بعض کا انکار کرتے ہیں اور وہ چاہتے ہیں کہ ایمان و کفر کے درمیان میں ایک راہ بنالیں۔

اور ظاہر ہے کہ یہ مومن و مسلم کی نہیں بلکہ کافر و منکر کی راہ ہے، مومن و مسلم کی راہ تو سیدھی راہ یہ ہے

يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً وَّلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ۔ (البقرہ)

اے پیروانِ دعوتِ ایمانی! اسلام میں پوری طرح داخل ہو جاؤ (اور اعتقاد و عمل کی ساری باتوں میں مسلم بن جاؤ مسلم ہونے کے لئے صرف اتنا ہی کافی نہیں کہ زبان سے اسلام کا اقرار کر لو) اور دیکھو شیطانی وسوسوں کی پیروی نہ کرو، وہ تو تمہارا کھلا دشمن ہے۔

بہرحال "سنۃ اللہ" یہ جاری رہی ہے کہ جب کسی قوم کی ہدایت یا تمام کائناتِ انسانی کی فوز و فلاح کے لئے نبی اور پیغمبر مبعوث ہوتا ہے تو اُس کو من جانب اللہ محکم دلائل و براہین اور آیات اللہ (معجزات) دونوں سے نوازا جاتا ہے، وہ ایک جانب وحیِ الٰہی کے ذریعہ کائنات کے معاش و معاد سے متعلق اوامر و نواہی اور بہترین دستور و نظام پیش کرتا ہے تو

دوسری جانب حسب مصلحتِ خداوندی "خدائی نشانات" کا مظاہرہ کرکے اپنی صداقت اور منجانب اللہ ہونے کا ثبوت دیتا ہے، نیز ہر ایک پیغمبر کو اُسی قسم کے معجزات و نشانات عطا کیئے جاتے ہیں جو اُس زمانہ کی علمی ترقیوں یا قومی و ملکی خصوصیتوں کے مناسب حال ہونے کے باوجود معارضہ کرنے والوں کو عاجز و درماندہ کردیں اور کوئی اُن کے مقابلہ میں تابِ مقاومت نہ لاسکے اور اگر تعصب و ضد درمیان میں حائل نہ ہوں تو اپنی اکتسابی ترقیوں اور خصوصیتوں کے حقائق سے آگاہ ہونے کی وجہ سے اس اعتراف پر مجبور ہو جائیں کہ یہ جو کچھ سامنے ہے انسانوں کی قدرت سے بالاتر، ان کی دسترس سے باہر، اور صرف خدائے واحد ہی کی جانب سے ہے۔

مثلاً حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کے زمانہ میں علمِ نجوم (Astronomy) اور علمِ کیمیا (Chemistry.) کا بہت زور تھا اور ساتھ ہی ان کی قوم کواکب و نجوم کے اثرات کو اُن کے ذاتی اثرات سمجھتی اور اُن کو موثر حقیقی یقین کرکے خدائے واحد کی جگہ اُن کی پرستش کرتی تھی اور اُن کا سب سے بڑا دیوتا شمس (سورج) تھا کیونکہ وہ روشنی اور حرارت دونوں کا حامل تھا اور یہی دونوں چیزیں ان کی نگاہ میں کائنات کی بقاء و فلاح کے لئے اصل الاصول تھیں اور اسی بنا پر کرۂ ارضی میں "آگ" کو اس کا مظہر مان کر اس کی بھی پرستش کی جاتی تھی، علاوہ ازیں اُن کو اشیاء کے خواص و اثرات اور اُن کے ردِ عمل پر بھی کافی عبور تھا گویا آج کی علمی تحقیقات کے لحاظ سے وہ کیمیاوی طریقہائے عمل سے بھی بڑی حد تک واقف تھے۔

اس لئے اللہ تعالیٰ نے ابراہیم (علیہ السلام) کو ان کی قوم کی ہدایت اور خدا پرستی کی تعلیم و تلقین کے لئے ایک جانب ایسے روشن حجۃ و براہان عطا فرمائے جن کے ذریعہ وہ

قوم کے غلط عقائد کے ابطال اور احقاقِ حق کی خدمت انجام دیں اور مظاہر پرستی کی وجہ سے حقیقت کے چہرہ پر تاریکی کا جو پردہ پڑ گیا تھا اس کو چاک کر کے رُخِ روشن کو نمایاں کر سکیں " وَتِلْكَ حُجَّتُنَآ اٰتَيْنٰهَآ اِبْرٰهِيْمَ عَلٰي قَوْمِهٖ نَرْفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنْ نَّشَاۗءُ اِنَّ رَبَّكَ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ " اور دوسری جانب جب کواکب پرست اور بت پرست بادشاہ سے لے کر عام افراد قوم نے ان کے دلائل و براہان سے لاجواب ہو کر اپنی مادی طاقت کے گھمنڈ پر دہکتی آگ میں جھونک دیا تو اُسی خالقِ اکبر نے جس کی دعوت و ارشاد کی خدمت حضرت ابراہیمؑ انجام دے رہے تھے " كُوْنِيْ بَرْدًا وَّسَلٰمًا " کہہ کر اپنی قدرت کا وہ عظیم الشان نشان (معجزہ) عطا کیا جس نے باطل کے پُر ہیبت ایوان میں زلزلہ پیدا کر دیا اور تمام قوم اس خدائی مظاہرہ سے عاجز، حیران و پریشان اور ذلیل و خاسر ہو کر رہ گئی " وَاَرَادُوْا بِهٖ كَيْدًا فَجَعَلْنٰهُمُ الْاَخْسَرِيْنَ "

اور حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کے زمانہ میں سحر (Magic) مصری علوم و فنون میں بہت زیادہ نمایاں اور امتیازی شان رکھتا تھا اور مصریوں کو فنِ سحر میں کمال حاصل تھا اس لئے حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کو قانونِ ہدایت (توراۃ) کے ساتھ ساتھ " یدِ بیضا " اور " عصا " جیسے معجزات دیئے گئے اور حضرت موسیٰؑ نے ساحرینِ مصر کے مقابلہ میں جب اُن کا مظاہرہ کیا تو سحر کے تمام اربابِ کمال اُس کو دیکھ کر یک زبان ہو کر پکار اُٹھے کہ بلاشبہ یہ سحر نہیں یہ تو اُس سے جدا اور انسانی طاقت سے بالاتر مظاہرہ ہے جو خدائے برحق نے اپنے سچے پیغمبروں کی تائید کے لئے اُن کے ہاتھ پر کرایا ہے کیونکہ ہم سحر کی حقیقت سے بخوبی واقف ہیں اور یہ کہہ کر انھوں نے فرعون اور قوم فرعون کے سامنے بے خوفی کے ساتھ اعلان کر دیا کہ وہ آج سے موسیٰ اور ہارون کے خدائے واحد ہی کے پرستار ہیں " فَاُلْقِيَ السَّحَرَةُ سٰجِدِيْنَ قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ رَبِّ مُوْسٰى وَهٰرُوْنَ " مگر فرعون اور امراءِ دربار اپنی بدبختی سے

یہی کہتے رہے" قَالَ لِلْمَلَاِ حَوْلَهٗۤ اِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ عَلِیْمٌ" "فَلَمَّا جَآءَهُمْ مُّوْسٰى بِاٰیٰتِنَا بَیِّنٰتٍ قَالُوْا مَا هٰذَاۤ اِلَّا سِحْرٌ مُّفْتَرًى وَّ مَا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِیْۤ اٰبَآىٕنَا الْاَوَّلِیْنَ"

اسی طرح حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کے زمانہ میں علمِ طب (Medical Science) اور علم الطبیعات (Physics) کا بہت چرچا تھا اور یونان کے اطبار و حکمار (فلاسفر) کی طب و حکمت گرد و پیش کے ممالک و امصار کے اربابِ کمال پر بہت زیادہ اثر انداز تھی اور ملکوں میں صدیوں سے بڑے بڑے طبیب اور فلسفی اپنی حکمت و دانش اور کمالاتِ طب کا مظاہرہ کر رہے تھے مگر خدائے واحد کی توحید اور دینِ حق کی تعلیم سے خواص و عوام یکسر محروم تھے اور خود بنی اسرائیل بھی جو کہ نبیوں کی نسل میں ہونے پر ہمیشہ فخر کرتے رہتے تھے جن گمراہیوں میں مبتلا تھے سطورِ گذشتہ میں اُن پر روشنی پڑ چکی ہے۔

پس ان حالات میں "سنۃ اللہ" نے جب حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کو رشد و ہدایت کے لئے منتخب کیا تو ایک جانب اُن کو حجۃ و برہان (انجیل) اور حکمت سے نوازا تو دوسری جانب زمانہ کے مخصوص حالات کے مناسب چند ایسے نشان (معجزات) بھی عطا فرمائے جو اس زمانہ کے اربابِ کمال اور اُن کے پیرووں پر اس طرح اثر انداز ہوں کہ جویائے حق کو اس اعتراف میں کوئی جھجک باقی نہ رہے کہ بلاشبہ یہ اعمال اکتسابی علوم سے جُدا محض خدائے تعالیٰ کی جانب سے رسولِ برحق کی تائید میں رونما ہوئے ہیں اور متعصب و متمرد کے پاس اس کے علاوہ اور کوئی چارہ کار نہ رہے کہ اُن کو "صریح جادو" کہہ کر اپنے بغض و حسد کی آگ کو اور مشتعل کرے۔

عیسیٰ (علیہ السلام) کے اُن معجزات میں سے جن کا مظاہرہ انھوں نے قوم کے سامنے کیا قرآن عزیز نے "چار معجزات" کا بصراحت ذکر کیا ہے۔ (۱) وہ خدا کے حکم سے مردہ کو

زندہ (۲) اور پیدائشی نابینا کو بینا اور جذامی کو چنگا کر دیا کرتے تھے (۳) وہ مٹی سے پرند بنا کر اس میں پھونک دیتے تھے اور خدا کے حکم سے اس میں روح پڑ جاتی تھی۔ (۴) وہ یہ بھی بتا دیا کرتے تھے کہ کس نے کیا کھایا اور خرچ کیا اور کیا گھر میں ذخیرہ محفوظ رکھا ہے؟

قوموں میں ایسے مسیحا موجود تھے جن کے علاج و معالجے اور اکتسابی تدابیر سے مایوس مریض شفا پاتے تھے، ان میں ماہرِ طبیعات ایسے فلسفی بھی کم نہ تھے جو روح و مادہ کے حقائق اور ارضی و سماوی اشیاء کی ماہیات پر بے نظیر نظریات و تجربیات کے مالک سمجھے جاتے تھے اور حقائقِ اشیاء ان کی باریک بینی اور مہارت اربابِ کمال کے لئے باعثِ صد نازش تھی لیکن جب اُن کے سامنے عیسیٰ (علیہ السلام) نے اسباب و وسائل اختیار کئے بغیر ان امور کا مظاہرہ کیا تو اُن پر بھی ہدایت و ضلالت کی قدرتی تقسیم کے مطابق یہی اثر پڑا کہ جس شخص کے قلب میں حق کی طلب موجزن تھی اُس نے اقرار کیا کہ بلاشبہ اس قسم کا مظاہرہ انسانی دسترس سے باہر اور نبیِ برحق کی تائید و تصدیق کے لئے منجانب اللہ ہے اور جن دلوں میں رعونت، حسد اور بغض و عناد تھا اُن کے تعصب نے وہی کہنے پر مجبور کیا جو اُن کے پیشرو انبیاء و رسل سے کہتے آئے تھے "اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِیْنٌ"

چوتھے معجزے کے بارے میں بعض مفسرین کہتے ہیں کہ اس کے مظاہرہ کی وجہ یہ پیش آئی کہ مخالفین جب اُن کی دعوتِ رشد و ہدایت سے نفور ہو کر اُن کو جھٹلاتے اور اُن کے پیش کردہ آیاتِ بینات (معجزات) کو سحر اور جادو کہتے تو ساتھ ہی ازرہِ تمسخر یہ بھی کہہ دیا کرتے تھے کہ اگر تم خدائے تعالیٰ کے ایسے مقبول بندے ہو تو بتاؤ آج ہم نے کیا کھایا ہے اور کیا بچا رکھا ہے تب عیسیٰ (علیہ السلام) اُن کے تمسخر کو سنجیدگی سے بدل دیتے اور وحیِ الٰہی کی نصرت سے اُن کے سوال کا جواب دے دیا کرتے تھے[1]

[1] البدایہ والنہایہ ج ۲ ص ۸۲۔

مگر قرآنِ حکیم نے اس معجزہ کو جس انداز میں بیان کیا ہے اُس کو غور کے ساتھ مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس "نشان" کے مظاہرہ کی وجہ مفسرین کے بیان کردہ توجیہ سے زیادہ دقیق اور وسیع معلوم ہوتی ہے اور وہ یہ کہ عیسیٰ (علیہ السلام) پیغام ہدایت و تبلیغِ حق کی خدمت انجام دیتے ہوئے اکثر و بیشتر لوگوں کو دنیا میں انہماک، دولت و ثروت کے لالچ، اور عیش پسند زندگی کی رغبت سے باز رکھنے پر مختلف اسالیبِ بیان کے ذریعہ توجہ دلایا کرتے تھے تو جس طرح بعض سعید روحیں اس کلمۂ حق کے سامنے سرِ تسلیم خم کردیتی تھیں اس کے برعکس شریر النفس انسان اُن کے مواعظِ حسنہ سے قلبی نفرت و اعراض کے باوجود امتثالِ امر کرنے والی ہستیوں سے زیادہ اُن کو یہ باور کراتیں کہ ہم تو ہمہ وقت آپ کے اس ارشاد کی تعمیل میں سرگرم رہتے ہیں لہٰذا قدرتِ حق نے یہ فیصلہ کیا کہ ان منافقین کی منافقت کی مضرت کو زائل کرنے کے لئے حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کو ایسا "نشان" عطا کیا جائے کہ اس ذریعہ سے حق و باطل منکشف ہوجائے اور حقوق اللہ اور حقوقِ انسانی کے اتلاف پر جو ذخیرہ اندوزی کا سامان کیا جا رہا ہے اُس کا پردہ چاک کردیا جائے۔

ان چہارگانہ خدائی نشان (معجزات) کے علاوہ خود حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بغیر باپ کے پیدائش بھی ایک عظیم الشان "خدائی نشان" تھا جس کے متعلق ابھی تفصیلات سُن چکے ہو۔

حضرت مسیح (علیہ السلام) کے ہاتھ پر جن معجزات کا ظہور ہوا یا اُن کی ولادت جس معجزانہ طریق پر ہوئی، یہود نے ازرہِ حسد اُن کا انکار کیا تو کیا لیکن بعض فطرت پرست مدعیِ اسلام حضرات نے بھی اُن کے انکار کے لئے راہ پیدا کرنے کی ناکام سعی فرمائی ہے، اُن میں سے بعض حضرات وہ ہیں جنھوں نے اس انکار کو ذاتی مفاد کے لئے نہیں بلکہ فطرت پرست اور

منکرینِ خدا یورپین علماءِ جدید سے مرعوبیت کی بنا پر یہ روش اختیار کی ہے تاکہ اُن کی مذہبیت پر عجائب پرستی کا الزام عائد نہ ہوسکے، ان میں سرسید اور مولوی چراغ علی صاحب خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں اور بعض وہ یہود صفت اشخاص ہیں جو اپنی ذاتی غرض اور ناپاک مقصد کی خاطر از رہِ حسد و بغض حضرت مسیح کے ان معجزات کا نہ صرف انکار کرتے ہیں بلکہ تاویلاتِ باطل کے پردہ میں اُن کا مضحکہ اُڑاتے ہیں، ان میں سے متنبی کاذب مرزا کادیانی اور مسٹر محمد علی لاہوری خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔

کادیانی اور لاہوری نے تو یہ ظلم کیا ہے کہ حضرت مسیحؑ کے معجزہ "اَنِّیْٓ اَخْلُقُ لَکُمْ مِّنَ الطِّیْنِ کَھَیْئَۃِ الطَّیْرِ فَاَنْفُخُ فِیْہِ فَیَکُوْنُ طَیْرًا بِاِذْنِ اللّٰہِ" کے متعلق یہ کہہ دیا کہ مسیح کا یہ عمل ایک تالاب کی مٹی کا رہینِ منت تھا، معجزہ کچھ نہیں تھا، اس تالاب کی مٹی کی یہ خاصیت تھی کہ جس کسی پرند کی شکل بنائی جاتی اور مُنہ سے دم تک سوراخ رکھ دیا جاتا تو ہوا بھر جانے سے اس میں آواز بھی پیدا ہو جاتی تھی اور حرکت بھی گویا العیاذ باللہ ان بدبختوں کے نزدیک حضرت مسیحؑ کی جانب سے منکروں کے مقابلہ میں یہ معجزانہ صداقت نہیں تھی بلکہ مداری یا شعبدہ باز کا تماشہ تھا۔

اسی طرح احیاءِ موتیٰ (مردہ کو زندہ کر دینا) کے معجزہ کا بھی انکار کرتے ہوئے یہ دعویٰ کیا ہے کہ قرآنِ عزیز نے یہ فیصلہ سنا دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ موت کے بعد کسی کو اس دنیا میں قبل از قیامت زندگی نہیں بخشے گا، لیکن لطف یہ ہے کہ اگر پورے قرآن کو از اول تا آخر پڑھ جائیے تو کسی ایک آیت میں بھی آپ کو یہ فیصلہ نہیں ملے گا بلکہ اس دعویٰ کے خلاف متعدد مقامات پر اس کا اثبات پائے گا کہ اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں موت دینے کے بعد حیاتِ تازہ بخشی ہے، مثلاً سورۂ بقرہ کی آیات ذبح بقرہ کے واقعہ میں ارشاد ہے۔

"فقلنا اضربوه ببعضها کذٰلک یحیی اللّٰہ الموتیٰ[۱]" یا سورۂ بقرہ ہی کی اس آیت میں ارشاد ہوتا ہے "فاماتہ اللّٰہ مائۃ عام ثم بعثہ قال کم لبثت قال لبثت یوما او بعض یوم، قال بل لبثت مائۃ عام[۲]" (الآیہ) یا اسی سورہ میں تیسری جگہ مذکور ہے وَاِذْ قَالَ اِبْرٰھِیْمُ رَبِّ اَرِنِیْ کَیْفَ تُحْیِ الْمَوْتٰی قَالَ اَوَلَمْ تُؤْمِنْ قَالَ بَلٰی وَلٰکِنْ لِّیَطْمَئِنَّ قَلْبِیْ، قَالَ فَخُذْ اَرْبَعَۃً مِّنَ الطَّیْرِ فَصُرْھُنَّ اِلَیْکَ ثُمَّ اجْعَلْ عَلٰی کُلِّ جَبَلٍ مِّنْھُنَّ جُزْءًا ثُمَّ ادْعُھُنَّ یَاْتِیْنَکَ سَعْیًا[۳]۔ چنانچہ ان تمام واقعات میں "احیاءِ موتیٰ" کے صاف اور صریح معانی ثابت ہیں اور جن حضرات نے ان مقامات میں احیاءِ موتیٰ سے مجازی یا کنائی معنی لئے ہیں اُن کو طرح طرح کی تاویلات کی پناہ لینی پڑی ہے مگر ان کی تاویلات سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ احیاءِ موتیٰ کی یہ تاویل اس وجہ سے نہیں کر رہے ہیں کہ قرآن کے نزدیک اس کا دنیا میں وقوع ممنوع ہے بلکہ وہ کہتے ہیں کہ آیاتِ مسطورہ بالا کے سیاق و سباق کے پیشِ نظر یہی معنی مناسب حال ہیں۔

غرض یہ دعویٰ کہ قرآن ممنوع قرار دیتا ہے کہ دارِ دنیا میں "احیاءِ موتیٰ" وقوع پذیر ہو صرف مرزا قادیانی اور مسٹر لاہوری کے دماغ کی اُپج ہے جو قطعاً باطل اور غیر ثابت ہے اور اُس کی پشت پر کوئی دلیل نہیں ہے، رہا یہ امر کہ خدا کے عام قانونِ فطرت کے ماتحت ایسا نہیں پیش آتا رہتا سو اگر ایسا ہوتا رہتا تو پھر "یہ معجزہ" ہرگز نہ کہلاتا اور خدائے برتر کا قانونِ خاص جو تصدیق انبیاء علیہم السلام کے مقصد سے کبھی کبھی مخالفین کے مقابلہ میں بہ طور تحدی (چیلنج) کے پیش آتا رہا ہے کوئی خصوصیت نہ رکھتا۔

---

[۱] حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واقعات میں بحث گذر چکی ہے۔ ملاحظہ ہو قصص القرآن ج ۲
[۲] ایضاً
[۳] قصص القرآن جلد اول میں بحث گذر چکی۔

اسی طرح حضرتِ مسیحؑ کی بن باپ پیدائش کے مسئلہ کا بھی انکار کیا گیا ہے اور قادیانی اور لاہوری نے بھی اس کے خلاف بے دلیل ہرزہ سرائی کی ہے لیکن اس مسئلہ کی موافق و مخالف آرار سے قطع نظر ایک غیر جانبدار منصف جب حضرت مسیحؑ کی پیدائش سے متعلق تمام آیاتِ قرآنی کا مطالعہ کرے تو اس پر یہ حقیقت بخوبی آشکارا ہو جائیگی کہ قرآن حضرت مسیحؑ سے متعلق یہود کی تفریط اور نصارٰی کی افراط دونوں کے خلاف اپنا وہ فرضِ منصبی ادا کرنا چاہتا ہے جس کے لئے قرآن کی دعوتِ حق کا ظہور ہوا ہے، یہود اور نصارٰی اس بارہ میں دو قطعاً مخالف اور متضاد سمتوں میں چلے گئے ہیں، یہود کہتے ہیں کہ حضرتِ مسیح علیہ السلام مفتری اور کاذب اور شعبدہ باز تھے اور نصارٰی کہتے ہیں کہ وہ خدا، خدا کے بیٹے یا ثالث ثلثہ تھے، ان حالات میں قرآن نے ان اوہام و ظنون کے خلاف علم و یقین کی راہ دکھاتے ہوئے دونوں کے خلاف یہ فیصلہ دیا کہ راہِ حق افراط اور تفریط کے درمیان ہے اور صراطِ مستقیم کی یہی سب سے بڑی شناخت ہے۔

وہ کہتا ہے واضح رہے کہ حضرت مسیح مفتری اور کاذب نہیں تھے بلکہ خدا کے سچے پیغمبر اور راہِ حق کے داعی صادق تھے، انھوں نے دعوتِ حق کی تصدیق کے لئے جو بعض عجیب باتیں کر دکھائیں وہ معجزاتِ انبیار کی فہرست میں شامل ہیں نہ کہ ساحروں اور شعبدہ بازوں کی اور یہ بھی صحیح ہے کہ ان کی پیدائش بغیر باپ کے ہوئی مگر اس سے یہ کیسے لازم آسکتا ہے کہ وہ خدا یا خدا کے بیٹے ہو گئے، کیا جو شخص پیدائش کا محتاج ہو اور پیدائش میں بھی ماں کے پیٹ کا محتاج اور جو شخص بشری لوازم کھانے پینے کا محتاج ہو وہ عبد اور بشر کے ماسوا خدا یا معبود ہو سکتا ہے؟ نہیں ہرگز نہیں۔

یہاں اس حقیقت کو فراموش نہیں کرنا چاہئے کہ نصارٰی نے حضرت مسیح علیہ السلام

کے متعلق الوہیت کا جو عقیدہ قائم کیا تھا اس کا بہت بڑا سہارا یہی واقعہ تھا جیسا کہ وفدِ نجران اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی باہمی گفتگو سے ظاہر ہوتا ہے۔

تو جبکہ قرآن نے یہود و نصاریٰ کے اُن تمام باطل عقائد کی واضح الفاظ میں تردید کر کے جو اُنھوں نے حضرت مسیحؑ کے متعلق قائم کر لئے تھے اپنا فریضۂ اصلاح انجام دیا، یہ کیسے ممکن تھا کہ اگر بن باپ کے پیدائش کا واقعہ باطل اور غیر واقعی تھا اور جو سہارا بن رہا تھا الوہیت مسیح کا، اس کے متعلق واضح طور سے قرآن تردید نہ کرتا بلکہ اس کے برعکس وہ جگہ جگہ اس واقعہ کو ٹھیک اُس طرح بیان کرتا جاتا جیسا کہ متی کی انجیل میں بیان کیا گیا ہے، اس کا فرض تھا کہ سب سے پہلے اسی پر ضرب کاری لگاتا اور صرف اس قدر کہہ کر کہ حضرت مسیحؑ کا باپ فلاں شخص تھا اُس ساری عمارت کو جڑ سے اکھاڑ پھینکتا جس پر الوہیتِ مسیحؑ کی بنیاد رکھی گئی ہے۔ مگر اس نے یہ طریقہ اختیار نہیں کیا بلکہ یہ کہا کہ یہ بات کسی طرح بھی مسیح کی الوہیت کی دلیل نہیں بن سکتی۔ "اِنَّ مَثَلَ عِیْسٰی عِنْدَ اللّٰہِ کَمَثَلِ اٰدَمَ خَلَقَہٗ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَہٗ کُنْ فَیَکُوْنَ" پس اگر بن باپ کی پیدائش مسیح کو درجۂ الوہیت دے سکتی ہے تو آدمؑ کو اُس سے زیادہ الوہیت کا حق حاصل ہے کہ وہ بن ماں باپ کے پیدا ہوا ہے۔

بہرحال جن تاویل پرستوں نے حضرت مسیح کی بن باپ پیدائش سے متعلق آیات کے جملوں کو جدا جدا کر کے غلط احتمالات پیدا کئے ہیں وہ اس لئے باطل ہیں کہ جب اس واقعہ سے متعلق آیات کو یکجا کر کے مطالبہ کیا جائے تو ایک لمحہ کے لئے بھی آیات کے معانی میں بن باپ پیدائش کے معنی کے ما سوا دوسرے کسی بھی احتمال کی گنجائش باقی نہیں رہتی مگر یہ کہ عربی زبان کے الفاظ کے معین مدلولات و اطلاقات میں تحریفِ معنوی پر بیجا جسارت کی جائے۔

نیز بقول مولانا ابوالکلام جن اصحاب نے بغیر باپ کے پیدائش سے متعلق آیات میں تاویلِ باطل کی ہے اُن کی دلیل کا مدار صرف اس بات پر ہے کہ حضرت مریم کا نکاح اگرچہ یوسف سے ہو چکا تھا مگر رخصتی عمل میں نہیں آئی تھی، ایسی صورت میں میاں بیوی کے درمیان مقاربت گو شریعتِ موسوی کے خلاف نہیں تھی تاہم وقت کے رسم ورواج کے قطعاً خلاف تھی اس لئے حضرت مسیحؑ کی پیدائش لوگوں پر گراں گزری" لیکن اول تو اس واقعہ کا ثبوت ہی موجود نہیں سب بے سند بات ہے دوسرے یہودیوں نے حضرت مریمؑ پر جو بہتان لگایا تھا" انسائیکلوپیڈیا آف بائیبل" میں تصریح ہے کہ اس بہتان کی نسبت ایک شخص پینتھر اٹالی کی جانب کی تھی نہ کہ یوسف نجار کی جانب، اس لئے تاویل کی یہ بنیاد ہی از سر تا پا غلط اور بے اصل ہے[1]۔

علاوہ ازیں جہاں تک اس مسئلہ کا عقلی پہلو ہے سو عقل بھی اس کے امکان کو ممنوع اور محال قرار نہیں دیتی بلکہ اس کو ممکن الوقوع تسلیم کرتی ہے، کیا سائنس کی موجودہ دنیا سے آشنا حضرات اس حقیقت سے ناواقف ہیں کہ آج جبکہ سائنس کی جدید تحقیق نے نظریوں سے آگے قدم بڑھا کر مشاہدہ اور تجربہ سے یہ ثابت کر دیا کہ دوسرے حیوانات کی طرح انسان کی خلقت و پیدائش بھی بیضہ سے ہوتی ہے اور اس کو اصطلاح میں خلیۂ[2] تخم کہتے ہیں، یہ خلیہ مرد اور عورت دونوں میں ہوتا ہے اور حمل قرار پا جانے کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ مرد کے خلیاتِ تخم عورت کے بیضہ میں داخل ہو جاتے ہیں، یہی خلیہ زندگی اور حیات کا تخم ہے اور قدرتِ حق نے اس کو بہت باریک جثہ عطا فرمایا ہے[3]۔ تو اس تحقیق نے امریکہ اور

---

[1] ترجمان القرآن ج ۲ [2] خلیہ کو انگریزی میں (Call) کہتے ہیں۔

[3] اس کا قطر انچ کا $\frac{1}{500}$ ہوتا ہے۔

انگلینڈ کے سائنسدانوں کو اس جانب متوجہ کر دیا ہے کہ کیوں وہ ایک ایسی کوشش نہ کریں کہ بغیر مرد کی مقاربت کے جنسِ رجال کے خلیاتِ تخم کو آلات کے ذریعہ جنسِ اناث کے بیض میں داخل کر کے "وجودِ انسانی" حاصل کرنے میں کامیاب ہوں۔ سائنس والوں کا یہ تخیل ابھی عملی حیثیت سے کتنا ہی دور ہو لیکن اس سے یہ نتیجہ ضرور پیدا ہوتا ہے کہ عقل یہ ممکن سمجھتی ہے کہ انسانی پیدائش، آنکھوں دیکھے عام طریقِ ولادت کے علاوہ بعض دوسرے طریقوں سے بھی ہو سکتی ہے اور اُن کو قانونِ قدرت کے خلاف اس لئے نہیں کہا جا سکتا کہ ہم نے قدرت کے تمام قوانین کا احاطہ نہیں کر لیا ہے بلکہ انسان جس قدر علم و دانش کی جانب بڑھتا جاتا ہے اس کے سامنے قدرتِ حق کے قانون کے نئے نئے گوشے کھلتے جاتے ہیں۔

بس اگر یہ صحیح ہے کہ جو بات کل ناممکن نظر آتی تھی آج وہ ممکن کہی جا رہی ہو اور جلد یا بہ دیر اس کے وقوع پر یقین کیا جا رہا ہے تو نہیں معلوم پھر اُس قانونِ قدرت سے انکار کر دینے کے کیا معنی ہیں جس کا علم اگرچہ ابھی تک ہم کو حاصل نہیں ہے مگر انبیاء و رسل جیسی قدسی صفات ہستیوں پر اُس علم کی حقیقت آشکارا ہے تو کیا علمی دلیل کا یہ بھی کوئی پہلو ہے کہ جس بات کا ہم کو علم نہ ہو اور عقل اس کو ناممکن اور محال نہ ثابت کرتی ہو اس کا انکار صرف "عدمِ علم" کی وجہ سے کر دیا جائے۔ خصوصاً جب یہ انکار ایک مدعیِ مسیحیت و نبوت کی جانب سے ہو تو اُس کے لئے تو یہی کہا جا سکتا ہے۔

اب ان "آیات بینات" کو قرآن حکیم سے سنئے اور موعظت و عبرت کے حصول کا سر و سامان کیجئے کہ ماضی کے ان واقعات کی تذکیر سے قرآن کا یہی عظیم مقصد ہے۔

وَيُعَلِّمُهُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرٰىةَ	اور خدا سکھاتا ہے اس (عیسیٰ) کو کتاب، حکمت، توراۃ
وَالْاِنْجِيْلَ وَرَسُوْلًا اِلٰى بَنِيْٓ	اور انجیل، اور وہ رسول ہے بنی اسرائیل کی جانب

إِسْرَائِيلَ أَنِّي قَدْ جِئْتُكُم بِآيَةٍ
مِّن رَّبِّكُمْ أَنِّي أَخْلُقُ لَكُم مِّنَ
الطِّينِ كَهَيْئَةِ الطَّيْرِ فَأَنفُخُ فِيهِ
فَيَكُونُ طَيْرًا بِإِذْنِ اللَّهِ وَ
أُبْرِئُ الْأَكْمَهَ وَالْأَبْرَصَ وَأُحْيِي
الْمَوْتَىٰ بِإِذْنِ اللَّهِ وَأُنَبِّئُكُم
بِمَا تَأْكُلُونَ وَمَا تَدَّخِرُونَ فِي
بُيُوتِكُمْ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَةً
لَّكُمْ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ ۝ وَ
مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ
التَّوْرَاةِ وَلِأُحِلَّ لَكُم بَعْضَ
الَّذِي حُرِّمَ عَلَيْكُمْ وَجِئْتُكُم
بِآيَةٍ مِّن رَّبِّكُمْ فَاتَّقُوا اللَّهَ
وَأَطِيعُونِ ۝ إِنَّ اللَّهَ رَبِّي
وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوهُ هَٰذَا
صِرَاطٌ مُّسْتَقِيمٌ ۝

(آل عمران)

وَإِذْ تَخْلُقُ مِنَ الطِّينِ
كَهَيْئَةِ الطَّيْرِ بِإِذْنِي

(وہ کہتا ہے) کہ بیشک میں تمہارے پاس تمہارے پروردگار
کی جانب سے "نشان" لے کر آیا ہوں، وہ یہ کہ میں
تمہارے لئے مٹی سے پرند کی شکل بناتا پھر اس میں
پھونک دیتا ہوں اور وہ خدا کے حکم سے زندہ پرند
بن جاتا ہے اور پیدائشی اندھے کو سوانکھا کر دیتا اور
سپید داغ کے جذام کو اچھا کر دیتا ہوں اور خدا
کے حکم سے مردہ کو زندہ کر دیتا ہوں اور تم کو بتا دیتا
ہوں جو تم کھا کر آتے ہو اور جو تم گھر میں ذخیرہ رکھ آتے ہو
سو اگر تم حقیقی ایمان رکھتے ہو تو بلاشبہ ان امور میں (میری
صداقت اور منجانب اللہ ہونے کے لئے) "نشان" ہے
اور میں تورات کی تصدیق کرنے والا ہوں جو میرے
سامنے ہے اور (اس لئے بھیجا گیا ہوں) تاکہ بعض ان
چیزوں کو جو تم پر حرام ہو گئی ہیں تمہارے لئے حلال کر دوں
تمہارے لئے پروردگار ہی کے پاس سے "نشان" لایا ہوں
پس تم اللہ سے ڈرو اور (اس کے دیئے ہوئے احکام میں)
میری اطاعت کرو۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ ہی میرا اور تمہارا
پروردگار ہے سو اس کی عبادت کرو یہی سیدھی راہ ہے
اور اے عیسیٰ بن مریم! تو میری اس نعمت کو یاد کر)
جبکہ تو میرے حکم سے گارے سے پرند کی شکل بنا دیتا

فَتَنْفُخُ فِيهَا فَتَكُونُ طَيْرًا	اور پھر اُس میں پھونک دیتا تھا اور وہ میرے حکم سے
بِإِذْنِي وَتُبْرِئُ الْأَكْمَهَ	زندہ پرند بن جاتا تھا اور جبکہ تو میرے حکم سے پیدائشی
وَالْأَبْرَصَ بِإِذْنِي وَإِذْ	اندھے کو سوانکھا اور سپید داغ کے کوڑھ کو اچھا
تُخْرِجُ الْمَوْتَىٰ بِإِذْنِي۔	کر دیتا تھا اور جبکہ تو میرے حکم سے مردہ کو زندہ کرکے
(مائدہ)	قبر سے نکالتا تھا۔
فَلَمَّا جَاءَهُمْ بِالْبَيِّنَاتِ	پھر جب وہ (عیسیٰ علیہ السلام) اُن کے پاس کھلے
قَالُوا هَٰذَا سِحْرٌ مُبِينٌ۔	نشان لے کر آیا تو انھوں نے (بنی اسرائیل نے)
(الصف)	کہا "یہ تو کھلا ہوا جادو ہے"۔

انبیاء (علیہم السلام) نے جب کبھی بھی قوموں کے سامنے آیات اللہ کا مظاہرہ کیا ہے تو منکروں نے ہمیشہ ان کے متعلق ایک بات ضرور کہی ہے "یہ تو کھلا ہوا جادو ہے"، پس کیا ایک جویائے حق اور غیر متعصب انسان کے لئے یہ جواب اس جانب رہنمائی نہیں کرتا کہ انبیا علیہم السلام کے اس قسم کے مظاہرے ضرور عام قوانین قدرت سے جُدا ایسے علم کے ذریعہ ظہور پذیر ہوتے تھے جو صرف ان قدسی صفات ہستیوں کے لئے ہی مخصوص رہا ہے اور اُن کے علاوہ انسانی دنیا اُس کے فہم حقیقت سے بہرہ مند نہیں ہوئی تب ہی اُن لوگوں کے پاس "جو از رہ عناد و ضد انکار پر تلے ہوئے تھے" اس کے انکار کے لئے اس سے بہتر دوسری تعبیر نہیں تھی کہ وہ ان امور کو "سحر و جادو" کہہ دیں۔ لہذا ان امور کو سحر و جادو کہنا بھی ان کے "معجزہ" اور "نشانِ خداوندی" ہونے کی زبردست دلیل ہے۔

حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) اور ان کی تعلیمات کا خلاصہ

بہرحال حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) بنی اسرائیل کو حجۃ و برہان اور آیات اللہ کے ذریعہ دینِ حق کی تعلیم دیتے رہتے اور ان کے بھولے ہوئے

سبق کو یاد دلا کر مردہ قلوب میں حیاتِ تازہ بخشتے رہتے تھے۔

خدا اور خدا کی توحید پر ایمان، انبیاء و رسل (علیہم السلام) کی تصدیق، آخرت (معاد) پر ایمان، ملائکۃ اللہ پر ایمان، قضاء و قدر پر ایمان، خدا کے رسولوں اور کتابوں پر ایمان، اخلاقِ حسنہ کے اختیار، اعمالِ سیئہ سے پرہیز و اجتناب، عبادتِ الٰہی سے رغبت، دنیا میں انہماک سے نفرت اور خدا کے کنبہ (مخلوقِ خدا) سے محبت و مودت یہی وہ تعلیم و تلقین تھی جو اُن کی زندگی کا مشغلہ اور فرضِ منصبی بنا ہوا تھا وہ بنی اسرائیل کو توراۃ، انجیل اور حکیمانہ پند و نصائح کے ذریعہ ان امور کی جانب دعوت دیتے مگر بدبخت یہود اپنی فطرتِ کج، صدیوں کی مسلسل سرکشی اور تعلیمِ الٰہی سے بغاوت کی بدولت اس درجہ متشدد ہو گئے تھے اور انبیاء و رسل کے قتل نے اُن کے قلوب کو حق و صداقت کے قبول میں اس درجہ سخت بنا دیا تھا کہ ایک مختصر سی جماعت کے علاوہ اُن کی جماعت کی بڑی اکثریت نے اُن کی مخالفت اور اُن کے ساتھ حسد و بغض کو اپنا شعار اور اپنی جماعتی زندگی کا معیار بنا لیا اور اس لئے انبیا کی سنتِ راشدہ کے مطابق رشد و ہدایت کے حلقہ بگوشوں میں دنیوی جاہ و جلال کے لحاظ سے کمزور و ناتواں اور زیردست پیشہ ور طبقہ کی اکثریت نظر آتی تھی، ضعفاء کا یہ طبقہ اگر اخلاص و دیانت کے ساتھ حق کی آواز پر لبیک کہتا تو بنی اسرائیل کا وہ سرکش و مغرور حلقہ اُن پر اور خدا کے پیغمبر پر پھبتیاں کستا، توہین و تذلیل کا مظاہرہ کرتا اور اپنی عملی جد و جہد کا بڑا حصہ معاندت و مخالفت میں صرف کرتا رہتا تھا۔

وَلَمَّا جَآءَ عِیْسٰی بِالْبَیِّنٰتِ	اور جب عیسیٰؑ ظاہر دلائل لے کر آئے تو کہا: بلاشبہ
قَالَ قَدْ جِئْتُکُمْ بِالْحِکْمَۃِ	میں تمہارے پاس "حکمت" لے کر آیا ہوں اور اس لئے
وَلِاُبَیِّنَ لَکُمْ بَعْضَ الَّذِیْ	آیا ہوں تا کہ ان بعض باتوں کو واضح کر دوں،

تَخْتَلِفُوْنَ فِيْهِ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَ
اَطِيْعُوْنِ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ رَبِّيْ وَ
رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ هٰذَا صِرَاطٌ
مُّسْتَقِيْمٌ ۔ فَاخْتَلَفَ الْاَحْزَابُ
مِنْۢ بَيْنِهِمْ فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا
مِنْ عَذَابِ يَوْمٍ اَلِيْمٍ (زخرف)

جن کے متعلق تم آپس میں جھگڑ رہے ہو، پس اللہ
سے ڈرو اور میری اطاعت کرو بیشک اللہ تعالیٰ
ہی میرا اور تمہارا پروردگار ہے سو اُس کی پرستش کرو
یہی سیدھی راہ ہے" پھر وہ آپس میں گروہ بندی کرنے
لگے سو اُن لوگوں کے لئے دردناک عذاب کے
ذریعہ ہلاکت اور خرابی ہے۔

وَاِذْ قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ
يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ
اِلَيْكُمْ مُّصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ
مِنَ التَّوْرٰةِ وَمُبَشِّرًاۢ بِرَسُوْلٍ
يَّاْتِيْ مِنْۢ بَعْدِي اسْمُهٗٓ اَحْمَدُ
فَلَمَّا جَآءَهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ قَالُوْا
هٰذَا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ (الصف)

اور (وہ وقت یاد کرو) جب عیسیٰ بن مریم نے کہا "اے
بنی اسرائیل! بلاشبہ میں تمہاری جانب اللہ کا پیغمبر
ہوں، تصدیق کرنے والا ہوں توراۃ کی جو میرے سامنے
ہے اور بشارت دینے والا ہوں ایک رسول کی جو
میرے بعد آئے گا نام اس کا احمد ہے" پس جب
(عیسیٰ علیہ السلام) آیا اُن کے پاس معجزات لیکر تو وہ
(بنی اسرائیل) کہنے لگے یہ تو کھلا ہوا جادو ہے۔

فَلَمَّآ اَحَسَّ عِيْسٰى مِنْهُمُ الْكُفْرَ
قَالَ مَنْ اَنْصَارِيْٓ اِلَى اللّٰهِ ط
قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ
اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَاشْهَدْ بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ
رَبَّنَآ اٰمَنَّا بِمَآ اَنْزَلْتَ وَاتَّبَعْنَا الرَّسُوْلَ
فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ (آل عمران)

پھر جب عیسیٰ نے اُن (بنی اسرائیل) سے کفر محسوس
کیا تو کہا" اللہ کی جانب میرا کون مددگار ہے"؟
حواریوں نے جواب دیا "ہم ہیں اللہ کے (دین کے)
مددگار، ہم اللہ پر ایمان لے آئے اور تم گواہ رہنا کہ ہم
مسلمان ہیں، اے ہمارے پروردگار جو تو نے اتارا ہے
ہم اس پر ایمان لے آئے اور ہم نے رسول کی پیروی اختیار

حواری عیسیٰ علیہ السلام | مگر عیسیٰ (علیہ السلام) معاندین ومخالفین کی دراندازیوں اور ہرزہ سرائیوں
کے باوجود اپنے فرضِ منصبی "دعوۃ الی الحق" میں سرگرم عمل رہتے اور روز و شب
بنی اسرائیل کی آبادیوں اور بستیوں میں پیغامِ حق سناتے اور روشن دلائل اور واضح
آیات اللہ کے ذریعہ لوگوں کو قبولِ حق وصداقت پر آمادہ کرتے رہتے تھے اور خدا اور
حکمِ خدا سے سرکش اور باغی انسانوں کی اس بھیڑ میں ایسی سعید روحیں بھی نکل آتی
تھیں جو عیسیٰ (علیہ السلام) کی دعوتِ حق پر لبیک کہتی اور سچائی کے ساتھ دینِ حق کو
قبول کرلیتی تھیں، ان ہی پاک نفسوں میں وہ مقدس ہستیاں بھی تھیں جو حضرت عیسیٰؑ
کے شرفِ صحبت سے فیضیاب ہو کر نہ صرف ایمان ہی لے آئی تھیں بلکہ دینِ حق کی
سربلندی اور کامیابی کے لئے انھوں نے جان ومال کی بازی لگا کر خدمتِ دین کے لئے
خود کو وقف کردیا تھا اور اکثر وبیشتر حضرت مسیح (علیہ السلام) کے ساتھ رہ کر تبلیغ ودعوت
کو سرانجام دیتی تھیں اسی خصوصیت کی وجہ سے وہ "حواری" (رفیق) اور "انصار اللہ"
(اللہ کے دین کے مددگار) کے مقدس القاب سے معزز وممتاز کی گئیں۔ چنانچہ ان بزرگ
ہستیوں نے پیغمبرِ خدا کی حیاتِ پاک کو اپنا اسوہ بنایا اور سخت سے سخت اور نازک سے نازک
حالات میں بھی ان کا ساتھ نہیں چھوڑا اور ہر طرح معاون ومددگار ثابت ہوئیں۔

وَاِذْ اَوْحَیْتُ اِلَى الْحَوَارِيّٖنَ	اور (اے عیسیٰ وہ وقت یاد کرو) جبکہ میں نے حواریوں
اَنْ اٰمِنُوْا بِیْ وَبِرَسُوْلِیْ قَالُوْٓا	کی جانب (تیری معرفت) یہ وحی کی کہ مجھ پر اور میرے
اٰمَنَّا وَاشْهَدْ بِاَنَّنَا	پیغمبر پر ایمان لاؤ تو انھوں نے جواب دیا ہم ایمان

لہ حواری: جمع: رفیق، مددگار کو کہتے ہیں اور دھوبی کو بھی، آخری معنی میں یہ مناسبت ہے کہ جس طرح دھوبی کپڑے کو سپید کردیتا ہے اسی طرح عیسیٰ علیہ السلام کے حواری دل کے میل صاف کردیا کرتے تھے۔

مُسْلِمُوْنَ۔ (مائدہ) لائے اور اے خدا! تو گواہ رہنا کہ ہم بلاشبہ مسلمان ہیں"

يَاۤ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْۤا اَنْصَارَ اللّٰهِ كَمَا قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ لِلْحَوَارِيّٖنَ مَنْ اَنْصَارِيْۤ اِلَى اللّٰهِ قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ فَاٰمَنَتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْۢ بَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ وَكَفَرَتْ طَّآئِفَةٌ فَاَيَّدْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا عَلٰى عَدُوِّهِمْ فَاَصْبَحُوْا ظٰهِرِيْنَ (الصف)

اے ایمان والو! تم اللہ کے (دین کے) مددگار ہوجاؤ جیسا کہ عیسیٰ بن مریمؑ نے جب حواریوں سے کہا "اللہ کے راستہ میں کون میرا مددگار رہے" تو حواریوں نے جواب دیا "ہم ہیں اللہ کی راہ کے مددگار" پس بنی اسرائیل کی ایک جماعت ایمان لائی اور ایک گروہ نے کفر اختیار کیا سو ہم نے مومنوں کی ان کے دشمنوں کے مقابلہ میں تائید کی پس وہ (مومن) غالب رہے۔

گذشتہ سطور میں یہ واضح ہو چکا ہے کہ عیسیٰ (علیہ السلام) کے یہ حواری بیشتر غریب اور مزدور طبقہ میں سے تھے کیونکہ انبیاء علیہم السلام کی دعوت و تبلیغ کے ساتھ "سنۃ اللہ" یہی جاری رہی ہے کہ ان کی صدائے حق پر لبیک کہنے اور دینِ حق پر جان سپاری کا مظاہرہ کرنے کے لئے اول غریب اور کمزور طبقہ ہی آگے بڑھتا ہے اور زیردست ہی فداکاری کا ثبوت دیتے ہیں اور وقت کی صاحبِ اقتدار اور زبردست ہستیاں اپنے غرور اور گھمنڈ کے ساتھ مقابلہ اور معارضہ کے لئے سامنے آتی اور معاندانہ سرگرمیوں کے ساتھ اعلاءِ کلمۃ اللہ کی راہ میں سنگِ گراں بن جاتی ہیں لیکن جب خدائے تعالیٰ کا قانونِ پاداشِ عمل اپنا کام کرتا ہے تو نتیجہ میں فلاح و کامرانی ان کمزور فدایانِ حق ہی کا حصہ ہو جاتا ہے اور متکبر و مغرور ہستیاں یا ہلاکت کے قعرِ ذلت میں جا گرتی ہیں اور یا مقہور و مغلوب ہو کر سرنگوں ہو جانے کے ماسوا کوئی چارۂ کار نہیں دیکھتیں۔

حواریِ عیسیٰ علیہ السلام اور قرآن و انجیل کا موازنہ

قرآنِ عزیز نے عیسیٰ (علیہ السلام) کے حواریوں کی منقبت بیان کی ہے، سورۂ آلِ عمران کی آیات تمہارے سامنے ہیں، حضرت مسیح (علیہ السلام) جب دینِ حق کی نصرت و یاری کے لئے پکارتے ہیں تو سب سے پہلے جنھوں نے "نحن انصار اللہ" کا نعرہ بلند کیا وہ یہی پاک ہستیاں تھیں، سورۂ صف میں اللہ رب العلمین نے جب مسلمانوں کو مخاطب کر کے "کونوا انصار اللہ" کی ترغیب دی تو "تذکیر بایام اللہ" کے پیشِ نظر ان ہی مقدس ہستیوں کا ذکر کیا اور اُن ہی کی مثال اور نظیر دے کر نصرتِ حق کے لئے برانگیختہ کیا اور سورۂ مائدہ میں اُن کے قبولِ ایمان اور دعوتِ حق کے سامنے انقیاد و تسلیم کا جو نقشہ کھینچا ہے وہ بھی اُن کے خلوص، حق طلبی اور حق کوشی کی زندۂ جاوید تصویر ہے۔ یہ سب کچھ تو اُس وقت کا حال ہے جب تک حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) اُن کے درمیان موجود ہیں لیکن آپ کے "رفع الی السماء" کے بعد بھی اُن کی پُر استقامت اور دین قویم کی فدا کارانہ خدمت کے متعلق سورۂ صف کی آیت "فَاَیَّدْنَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا عَلٰی عَدُوِّهِمْ فَاَصْبَحُوْا ظٰهِرِیْنَ" میں کافی اشارہ موجود ہے اور شاہ عبد القادر (نور اللہ مرقدہ) نے اسی بنا پر آیتِ زیرِ بحث کی تفسیر کرتے ہوئے تاریخی شہادت کا اس طرح ذکر فرمایا ہے۔

> حضرت عیسیٰ کے بعد ان کے یاروں (حواریوں) نے بڑی محنتیں کی ہیں تب اُن کا دین نشر ہوا، ہمارے حضرت کے پیچھے بھی حنیفوں نے اس سے زیادہ کیا۔

مگر اس کے برعکس بائبل (انجیل) بعض مقامات میں اگر اُن کی منقبت اور مدح سرائی میں رطب اللسان ہے تو دوسری جانب ان کو بزدل اور منافق ثابت کرتی ہے۔ انجیل یوحنا میں حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کے مشہور و معتمد علیہ حواری یہودا کے متعلق اس وقت کا حال جب حضرت یسوع (علیہ السلام) کو یہودی گرفتار کرنا چاہتے ہیں" اس طرح مذکور ہے۔

یہ باتیں کہہ کر یسوع اپنے دل میں گھبرایا اور یہ گواہی دی کہ میں تم سے سچ سچ کہتا ہوں کہ
تم میں سے ایک شخص مجھے پکڑوا دیگا، شاگرد شبہ کرکے کہ وہ کس کی نسبت کہتا ہے ایک دوسرے
کو دیکھنے لگے ...... ایک شخص جس سے یسوع محبت کرتا تھا ......
اس نے یسوع کی چھاتی کا سہارا لے کر کہا اے خداوند وہ کون ہے؟ یسوع نے جواب دیا کہ
جسے میں نوالہ ڈبو کر دیدوں گا وہی ہے پھر اُس نے نوالہ ڈبو دیا اور لے کر شمعون اسکریوتی
کے بیٹے یہوداہ کو دیدیا اور اُس نوالہ کے بعد شیطان اُس میں سما گیا۔[1]

اور انجیل متی میں اُس شمعون پطرس حواری کے متعلق "جو بقول اناجیل ساری عمر حضرت
یسوع کا پیارا اور معتمد علیہ رہا" یہ مسطور ہے۔

شمعون پطرس نے اُس سے کہا، اے خداوند تو کہاں جاتا ہے، یسوع نے جواب دیا کہ
جہاں میں جاتا ہوں اب تو میرے پیچھے نہیں آسکتا مگر بعد میں میرے پیچھے آئیگا۔ پطرس
نے اُس سے کہا اے خداوند میں اب تیرے پیچھے کیوں نہیں آسکتا، میں تو تیرے لئے اپنی جان
دوں گا۔ یسوع نے جواب دیا، کیا تو میرے لئے اپنی جان دیگا؟ میں تجھ سے سچ سچ کہتا ہوں
کہ مرغ بانگ نہ دیگا جب تک کہ تو تین بار میرا انکار نہ کرے گا۔[3]

اور اسی متی کی انجیل میں تمام شاگردوں (حواریوں) کی بزدلی اور حضرت یسوع کو
بے یار و مددگار چھوڑ کر فرار ہو جانے کا اس طرح ذکر کیا گیا ہے۔

"اس پر سارے شاگرد اُسے چھوڑ کر بھاگ گئے"۔[2]

اِن حوالجات سے تین ایسی باتیں ثابت ہوتی ہیں جن کو کسی طرح بھی عقل و نقل تسلیم
کرنے کو تیار نہیں اول یہ کہ جو شاگرد اور حواری حضرت یسوع کے زیادہ قریب، اُن کے

---

[1] باب ۱۳ آیات ۲۷-۲۱۔ [2] متی باب ۲۷ آیت ۵۶۔ [3] باب ۲۶ آیت ۵۶۔

معتمد علیہ اور اُن کی نگاہوں میں محبوب تھے وہ نتیجہ میں نہ صرف بزدل بلکہ "منافق" نکلے۔ مگر عقل و نقل کا فیصلہ یہ ہے کہ اگرچہ ہر ایک پیغمبر اور مصلح کی جماعت میں ایک چھوٹا سا گروہ منافقین کا عموماً ہوتا ہے جو اپنی دنیوی اغراض کی خاطر بہ کراہتِ قلب ظاہر داری کے طور پر شریکِ جماعت ہونا مفید سمجھتا ہے مگر ایک مصلح اور پیغمبر کے درمیان ہمیشہ سے یہ فرق رہا ہے کہ مصلح خواہ اپنی جماعت کے منافقین سے پوری طرح آگاہ نہ ہو سکے، لیکن نبی اور پیغمبر کو "وحیِ الٰہی" کے ذریعہ شروع سے ہی مخلص اور منافق کی اطلاع دیدی جاتی ہے تاکہ ایک منکر و کافر سے زیادہ جس گروہ سے جماعتِ حق اور اس کی دعوت و اصلاح کو ضرر پہنچ سکتا ہے، نبی اُس کے حالات سے غافل نہ رہے۔ پس اسی پر کوئی منافق کسی وقت اور کسی حالت میں بھی نبی اور پیغمبر کا محبوب، معتمد علیہ اور مقرب نہیں ہو سکتا؛ البتہ یہ ایک جدا امر ہے کہ نبی، دینِ حق کی مصالح کی وجہ سے اس کے ساتھ اعراض اور درگذر کا طریقِ عمل مناسب سمجھے جیسا کہ نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اپنے ایک صحابی کے اس سوال پر کہ "جب آپ منافقین کے حالاتِ منافقت سے آگاہ ہیں تو اُن کا مقابلہ کر کے کیوں اُن کو کیفرِ کردار تک نہیں پہنچا دیتے تاکہ جماعتِ مسلمین کو اُن کی منافقت سے نجات ملے" یہ جواب دیا "اس لئے کہ ان کے قبولِ ایمان کی ظاہر داری کے بعد ہمارے سخت گیر طریقہ کے متعلق غیر مسلموں کو یہ دھوکا نہ ہو کہ وہ کہہ اُٹھیں "محمد" اپنے ساتھیوں کو بھی قتل کرنے سے نہیں چوکتے"۔

دوسری بات یہ ثابت ہوتی ہے کہ یہوداہ کے اندر شیطان نے اس وقت حلول کیا جب حضرت یسوع نے اپنے ہاتھ سے اُس کو نوالہ ڈبو کر دیا، مگر یہ بات بھی اس لئے عقل و نقل کے خلاف ہے کہ بزرگوں اور مقدس انسانوں کے ہاتھوں سے جو کچھ ہوتا ہے اُس کا

اثر برکت، طہارت اور تقدیس تو ہوا کرتا ہے لیکن شیطان کا حلول اور بدی کا نفوذ نہیں ہوا کرتا، بیشک یہ درست ہے کہ جب حق کا ترازو قائم ہوتا ہے تو اُس سے کھرا اور کھوٹا دونوں کی حقیقت کا انکشاف ہو جایا کرتا ہے لیکن یہ کبھی نہیں ہوتا کہ اُس پیمانہ کے مس کرنے سے کسی کھرے میں کھوٹ پیدا ہو جائے اور انجیل کے اس بیان میں صورتِ حال پہلی نہیں بلکہ دوسری ہے۔

تیسری بات یہ کہ حضرت یسوعؑ کے تمام اُن حواریوں میں سے "جن کی مدح و ستائش میں جگہ جگہ بائبل رطب اللسان ہے" ایک، دو یا دس، پانچ نہیں سب کے سب نہایت بزدلی اور غداری کے ساتھ اس وقت حضرت مسیحؑ سے کنارہ کش ہو گئے، جب دینِ حق کی حمایت و نصرت کے لئے سب سے زیادہ اُن کی ضرورت تھی اور جبکہ پیغمبرِ خدا (علیہ الصلوٰۃ والسلام) دشمنوں کے نرغہ میں پھنسے ہوئے تھے۔

مگر انجیل کی اس شہادت کے خلاف سورۂ آلِ عمران میں قرآنِ عزیز نے یہ شہادت دی ہے کہ اس نازک وقت میں جب حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) نے اپنے حواریوں کو دینِ حق کی نصرت و یاری کے لئے پکارا تو سب نے اولوالعزمی اور فداکارانہ جذبہ کے ساتھ یہ جواب دیا "نحن انصار اللہ" اور پھر حضرت مسیح کے سامنے اپنی استقامتِ دین اور اپنے مخلصانہ ایمان کے متعلق شہادت دے کر نصرت کا پورا پورا یقین دلایا اور پھر سورۂ صف میں قرآنِ عزیز نے یہ بھی ظاہر کیا کہ ان حواریوں نے حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) سے جو کچھ کہا تھا ان کی موجودگی میں اور اُن کے بعد سچی وفاداری کے ساتھ نباہا اور بلاشبہ مومنین صادقین ثابت ہوئے اور اس لئے اللہ تعالیٰ نے بھی ان کی مدد فرمائی اور اُن کو دشمنانِ حق کے مقابلہ میں کامیاب کیا۔

انجیل اور قرآن کے اس موازنہ کو دیکھ کر ایک انصاف پسند یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا۔

کہ اس معاملہ میں "حق" قرآن کے ساتھ ہے اور علمار نصاریٰ نے انجیل میں تحریف کر کے اس قسم کے گڑھے ہوئے واقعات کا اضافہ اس لئے کیا ہے تاکہ صدیوں بعد کے خود ساختہ عقیدہ عقیدہ "صلیب مسیح" سے متعلق یہ داستان صحیح ترتیب پر قائم ہو سکے کہ جب مسیح (علیہ السلام) کو صلیب پر لٹکا یا گیا تو انھوں نے یہ کہتے کہتے جان دیدی" ایلی ایلی لما سبقتنی اے خدا! اے خدا! تو نے مجھے کیوں یکہ و تنہا چھوڑ دیا" اور کسی ایک شخص نے بھی مسیح کا ساتھ نہ دیا۔ بہر حال حواریوں سے متعلق بائبل کی یہ تصریحات محرف اور خود ساختہ داستان سرائی سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتیں۔

نزول مائدہ | مخلص اور فدا کار حواریوں کی جماعت اگرچہ صادق الایمان اور راسخ الاعتقاد تھی مگر علمی و مجلسی تکلفاتِ گفت و شنید کے لحاظ سے سادہ لوح اور ضروریاتِ زندگی کے سروسامان کے اعتبار سے غربا اور ضعفا کی جماعت تھی اس لئے انھوں نے ازراہِ سادگی و سادہ دلی حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) سے یہ درخواست کی کہ جس خدائے برتر میں یہ لامحدود طاقت ہے کہ اس کا ایک نمونہ آپ کی ذاتِ اقدس اور وہ نشان (معجزات) ہیں خدا تعالیٰ نے جن کو آپ کی تصدیق نبوت و رسالت کے لئے آپ کے ہاتھ پر ظاہر فرمایا اُس خدا میں یہ طاقت بھی ضرور ہوگی کہ وہ ہمارے لئے غیب سے ایک دستر خوان نازل کر دیا کرے تاکہ ہم روزی کمانے کی فکر سے آزاد ہو کر باطمینانِ قلب یادِ خدا اور دینِ حق کی دعوت و تبلیغ میں مصروف رہا کریں۔ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) نے یہ سُن کر ان کو نصیحت فرمائی کہ اگرچہ خدا کی طاقت بے غایت اور بے نہایت ہے لیکن کسی سچے بندہ کے لئے یہ زیبا نہیں کہ وہ اس طرح خدا کو آزمائے، پس خدا سے ڈرو اور ایسے خیالات سے بچو، یہ سُن کر حواریوں نے جواب دیا "ہم ادر خدا کو آزمائیں، حاشا ہمارا یہ مقصد نہیں ہمارا تو یہ مطلب ہے کہ رزق کی جد وجہد سے دل کو مطمئن

کرے کہ خدا کے اس عطیہ کو زندگی کا سہارا بنا لیں اور آپ کی تصدیق میں ہم کو حق الیقین کا اعتقادِ راسخ حاصل ہو جائے اور ہم اسکی خدائی پر کائناتِ انسانی کے لئے شاہدِ عدل بن جائیں"۔

حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) نے جب اُن کا بڑھتا ہوا اصرار دیکھا تو بارگاہِ الٰہی میں دعا کی "اے خدا! تو ان کے سوال کو پورا کر اور آسمان سے ایسا مائدہ (دسترخوانِ نعمت) نازل فرما کہ وہ ہمارے لئے تیرے غضب کا مظہر ثابت نہ ہو بلکہ ہمارے اول و آخر سب کے لئے خوشی کی یادگار (عید) بن جائے اور تیرا "نشان" کہلائے اور اس ذریعہ سے ہم کو اپنے غیبی رزق سے شادکام کرے کیونکہ تو ہی بہتر رزق رساں ہے" اس دعار کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے وحی نازل فرمائی: عیسیٰ! تمہاری دعار قبول ہے، میں اس کو ضرور نازل کروں گا لیکن یہ واضح رہے کہ اس کھلی نشانی نازل ہونے کے بعد اگر ان میں سے کسی نے بھی خدا کے حکم کی خلاف ورزی کی تو پھر ان کو عذاب بھی ایسا ہولناک دوں گا جو کائنات کے کسی انسان کو نہیں دیا جائے گا۔

قرآنِ عزیز نے نزولِ مائدہ کے واقعہ کا اس معجزانہ اسلوبِ بیان کے ساتھ ذکر کیا ہے۔

اِذْ قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ يٰعِيْسَى	اور (دیکھو) جب ایسا ہوا تھا کہ حواریوں نے کہا تھا اے
ابْنَ مَرْيَمَ هَلْ يَسْتَطِيْعُ رَبُّكَ	عیسیٰ بن مریم! کیا تمہارا پروردگار ایسا کر سکتا ہے کہ آسمان سے
اَنْ يُّنَزِّلَ عَلَيْنَا مَآئِدَةً مِّنَ	ہم پر ایک خوان اتار دے؟ (یعنی ہماری غذا کے لئے
السَّمَآءِ قَالَ اتَّقُوا اللّٰهَ اِنْ	آسمان سے غیبی سامان کر دے) عیسیٰ نے کہا خدا سے ڈرو
كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۞ قَالُوْا نُرِيْدُ اَنْ	(اور ایسی فرمائشیں نہ کرو) اگر تم ایمان رکھتے ہو انھوں نے
نَّاْكُلَ مِنْهَا وَتَطْمَئِنَّ قُلُوْبُنَا	کہا (مقصود اس سے قدرتِ الٰہی کا امتحان نہیں ہے) ہم
وَنَعْلَمَ اَنْ قَدْ صَدَقْتَنَا وَ	چاہتے ہیں (ہمیں غذا میسر آئے تو) اس میں سے کھائیں اور
نَكُوْنَ عَلَيْهَا مِنَ الشّٰهِدِيْنَ	ہمارے دل آرام پائیں اور ہم جان لیں کہ تو نے ہمیں

قَالَ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ اللّٰهُمَّ	سچ بتایا تھا اور اس پر ہم گواہ ہو جائیں۔ اس پر عیسیٰ بن مریمؑ
رَبَّنَا أَنْزِلْ عَلَيْنَا مَائِدَةً مِّنَ	نے دعا کی "اے اللہ! اے ہمارے پروردگار! ہم پر آسمان سے
السَّمَاءِ تَكُونُ لَنَا عِيدًا لِّأَوَّلِنَا	ایک خوان بھیج دے کہ اس کا آنا ہمارے لئے اور ہمارے اگلوں
وَآخِرِنَا وَآيَةً مِّنْكَ وَارْزُقْنَا	اور پچھلوں سب کیلئے عید قرار پائے اور تیری طرف سے
وَأَنْتَ خَيْرُ الرَّازِقِينَ ۔ قَالَ	(فضل و کرم کی) ایک نشانی ہو۔ ہمیں روزی دے تو سب سے
اللّٰهُ إِنِّي مُنَزِّلُهَا عَلَيْكُمْ فَمَنْ	بہتر روزی دینے والا ہے" اللہ نے فرمایا "میں تمہارے لئے
يَكْفُرْ بَعْدُ مِنْكُمْ فَإِنِّي أُعَذِّبُهُ	خوان بھیجوں گا، لیکن جو شخص اس کے بعد بھی (راہِ حق سے)
عَذَابًا لَّا أُعَذِّبُهُ أَحَدًا مِّنَ	انکار کریگا تو میں اسے (پاداشِ عمل میں) عذاب دونگا، ایسا
الْعَالَمِينَ ۔ (مائدہ)	عذاب کہ تمام دنیا میں کسی آدمی کو بھی ویسا عذاب نہیں دیا جائیگا۔

یہ مائدہ نازل ہوا یا نہیں؟ قرآن عزیز نے اس کے متعلق کوئی تفصیل نہیں بیان کی اور نہ کسی مرفوع حدیث میں اس کا کوئی تذکرہ پایا جاتا ہے، البتہ آثارِ صحابہ و تابعین (رضی اللہ عنہم) میں ضرور تفصیلات مذکور ہیں۔

مجاہد اور حسن بصری (رحمہم اللہ) فرماتے ہیں کہ مائدہ کا نزول نہیں ہوا، اس لئے کہ خدائے تعالیٰ نے اس کے نزول کو جس شرط کے ساتھ مشروط کر دیا طلب کرنے والوں نے یہ محسوس کرتے ہوئے کہ انسان ضعیف البنیان اور کمزوریوں کا مجسمہ ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ کسی لغزش یا معمولی خلاف ورزی کی بدولت اس دردناک عذاب کے سزاوار ٹھیریں اپنے سوال کو واپس لے لیا، علاوہ ازیں اگر مائدہ کا نزول ہوا ہوتا تو ایسا نشانِ الٰہی (معجزہ) تھا کہ نصاریٰ اس پر جس قدر بھی فخر کرتے وہ کم تھا اور ان کے یہاں اس کی جس قدر بھی شہرت ہوتی وہ بے جا نہیں ہوتی تاہم ان کے یہاں اس نزولِ مائدہ کا اس طرح کوئی

تذکرہ نہیں پایا جاتا۔ ؎۱

اور حضرت عبد اللہ بن عباس (رضی اللہ عنہما) اور حضرت عمار بن یاسر (رضی اللہ عنہ) سے منقول ہے کہ یہ واقعہ پیش آیا اور مائدہ کا نزول ہوا، جمہور کا رجحان اسی جانب ہے البتہ اس کے نزول کی تفصیلات میں مختلف اقوال پائے جاتے ہیں۔ مثلاً صرف ایک دن نازل ہوا یا چالیس روز تک نازل ہوتا رہا؟ اور پھر اُترنا بند ہو گیا تو کیوں؟ اور صرف یہی ہوا کہ نازل نہ ہوا، یا جن لوگوں کی خلاف ورزی کی وجہ سے بند ہوا اُن پر سخت قسم کا عذاب بھی آپہنچا؟ جو نقول یہ کہتی ہیں کہ مائدہ کا نزول صرف ایک دن نہیں بلکہ چالیس دن تک برابر جاری رہا، وہ بند ہو جانے کا سبب یہ بیان کرتی ہیں کہ نزولِ مائدہ پر حکم یہ ہوا کہ اس کو فقیر، مسکین اور مریض ہی کھائیں تونگر اور بھلے چنگے نہ کھائیں مگر چند روز تعمیل کے بعد لوگوں نے آہستہ آہستہ اس کی خلاف ورزی شروع کر دی، یا یہ حکم ملا تھا کہ اس کو کھائیں سب مگر اگلے روز کے لئے ذخیرہ نہ کریں مگر کچھ عرصہ کے بعد اس کی خلاف ورزی ہونے لگی اور نتیجہ یہ نکلا کہ نہ صرف مائدہ کا نزول ہی بند ہو گیا بلکہ خلاف ورزی کرنے والے خنزیر اور بندر کی شکل میں مسخ کر دیئے گئے۔ ؎۲

بہرحال اِن آثار میں جو قدرِ مشترک ہے اُس کا حاصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کی دعا قبول فرمالی تو مشیتِ باری کا یہ حکم ہوا کہ مائدہ طیار ہو چنانچہ لوگوں کی آنکھوں دیکھتے خدا کے فرشتے فضاءِ آسمانی سے اُس کو لیکر اُترے اِدھر فرشتے آہستہ آہستہ اُس کو لئے ہوئے اُتر رہے تھے اور اُدھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام انتہائی خشوع و خضوع کے ساتھ

؎۱ تفسیر ابن کثیر جلد ۲ ص ۱۱۶۔ مگر یوحنا کی انجیل باب ۶ میں تو یہ اشارہ پایا جاتا ہے کہ یہ واقعہ "عید فصح" کے موقعہ پر پیش آیا

؎۲ نزولِ مائدہ کا سوال اگرچہ کیا تھا حواریوں نے مگر کیا تھا سب کی جانب سے اس لئے یہ واضح رہے کہ جن نقول میں خلاف ورزی اور اس سے متعلق عذاب کا ذکر ہے ان کا اشارہ حواریوں میں سے کسی کی جانب مطلق نہیں ہے کیونکہ یہ بات نصوص قرآنی کے خلاف ہے۔

درگاہِ الٰہی میں دست بدعا تھے کہ مائدہ آپہنچا اور حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) نے اول دو رکعت نمازِ شکر ادا کی اور پھر مائدہ (خوان) کو کھولا تو اس میں تلی ہوئی مچھلیاں اور تر و تازہ پھل اور روٹیاں موجود پائیں اور خوان کھولتے ہی ایسی نفیس خوشبو نکلی کہ اس کی مہک نے سب کو مست کر دیا، حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) نے لوگوں کو حکم دیا کہ وہ کھائیں مگر لوگوں نے اصرار کیا کہ ابتدا آپ کریں، آپ نے ارشاد فرمایا، یہ میرے لئے نہیں ہے، تمہاری طلب پر نازل ہوا ہے یہ سن کر سب گھبرائے کہ نہ معلوم اس کا نتیجہ کیا ہو کہ خدا کا رسول تو نہ کھائے اور ہم کھائیں آپ نے یہ دیکھ کر ارشاد فرمایا "اچھا فقراء، مساکین، معذورین اور مریضوں کو بلاؤ یہ اُن کا حق ہے" تب ہزارہا بندگانِ خدا نے شکم سیر ہو کر کھایا مگر مائدہ کی مقدار میں کوئی فرق نہیں آیا۔[1]

اس مسئلہ میں حضرت شاہ عبدالقادر (نور اللہ مرقدہ) مجاہد اور حسن بصری (رحمہم اللہ) کے ہم نوا معلوم ہوتے ہیں اور نزولِ مائدہ سے متعلق ان دونوں جماعتوں سے الگ ایک اور لطیف بات ارشاد فرماتے ہیں۔ موضح القرآن میں ہے۔

(ھل یستطیع) "ہو سکے" یہ معنی کہ ہمارے واسطے تمہاری دعا سے اس قدر خرقِ عادت کرے یا نہ کرے۔ فرمایا (اتقوا اللہ) "ڈرو اللہ سے" یعنی بندہ کو چاہئے کہ اللہ کو نہ آزمائے کہ میرا کہا مانتا ہے یا نہیں اگرچہ خداوند (آقا و مالک) بہتیری مہربانی کرے "ونکون علیہا من الشھدین" یعنی برکت کی امید پر مانگتے ہیں اور (تاکہ) معجزہ ہمیشہ مشہور رہے، آزمانے کو نہیں، کہتے ہیں وہ خوان اترا یکشنبہ کو وہ نصاریٰ کی عید ہے جیسے ہم کو روزِ جمعہ۔

بعضے کہتے ہیں وہ خوان اترا چالیس روز تک اور پھر بعض نے ناشکری کی یعنی حکم ہوا تھا کہ فقراء اور مریض کھاویں نہ محظوظ (تونگر) اور چنگے پھر قریب اسّی آدمی سور اور بندر

---

[1] یہ واقعات بڑی تفصیل کے ساتھ تمام کتب تفسیر میں موجود ہیں۔

ہو گئے (مگر) یہ عذاب پہلے یہود میں ہوا تھا پیچھے کسی کو نہیں ہوا۔[1]

اور بعضے کہتے ہیں (مائدہ) نہ اترا، تہدید سُن کر مانگنے والے ڈر گئے نہ مانگا، لیکن پیغمبر کی دعا عبث نہیں اور اس کلام (قرآن) میں نقل کرنا بے حکمت نہیں، شاید اس دعا کا اثر یہ ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کی امت (نصاریٰ) میں آسودگی مال سے ہمیشہ رہی اور جو کوئی ان میں ناشکری کرے تو شاید آخرت میں سب سے زیادہ عذاب پاوے۔ اس میں مسلمان کو عبرت ہے کہ اپنا مدعا خرقِ عادت کی راہ سے نہ چاہے پھر اُس کی شکرگذاری بہت مشکل ہے، اسبابِ ظاہری پر قناعت کرے تو بہتر ہے۔ اس قصہ میں بھی ثابت ہوا کہ حق تعالیٰ کے آگے حمایت پیش نہیں جاتی۔[2]

اس سلسلہ میں حضرت عمار بن یاسر (رضی اللہ عنہ) نے موعظت و بصیرت سے متعلق بہت خوب بات ارشاد فرمائی ہے۔

عیسیٰ (علیہ السلام) سے اُن کی قوم نے نزولِ مائدہ کی درخواست کی تو اللہ تعالیٰ کی جانب سے جواب ملا "تمہاری درخواست اس شرط کے ساتھ منظور کی جاتی ہے کہ نہ اس میں خیانت کرنا، نہ اس کو چھپائے رکھنا اور نہ اس کو ذخیرہ کرنا ورنہ یہ بند کر دیا جائیگا اور تم کو ایسا عبرتناک عذاب دوں گا جو کسی کو نہ دیا جائے گا"

اے معشر عرب! تم اپنی حالت پر غور کرو کہ اونٹوں اور بکریوں کی دم پکڑ کر جنگلوں میں چراتے پھرتے تھے، پھر خدائے تعالیٰ نے اپنی رحمت سے تمہارے درمیان ہی سے ایک برگزیدہ رسول مبعوث فرمایا جس کے حسب و نسب سے تم اچھی طرح واقف ہو، اس نے تم کو یہ خبر دی کہ عنقریب تم عجم پر غالب آجاؤ گے اور اس پر چھا جاؤ گے۔ اور اُس نے

---

[1] شاہ صاحب کا مسلک یہ ہے کہ واقعۂ مسخ صحیح نہیں ہے۔ [2] موضح القرآن سورۂ مائدہ۔

تم کو سختی کے ساتھ منع فرمایا کہ مال و دولت کی فراوانی دیکھ کر ہرگز تم چاندی اور سونے کے خزانے جمع نہ کرنا مگر قسم بخدا کہ زیادہ لیل و نہار نہ گذریں گے کہ تم ضرور سونے چاندی کے خزانے جمع کرو گے اور اس طرح خدائے برتر کے دردناک عذاب کے مستحق بنو گے [۱]

رفع الی السماء یعنی زندہ آسمان پر اٹھالیا جانا

حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) نے نہ شادی کی اور نہ بود و ماند کے لئے گھر بنایا وہ شہر شہر اور گاؤں گاؤں خدا کا پیغام سناتے اور دینِ حق کی دعوت و تبلیغ کا فرض انجام دیتے اور جہاں بھی رات آپہنچتی وہیں کسی سرو سامانِ راحت کے بغیر شب بسر کر دیتے تھے اور چونکہ ان کی ذاتِ اقدس سے مخلوقِ خدا جسمانی و روحانی دونوں طرح کی شفا اور تسکین پاتی تھی اس لئے جس جانب بھی اُن کا گذر ہو جاتا خلقت کا انبوہ حسنِ عقیدت کے ساتھ جمع ہو جاتا اور والہانہ محبت کے ساتھ اُن پر نثار ہو جانے کو تیار رہتا تھا۔

یہود کو اس دعوتِ حق کے ساتھ جو بغض و عناد تھا اس نے اس بڑھتی ہوئی مقبولیت کو انتہائی حسد اور سخت خطرہ کی نگاہ سے دیکھا اور جب اُن کے مسخ شدہ قلوب کسی طرح اس کو برداشت نہ کر سکے تو اُن کے سرداروں، فقیہوں، فریسیوں اور صدوقیوں نے ذاتِ اقدس کے خلاف سازش شروع کی اور طے یہ پایا کہ اس ہستی کے خلاف کامیابی حاصل کرنے کی بجز اُس کے کوئی صورت نظر نہیں آتی کہ بادشاہِ وقت کو مشتعل کر کے اُس کو دار پر چڑھا دیا جائے۔

گذشتہ چند صدیوں سے یہود کے ناگفتہ بہ حالات کی بدولت اس زمانہ میں یہودیہ کے بادشاہ ہیرودیس کی حکومت اپنے باپ دادا کے علاقہ میں سے بمشکل ایک چوتھائی پر قائم تھی اور وہ بھی برائے نام اور اصل حکومت و اقتدار وقت کے بت پرست شاہنشاہ قیصرِ روم کو حاصل تھا اور اس کی نیابت میں پلاطیس یہودیہ کے اکثر علاقہ کا گورنر یا بادشاہ تھا۔

---

[۱] تفسیر ابن کثیر جلد ۲ سورہ مائدہ۔

یہود اگرچہ اس بت پرست بادشاہ کے اقتدار کو اپنی بدبختی سمجھ کر اُس سے متنفر تھے مگر حضرت مسیح (علیہ السلام) کے خلاف قلوب میں مشتعل حسد کی آگ نے اور صدیوں کی غلامی سے پیدا شدہ پست ذہنیت نے ایسا اندھا کر دیا کہ انجام او نتیجہ کی فکر سے بے پرواہ ہو کر پلاطیس کے دربار میں جا پہنچے اور عرض کیا "عالی جاہ! یہ شخص نہ صرف ہمارے لئے بلکہ حکومت کے لئے بھی خطرہ بنتا جا رہا ہے اگر فوراً ہی اس کا استیصال نہ کر دیا گیا تو نہ ہمارا دین ہی صحیح حالت میں باقی رہ سکے گا اور اندیشہ ہے کہ کہیں آپ کے ہاتھ سے حکومت کا اقتدار بھی چلا جائے اس لئے کہ اس شخص نے عجیب و غریب شعبدے دکھا کر خلقت کو اپنا گرویدہ بنا لیا ہے اور ہر وقت اس گھات میں لگا ہے کہ عوام کی اس طاقت کے بل پر قیصر اور آپ کو شکست دے کر خود بنی اسرائیل کا بادشاہ بن جائے۔ اس شخص نے لوگوں کو صرف دنیوی راہ سے ہی گمراہ نہیں کیا بلکہ اس نے ہمارے دین تک کو بھی بدل ڈالا اور لوگوں کو بددین بنانے میں منہمک ہے۔ پس اس فتنہ کا انسداد از بس ضروری ہے تاکہ بڑھتا ہوا یہ فتنہ ابتدائی منزل ہی میں کچل ڈالا جائے"۔

غرض کافی گفت و شنید کے بعد پلاطیس نے اُن کو اجازت دیدی کہ وہ حضرت مسیح (علیہ السلام) کو گرفتار کر لیں اور شاہی دربار میں مجرم کی حیثیت سے پیش کریں، بنی اسرائیل کے سردار، فقیہ اور کاہن یہ فرمان حاصل کر کے بیحد مسرور ہوئے اور فخر و مباہات سے ایک دوسرے کو مبارکباد دینے لگے کہ آخر ہماری سازش کارگر ہوئی اور ہماری تدبیر کا تیر ٹھیک نشانہ پر بیٹھ گیا اور کہنے لگے کہ اب ضرورت اس امر کی ہے کہ خاص موقعہ کا منتظر رہا جائے اور کسی خلوت اور تنہائی کے موقعہ پر اس طرح اس کو گرفتار کیا جائے کہ عوام میں ہیجان نہ ہونے پائے۔ انجیل یوحنا میں اس واقعہ سے متعلق یہ کہا گیا ہے۔

پس سردار کاہنوں اور فریسیوں نے صدر عدالت کے لوگوں کو جمع کر کے کہا ہم کرتے کیا ہیں؟
یہ آدمی تو بہت معجزے دکھاتا ہے اگر ہم اُسے یونہی چھوڑ دیں تو سب اس پر ایمان لے
آئیں گے اور رومی آکر ہماری جگہ اور قوم دونوں پر قبضہ کر لیں گے اور ان میں سے کائفا نام
ایک شخص نے جو اُس سال سردار کاہن تھا اُن سے کہا تم نہیں جانتے اور نہ سوچتے ہو کہ تمہارے
لئے یہی بہتر ہے کہ ایک آدمی امت کے واسطے مرے نہ کہ ساری قوم ہلاک ہو۔[1]

یہ اُس مشورہ کا تذکرہ ہے جو بادشاہ کے پاس جانے سے قبل آپس میں ہوا اور یہ خطرہ
ظاہر کیا گیا کہ اگر اس ہستی کو یونہی چھوڑ دیا گیا تو بادشاہِ وقت (قیصر) کہیں سلطنت کے لئے خطرہ
سمجھ کر رہی سہی برائے نام حکومتِ یہود کا بھی خاتمہ نہ کر دے۔

اور مرقس کی انجیل میں ہے۔

دو دن کے بعد فسح اور عیدِ فطیر ہونے والی تھی اور سردار کاہن اور فقیہ موقع ڈھونڈ رہے
تھے کہ اُسے کیوں کر فریب سے پکڑ کر قتل کریں کیونکہ کہتے تھے کہ عید کو نہیں ایسا نہ ہو کہ بلوہ ہو جائے۔[2]

دوسری جانب حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) اور ان کے حواریوں کے مکالمہ کو سورۂ آلِ عمران
اور سورۂ صف کے حوالہ سے نقل کیا جا چکا ہے کہ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) نے جب یہود کے
کفر و انکار اور معاندانہ ریشہ دوانیوں کو محسوس کیا تو ایک جگہ اپنے حواریوں کو جمع کیا اور اُن
سے فرمایا کہ بنی اسرائیل کے سرداروں اور کاہنوں کی معاندانہ سرگرمیاں تم سے پوشیدہ نہیں
ہیں، اب وقت کی نزاکت اور کڑی آزمائش و امتحان کی گھڑی کی قربت تقاضا کرتی ہے کہ
میں تم سے سوال کروں کہ تم میں کون وہ افراد ہیں جو اس کفر و انکار کے سیلاب کے سامنے
سینہ سپر ہو کر خدا کے دین کے ناصر و مددگار رہیں گے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا یہ ارشادِ مبارک

[1] باب ۱۱ آیات ۴۷ تا ۵۱۔ [2] باب ۱۴ آیات ۲-۱۔

سن کر سب نے بڑے جوش و خروش اور صداقتِ ایمانی کے ساتھ جواب دیا "ہم ہیں اللہ کے مددگار خدائے واحد کے پرستار، آپ گواہ رہیں کہ ہم مسلم و فاشعار ہیں، اور درگاہِ باری میں اپنی اس اطاعت کوشی پر استقامت کے لئے یوں دستِ بدعا ہیں، اے پروردگار! ہم تیری اُتاری ہوئی کتاب پر ایمان لے آئے اور صدقِ دل کے ساتھ تیرے پیغمبر کے پیرو ہیں، خدایا! تو ہم کو صداقت و حقانیت کے فداکاروں کی فہرست میں لکھ لے۔"

حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور اُن کے فریضۂ دعوت و تبلیغ کے خلاف یہود بنی اسرائیل کی مخالفانہ سرگرمیوں سے متعلق حالات کا یہ حصہ تو اکثر و بیشتر ایسا ہے کہ قرآن اور انجیل کے درمیان اصولاً اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے لیکن اس کے مابعد کے بقیہ حصۂ بیان میں دونوں کی قطعاً جُدا جُدا راہیں ہیں اور اُن کے درمیان اس درجہ تضاد ہے کہ کسی طرح بھی ایک کو دوسری راہ کے قریب نہیں لایا جا سکتا۔ البتہ اس جگہ پہنچ کر یہود اور نصاریٰ دونوں کا باہمی اتحاد ہو جاتا ہے اور دونوں کے بیانات واقعہ سے متعلق ایک ہی عقیدہ پیش کرتے ہیں، فرق ہے تو یہ کہ یہود اُس واقعہ کو اپنا کارنامہ اور اپنے لئے باعثِ فخر سمجھتے ہیں اور نصاریٰ اس کو یہود بنی اسرائیل کی ایک قابلِ لعنت جدوجہد یقین کرتے ہیں۔

یہود اور نصاریٰ دونوں کا مشترک بیان یہ ہے کہ یہود کے سرداروں اور کاہنوں کو یہ اطلاع ملی کہ اس وقت یسوع (علیہ السلام) لوگوں کی بھیڑ سے الگ اپنے شاگردوں کے ساتھ ایک بند مکان میں موجود ہیں، یہ موقع بہترین ہے، اس کو ہاتھ سے نہ دیجئے۔ فوراً ہی یہ لوگ موقع پر پہنچ گئے اور چاروں طرف سے مکان کا محاصرہ کر کے یسوع (علیہ السلام) کو گرفتار کر لیا اور توہین و تذلیل کرتے ہوئے پلاطیس کے دربار میں لے گئے تاکہ وہ ان کو سولی پر لٹکائے اور اگرچہ پیلاطیس نے عیسیٰ (علیہ السلام) کو بے قصور سمجھ کر چھوڑ دینا چاہا مگر بنی اسرائیل کے اشتعال پر

مجبوراً سپاہیوں کے حوالہ کر دیا۔ سپاہیوں نے اُن کو کانٹوں کا تاج پہنایا، منہ پر تھوکا، کوڑے لگائے اور ہر طرح کی توہین و تذلیل کرنے کے بعد مجرموں کی طرح سولی پر لٹکا دیا اور دونوں ہاتھوں میں میخیں ٹھونک دیں، سینہ کو برچھی کی انی سے چھید دیا اور اس کس مپرسی کی حالت میں انھوں نے یہ کہتے ہوئے جان دے دی "ایلی ایلی لما سبقتنی" انجیلِ متی میں اس واقعہ کی تفصیلات کو ان الفاظ کے ساتھ بیان کیا گیا ہے :-

"سردار کاہن نے اُس سے کہا: میں تجھے زندہ خدا کی قسم دیتا ہوں کہ اگر تو خدا کا بیٹا مسیح ہے تو ہم سے کہہ دے یسوع نے اُس سے کہا: تو نے خود کہہ دیا بلکہ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ اس کے بعد تم ابن آدم کو قادر مطلق کی داہنی طرف بیٹھے اور آسمان کے بادلوں پر آتا دیکھو گے اس پر سردار کاہن نے یہ کہہ کر اپنے کپڑے پھاڑے کہ اُس نے کفر بکا ہے اب ہمیں گواہوں کی کیا حاجت رہی، دیکھو تم نے ابھی یہ کفر سُنا ہے تمہاری کیا رائے ہے، انھوں نے جواب میں کہا وہ قتل کے لائق ہے اس پر انھوں نے اس کے منہ پر تھوکا اور اس کے مکے مارے اور بعض نے طمانچے مار کے کہا" اے مسیح ہمیں نبوت سے بتا کہ کس نے تجھے مارا . . . . . جب صبح ہوئی تو سب سردار کاہنوں اور قوم کے بزرگوں نے یسوع کے خلاف مشورہ کیا کہ اُسے مار ڈالیں اور اسے باندھ کر لے گئے اور پیلاطیس حاکم کے حوالہ کیا . . . . . اور حاکم کا دستور تھا کہ عید پر لوگوں (بنی اسرائیل) کی خاطر ایک قیدی جسے وہ چاہتے تھے چھوڑ دیتا تھا اس وقت برابا نام اُن کا ایک مشہور قیدی تھا پس جب وہ اکٹھے ہوئے تو پیلاطیس نے اُن سے کہا تم کسے چاہتے ہو کہ میں تمہاری خاطر چھوڑ دوں؟ برابا کو یا یسوع کو جو مسیح کہلاتا ہے؟ . . . . . وہ بولے برابا کو پیلاطیس نے اُن سے کہا پھر یسوع کو جو مسیح کہلاتا ہے کیا کروں سب نے کہا اس کو صلیب دی جائے اُس نے کہا کہ کیوں؟ اس نے کیا برائی کی ہے؟ مگر وہ

اور بھی چلا چلا کر بولے کہ اس کو صلیب دی جائے، جب پیلاطیس نے دیکھا کہ کچھ بن نہیں پڑتا اُلٹا بلوہ ہوتا جاتا ہے تو پانی لے کر لوگوں کے روبرو اپنے ہاتھ دھوئے اور کہا" میں اس راستباز کے خون سے بری ہوں تم جانو" سب لوگوں نے جواب دے کر کہا" کہ اس کا خون ہماری اور ہماری اولاد کی گردن پر" اس پر اس نے براباؔ کو اُن کی خاطر چھوڑ دیا اور یسوعؔ کو کوڑے لگوا کر حوالے کیا تاکہ صلیب دی جائے۔ اس پر حاکم کے سپاہیوں نے یسوعؔ کو قلعہ میں لیجا کر ساری پلٹن اس کے گرد جمع کی اور اُس کے کپڑے اتار کر اُسے قرمزی چوغہ پہنایا اور کانٹوں کا تاج بنا کر اس کے سر پر رکھا اور ایک سرکنڈا اس کے داہنے ہاتھ میں دیا اور اس کے آگے گھٹنے ٹیک اُسے ٹھٹھوں میں اڑانے لگے کہ اے یہودیوں کے بادشاہ۔ آداب۔ اور اس پر تھوکا اور وہی سرکنڈا لے کر اس کے سر پر مارنے لگے اور جب اس کا ٹھٹھا کر چکے تو چوغے کو اُس پر سے اتار کر پھر اس کے کپڑے اُسے پہنائے اور صلیب دینے کو لے گئے۔ اس وقت اس کے ساتھ دو ڈاکو صلیب پر چڑھائے گئے ایک دہنے اور ایک بائیں اور راہ چلنے والے سر ہلا ہلا کر اس کو لعن طعن کرتے اور کہتے تھے اے مقدس کے ڈھانے والے اور تین دن میں بنانے والے اپنے تئیں بچا۔ اگر تو خدا کا بیٹا ہے تو صلیب پر سے اُتر آ اسی طرح سردار کاہن بھی فقیہوں اور بزرگوں کے ساتھ مل کے ٹھٹھے سے کہتے تھے اس نے اوروں کو بچایا اپنے تئیں نہیں بچا سکتا۔ . . . اور دوپہر سے لے کر تیسرے پہر تک تمام ملک میں اندھیرا چھایا رہا اور تیسرے پہر کے قریب یسوعؔ نے بڑی آواز سے چلا کر کہا:" ایلی ایلی لما سبقتنی" (اے میرے خدا! اے میرے خدا! تو نے مجھ کو کیوں چھوڑ دیا) جو وہاں کھڑے تھے اُن میں سے بعض نے سن کر کہا، یہ ایلیا کو پکارتا ہے . . . . یسوعؔ پھر بڑی آواز سے چلایا اور جان دیدی"۔ [1]

---

[1] باب ۲۶ آیت ۵۷ تا ۵۰۔

تفصیلات میں کم و بیش فرق کے ساتھ یہی مفروضہ داستان باقی تینوں انجیلوں میں بھی مذکور ہے۔ چاروں انجیلوں کی من گھڑت مگر مفروضہ داستان کو مطالعہ کرنے کے بعد طبیعت پر قدرتی اثر یہ پڑتا ہے کہ حضرت مسیح (علیہ السلام) کی موت انتہائی بیکسی اور بے بسی کی حالت میں دردناک طریقہ سے ہوئی اور اگرچہ خدا کے نیک اور مقرب بندوں کے لئے یہ کوئی اجنبی بات نہ تھی بلکہ مقربین بارگاہ صمدی کے لئے اس قسم کی کڑی آزمائشوں کا مظاہرہ اکثر ہوتا رہا ہے لیکن اس واقعہ کا یہ پہلو اس کے مفروضہ اور گھڑے ہوئے ہونے پر روز روشن کی طرح شاہد ہے کہ حضرت یسوع نے ایک اولو العزم پیغمبر بلکہ مرد صالح کی طرح اس واقعہ کو صبر و رضاء الٰہی کے ساتھ انگیز نہیں کیا بلکہ ایک انتہائی مایوس انسان کی طرح خدا سے شکوہ کرتے کرتے جان دیدی "ایلی ایلی لما سبقتنی" کہتے ہوئے جان دے دینا مایوسی اور شکوہ کی وہ صورت حال ہے جو کسی طرح بھی حضرت مسیح (علیہ السلام) کے شایان شان نہیں کہی جا سکتی، پھر اس واقعہ کا یہ پہلو بھی کم حیرت زا نہیں ہے کہ بقول انجیل کے یسوع مسیح نے اس حادثہ سے قبل تین مرتبہ خدائے تعالیٰ سے یہ درخواست کی "اے میرے باپ اگر ہو سکے تو یہ (موت کا) پیالہ مجھ سے ٹل جائے" اور جب یہ درخواست کسی طرح قبول نہ ہوئی تو مایوس ہو کر یہ کہنا پڑا "اگر یہ میرے پئے بغیر نہیں ٹل سکتا تو تیری مرضی پوری ہو"

باعث حیرت یہ بات ہے کہ جبکہ عقیدۂ "کفارہ" کے مطابق حضرت مسیح کا یہ معاملہ خدا اور اُس کے بیٹے (العیاذ باللہ) کے درمیان طے شدہ تھا تو پھر اس درخواست کے کیا معنی، اور اگر لوازم بشریت کی بنا پر تھا تو خدا کی مرضی معلوم ہو جانے اور اُس پر قناعت کر لینے کے بعد پھر یہ بے صبر اور مایوس انسانوں کی طرح جان دینے کا کیا سبب؟

یہود کی گڑھی ہوئی اس داستان کو چونکہ نصاریٰ نے قبول کر لیا تو یہود ازرہ فخر و غرور

اس پر یہود مسرور ہیں اور کہتے ہیں کہ مسیح ناصری اگر "مسیح موعود" ہوتا تو خدائے تعالیٰ اس بے بسی اور بے کسی کے ساتھ اس کو ہمارے ہاتھ میں نہ دے دیتا کہ وہ مرتے وقت تک خدا سے شکوہ کرتا رہا کہ اس کو بچائے مگر خدا نے اس کی کوئی مدد نہ کی حالانکہ ہمارے باپ دادا اس وقت بھی کافی اشتعال دیتے رہے کہ اگر تو حقیقۃً خدا کا بیٹا اور "مسیح موعود" ہے تو کیوں تجھ کو خدا نے ہمارے ہاتھوں اس ذلت سے نہ بچا لیا۔

دقت یہ ہے کہ نصاریٰ کے پاس جبکہ اس چبھتے ہوئے الزام کا کوئی جواب نہیں تھا اور واقعہ کی ان تفصیلات کو مان لینے کے بعد "عقیدۂ کفارہ" کی کوئی قیمت باقی نہیں رہ جاتی تھی تب انہوں نے واقعہ کی ان تفصیلات کے بعد ایک پارۂ بیان کا اور اضافہ کیا۔ یوحنا کی انجیل میں ہے:-

"لیکن جب انہوں نے یسوع کے پاس آکر دیکھا کہ وہ مر چکا ہے تو اس کی ٹانگیں نہ توڑیں مگر ان میں سے ایک سپاہی نے بھالے سے اس کی پسلی چھیدی اور فی الفور اس سے خون اور پانی بہہ نکلا۔۔۔ ان باتوں کے بعد ارمتیہ کے رہنے والے یوسف نے جو یسوع کا شاگرد تھا یہودیوں کے خوف سے خفیہ طور پر پیلاطیس سے اجازت چاہی کہ یسوع کی لاش لے جائے پیلاطیس نے اجازت دیدی پس وہ آکر اس کی لاش لے گیا اور نیکدیمس بھی آیا جو پہلے یسوع کے پاس رات کو گیا تھا اور پچاس سیر کے قریب مر اور عود ملا ہوا لایا پس انہوں نے یسوع کی لاش لے کر اسے سوتی کپڑے میں خوشبودار چیزوں کے ساتھ کفنایا جس طرح کہ یہودیوں میں دفن کرنے کا دستور ہے اور جس جگہ اسے صلیب دی گئی وہاں ایک باغ تھا اور اس باغ میں ایک نئی قبر تھی جس میں کبھی کوئی نہ رکھا گیا تھا پس انہوں نے یہودیوں کی تیاری کے دن کے باعث یسوع کو وہیں رکھ دیا۔

ہفتہ کے پہلے دن مریم مگدلینی ایسے تڑکے کہ ابھی اندھیرا ہی تھا قبر پر آئی اور پتھر کو قبر سے ہٹا ہوا دیکھا پس وہ شمعون پطرس اور اس کے دوسرے شاگرد کے پاس جسے یسوع عزیز رکھتا تھا دوڑی ہوئی گئی اور اُن سے کہا کہ خداوند کو قبر سے نکال لے گئے اور ہمیں معلوم نہیں کہ اُسے کہاں رکھ دیا۔ . . . . لیکن مریم باہر قبر کے پاس کھڑی روتی رہی اور جب روتے روتے قبر کی طرف جھک کے اندر نظر کی تو دو فرشتوں کو سفید پوشاک پہنے ہوئے ایک کو سرہانے اور دوسرے کو پائینتی بیٹھے دیکھا جہاں یسوع کی لاش پڑی تھی انھوں نے اس سے کہا اے عورت تو کیوں روتی ہے اُس نے اُن سے کہا اس لئے کہ میرے خداوند کو اٹھا لے گئے اور معلوم نہیں کہ اُسے کہاں رکھا یہ کہہ کر وہ پیچھے پھری اور یسوع کو کھڑے دیکھا اور نہ پہچانا کہ یہ یسوع ہے۔ "یسوع نے اس سے کہا مریم! وہ پھر کر اُس سے عبرانی زبان میں بولی "ربونی" یعنی اے استاد! یسوع نے اس سے کہا مجھے نہ چھو کیونکہ میں اب تک باپ کے پاس اوپر نہیں گیا لیکن میرے بھائیوں کے پاس جا کر اُن سے کہو کہ میں اپنے باپ اور تمہارے باپ کے اور اپنے خدا اور تمہارے خدا کے پاس اوپر جاتا ہوں، مریم مگدلینی نے آکر شاگردوں کو خبر دی کہ میں نے خداوند کو دیکھا اور اس نے مجھ سے یہ باتیں کہیں۔

پھر اُسی دن جو ہفتہ کا پہلا دن تھا شام کے وقت جب وہاں کے دروازے جہاں شاگرد تھے یہودیوں کے ڈر سے بند تھے یسوع آکر بیچ میں کھڑا ہوا اور ان سے کہا کہ تمہاری سلامتی ہو اور یہ کہہ کر اُس نے اپنے ہاتھ اور پسلی انھیں دکھائی پس شاگرد خداوند کو دیکھ کر خوش ہوئے یسوع نے پھر اُن سے کہا کہ تمہاری سلامتی ہو جس طرح باپ نے مجھے بھیجا ہے اسی طرح میں بھی تمہیں بھیجتا ہوں اور یہ کہہ کر اُن پر پھونکا اور ان سے کہا "روح القدس" لو۔[1]

[1] انجیل یوحنا باب ۱۹ آیت ۴۲-۳۳ و آیت ۴۲-۳۸ و باب ۲۰ آیات ۱ تا ۲۲۔

ہر ایک شخص معمولی غور و فکر کے بعد بہ سہولت سمجھ سکتا ہے کہ یہ پارۂ بیان، پہلے حصۂ بیان کے ساتھ غیر مربوط اور قطعاً بے جوڑ ہے بلکہ یہ اندازہ لگانا ہی مشکل ہو جاتا ہے کہ یہ دونوں تفصیلات ایک ہی شخصیت سے وابستہ ہیں کیونکہ پہلا پارۂ بیان ایک ایسی شخصیت کا مرقع ہے جو بے بس و بے کس مایوس اور خدا سے شاکی نظر آتی ہے اور دوسرا حصۂ بیان ایسی ہستی کا رخِ روشن پیش کرتی ہے جو خدائی صفات سے متصف، ذاتِ باری کی مقرب اور پیش آمدہ واقعات سے مطمئن و مسرور ہے بلکہ اُن کے وقوع کی تحسین اور ان کو اپنے ادائے فرض کا اہم جزو سمجھتی ہے۔

ببیں تفاوتِ رہ از کجاست تا بکجا!

بہر حال حقیقت چونکہ دوسری تھی اور ایک عرصۂ دراز کے بعد "عقیدۂ کفارہ" کی بدعت نے نصاریٰ کو اُس کے خلاف اس گڑھے ہوئے افسانہ کی تصنیف پر مجبور کر دیا اس لئے قرآنِ عزیز نے حضرت مریم اور حضرت عیسیٰ (علیہما السلام) سے متعلق دوسرے گوشوں کی طرح اس گوشہ سے بھی جہالت و تاریکی کا پردہ ہٹا کر حقیقتِ حال کے رُخِ روشن کو جلوہ آرا کرنا ضروری سمجھا اور اُس نے اپنا وہ فرض انجام دیا جس کو مذاہبِ عالم کی تاریخ میں "قرآن کی دعوتِ تجدید و اصلاح" کہا جاتا ہے۔

اُس نے بتایا کہ جس زمانہ میں بنی اسرائیل، پیغمبرِ حق اور رسولِ خدا (عیسیٰ بن مریم) کے خلاف خفیہ تدبیروں اور سازشوں میں مصروف اور اُن پر نازاں تھے اسی زمانہ میں خدائے برتر کے قانونِ قضاء و قدر نے یہ فیصلہ نافذ کر دیا کہ کوئی طاقت اور مخالف قوت عیسیٰ بن مریم (علیہما السلام) پر قابو نہیں پا سکتی اور ہماری محکم تدبیر اُس کو دشمنوں کے ہر مکر سے محفوظ رکھے گی۔ اور نتیجہ یہ نکلا کہ جب بنی اسرائیل نے اُن پر زرغہ کیا تو اُن کو پیغمبرِ خدا پر کسی طرح دسترس حاصل نہ ہو سکی اور اِن کو بحفاظتِ تمام اٹھا لیا گیا اور جب بنی اسرائیل مکان میں گھسے تو صورتِ حال

اُن پر مشتبہ ہو گئی اور وہ ذلت و رسوائی کے ساتھ اپنے مقصد میں ناکام رہے اور اس طرح خدا نے اپنا وعدہ پورا کر دکھایا جو عیسیٰ بن مریم کی حفاظت کے لئے کیا گیا تھا۔

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ جب عیسیٰ (علیہ السلام) نے یہ محسوس فرمایا کہ اب بنی اسرائیل کے کفر و انکار کی سرگرمیاں اس درجہ بڑھ گئی ہیں کہ وہ میری توہین و تذلیل بلکہ قتل کے لئے سرگرمِ سازش ہیں تو انھوں نے خاص طور سے ایک مکان میں اپنے حواریوں کو جمع کیا اور ان کے سامنے صورتِ حال کا نقشہ پیش فرما کر ارشاد فرمایا: امتحان کی گھڑی سر پر ہے، کڑی آزمائش کا وقت ہے، حق کو مٹانے کی سازشیں پورے شباب پر ہیں، اب میں تمہارے درمیان زیادہ نہیں رہونگا اس لئے میرے بعد دینِ حق پر استقامت، اُس کی نشر و اشاعت، اور یاری و نصرت کا معاملہ صرف تمہارے ساتھ وابستہ ہو جانے والا ہے اس لئے مجھے بتاؤ کہ خدا کی راہ میں سچا مددگار کون کون ہے۔ حواریوں نے یہ کلامِ حق سن کر کہا "ہم سب ہی خدا کے دین کے مددگار ہیں، ہم سچے دل سے خدا پر ایمان لائے ہیں اور اپنی صداقتِ ایمانی کا آپ ہی کو گواہ بناتے ہیں اور یہ کہنے کے بعد انسانی کمزوریوں کے پیشِ نظر اپنے دعویٰ پر ہی بات ختم نہیں کر دی بلکہ درگاہِ الٰہی میں دست بدعا ہو گئے کہ جو کچھ ہم کہہ رہے ہیں تو اس پر ہم کو استقامت عطا فرما اور ہم کو اپنے دین کے مددگاروں کی فہرست میں لکھ لے۔

اس جانب سے مطمئن ہو کر اب حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) اپنے فریضۂ دعوت و ارشاد کے ساتھ ساتھ منتظر رہے کہ دیکھئے معاندین کی سرگرمیاں کیا رُخ اختیار کرتی ہیں، اور خدائے برحق کا فیصلہ کیا صادر ہوتا ہے؟ اللہ تعالیٰ نے اس سلسلہ میں قرآنِ عزیز کے ذریعہ یہود و نصاریٰ کے ظنون و اوہامِ فاسدہ کے خلاف "علم و یقین کی روشنی" بخشتے ہوئے یہ بھی بتایا کہ جس وقت معاندین اپنی خفیہ تدبیروں میں سرگرمِ عمل تھے اسی وقت ہم نے بھی اپنی قدرتِ کاملہ کی مخفی

تدبیر کے ذریعہ یہ فیصلہ کرلیا کہ عیسیٰ بن مریمؑ کے متعلق معاندینِ حق کی تدبیر کا کوئی گوشہ بھی کامیاب نہیں ہونے دیا جائے گا اور بلاشبہ اللہ تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ کی پوشیدہ تدابیر کے مقابلہ میں کسی کی پیش نہیں جاسکے گی اس لئے کہ اس کی تدبیر سے بہتر کوئی تدبیر ہو ہی نہیں سکتی۔

وَمَكَرُوْا وَمَكَرَ اللّٰهُ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمَاكِرِيْنَ ۔ (آل عمران)	اور انھوں نے (یہود نے عیسیٰ علیہ السلام کے خلاف) خفیہ تدبیر کی اور اللہ نے (یہود کے مکر کے خلاف) خفیہ تدبیر کی اور اللہ سب سے بہتر خفیہ تدبیر کا مالک ہے۔

لغتِ عرب میں "مکر" کے معنی خفیہ تدبیر (اور دھوکا کرنے کے) ہیں اور علم معانی کے قاعدہ "مشاکلہ" کے مطابق جب کوئی شخص کسی کے جواب یا دفاع (Defence) میں خفیہ تدبیر کرتا ہے تو خواہ وہ اخلاق اور مذہب کی نگاہ میں کتنی ہی عمدہ تدبیر کیوں نہ ہو اس کو بھی "مکر" ہی سے تعبیر کیا جاتا ہے جیسا کہ ہر ایک زبان کے محاورہ میں بولا جاتا ہے "برائی کا بدلہ برائی ہے" حالانکہ ہر شخص یہ یقین رکھتا ہے کہ برائی کرنے والے کے جواب میں اسی قدر مقابلہ کا جواب دینا اخلاق اور مذہب دونوں کی نگاہ میں "برائی" نہیں ہے تاہم تعبیر میں دونوں کو ہم شکل ظاہر کر دیا جاتا ہے اور اسی کو "مشاکلہ" کہتے ہیں اور یہ فصاحت و بلاغت کا اہم جزء سمجھا جاتا ہے۔

غرض خفیہ تدبیر دونوں جانب سے تھی ایک جانب بُرے بندوں کی بُری تدبیر اور دوسری جانب خدائے برتر کی بہترین تدبیر، نیز ایک جانب قادرِ مطلق کی تدبیرِ کامل تھی جس میں نقص و خامی کا امکان نہیں اور دوسری جانب دھوکے اور فریب کی خام کاریاں تھیں جو تارِ عنکبوت ہو کر رہ گئیں۔

آخر وہ وقت آپہنچا کہ بنی اسرائیل کے سرداروں، کاہنوں اور فقیہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ایک بند مکان میں محاصرہ کرلیا، ذاتِ اقدس اور حواری مکان کے

اندر بند ہیں اور دشمن چاروں طرف سے محاصرہ کئے ہوئے ہیں لہٰذا اب قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوا کہ وہ کیا صورت ہوئی کہ جس سے دشمن ناکام رہے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو کسی طرح کا بھی گزند نہ پہنچا سکے۔ تاکہ خدائے قادر کا وعدۂ حفاظت اور دعویٰ تدبیر خیر پورا ہو تو اس کے متعلق قرآن نے بتایا کہ بیشک خدا کا وعدہ پورا ہوا اور اُس کی تدبیر محکم نے عیسیٰ (علیہ السلام) کو دشمنوں کے ہاتھوں سے ہر طرح محفوظ رکھا اور صورت یہ پیش آئی کہ اس نازک گھڑی میں حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کو وحی الٰہی نے یہ بشارت سنائی "عیسیٰ! خوف نہ کر تیری مدت پوری کی جائے گی (یعنی تم کو دشمن قتل نہیں کر سکیں گے اور نہ تم اس وقت موت سے دوچار ہو گے) اور ہو گا یہ کہ میں تجھ کو اپنی جانب (ملاِ اعلیٰ کی جانب) اٹھا لوں گا اور ان کافروں سے ہر طرح تجھ کو پاک رکھوں گا (یعنی یہ تجھ پر کسی قسم کا قابو نہ پا سکیں گے) اور تیرے پیروؤں کو ان کافروں پر ہمیشہ غالب رکھوں گا (یعنی بنی اسرائیل کے مقابلہ میں قیامت تک عیسائی اور مسلمان غالب رہیں گے اور ان کو کبھی ان دونوں پر حاکمانہ اقتدار نصیب نہیں ہو گا) پھر انجام کار میری جانب (موت کے بعد) لوٹ آنا ہے پس میں اُن باتوں پر فیصلہ حق دوں گا جن کے متعلق تم آپس میں اختلاف کر رہے ہو۔

اِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسٰٓى اِنِّىْ مُتَوَفِّيْكَ	(وہ وقت ذکر کے لائق ہے) جب اللہ تعالیٰ نے عیسیٰ ؑ
وَرَافِعُكَ اِلَىَّ وَمُطَهِّرُكَ مِنَ	سے کہا "اے عیسیٰ! بے شبہ میں تیری مدت کو پوری کروں گا
الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَجَاعِلُ الَّذِيْنَ	اور تجھ کو اپنی جانب اٹھا لینے والا ہوں اور تجھ کو کافروں
اتَّبَعُوْكَ فَوْقَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا	(بنی اسرائیل) سے پاک رکھنے والا ہوں اور جو تیری
اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ ثُمَّ اِلَىَّ مَرْجِعُكُمْ	پیروی کریں گے اُن کو تیرے منکروں پر قیامت تک غالب
فَاَحْكُمُ بَيْنَكُمْ فِيْمَا كُنْتُمْ فِيْهِ	رکھنے والا ہوں پھر میری جانب ہی لوٹنا ہے پھر میں اُن باتوں کا

تَخْتَلِفُوْنَ ۝ (آل عمران)

فیصلہ کروں گا جن کے بارہ میں (آج) تم جھگڑ رہے ہو۔

وَاِذْ كَفَفْتُ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ عَنْكَ اِذْ جِئْتَهُمْ بِالْبَیِّنٰتِ فَقَالَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِیْنٌ ۔ (مائدہ)

(قیامت کے دن اللہ تعالیٰ حضرت عیسیٰ کو اپنے احسانات شمار کراتے ہوئے فرمائیگا) اور وہ وقت یاد کرو جب میں نے بنی اسرائیل کو تجھ سے روک دیا (یعنی وہ کسی طرح تجھ پر قابو نہ پاسکے) جبکہ تو اُن کے پاس معجزات لے کر آیا اور ان میں سے کافروں نے کہہ دیا: یہ تو جادو کے ماسوا اور کچھ نہیں ہے۔

تو اب جبکہ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کو یہ اطمینان دلادیا گیا کہ اس سخت محاصرہ کے باوجود دشمن تم کو قتل نہ کرسکیں گے اور تم کو غیبی ہاتھ ملاءِ اعلیٰ کی جانب اٹھالے گا اور اس طرح دشمنانِ دین کے ناپاک ہاتھوں سے آپ ہر طرح محفوظ کردیے جائیں گے تو اس جگہ پہنچ کر ایک دوسرا سوال پیدا ہوا کہ یہ کس طرح ہوا اور واقعہ نے کیا صورت اختیار کرلی؟ کیونکہ یہود و نصاریٰ تو کہتے ہیں کہ مسیح کو سولی پر بھی لٹکایا اور مار بھی ڈالا تب قرآن نے بتایا کہ مسیح بن مریم (علیہما السلام) کے قتل و صلیب کی پوری داستان سرتاسر غلط اور جھوٹ ہے بلکہ اصل معاملہ یہ ہے کہ جب مسیح کو بقیدِ حیات ملاءِ اعلیٰ کی جانب اٹھالیا گیا اور اس کے بعد دشمن مکان کے اندر گھس پڑے تو اُن پر صورتِ حال مشتبہ کردی گئی اور وہ کسی طرح نہ جان سکے کہ آخر اس مکان میں سے مسیح (علیہ السلام) کہاں چلا گیا۔

وَقَوْلِهِمْ اِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِیْحَ عِیْسَى ابْنَ مَرْیَمَ رَسُوْلَ اللّٰهِ وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ وَاِنَّ الَّذِیْنَ اخْتَلَفُوْا

اور (یہود ملعون قرار دیے گئے) اپنے اس قول پر کہ ہم نے مسیح عیسیٰ بن مریم پیغمبرِ خدا کو قتل کردیا حالانکہ اُنھوں نے نہ اُس کو قتل کیا اور نہ سولی پر چڑھایا بلکہ (خدا کی خفیہ تدبیر کی بدولت) اصل معاملہ ان پر مشتبہ ہو کر رہ گیا اور جو لوگ

فِيهِ لَفِي شَكٍّ مِّنْهُ مَا لَهُم بِهِ مِنْ عِلْمٍ إِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ وَمَا قَتَلُوهُ يَقِينًا ۞ بَل رَّفَعَهُ اللَّهُ إِلَيْهِ ۞ وَكَانَ اللَّهُ عَزِيزًا حَكِيمًا ۞

(نساء)

اس کے قتل کے بارہ میں جھگڑ رہے ہیں بلاشبہ وہ اُس (مسیحؑ) کی جانب سے شک میں پڑے ہوئے ہیں اُن کے پاس حقیقتِ حال کے بارہ میں ظن (اٹکل) کی پیروی کے سوا علم کی روشنی نہیں ہے اور انھوں نے عیسیٰؑ کو یقیناً قتل نہیں کیا بلکہ اُن کو اللہ نے اپنی جانب (ملاءِ اعلیٰ کی جانب) اُٹھالیا اور اللہ غالب حکمت والا ہے۔

قرآنِ عزیز کا یہ وہ بیان ہے جو یہود و نصاریٰ کے اختراعی فسانہ کے خلاف اُس نے حضرت مسیح بن مریم (علیہما السلام) کے متعلق دیا ہے اب دونوں بیانات آپ کے سامنے ہیں اور عدل و انصاف کا ترازو آپ کے ہاتھ میں۔ پہلے حضرت مسیح (علیہ السلام) کی شخصیت اور ان کے دعوت و ارشاد کے مشن کو تاریخی حقائق کی روشنی میں معلوم کیجئے اور اس کے بعد ایک مرتبہ پھر اُن تفصیلی واقعات پر نظر ڈالئے جو ایک اولو العزم پیغمبر مقرب بارگاہِ الٰہی اور نصاریٰ کے عقیدۂ باطل کے مطابق خدا کے بیٹے کو خدا کے فیصلے کے سامنے نالاں، مضطرب، بے یار و مددگار اور خدا سے شاکی ظاہر کرتے ہیں اور ساتھ ہی اُس تضاد بیان پر بھی غور فرمائیے کہ ایک جانب عقیدۂ کفارہ کی بنیاد صرف اس پر قائم ہے کہ حضرت مسیح خدا کا بیٹا بن کر آیا ہی اس غرض سے تھا کہ مصلوب ہو کر دنیا کے گناہوں کا کفارہ ہو جائے اور دوسری جانب صلیب اور قتل مسیح کی داستان اس اساس پر گھڑی گئی ہے کہ جب وہ وقت موعود آ پہنچتا ہے تو خدا کا یہ فرضی بیٹا اپنی حقیقت اور دنیا میں آنے کی غرض کو یکسر فراموش کر کے "ایلی ایلی لما سبقتنی" کا حسرتناک جملہ زبان سے کہتا اور مرضی الٰہی پر اپنی مرضی کا اظہار کرتا ہوا نظر آتا ہے کیا کسی شخص کو یہ سوال کرنے کا حق نہیں ہے کہ اگر نصاریٰ کے بیان کردہ واقعات کے دونوں حصے صحیح اور درست ہیں

تو ان دونوں کے باہم یہ تضاد کیسا اور اس عدم مطابقت کے کیا معنی ؟

پس اگر ایک حقیقت بین اور دور رس نگاہ ان تمام پہلوؤں کو سامنے رکھ کر اور واقعات حالات کی ان تمام کڑیوں کو باہم جوڑ کر اس مسئلہ کا مطالعہ کرے تو وہ تصدیق حق کے پیش نظر بلا تامل یہ فیصلہ کرے گی کہ بائبل کی یہ داستان تضاد کی حامل اور گڑھی ہوئی داستان ہے اور قرآن نے اس سلسلہ میں جو فیصلہ دیا ہے وہی حق اور مبنی بر صداقت ہے۔

تاریخ شاہد ہے کہ حضرت مسیح (علیہ السلام) کے بعد سے سینٹ پال سے قبل تک نصاریٰ "یہود" کی اس خرافی داستان سے قطعاً بے تعلق تھے لیکن جب سینٹ پال (پولس رسول) نے تثلیث اور کفارہ پر جدید عیسائیت کی بنیاد رکھی تو کفارہ کے عقیدہ کی استواری کے لئے یہود کی اس خرافی داستان کو بھی مذہب کا جزء بنا لیا گیا۔

لیکن واقعہ سے متعلق حد درجہ افسوسناک پہلو یہ ہے کہ جبکہ چودہ صدیوں سے قرآن حکیم نے عیسیٰ (علیہ السلام) کی عظمت و جلالت قدر کا اعلان کرتے ہوئے اُن کے "رفع الی السماء" کی حقیقت کو یہود و نصاریٰ کی خرافی داستان کے خلاف علم و یقین کی روشنی میں نمایاں اور یہود و نصاریٰ کو دلائل و براہین کے ذریعہ لاجواب اور سرنگوں کر دیا تھا اس کے مقابلہ میں آج ایک مدعی اسلام، دعوئے نبوت و مسیحیت کے شوق یا ہندوستان پر مسلط عیسائی حکومت کی خود غرضانہ خوشامد میں یہود و نصاریٰ کے اسی عقیدہ کو دوبارہ زندہ کرنا اور اس پر اپنے باطل عقیدۂ نبوت" کی بنیاد رکھنا چاہتا ہے اور پنجاب (قادیان) کا یہ متنبی قرآن عزیز کی تصریحات سے بے نیاز ہو کر نہایت جسارت کے ساتھ اُن تمام واقعات کی تصدیق کرتا ہے جو اس سلسلہ میں یہود و نصاریٰ نے اپنے باطل مزعومہ عقائد کی تکمیل کے لئے اختراع کئے ہیں، وہ کہتا ہے کہ بلاشبہ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کو یہود نے اسیر کیا، ان کا ٹھٹھا اڑایا، اُن کے منہ پر

ٹھوکا اُن کے طمانچے بھی لگائے، ان کو کانٹوں کا تاج بھی پہنایا اور ان کے علاوہ ہر قسم کی توہین و تذلیل کا سلوک کرنے کے بعد ان کو صلیب پر بھی چڑھایا اور اپنے زعم میں ان کو قتل بھی کر ڈالا البتہ یہود و نصاریٰ کی حرف بحرف تصدیق کے بعد بغیر کسی قرآنی نص، حدیثی روایت اور تاریخی شہادت کے اپنی جانب سے یہ اضافہ کرتا ہے کہ جب شاگردوں کے مطالبہ پر نعش اُن کے حوالہ کردی گئی اور وہ تجہیز و تکفین کے لئے آمادہ ہوئے تو دیکھا کہ جسم میں جان باقی ہے تب انھوں نے خفیہ طور پر ایک خاص مرہم کے ذریعہ اُن کے زخموں کا علاج کیا اور جب وہ چنگے ہو گئے تو پوشیدہ رہ کر کشمیر کو چلے گئے اور وہاں بھی حیات کے آخری لمحوں تک خود کو چھپائے رکھا اور گمنامی میں وہیں انتقال پا گئے گویا یوں کہئے کہ یہود و نصاریٰ کی مفروضہ داستان میں حضرت مسیح (علیہ السلام) سے متعلق توہین و تذلیل کے جس قدر بھی پہلو تھے وہ سب تو متنبی کاذب نے قبول کرلئے باقی اُن کی عظمت شان اور جلالت مرتبہ سے متعلق پہلو کو داستان سے خارج کرکے اس کے ساتھ ایک ایسا فرضی حصہ جوڑ دیا جس سے ایک جانب نیچر پرستوں کو اپنی جانب مائل کرنے کا سامان مہیا ہو سکے اور دوسری جانب عیسیٰ (علیہ السلام) کی باقی زندگی مبارک کو گمنامی کے ساتھ وابستہ کرکے توہین و تذلیل کا ایک گوشہ جو تشنہ سامان رہ گیا تھا اس کی تکمیل ہو جائے (انا للہ وانا الیہ راجعون)

متنبی پنجاب کو یہ سب کچھ کرنے کی کیوں ضرورت پیش آئی؟ اس کی جانب ابھی اشارہ کیا جا چکا ہے اور اس کی تفصیل کے لئے پروفیسر برنی کی کتاب "قادیانی مذہب" لائق مطالعہ ہے یا خود متنبی کاذب کی تصنیفی ہفوات اس حقیقت کو عریاں کرنے میں مدد دیتی ہیں۔

ہمارے پیش نظر تو یہ مسئلہ ہے کہ متنبی پنجاب نے کس طرح قرآن حکیم کی نصوص قطعیہ کے خلاف یہود و نصاریٰ کے عقیدۂ "توہین" "تصلیب" اور "قتل عیسیٰ علیہ السلام" کی تائید پر بے جا

جسارت کا اقدام کیا اور جس حد تک اختلاف کیا اس میں بھی دعویٰ قرآنی کے خلاف اُن کی حیاتِ طیبہ کو نامراد و ناکام اور گمنام ثابت کرنے کی سعی لاحاصل کی ۔

آپ ابھی سُن چکے ہیں کہ قرآنِ عزیز نے بنی اسرائیل کے مقابلہ میں خدائے تعالیٰ کی نجات سے دعویٰ حفاظت و برتری کو کس قوتِ بیان کے ساتھ نمایاں کیا ہے " وَمَكَرُوا وَمَكَرَ اللَّهُ وَاللَّهُ خَيْرُ الْمَاكِرِينَ " " إِنِّي مُتَوَفِّيكَ وَرَافِعُكَ إِلَيَّ وَمُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِينَ كَفَرُوا " اور پھر کس زور کے ساتھ یہ اعلان کیا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے دعوئے حفاظت کو اس شان کے ساتھ پورا کیا کہ دشمن کسی حیثیت سے بھی مسیح بن مریم (علیہما السلام) پر قابو نہ پا سکے اور ہاتھ تک نہ لگا سکے ۔ " وَإِذْ كَفَفْتُ بَنِي إِسْرَائِيلَ عَنْكَ " " وَمَا قَتَلُوهُ وَمَا صَلَبُوهُ وَلَٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ وَمَا قَتَلُوهُ يَقِينًا بَلْ رَفَعَهُ اللَّهُ إِلَيْهِ "

تو اب قابلِ غور ہے یہ بات کہ ہم دنیا میں روز و شب یہ مشاہدہ کرتے رہتے ہیں کہ اگر کسی صاحبِ قوت و اقتدار ہستی کے عزیز دوست یا مصاحب کے خلاف اُن کا دشمن درپے آزار یا قتل کے درپے ہوتا ہے اور یہ سمجھ کر کہ ہم صاحبِ اقتدار ہستی کی اعانت کے بغیر دشمن کے مقابلہ میں عہدہ برآ نہیں ہو سکتے وہ صاحبِ اقتدار کی جانب رجوع کرتے ہیں اور یہ ہستی اُن کو پوری طرح اطمینان دلاتی ہے کہ دشمن اُن کو کسی طرح نقصان نہیں پہنچا سکتا بلکہ اُن تک اُس کی دسترس ہی نہیں ہونے دی جائیگی تو ہر ایک اہلِ عقل اس کا یہی مطلب لیتا ہے کہ اب کسی بھی حالت میں ان کو دشمن کا خطرہ باقی نہیں رہا مگر یہ کہ صاحبِ اقتدار ہستی یا اپنے وعدہ کا ایفا نہ کرے اور جھوٹا ثابت ہو اور یا دشمن کی طاقت اتنی زیادہ ہو کہ وہ خود بھی اس حمایت و نصرت میں مغلوب و مقہور ہو کر رہ جائے ۔

پس جب انسانی دنیا میں یہ اطلاع موصول ہو کہ صاحبِ اقتدار ہستی کے عزیز دوست

یا مصاحب کو اُس کے دشمن نے گرفتار کر لیا، مارا پیٹا، منہ پر تھوکا اور ہر طرح ذلیل و رسوا کر کے اپنے گمان میں مار بھی ڈالا اور مردہ سمجھ کر نعش اُس کے عزیزوں کے سپرد کر دی مگر حسب اتفاق نبض دیکھنے سے معلوم ہوا کہ کہیں جان اٹکی رہ گئی ہے لہذا علاج معالجہ کیا گیا اور وہ رو بصحت ہو گیا تو دنیائے انسانی اس صاحب اقتدار ہستی کے متعلق کیا رائے قائم کریگی جس نے اس مظلوم کی حمایت و نصرت کا وعدہ کیا تھا؟ یہ کہ اُس نے اپنا وعدہ پورا کیا یا نہیں کیا؟ ظاہر ہے کہ نہیں کیا خواہ قصداً نہیں کیا یا اس لئے کہ وہ مجبور رہا۔

پس اگر دنیائے انسانی کے معاملات میں صورتِ حال یہ ہے تو معلوم نہیں کہ متنبی پنجاب کے عقل و دماغ نے قادرِ مطلق خدا کے متعلق کس ذہنیت کے ماتحت یہ فیصلہ کیا کہ خدا نے عیسیٰ بن مریم (علیہما السلام) کو ہر قسم کی حفاظت و صیانت کے وعدہ کے باوجود دشمن کے ہاتھوں وہ سب کچھ ہونے دیا جس کو یہود و نصاریٰ کی اندھی تقلید میں متنبی پنجاب نے تسلیم کر لیا اور اشک شوی کے لئے صرف اس قدر اضافہ کر دیا کہ اگرچہ یہود نے صلیب و قتل کے بعد سمجھ لیا تھا کہ روح قفسِ عنصری سے نکل چکی ہے مگر حقیقتہً ایسا نہیں ہوا تھا بلکہ رمقِ جان ابھی غیر محسوس طور پر باقی تھی اس لئے اُسی طرح اُن کی جان بچ گئی جس طرح موجودہ زمانہ میں اب سے چند سال قبل جیلوں میں پھانسی دینے کا جو طریقہ رائج تھا اس کی وجہ سے کبھی پھانسی پانے کے بعد رمقِ جان باقی رہ جاتی تھی اور نعش کی سپردگی کے بعد علاج معالجہ سے وہ اچھا ہو جاتا تھا۔

بہر حال ہم تو اُس ذاتِ واحد، قادرِ مطلق خدا پر ایمان رکھتے ہیں جس نے جب کبھی بھی اپنے خاص بندوں (نبیوں اور رسولوں) سے اس قسم کا وعدہ حفاظت و صیانت کیا ہے تو پھر اُس کو پورا بھی ایسی شان سے کیا ہے جو قادرِ مطلق ہستی کے لئے شایان اور لائق ہے۔

حضرت صالح (علیہ السلام) اور ان کی قوم کے منکرینِ حق کا معاملہ سورۂ نمل میں جس معجزانہ شان کے ساتھ بیان ہوا ہے اس پر غور فرمایئے۔ ارشاد باری ہے۔

وَكَانَ فِي الْمَدِينَةِ تِسْعَةُ رَهْطٍ يُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ وَلَا يُصْلِحُونَ ۝ قَالُوا تَقَاسَمُوا بِاللَّهِ لَنُبَيِّتَنَّهُ وَأَهْلَهُ ثُمَّ لَنَقُولَنَّ لِوَلِيِّهِ مَا شَهِدْنَا مَهْلِكَ أَهْلِهِ وَإِنَّا لَصَادِقُونَ ۝ وَمَكَرُوا مَكْرًا وَمَكَرْنَا مَكْرًا وَهُمْ لَا يَشْعُرُونَ ۝ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ مَكْرِهِمْ أَنَّا دَمَّرْنَاهُمْ وَقَوْمَهُمْ أَجْمَعِينَ ۝ فَتِلْكَ بُيُوتُهُمْ خَاوِيَةً بِمَا ظَلَمُوا إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَةً لِقَوْمٍ يَعْلَمُونَ ۝ وَأَنْجَيْنَا الَّذِينَ آمَنُوا وَكَانُوا يَتَّقُونَ ۔

(نمل)

اور شہر میں نو شخص تھے جو (بہت) مفسد تھے اور کوئی کام صلاح کاری کا نہیں کرتے تھے، انھوں نے آپس میں کہا "باہم قسمیں کھاؤ کہ ہم ضرور صالحؑ اور اس کے گھر والوں پر شبخون ماریںگے اور پھر اس کے وارثوں سے کہدینگے کہ ہم اُس کے خاندان کی ہلاکت کے وقت موقعہ پر موجود ہی نہیں تھے اور قسم بخدا ہم ضرور سچے ہیں" اور انھوں نے (صالحؑ کے خلاف) خفیہ سازش کی اور ہم نے (بھی ان کی سازش کے خلاف) خفیہ تدبیر کی اور وہ ہماری مخفی تدبیر کو نہیں سمجھتے تھے پس (اے محمدؐ) دیکھو! کہ اُن کی خفیہ سازشی تدبیر کا کیا حشر ہوا؟ یہ کہ ہم نے اُن کو (مفسدوں کو) اور ان کی سرکش قوم کو سب کو ہلاک کر دیا (نگاہ اٹھاکر) دیکھو یہ (قریب ہی) ہیں اُن کے گھروں کے کھنڈر ویران ہیں اُن کے ظلم کی وجہ سے بیشک اس واقعہ میں نشانی ہے سمجھ والوں کے لئے اور ہم نے نجات دی ایمان والوں کو جو کہ پرہیزگار تھے۔

اور پھر مطالعہ کیجئے اس عظیم الشان واقعہ کا جو حضرت خاتم الانبیاء (صلی اللہ علیہ وسلم) سے تعلق رکھتا ہے اور سورۂ انفال میں دشمنانِ حق کی ذلت و رسوائی کا ابدی اعلان ہے۔

ان دونوں واقعات میں حق و باطل کے معرکوں، دشمنوں کی خفیہ سازشوں اور انبیاء علیہم السلام کی حفاظت کے لئے وعدۂ الٰہی اور اُس کے بے غل و غش پورا ہونے کا جو نقشہ قرآنِ عزیز نے پیش کیا ہے، تاریخی نگاہ سے اُن پر غور فرمایئے اور فیصلہ کیجئے کہ جس خدا نے صالح (علیہ السلام) اور خاتم الانبیاء محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھ اپنے وعدۂ حفاظت کو اس شانِ رفیع کے ساتھ پورا کیا ہو۔ کیا متنبی پنجاب کے عقیدہ کے مطابق اسی شانِ معجزانہ کے ساتھ وہ عیسیٰ (علیہ السلام) کے حق میں پورا ہوا؟ نہیں ہرگز نہیں" حالانکہ آیاتِ قرآنی شاہد ہیں کہ ان دونوں واقعات کے مقابلہ میں عیسیٰ بن مریم (علیہما السلام) سے کئے گئے وعدے زیادہ واضح تفصیلات رکھتے ہیں اور اُن میں صاف کہا گیا ہے کہ خدا کے بہترین مخفی فیصلہ کے مطابق حضرت مسیح (علیہ السلام) کے دشمن اُن کو ہاتھ تک نہ لگا سکیں گے تب ہی تو قیامت کے روز اللہ تعالیٰ اپنے جن احسانات و انعامات کو شمار کرائے گا اُن میں سے ایک بڑا انعام و احسان یہ بھی ہو گا۔

وَإِذْ كَفَفْتُ بَنِيٓ إِسْرَآءِيلَ عَنكَ — اور جبکہ ہم نے بنی اسرائیل کو تجھ سے روک دیا تھا"

متنبی پنجاب کو اگر اپنی نبوت اور مسیحیت کے افترا اور ڈھونگ کو مضبوط کرنے کے لئے حضرت مسیح کے زندہ آسمان پر اٹھائے جانے کے خلاف اس درجہ ناگواری تھی جیسا کہ متنبی کاذب کی تصنیفات سے معلوم ہوتا ہے تب بھی یہود اور نصاریٰ کی اس اندھی تقلید کے لئے مقابلہ میں جو نصوصِ قرآنی کے خلاف "کفر بواح" تک پہنچاتی اور حضرت مسیح کی شانِ رفیع کے حق میں باعث توہین و تذلیل اور وعدۂ الٰہی کی تکذیب کرتی ہے" کیا یہ کافی نہیں تھا کہ تاویلِ باطل[۱] کے

[۱] تاویل باطل اس لئے کہ حیاتِ عیسیٰ علیہ السلام سے متعلق دیگر نصوصِ قرآنی، حدیثی اور اجماعِ امت کے پیشِ نظر اس مقام پر یہ تاویل بلاشبہ باطل ہے مگر اس سے کم از کم حضرت مسیح (علیہ السلام) کی توہین اور وعدۂ الٰہی کی تکذیب کا پہلو نہیں نکلتا۔

پردہ میں اتنا ہی کہہ دیا جاتا کہ وہ اگرچہ بقیدِ حیات آسمان پر نہیں اُٹھائے گئے مگر اللہ تعالیٰ نے بند مکان سے کسی طریق پر اُن کو دشمنوں کے نرغے سے نکال کر محفوظ کر دیا اور دشمن کسی طرح اُن کو نہ پا سکے، لیکن وائے بر حالِ متنبی قادیان کہ خدا کے سچے پیغمبر حضرت عیسیٰ بن مریم (علیہما السلام) کے ساتھ بغض و عناد نے "خسر الدنیا والآخرہ" کا مصداق بنا کر ہی چھوڑا۔

قادیانی تلبیس اور اس کا جواب

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اس معرکۃ الآرا مسئلہ میں "جو ان کی عظمت اور جلالت کا زبردست نشان ہے" سورۂ آلِ عمران کی آیات کا باہمی ربط اور ترتیب ذکری خصوصیت کے ساتھ قابلِ توجہ ہے کہ متنبی کاذب نے اس میں بھی "تلبیس الحق بالباطل" کا ثبوت دے کر ناواقف کو گمراہ کرنے کی کوشش کی ہے۔

قرآنِ عزیز، سورۂ آلِ عمران میں اللہ تعالیٰ نے حضرت مسیح کے دشمنوں کے نرغہ میں گھر جانے سے متعلق جس تسلی اور وعدہ کا ذکر کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ فطری شکل وصورت یہ پیش آئی کہ جب دشمنانِ دین نے حضرت مسیح (علیہ السلام) کا ایک بند مکان میں محاصرہ کر لیا تو ایک اولوالعزم پیغمبر اور خدائے برحق کے درمیان تقرب کا جو رشتہ قائم ہے اس کے پیشِ نظر قدرتی طور پر حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کو یہ خیال پیدا ہوا کہ اب کیا پیش آنے والا ہے، راہِ حق میں جاں سپاری یا قدرتِ الٰہی کا کوئی اور کرشمہ؟ اور اگر دشمنوں سے تحفظ کے لئے کوئی کرشمہ پیش آنے والا ہے تو اس کی کیا شکل ہوگی کیونکہ بظاہر کوئی سامان نظر نہیں آتا؟ اور اگر تحفظ ہوا بھی تو کیا کچھ مصائب و آلام اُٹھانے کے بعد تحفظِ جان ہوگا یا دشمن کسی بھی صورت میں قابو نہ پا سکیں گے؟ تب اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کو مخاطب کرتے ہوئے حضرتِ عیسیٰ (علیہ السلام) کے قلب میں فطری طور پر پیدا ہونے والے سوالات کا ترتیب وار اس طرح جواب دیا "عیسیٰ! میری یہ ذمہ داری ہے کہ میں تیری مقررہ مدتِ حیات پوری کرونگا یعنی

مطمئن رہو کہ تجھ کو دشمن قتل نہ کر پائیں گے" (إِنِّي مُتَوَفِّيكَ) اور صورت یہ ہوگی کہ اس وقت میں تجھ کو اپنی جانب یعنی ملاءِ اعلیٰ کی جانب اٹھا لوں گا" (وَرَافِعُكَ إِلَيَّ) اور یہ بھی اس طرح نہیں کہ پہلے سب کچھ مصائب ہو گذریں گے اور پھر ہم تجھ کو آخر میں علاج معالجہ کرا کر اٹھائیں گے نہیں بلکہ یوں ہوگا کہ تو دشمن کے ناپاک ہاتھوں سے ہر طرح محفوظ رہے گا اور کوئی دشمن تجھ کو ہاتھ تک نہ لگا سکیگا (وَمُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِينَ كَفَرُوا) یہ تو تمہارے فطری سوالات کا جواب ہوا لیکن اس سے بھی زیادہ ہم یہ کریں گے کہ جو تیرے پیرو ہیں (خواہ غلط کار ہوں جیسا کہ نصارٰی اور خواہ صحیح العقیدہ ہوں جیسا کہ مسلمان) اُن کو قیامت تک یہود پر غالب رکھیں گے اور تا قیامِ قیامت کبھی ان کو حاکمانہ اقتدار نصیب نہیں ہوگا، باقی رہا تمام معاملات کا فیصلہ سو اس کے لئے (قیامت کا) دن مقرر ہے اُس روز سب اختلافات ختم ہو جائیں گے اور حق و باطل کا دو ٹوک فیصلہ کر دیا جائے گا۔

زیرِ بحث آیات کی یہ تفسیر جس طرح سلف صالحین اور اجماعِ امت کے مطابق ہے اسی طرح اس میں آیات میں کئے گئے متعدد وعدوں کی ترتیب میں بھی کوئی فرق نہیں پڑتا اور مقدم کو موخر اور موخر کو مقدم کرنے کی ضرورت پیش نہیں آتی مگر مرزائے قادیانی نے اپنی "مسندِ مسیحیت و نبوت" کو قائم کرنے کے لئے قرآن، احادیثِ صحیحہ اور اجماعِ اُمت کے خلاف جبکہ یہ دعوٰی کیا کہ حضرتِ عیسٰی (علیہ السلام) کی موت ہو چکی تو اس سلسلہ کی آیات میں تحریفِ معنوی کی ناکام سعی کو بھی ضروری سمجھا اور دعوٰی کیا کہ اگر مسیح (علیہ السلام) کی موت کے وقوع کو رفع الی السماء اور تطہیر اور تفوق المطیعین علی الکافرین سے قبل تسلیم نہ کیا جائیگا تو ترتیب ذکری میں فرق آجائے گا اور مقدم کو موخر اور موخر کو مقدم ماننا پڑے گا اور یہ قرآنِ عزیز کی شانِ بلاغت کے خلاف ہے لہذا یہ ماننا چاہئے کہ "إِنِّي مُتَوَفِّيكَ" کے وعدہ کا وقوع ہو چکا

اور عیسیٰ (علیہ السلام) پر موت آچکی۔

مرزائے کادیانی کی یہ "تلبیس" اگرچہ اُن حضرات سے تو پوشیدہ نہیں رہ سکتی جو عربیت اور قرآن کے اسلوبِ بیان کا ذوق رکھتے ہیں، لیکن عوام کو مغالطہ میں ڈال سکتی ہے اس لئے اس عنوان کے شروع ہی میں آیات کی تفسیر کو اس طرح بیان کر دیا گیا کہ مرزا کی جانب سے جو تلبیس کی گئی ہے وہ خود بخود زائل ہو جائے تاہم مزید تشریح کے لئے یہ اور اضافہ ہے کہ ترتیبِ ذکری کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ کلام میں اگر چند باتیں ترتیب وار ذکر کی گئی ہیں تو اُن کا وقوع بھی اس طرح ہونا چاہئے کہ اُس کلام میں ذکر کردہ ترتیب بگڑنے نہ پائے اور مقدم کو موخر اور موخر کو مقدم کرنا نہ پڑے اور یہ جب ضروری ہے کہ کلام کی فصاحت و بلاغت کا تقاضہ ہی یہ ہو کہ ترتیب ذکری میں فرق نہ آنے پائے ورنہ تو بعض مقامات پر تقدیم و تاخیر کو بھی فصاحت کی جان سمجھا جاتا ہے اور یہ علم معانی کا مشہور مسئلہ ہے۔

پس قرآن کی ان آیات میں جمہور اہلِ اسلام کی تفسیر کے مطابق ترتیبِ ذکری بحالہ قائم ہے اس لئے کہ خدا کی جانب سے پہلا وعدہ یہ ہے کہ میں تمہاری مقررہ مدت پوری کروں گا "اِنّی مُتَوَفِّیكَ" یعنی تمہاری موت ان دشمنوں کے ہاتھ سے نہیں ہوگی بلکہ تم اپنی طبعی موت سے مرو گے مگر اس پہلے وعدہ کو پورا کرنے کے لئے متعدد صورتیں ہو سکتی تھیں یہ کہ دشمنوں پر باہر سے اچانک حملہ ہو جائے اور وہ فرار ہو جائیں یا سب وہیں کھیت رہیں اور حضرت مسیح (علیہ السلام) ان کی زد سے بچ جائیں، یا یہ کہ قوم عاد و ثمود کی طرح زمین یا آسمان سے قدرتی عذاب آکر ان سب کو ہلاک کر دے، یا یہ کہ حضرت مسیح کسی ترکیب سے اُن کے نرغہ میں سے محفوظ نکل جائیں اور ان کی دسترس سے باہر ہو جائیں، یا یہ کہ اللہ تعالیٰ اپنے کرشمۂ قدرت سے عیسیٰ (علیہ السلام) کو مکان بند رہتے ہوئے ملاءِ اعلیٰ کی جانب اٹھا لے وغیرہ وغیرہ

تو قرآن نے بتایا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کو خبر دی کہ پہلے وعدہ کا ایفاء مسطورہ بالا آخری شکل یعنی "وَرَافِعُكَ إِلَيَّ" کی شکل میں ہوگا اور ہوگا بھی ایسی قدرت کاملہ کے ہاتھوں کہ اس محاصرہ کے باوجود دشمن اپنے ناپاک ہاتھ تجھ کو نہیں لگا سکیں گے اور میں ان کافروں کے ہاتھ سے تجھ کو پاک رکھوں گا "وَمُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِينَ كَفَرُوا" اور ان باتوں کے علاوہ یہ بھی ہوگا کہ میں تیرے پیرووں کو تیرے منکروں پر قیامت تک غالب رکھوں گا بہرحال بعد کے یہ تینوں وعدے بالترتیب جب ہی عمل میں آئیں گے کہ پہلے وعدۂ اول وقوع پذیر ہو جائے یعنی تیری موت ان کے ہاتھوں نہ ہو بلکہ اپنی مقررہ مدت پر پہنچ کر طبعی موت آئے، ان آیات میں پہلے وعدہ کے متعلق یہ نہیں کہا گیا کہ میں اول تجھ کو ماروں گا اور پھر بالترتیب یہ سب امور انجام دوں گا کیونکہ یہ قول صرف جاہل ہی کہہ سکتا ہے لیکن جس کو گفتگو کا معمولی بھی سلیقہ ہے وہ ہرگز ایسا کہنے کی جرأت نہیں کریگا کیونکہ ترتیبِ ذکری کے لئے یہ تو ہونا چاہئے کہ ان امور کے وقوع میں ایسی صورت نہ پیدا ہو جائے کہ ترتیب میں فرق لاکر تقدیم و تاخیر کا عمل جاری کرنا پڑے لیکن اگر کوئی شے زمانہ کا امتداد اور طوالت چاہتی ہے اور اس کے آخری حصہ کا وقوع اُن تمام امور کے بعد پیش آتا ہے جو اس کے بعد مذکور تھے مگر ترتیبِ ذکری میں مطلق کوئی فرق نہیں آتا تو ایسی شکل میں اُس وقوع کے متاخر ہو جانے سے کسی عالم کے نزدیک بھی کلام کی فصاحت و بلاغت میں نقص واقع نہیں ہوتا اور نہ اس قسم کے وقوعِ ترتیبی کا ترتیبِ ذکری کے ساتھ کوئی تعلق ہوتا ہے۔

پس مسئلہ زیرِ بحث میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طبعی موت کا وقوع کبھی بھی ہو اُس کا ترتیبِ ذکری سے مطلق کوئی علاقہ نہیں ہے، ہاں تو "إِنِّي مُتَوَفِّيكَ" کہہ کر یہ بتایا گیا ہے کہ دیے گئے متعدد وعدوں میں پہل اور اولیت اس وعدہ کو حاصل ہے کہ تمہاری موت کا

سبب یہ یہود بنی اسرائیل نہیں ہوں گے بلکہ جب بھی یہ مقررہ مدت پوری ہوگی اُس طریق پر
ہوگی جو عام طور سے میری جانب منسوب کی جاتی ہے (یعنی طبعی موت) اور یہ وعدہ بہر حال
باقی تین وعدوں سے پہلے ہی رہا تب ہی تو یہ تینوں وعدے وقوع میں آسکے، اور اگر
کہیں دشمن حضرت مسیح (علیہ السلام) کی موت کا سبب بن گئے ہوتے تو پھر "رفع" اور
"تطہیر" کے لئے کوئی صورت ہی نہ رہ جاتی اور مرزا کادیانی کی طرح باطل اور رکیک تاویلات
کی آڑ لینی پڑتی اور آیات زیرِ بحث کی "روح" فنا ہو کر رہ جاتی۔ اور یہ اس لئے کہ اگر "رفع"
سے رفعِ روحانی اور "تطہیر" سے روحانی پاکی مراد لئے جائیں تو یہ قطعاً بے محل اور بے
موقع ہوگا کیونکہ قرآن کے ارشاد کے مطابق یہ وعدے حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کو
دیئے جا رہے ہیں تو حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کو یہ بتانا کہ تمہارے متعلق یہود کا یہ اعتقاد
"کہ تم کاذب اور ملعون ہو" غلط ہے اور تم مطمئن رہو کہ میں تمہارا رفع روحانی کرنے والا ہوں
قطعاً عبث تھا کیونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام پیغمبر خدا ہیں اور جانتے ہیں کہ یہود کا افترار
کیا حقیقت رکھتا ہے نیز یہود کو حضرت مسیح کے رفعِ روحانی کا پتہ نہیں ہو سکتا کیونکہ یہ
معاملہ عالم غیب سے متعلق ہے تو خدائے برتر کا یہ ارشاد نہ حضرت مسیح کی بر محل تسلی کا باعث ہو سکتا
تھا اور نہ یہود کے لئے سود مند اور یہی حال دوسرے وعدۂ تطہیر کا ہے بلکہ جب بقولِ کادیانی
یہود کے ہاتھوں حضرت مسیح صلیب پر چڑھا دیئے گئے تو نعش پا لینے کے بعد شاگردوں کا
مرہم عیسیٰ لگا کر چنگا کر لینے اور پھر منجانب اللہ حق کی ہدایت و ارشاد کے لئے مامور کئے گئے
تھے ان سے جان بچا کر بھاگ جانے اور زندگی بھر گمنامی میں زندگی بسر کرتے رہنے کے بعد
"رَافِعُكَ إِلَيَّ" اور "مُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِينَ كَفَرُوا" کہہ دینے سے نہ یہود کے عقیدہ متعلق مسیحؑ
کی ہی تردید ہوگی اور نہ ایک غیر جانبدار انسان ہی یہ سمجھ سکے گا کہ ایسے موقعہ پر جبکہ

عیسیٰ (علیہ السلام) دشمنوں کے نرغے میں ہیں اور جبکہ اُن کو یہ یقین ہے کہ میں خدا کا پیغمبر ہوں اور موت کے بعد رفع روحانی اور تطہیر لازم شے ہے" ان تسلیوں اور وعدوں کا کیا فائدہ ہے خصوصاً جبکہ اُن کے ساتھ دشمن نے وہ سب کچھ کرلیا جو وہ کرنا چاہتا تھا۔

البتہ جمہور اہلِ حق کی تفسیر کے مطابق آیاتِ قرآنی کی روح اپنی معجزانہ بلاغت کے ساتھ پوری طرح ناطق ہے کہ یہ وعدے حضرت مسیحؑ سے جس طرح کئے گئے وہ برمحل اور فطری اضطراب کے لئے بلاشبہ باعثِ تسکین ہیں اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی معرفت کا وقت کے یہود و نصاریٰ کے وراثتی عقائد باطلہ کی تردید کے لئے کافی اور مدلل۔

جمہور اہلِ حق کی یہ تفسیر توفی کے معنی "مقررہ مدت پوری کرنا" اختیار کرکے کی گئی ہے جس کا حاصل (توفی بمعنی موت) نکلتا ہے لیکن توفی کے یہ حقیقی معنی نہیں ہیں بلکہ بطور کنایہ کے مستعمل ہوئے ہیں کیونکہ لغتِ عرب میں اس کا مادہ (میٹر) وفی، یفی، وفاءٌ ہے جس کے معنی "پورا کرنے" کے آتے ہیں اور اس کو جب باب تفعل میں لے جاکر "توفی" بناتے ہیں تو اس کے معنی "کسی شے کو پورا پورا لے لینا" یا "کسی شے کو سالم قبضہ میں کرلینا" آتے ہیں۔ (توفی۔ اخذہ وافیاً تاماً یقال "توفیت من فلان مالی علیہ") اور چونکہ موت میں بھی، اسلامی عقیدہ کے مطابق۔ روح کو پورا لے لیا جاتا ہے اس لئے کنایہ کے طور پر "کہ جس میں حقیقی معنی بحالہ محفوظ رہا کرتے ہیں" توفی بمعنی موت مستعمل ہوتا ہے اور کہتے ہیں "توفاہ اللہ ای اماتہ" لیکن اگر موقعہ پر دوسرے دلائل ایسے موجود ہوں جن کے پیشِ نظر توفی کے حقیقی معنی لئے جاسکتے ہوں یا حقیقی کے ماسوا دوسرے معنی بن ہی نہ سکتے ہوں تو اُس مقام پر خواہ فاعل "اللہ تعالیٰ" اور مفعول "ذی روح انسان" ہی کیوں نہ ہو وہاں حقیقی معنی "پورا لے لینا" ہی مراد ہوں گے مثلاً آیت "اَللّٰہُ یَتَوَفَّی الْاَنْفُسَ حِیْنَ مَوْتِھَا وَالَّتِیْ لَمْ تَمُتْ فِیْ مَنَامِھَا" اللہ پورا لے لیتا ہی

جانوں کو اُن کی موت کے وقت اور اُن جانوں کو جن کو ابھی موت نہیں آئی ہے پورا لے لیتا ہے نیند میں "والتی لم تمت" کے لئے بھی لفظ "توفی" بولا گیا یعنی ایک جانب یہ صراحت کی جا رہی ہے کہ یہ وہ جانیں (نفوس) ہیں جن کو موت نہیں آئی اور دوسری جانب یہ بھی بصراحت کہا جا رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نیند کی حالت میں اُن کے ساتھ "توفی" کا معاملہ کرتا ہے تو یہاں اللہ تعالیٰ فاعل ہے "متوفی" اور نفس انسانی مفعول ہے "متوفٰی" مگر پھر بھی کسی صورت سے "توفی بمعنی موت" صحیح نہیں ہیں ورنہ تو قرآن کا جملہ "وَالَّتِیْ لَمْ تَمُتْ" العیاذ باللہ مہمل ہو کر رہ جائیگا یا مثلاً "وَهُوَ الَّذِیْ یَتَوَفّٰکُمْ بِالَّیْلِ وَیَعْلَمُ مَا جَرَحْتُمْ بِالنَّهَارِ۔ اور وہی (اللہ) ہے جو پورا لے لیتا یا قبضہ میں کر لیتا ہے تم کو رات میں اور جانتا ہے جو تم کماتے ہو دن میں" میں بھی کسی طرح توفی بمعنی موت نہیں بن سکتے حالانکہ توفی کا فاعل اللہ اور مفعول انسانی نفوس ہیں، یا مثلاً آیت "حَتّٰٓی اِذَا جَآءَ اَحَدَکُمُ الْمَوْتُ تَوَفَّتْهُ رُسُلُنَا: یہاں تک کہ جب آتی ہے تم میں سے ایک کسی کو موت، قبض کر لیتے ہیں یا پورا لے لیتے ہیں اس کو ہمارے بھیجے ہوئے (فرشتے)" میں ذکر موت ہی کا ہو رہا ہے لیکن پھر بھی "توفتہ" میں توفی کے معنی موت کے نہیں بن سکتے ورنہ بے فائدہ تکرار لازم آئے گا یعنی "اَحَدَکُمُ الْمَوْتُ" میں جب لفظ "موت" کا ذکر آچکا تو اب "تَوَفَّتْهُ" میں بھی اگر توفی کے معنی موت ہی کے لئے جائیں تو ترجمہ یہ ہو گا، "یہاں تک کہ جب آتی ہے تم میں سے ایک کسی کو موت، موت لے آتے ہیں ہمارے بھیجے ہوئے (فرشتے) اور ظاہر ہے کہ اس صورت میں دوبارہ لفظِ موت کا ذکر بے فائدہ ہے اور کلام فصیح و بلیغ اور معجز تو کیا روز مرہ کے محاورہ اور عام بول چال کے لحاظ سے بھی پست اور لاطائل ہو جاتا ہے البتہ اگر "توفی" کے حقیقی معنی "کسی شے پر قبضہ کرنا یا اس کو پورا لے لینا" مراد لئے جائیں تو قرآن عزیز کا مقصد ٹھیک ادا ہو گا اور کلام بھی اپنے حدِ اعجاز پر قائم رہے گا۔

اب ہر ایک عاقل غور کر سکتا ہے کہ یہ دعویٰ کرنا کہ توفّٰی کے حقیقی معنی موت کے ہیں خصوصاً جبکہ فاعل خدا ہو اور مفعول ذی روح کہاں تک صحیح اور درست ہے۔

بہرحال اس موقع پر "موت" اور "توفی" دونوں کا ساتھ ساتھ بیان ہونا اور دونوں کا ایک ہی معمول ہونا اور پھر دونوں کے معنی میں فرق و تفاوت اس بات کے لئے واضح دلیل ہے کہ یہ دونوں مرادف الفاظ نہیں ہیں اور جس طرح لیث و اسد (بمعنی شیر) ابل و جمل (بمعنی اونٹ) نون و حوت (بمعنی مچھلی) وغیرہ اسماء کا اور جمعؔ، شملؔ، کسبؔ (بمعنی جمع ہونا) اور لبثؔ مکثؔ (بمعنی ٹھہرنا) اور عطش، ظمأ (پیاس) اور جوعؔ، سغبؔ (بمعنی بھوک) مصادر کا حال ہے، موت اور توفّی کے درمیان وہ معاملہ نہیں ہے بلکہ اُن کے حقیقی معانی میں نمایاں فرق ہے۔

اور مثلاً آیت "فَأَمْسِكُوهُنَّ فِي الْبُيُوتِ حَتَّىٰ يَتَوَفَّاهُنَّ الْمَوْتُ" پس روکے رکھو اُن (عورتوں) کو گھروں میں یہاں تک کہ لے لے اُن کو موت" میں موت کو فعلِ توفّی کا فاعل قرار دیا گیا ہے اور ہر ایک زبان کی نحو (گرامر) کا یہ مسلمہ مسئلہ ہے کہ فاعل اور فعل ایک نہیں ہوتے چونکہ فعل، فاعل سے صادر ہوتا ہے، عین ذاتِ فاعل نہیں ہوا کرتا تو اس سے یہ بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ توفی کے حقیقی معنی "موت" کے ہرگز ہرگز نہیں ہیں، ورنہ اس کا اطلاق جائز نہیں ہو سکتا تھا۔

ان تین مقامات کے علاوہ سورۂ بقر کی آیت۔

ثُمَّ تُوَفَّىٰ كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ — پھر پورا دیا جائے گا ہر ایک نفس کو جو کچھ اس نے کمایا ہے۔

اور سورۂ نحل کی آیت

وَتُوَفَّىٰ كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ — اور پورا دیا جائے گا ہر نفس کو جو کچھ اس نے کمایا ہے۔

میں بھی توفی کا فاعل اللہ تعالیٰ اور مفعول نفسِ انسانی ہے تاہم یہاں توفّی بمعنی موت نہیں

بن سکتے اور یہ بہت واضح اور صاف بات ہے۔

غرض ان آیات میں باوجود اس امر کے کہ "توفی" کا فاعل اللہ تعالیٰ اور اُس کا مفعول "انسان یا نفسِ انسانی" ہے پھر بھی باجماعِ اہلِ لغت و تفسیر "موت کے معنیٰ" نہیں ہو سکتے خواہ اس لئے کہ دلیل اور قرینہ اس معنی کے خلاف ہے اور یا اس لئے کہ اُس مقام پر توفی کے حقیقی معنی (پورا لے لینا یا قبض کر لینا) کے ماسوا "موت کے معنیٰ" کسی طرح بن ہی نہیں سکتے۔

تو مرزائے قادیانی کا یہ دعویٰ کہ "توفی" اور "موت" مرادف الفاظ ہیں یا یہ کہ توفی کا فاعل اگر اللہ تعالیٰ اور مفعول، انسان یا نفس انسانی ہو تو اُس جگہ صرف "موت" ہی کے معنی ہوں گے، دونوں دعوئے باطل اور نصوصِ قرآن کے قطعاً مخالف ہیں۔ "فَهَاتُوا بُرْهَانَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ"۔

توفی اور موت یقیناً مرادف الفاظ نہیں ہیں اور توفی کے حقیقی معنی "موت" نہیں بلکہ "پورا لے لینا یا قبض کر لینا" ہیں۔ قرآن عزیز سے اس کی ایک واضح دلیل یہ ہے کہ پورے قرآن میں کسی ایک جگہ بھی موت کا فاعل اللہ تعالیٰ کے سوا اور کسی کو قرار نہیں دیا مگر اس کے برعکس توفی کا فاعل متعدد مقامات پر ملائکہ (فرشتوں) کو ٹھیرایا ہے مثلاً سورۂ نساء میں ہے "إِنَّ الَّذِينَ تَوَفَّاهُمُ الْمَلَائِكَةُ۔ بیشک وہ لوگ جن کو فرشتوں نے قبض کر لیا یا پورا پورا لے لیا" اور سورۂ انعام میں ہے "توفته رسلنا۔ قبض کر لیا یا پورا لے لیا اُس کو ہمارے بھیجے ہوئے (فرشتوں) نے اور سورۂ سجدہ میں ہے "قُلْ يَتَوَفَّاكُمْ مَلَكُ الْمَوْتِ" (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کہدیجئے قبض کرے گا تم کو موت کا فرشتہ" اور سورۂ انفال میں ہے وَلَوْ تَرَىٰ إِذْ يَتَوَفَّى الَّذِينَ كَفَرُوا الْمَلَائِكَةُ۔ اور کاش کہ تو دیکھے جس وقت کہ قبض کرتے ہیں فرشتے اُن لوگوں (کی روحوں) کو جنھوں نے کفر کیا ہے۔

ان تمام مقامات پر اگرچہ توفی "کنایۃً" بمعنی موت استعمال ہوا ہے لیکن پھر بھی چونکہ اُس کی نسبت اللہ تعالیٰ کی بجائے ملائکہ اور ملک الموت کی جانب ہو رہی تھی اس لئے لفظ "توفی" کا اطلاق کیا گیا اور لفظ "موت" استعمال نہیں کیا گیا اور یہ صرف اس لئے کہ موت تو اللہ کا فعل ہے اور موت کے وقت انسان کا یعنی روحِ انسانی کا قبض کرنا اور اس کو پورا پورا لے لینا یہ فرشتوں کا عمل ہے، تو جن مقامات میں یہ بتانا مقصود ہے کہ جب خدا کسی کی اجل پوری کر دیتا اور موت کا حکم صادر فرماتا ہے تو اس کی صورتِ عمل کیا پیش آتی ہے ان مقامات میں موت کا اطلاق ہرگز موزوں نہیں تھا بلکہ "توفی" کا لفظ ہی اُس حقیقت کو ادا کر سکتا تھا۔

موت اور توفی کے درمیان قرآنی اطلاقات کے پیشِ نظر ایک بہت بڑا فرق یہ بھی ہے کہ قرآنِ عزیز نے جگہ جگہ "موت" اور "حیات" کو تو مقابل ٹھیرایا ہے لیکن "توفی" کو کسی ایک مقام پر بھی "حیات" کا مقابل قرار نہیں دیا۔ مثلاً سورۂ ملک میں ہے "هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوۃَ۔ خدا ہی وہ ذات ہے جس نے پیدا کیا موت کو اور زندگی کو" اور سورۂ فرقان میں ہے "وَلَا یَمْلِکُوْنَ مَوْتًا وَّلَا حَیٰوۃً۔ اور وہ نہیں مالک ہیں موت کے اور نہ حیات کے" اور اسی طرح ان دونوں کے مشتقات کو مقابل ٹھیرایا ہے مثلاً "کَیْفَ تُحْیِ الْمَوْتٰی[۱]" "یُحْیِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا[۲]" "فَاَحْیَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا[۳]" "وَاُحْیِ الْمَوْتٰی بِاِذْنِ اللّٰهِ[۴]" "وَهُوَ یُحْیِ الْمَوْتٰی[۵]" (وغیر ذلک کثیرا)۔ البتہ توفی کے حقیقی معنی میں چونکہ یہ وسعت موجود ہے کہ اسلام کے نقطۂ نظر سے موت کی جو حقیقت ہے بطریقِ کنایہ اس پر بھی حسب موقعہ اس کا اطلاق ہو سکتا ہے تو یہ استعمال اور اطلاق بھی جائز ٹھیرا اور اس میں کسی کو بھی اختلاف نہیں۔

---

[۱] بقرہ [۲] روم [۳] بقرہ، نحل، جاثیہ [۴] آل عمران [۵] شوریٰ۔

"توفی" کے معنی کی اس مفصل تشریح و توضیح کا حاصل یہ ہوا کہ لغتِ عرب اور قرآنی اطلاقات دونوں اس کے شاہد ہیں کہ توفّی اور موت دونوں کے حقیقی معنی میں بھی اور دونوں کے اطلاقات میں بھی واضح فرق ہے اور دونوں مرادف الفاظ نہیں ہیں خواہ توفی کا فاعل اللہ تعالیٰ اور مفعول "انسان اور روحِ انسانی" ہی کیوں نہ ہو۔ مگر اسلامی نقطۂ نظر سے چونکہ موت ایک ایسی حقیقت کا نام ہے جس پر بطریقِ "توسع" اور "کنایہ" توفّی کا اطلاق کیا جا سکتا ہے، پس جس مقام پر قرینہ اور محلِ استعمال کا تقاضہ یہ ہو گا کہ وہاں توفّی بول کر کنایۃً موت کے معنی لئے جانے چاہئیں تو اس جگہ "موت" کے معنی مراد ہوں گے لیکن اس کے برعکس اگر دلیل، قرینہ اور محلِ استعمال حقیقی معنی کا متقاضی ہے تو اُس جگہ وہی معنی مراد ہوں گے اور اُن ہی کو مقدم سمجھا جائے گا خواہ کنائی معنی وہاں قطعاً نہ بن سکتے ہوں اور خواہ بن سکتے ہوں مگر محلِ استعمال اور دوسرے دلائل اُس کو مرجوح یا ممنوع قرار دیتے ہوں۔

یہی وہ حقیقت ہے جس کو بہ نظرِ غائر مطالعہ کرنے کے بعد لغت کے مشہور امام ابوالبقاء نے یہ تصریح کی ہے کہ عوام میں توفی کے معنی اگرچہ "موت" کے سمجھے جاتے ہیں مگر خواص کے نزدیک اُس کے معنی "پورا لے لینا" اور "قبض کرنا" ہیں۔ فرماتے ہیں۔ التوفی الاماتة وقبض الروح وعلیه استعمال العامة والاستیفاء واخذ الحق وعلیه استعمال البلغاء۔

الحاصل، سورۂ مائدہ کی آیت "اِنِّیْ مُتَوَفِّیْکَ" میں اگر حقیقی معنی مراد ہوں۔ جیسا کہ جلیل القدر علماء تفسیر و لغت نے اختیار کئے ہیں —— تب بھی مرزائے قادیانی کے علی الرغم آیاتِ زیرِ بحث کا یہ مطلب ہو گا کہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کو یہ تسلی دی گئی "اے عیسیٰ! میں تجھ کو پورا پورا لے لینے والا ہوں یا تجھ کو قبض کرنے والا ہوں

اور صورت یہ ہوگی کہ میں تجھ کو اپنی جانب (ملاءِ اعلیٰ کی جانب) اٹھا لینے والا ہوں اور تجھ کو دشمنوں کے ناپاک ہاتھوں سے پاک رکھنے والا ہوں الخ" یعنی جب شروع میں یہ بتایا کہ تجھ کو قبض کر لیا جائیگا یا پورا لے لیا جائیگا تو قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوا کہ قبض کرنے اور پورا لے لینے کی مختلف شکلیں ہیں مثلاً ایک یہ کہ موت آجائے اور روح کو قبض کر لیا جائے اور پورا لے لیا جائے اور دوسری یہ کہ زندہ ملاءِ اعلیٰ کی جانب (اپنی جانب) اُٹھا لیا جائے تو یہاں کونسی صورت پیش آئے گی پس اس کو صاف اور واضح کرنے کے لئے کہا گیا کہ دوسری شکل اختیار کی جائے گی تاکہ دشمنوں کی سازشوں کے مقابلہ میں معجزانہ تدبیر کے ذریعہ وعدۂ الٰہی "وَمَكَرُوا وَمَكَرَ اللّٰهُ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمَاكِرِينَ" پورا ہو اور "وَإِذْ كَفَفْتُ بَنِي إِسْرَائِيلَ عَنْكَ" کا عظیم الشان مظاہرہ ہو جائے اور "توفی" اور "رفع" ہو جانے پر نتیجہ یہ نکلے کہ ذاتِ اقدس کافروں کے ہاتھ سے ہر طرح محفوظ ہو جائے اور اس طرح وعدۂ ربانی "وَمُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِينَ كَفَرُوا" بغیر کسی تاویل کے صحیح ہو جائے اور تاویلِ باطل کے ذریعہ شک اور تردد یا حقیقتِ حال سے انکار صرف اُن ہی قلوب کا حصہ رہ جائے جو قرآن سے علم حاصل کرنے کی بجائے اوّل اپنے ذاتی اوہام و ظنون کو راہنما بناتے اور پھر قرآن کے منطوق و مفہوم کے خلاف اس کے منہ میں اپنی زبان رکھ دینا چاہتے ہیں اور اس سے وہ کہلانا چاہتے ہیں جو وہ خود کہنا نہیں چاہتا مگر وہ قرآنِ عزیز کی اس صفت سے غافل رہتے ہیں "لَا يَأْتِيهِ الْبَاطِلُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهِ تَنْزِيلٌ مِنْ حَكِيمٍ حَمِيدٍ۔ اس قرآن کے آگے سے اور نہ اس کے پیچھے سے (کسی جانب سے بھی) باطل نہیں پھٹک سکتا، یہ اُتارا ہوا ہے ایسی ہستی کی جانب سے جو حکمت والی، خوبیوں والی ہے"

متنبیِ پنجاب کو جب قرآنِ عزیز کی ان نصوص سے متعلق تحریفِ معنوی میں ناکامی

Spau Kal [illegible]

ہوئی اور خسران کے سوا کچھ ہاتھ نہ آیا تو مجبور ہو کر اور قرآنِ عزیز کے اطلاقات، احادیثِ صحیحہ کی اطلاعات اور اجماعِ امت کے فیصلہ کو پس پشت ڈال کر فلسفہ کی آغوش میں پناہ لینے کا ارادہ کیا اور اپنی تصانیف میں یہ ہرزہ سرائی کی کہ اگر حضرت مسیحؑ آسمان پر زندہ اٹھا لئے گئے تو یہ عقل کے خلاف ہے اس لئے کہ کوئی مادی جسم ملاءِ اعلیٰ تک پرواز نہیں کر سکتا اور کر بھی جاتا تو اتنی طویل مدت کیسے زندہ ہے اور وہاں کھانے، پینے اور رفع حاجت کرنے کی صورت کیسے عمل میں آسکتی ہے؟

قدرتِ الٰہی کے معجزانہ افعال کو خلافِ عقل کہہ کر بات اگر ختم ہو سکتی تو شاید قادیانی کی یہ فلسفیانہ موشگافی درخورِ اعتنا سمجھی جا سکتی۔ لیکن آج فلسفۂ جدید بہ شکل سائنس ترقی کر کے جس حد تک پہنچ چکا ہے وہاں نظریات (Thioris.) نہیں بلکہ مشاہدات اور عملیات (Practicles) اس بات کو ثابت کر رہے ہیں کہ فضا کے موانعات کو اگر آہستہ آہستہ ہٹا دیا جائے یا ان کو ضبط (Control.) میں لے آیا جائے تو مادی جسم کے لئے غیر معلوم بلندی تک پہنچنا ممکن العمل ہو جائے گا اور اس کے لئے جو جدوجہد وہ کر رہے ہیں اس کو ممکن العمل سمجھ کر ہی کر رہے ہیں اور سائنٹیفک (Scintific.) طریقہ پر کر رہے ہیں، پس اگر آج کا انسان میلوں اوپر ہوائی جہاز کے ذریعہ جا سکتا ہے اور ٹیلی ویژن کے ذریعہ ہزاروں میل سے مادی انسان کے ساتھ باتیں کرتے وقت اُس کے جسم کی تصویر لے سکتا ہے اور ہوا اور آفتاب کی لہروں اور شعاعوں پر کنٹرول کر کے ہزاروں میل تک اپنی آواز کو بذریعہ ریڈیو نشر کر سکتا ہے اور ہزاروں برس کے گذرے ہوئے واقعات کو فضا میں نظم کر کے آج اس طرح سُنا سکتا ہے گویا وہ سب کچھ اس وقت ہو رہا ہے تو اس انسان کے خالق بلکہ خالقِ کائنات کے متعلق ازرہِ فلسفہ یہ کہنا کہ وہ مادی جسم کو ملاءِ اعلیٰ تک کیسے لے جا سکتا ہے اپنی غباوت پر مہر کرنا نہیں تو اور کیا ہے۔

اور اگر ادویات اور غذاؤں اور حفظانِ صحت کے مختلف طریق سے عمرِ طبعی کو دوگنا اور تین گنا کیا جاسکتا اور کیا جارہا ہے نیز اگر مختلف غذاؤں کے اثرات ونتائج ہیں یہ فرق ہوسکتا ہو اور ہوتا ہے کہ کسی سے فضلہ زیادہ بنے اور کسی سے بہت کم بنے اور کسی سے قطعاً نہ بنے بلکہ وہ خالص خون کی شکل میں تحلیل ہوجائے اور اگر انسان اپنی ریاضتوں اور مجاہدوں کے ذریعہ روحانی قوت کو بڑھا کر آج اس دنیا میں دنوں، ہفتوں بلکہ مہینوں بغیر خوردونوش زندہ رہ سکتا ہے تو مجبور انسانوں کی ان کامیاب کوششوں کو صحیح سمجھنے کے باوجود خالقِ ارض وسماوات کی جانب حضرت مسیحؑ کی رفعتِ آسمانی پر سطورہ بالا شکوک پیش کرنا یا اُن کے پیش نظر ان کے بجسدِ عنصری ملاءِ اعلیٰ تک پہنچنے اور وہاں زندہ رہنے کا انکار کرنا اگر جہالت نہیں تو اور کیا ہے؟

حقیقت یہ ہے کہ جو شخص علمی حقائق سے ناآشنا اور علومِ قرآن سے محروم ہے وہ "خلافِ عقل" اور "ماورارِ عقل" ان دونوں باتوں کے درمیان فرق کرنے سے عاجز ہے اور اس لئے ہمیشہ ماورارِ عقل کو خلافِ عقل کہہ کر پیش کرتا رہتا ہے۔

دراصل انسان کی فکری گمراہیوں کا سرچشمہ صرف ۲ ہی باتیں ہیں ایک یہ کہ انسان "عقل" سے اس درجہ بے بہرہ ہوجائے کہ ہر ایک بات بے سمجھے بوجھے مان لے اور اندھوں کی طرح ہر ایک راہ پر چلنے لگے دوسری بات یہ کہ جو حقیقت بھی عقل سے بالاتر نظر آئے اس کو فوراً جھٹلا دے اور یہ یقین کرلے کہ جس شے کو اُس کی سمجھ یا چند انسانوں کی سمجھ ادراک نہیں کرسکتی وہ شے حقیقۃً وجود نہیں رکھتی اور تکذیب کے لائق ہے حالانکہ بہت سی باتیں وہ ہیں جو ایک دور کے تمام عقلاء کے نزدیک ماورارِ عقل سمجھی جاتی ہیں، اس لئے کہ اُن کی عقلیں اُن باتوں کا ادراک کرنے سے عاجز ہیں مگر وہی باتیں علمی ترقی کے دوسرے دور میں جاکر نہ صرف ممکن الوقوع قرار پاتی بلکہ مشاہدہ اور تجربہ میں آجاتی ہیں

پس اگر ہر ایک وہ شے جو کسی ایک انسان یا جماعت یا اس کے دور کے تمام اہلِ عقل کے نزدیک ماورارِ عقل تھی "خلاف عقل" کہلانے کی مستحق تھی تو وہ دوسرے دور میں کیوں عقل کیلئے ممکن ہوئی بلکہ مشاہدہ میں آگئی۔

قرآن عزیز نے گمراہی کی اس پہلی حالت کو (جہل، ظن، خرص (اٹکل)) سے تعبیر کیا ہے اور دوسری حالت کو "الحاد" کہا ہے اور یہ دونوں حالتیں "علم وعرفان" سے محرومی کا نتیجہ ہوتی ہیں۔

خلافِ عقل اور ماورارِ عقل کے درمیان یہ فرق ہے کہ خلافِ عقل بات وہ ہو سکتی ہے جس کے نہ ہو سکنے کے متعلق علم ویقین کی روشنی میں مثبت دلائل وبراہین موجود ہوں اور عقل، دلیل وبرہان اور علم یقین سے یہ ثابت کرتی ہو کہ ایسا ہونا ناممکن اور محالِ ذاتی ہے اور ماورارِ عقل اُس بات کو کہتے ہیں کہ بعض باتوں کے متعلق عقل ہی کا یہ فیصلہ ہے کہ چونکہ انسانی عقل کا ادراک ایک خاص حد سے آگے نہیں بڑھتا اور حقیقت اِسی حد پر ختم نہیں ہو جاتی لہٰذا ہر وہ بات جو عقل کے احاطہ میں نہ آسکتی ہو مگر اس کے انکار پر علم ویقین کے ذریعہ برہان ودلیل بھی دی جا سکتی ہوں تو ایسی بات کو خلاف عقل نہیں بلکہ ماورارِ عقل کہیں گے۔

خلافِ عقل اور ماورارِ عقل کے درمیان امتیاز ہی کا یہ نتیجہ ہے کہ جن چیزوں کو کل کی دنیا میں عام طور پر خلافِ عقل کہا جاتا رہا اُن کو اہلِ دانش وبینش نے خلافِ عقل نہ سمجھتے ہوئے موجودہ دور میں ممکن بلکہ موجود کر دکھایا اور کل یہی عقل کی ترقی آج کی بہت سی ماورارِ عقل باتوں کو احاطۂ عقل میں لاسکے گی اور نہ معلوم یہ سلسلہ کب تک جاری رہے گا۔

پس جو شخص حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کے بجسدِ عنصری رفع الی السمار کا اس لئے منکر ہے کہ عقلی فلسفہ اُس کا انکار کرتا ہے تو اس کا یہ دعویٰ "برہان ودلیل اور علم ویقین

کی جگہ محض جہل، ظن، اٹکل کے ماتحت ہے اور ایسے حضرات کے لئے پھر عالم غیب کی تمام ماوراءِ عقل باتوں مثلاً وحی، فرشتہ، جنت، جہنم، حشر، معاد، معجزہ وغیرہ تمام باتوں کو خلاف عقل کہہ کر جھٹلا دینا چاہئے۔

قرآنِ عزیز نے ان ہی جیسے منکرینِ حق کے متعلق صاف صاف مکذبین کا لقب تجویز کر دیا ہے۔

بَلْ كَذَّبُوا بِمَا لَمْ يُحِيطُوا بِعِلْمِهِ وَلَمَّا يَأْتِهِمْ تَأْوِيلُهُ كَذَٰلِكَ كَذَّبَ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ فَانظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الظَّالِمِينَ ۔ (یونس)

نہیں یہ بات نہیں ہے (جیسا کفار کہتے ہیں) اصل حقیقت یہ ہے کہ جس بات پر یہ اپنے علم سے احاطہ نہ کر سکے اور جس بات کا نتیجہ ابھی پیش نہیں آیا اس کے جھٹلانے پر آمادہ ہو گئے ٹھیک اسی طرح انھوں نے بھی جھٹلایا تھا جو اُن سے پہلے گذر چکے ہیں تو دیکھو ظلم کرنے والوں کا کیسا کچھ انجام ہو چکا ہے۔

آیت میں کذبوا بمالم یحیطوا بعلمہ کہہ کر جس حقیقت کا اعلان کیا گیا ہے "یعنی انسان کی عقل جس بات کا ادراک نہ کر سکے اس کو دلیل و برہان اور علم یقین کے بغیر ہی جھٹلا دینا اور صرف اس بنا پر انکار کر دینا کہ یہ بات ہماری سمجھ سے بالاتر ہے" اُس کی ایک نظیر مرزائے قادیان کا وہ انکار ہے جو حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کے "رفع الی السماء" سے متعلق ہے اور اس کے خلیفہ مسٹر لاہوری کی فلسفیانہ موشگافیاں بھی اسی بے دلیل انکار و جحود کا شعبہ ہیں۔

اس حربہ کو بھی کمزور سمجھ کر متنبی پنجاب نے پھر رُخ بدلا اور یہ دعویٰ کیا کہ اس موقعہ کے علاوہ قرآن کے کسی مقام سے یہ ثابت نہیں کیا جا سکتا کہ "رفع" سے "رفعِ روحانی" کے ماسوا کوئی معنی لئے گئے ہیں یعنی مادی شے کی جانب رفع کی نسبت کی گئی ہو لہٰذا اس مقام پر بھی رفعِ روحانی کے علاوہ معنی لینا قرآن کے اطلاق و استعمال کے خلاف ہے۔

مگر متنبی کاذب کا یہ دعویٰ اول تو بنیاداً ہی غلط ہے کیونکہ اگر کسی لفظ کے محلِ استعمال سے یا قرآن ہی کی دوسری نصوص سے ایک معنی متعین ہیں تب یہ سوال پیدا کرنا کہ یہی استعمال دوسرے کسی مقام پر جب تک ثابت نہیں ہوگا قابلِ تسلیم نہیں" حد درجہ کی نادانی ہے تا وقتیکہ دلیل سے یہ ثابت نہ کر دیا جائے کہ لغتِ عرب میں اس لفظ کا اس معنیٰ میں استعمال جائز ہی نہیں اور اگر اتمامِ حجت کے طور پر اس قسم کے بے سر سوال یا دعوے قابلِ جواب یا لائقِ رد سمجھا ہی جائے تو سورۂ والنازعٰت کی یہ آیت کافی دوانی ہے۔

ءَاَنۡتُمۡ اَشَدُّ خَلۡقًا اَمِ السَّمَآءُ ؕ بَنٰٮهَا رَفَعَ سَمۡكَهَا — (اے افرادِ نسلِ انسانی) خلقت اور پیدائش کے لحاظ سے کیا تم زیادہ بھاری اور بوجھل ہو یا آسمان، جس کو خدا نے بنایا اور اُس کے بوجھل جسم کو بلند کیا۔ (الآیہ)

اور ایک آسمان پر ہی کیا موقوف ہے یہ ہم سے لاکھوں اور کروڑوں میل دور فضاء میں سورج، چاند اور ستاروں کو خدائے برتر نے جو بلندی اور رفعت عطا کی ہے کیا یہ سب کے سب مادی اجسام نہیں ہیں؟ اور اگر ہیں اور یقیناً ہیں تو جس خالقِ ارض و سماوات نے ان مادی اجسام کا رفع کیا ہے وہ اگر ایک انسانی مخلوق کا رفع آسمانی کر دے تو اُس کو قرآن کے اطلاق و استعمال کے خلاف کہنا غباوت اور جہالت نہیں تو اور کیا ہے البتہ ثبوت درکار ہے تو اس کے لئے قرآنِ عزیز کی نصوص، صحیح احادیث اور اجماعِ اُمت سے زیادہ موثق ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے؟

حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کا رفع سماوی اور چند جذباتی باتیں

مرزائے کادیانی نے اگرچہ اس مسئلہ میں جمہور کے خلاف یہود و نصاریٰ کی پیروی میں تحریفِ مطالب کی کافی سعی ناکام کی ہے اور مسٹر لاہوری نے بھی تفسیرِ قرآن میں تحریفِ معنوی کے ذریعہ اپنے

مقتدا کی مدد کی تاہم دل کا چور اُن کو مطمئن نہیں کرسکا اور اس لئے انھوں نے دلائل و براہین کی جگہ جذبات کو دلیلِ راہ بنایا اور کبھی تو یہ کہا کہ جو لوگ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کو آسمان پر زندہ تسلیم کرتے ہیں وہ ان کو خاتم الانبیاء محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر فضیلت دیتے ہیں کہ آپ زمین پر ہوں اور حضرت عیسیٰ آسمان پر، یہ تو سخت توہین کی بات ہے۔

لیکن علمی حلقوں میں اس لچر اور پوچ جذبہ کی کیا قدر و قیمت ہو سکتی ہے جبکہ ہر ایک مذہبی انسان اس حقیقت سے بخوبی آشنا ہے کہ اگرچہ فرشتے ہمیشہ بقیدِ حیات ملاءِ اعلیٰ میں موجود اور سکونت پذیر ہیں تاہم اُن سب کے مقابلہ میں بلکہ اُن کی جلیل القدر ہستیوں مثلاً جبرئیل و میکائیل کے مقابلہ میں بھی ایک مفضول سے مفضول نبی کا رتبہ بہت بلند اور عالی ہے حالانکہ وہ نبی زمین پر مقیم رہا ہے اور جبرئیل کا قیام ملاءِ اعلیٰ سے بھی بلند تر مقام پر رہتا ہے چہ جائیکہ خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کا مرتبۂ جلیل کہ جس کی عظمت "بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر" میں مضمر ہے، علاوہ ازیں نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے شبِ معراج میں "قاب قوسین او ادنیٰ" کا جو تقرب پایا ہے وہ نہ کسی ملک اور فرشتہ کو حاصل ہوا اور نہ کسی نبی اور رسول کو اس لئے حضرت مسیح کا رفعِ آسمانی اُس "رفعت" کو پہنچ ہی نہیں سکتا جو اسریٰ میں آپ کو حاصل ہوئی۔ بہرحال فاضل و مفضول کے درمیان فرقِ مراتب کے لئے تنہا ملاءِ اعلیٰ کا قیام معیارِ فضیلت نہیں ہے خصوصاً اُس "افضل ہستی" کے مقابلہ میں جس کی فضیلت کا معیار خود اُس کا وجودِ باوجود ہو اور جس کی ذاتِ قدسی صفات خود ہی منبعِ فضائل اور مرجعِ کمالات ہو ایسی ہستی سے تو "مقام" عزت و مرتبہ پاتا ہے نہ کہ وہ ذاتِ گرامی سے

حُسنِ یوسف، دمِ عیسیٰ، یدِ بیضا داری ۔۔۔ آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

اور کبھی یہ کہا کہ جو شخص عیسیٰ (علیہ السلام) کو زندہ تسلیم کرتا ہے وہ "العیاذ باللہ" نبی اکرم

(صلی اللہ علیہ وسلم) کی اس لئے توہین کرتا ہے کہ وہ بقیدِ حیات نہیں رہے اور اس طرح حضرت عیسیٰ کو پھر ذاتِ اقدس پر برتری حاصل ہو گئی۔

یہ مقولہ پہلے سے بھی زیادہ بے کیف اور بے معنیٰ ہے بلکہ سرتاسر غلط بنیاد پر قائم اس لئے کہ کون اہلِ عقل اور ذی ہوش کہہ سکتا ہے کہ "زندگی" بھی فاضل و مفضول کے درمیان معیارِ فضیلت ہے، اس لئے کہ زندگی کی قیمت ذاتی کمالات و فضائل سے ہے نہ اس لئے کہ وہ زندگی ہے پھر "معیارِ فضیلت" کی اس بحث سے قطع نظر اس موقع پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مسئلہ فضیلت کو درمیان لانا اس لئے بھی قطعاً بے محل ہے کہ جبکہ قرآنِ عزیز کی نصوص نے تمام کائنات پر آپ کی برتری کو ثابت کر دیا اور آپ کی سیرت نے زندہ شہادت بن کر اُن نصوص کی تصدیق کر دی تو کسی بھی انسان کی "زندگی" یا "رفع آسمانی" یا اور کوئی "وجہِ فضیلت" اس کے مقابلہ میں نہیں لائی جا سکتی، اور ہر ایک حالت و صورت میں "فضلِ کلی" اُسی جامع کمالات ہستی کو حاصل رہے گا۔

وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ کی تفسیر

اس مسئلہ کو ختم کرنے سے پہلے اب ایک بات باقی رہ جاتی ہے کہ سورۂ نساء کی مسطورۂ بالا آیت میں "ولکن شبہ لھم" کی کیا تفسیر ہے؟ یعنی وہ کیا اشتباہ تھا جو یہودیوں پر طاری کر دیا گیا، تو قرآن عزیز اس کا جواب اس مقام پر بھی اور آل عمران میں بھی ایک ہی دیتا ہے اور وہ "رفع الی السماء" ہے، آلِ عمران میں اس کو وعدہ کی شکل میں ظاہر کیا "وَرَافِعُكَ اِلَیَّ" اور نساء میں ایفاء وعدہ کی صورت میں یعنی "بَل رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ" جس کا حاصل یہ نکلتا ہے کہ محاصرہ کے وقت جب منکرینِ حق گرفتاری کے لئے اندر گھسے تو وہاں عیسیٰ (علیہ السلام) کو نہ پایا، یہ دیکھا تو سخت حیران ہوئے اور کسی طرح اندازہ نہ لگا سکے کہ صورتِ حال کیا پیش آئی اور اس طرح "وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ" کا مصداق بن کر رہ گئے۔ اس کے بعد

قرآن کہتا ہے " اِنَّ الَّذِیْنَ اخْتَلَفُوْا فِیْهِ لَفِیْ شَكٍّ مِّنْهُ مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ اِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ وَمَا قَتَلُوْهُ یَقِیْنًا " تو یہ اشتباہ کے بعد جو صورتِ حال پیش آئی اُس کا نقشہ بیان کیا گیا ہے اور اس سے دو باتیں بصراحت ظاہر ہوتی ہیں ایک یہ کہ یہود اس سلسلہ میں اس طرح شک میں پڑ گئے تھے کہ گمان اور اٹکل کے ماسوا اُن کے پاس علم و یقین کی کوئی صورت باقی نہیں رہ گئی تھی اور دوسری بات یہ کہ انھوں نے کسی کو قتل کر کے یہ مشہور کیا کہ انھوں نے مسیح علیہ السلام کو قتل کر دیا اور یا پھر آیت زمانۂ نبوتِ محمدی کے یہود کا حال بیان کر رہی ہے ۔

پس قرآن عزیز کے اُن واضح اعلانات کے بعد جو حضرت مسیحؑ کی حفاظت و صیانت کے سلسلہ میں کئے گئے ہیں اور جن کو تفصیل کے ساتھ سطورِ بالا میں بیان کر دیا گیا ہے، ان دو باتوں کی جزئی تفصیلات کا تعلق آثارِ صحابہ (رضی اللہ عنہم) اور تاریخی روایات پر رہ جاتا ہے اور اس سلسلہ میں صرف اُن ہی روایات و آثار کو قابلِ تسلیم سمجھا جائے گا جو اپنی صحتِ روایت کے ساتھ ساتھ اُن بنیادی تصریحات سے نہ ٹکراتی ہوں جن کا ذکر متعدد مقامات پر قرآنِ عزیز نے بصراحت کر دیا ہے اور " القران یفسر بعضہ بعضًا۔ قرآن کا ایک حصہ دوسرے حصہ کی خود ہی تفسیر کر دیتا ہے " کے اصول پر جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضرت عیسٰی (علیہ السلام) کو دشمن ہاتھ تک نہ لگا سکے اور وہ محفوظ ملاءِ اعلیٰ کی جانب اٹھا لئے گئے اور جیسا کہ حیوۃِ عیسٰیؑ کی بحث میں ابھی نصوصِ قرآنی سے ثابت ہوگا کہ وہ وقوعِ قیامت کے لئے " نشان " ہیں اور اس لئے دوبارہ کائناتِ ارضی میں واپس آکر اور مفوضہ خدمت انجام دے کر پھر موت سے دوچار ہوں گے ۔

شخصِ مقتول و مصلوب سے متعلق آثار و تاریخ کی جو ملی جلی روایات ہیں اُن کا حاصل یہ ہے کہ " سبت کی شب " میں حضرت عیسٰی (علیہ السلام) بیت المقدس کے ایک بند

مکان میں اپنے حواریوں کے ساتھ موجود تھے کہ بنی اسرائیل کی سازش سے دمشق کے بت پرست پادشاہ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی گرفتاری کے لئے ایک دستہ بھیجا اُس نے آکر محاصرہ کرلیا۔ اسی اثنا میں اللہ تعالیٰ نے عیسیٰ (علیہ السلام) کو ملاءِ اعلیٰ کی جانب اٹھالیا۔ جب سپاہی اندر داخل ہوئے تو اُنھوں نے حواریوں میں ایک ہی شخص کو حضرت عیسیٰؑ کے ہم شبیہ پایا۔ اور اس کو گرفتار کر کے لے گئے اور پھر اُس کے ساتھ وہ سب کچھ ہوا جس کا ذکر گذشتہ سطور میں ہو چکا ہے۔ ان ہی روایات میں بعض اُس کا نام یودس بن کریا یوطا بیان کرتے ہیں اور بعض جرجس اور دوسرے داؤد بن لوزا کہتے ہیں۔

پھر ان روایات میں سے بعض میں ہے کہ یہ شخصِ مقتول اپنی خلقت ہی میں حضرت مسیح (علیہ السلام) کا مشابہ اور اُن کا نقشِ ثانی تھا، اسرائیلیاتِ انجیلی میں ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواریوں میں سے یہودا اسخر لوطی حضرت عیسیٰؑ کا شبیہ تھا اور بعض روایات میں ہے کہ جب یہ نازک گھڑی آپہنچی تو حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) نے حواریوں کو دعوت و تبلیغ حق سے متعلق تلقین و ہدایات کے بعد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے بذریعہ وحی مجھ کو مطلع کر دیا ہے کہ میں ایک مدت تک کے لئے ملاءِ اعلیٰ کی جانب اٹھا لیا جاؤں گا اور یہ واقعہ مخالفین اور متبعین دونوں کے لئے سخت آزمائش و امتحان بن جانے والا ہے لہذا تم میں سے جو شخص اس پر آمادہ ہو کہ اللہ تعالیٰ اس کو میرا شبیہ بنا دے اور وہ خدا کی راہ میں جامِ شہادت پئے اس کو جنت کی بشارت ہے، تب ایک حواری نے پہل کی اور خود کو اس کے لئے پیش کیا اور منجانب اللہ وہ حضرت کا ہم شکل ہو گیا اور سپاہیوں نے اس کو گرفتار کر لیا[۱]۔

یہ تفصیلات نہ قرآن میں مذکور ہیں اور نہ احادیثِ مرفوعہ میں اس لئے وہ صحیح ہوں

---

[۱] واقعات کی یہ تفصیلات تاریخ ابنِ کثیر جلد ۲ اور کتب تفسیر میں منقول ہیں۔

یا غلط نفس مسئلہ اپنی جگہ اٹل ہے اور قرآن کی آیات میں منصوص، اس لئے اصحابِ ذوق کو اختیار ہے کہ وہ صرف قرآن کے اس اجمال پر ہی قناعت کریں کہ حضرت مسیح (علیہ السلام) کا رفع الی السمار اور ہر طرح دشمنوں سے تحفظ نیز یہود پر معاملہ کا مشتبہ ہو کر کسی دوسرے کو قتل کرنا، یہود و نصاریٰ کے پاس اس سلسلہ میں علم و یقین سے محروم ہو کر ظن و تخمین اور شک و شبہ میں مبتلا ہو جانا اور قرآن کا حقیقتِ واقعہ کو علم و یقین کی روشنی میں ظاہر کر دینا یہ سب حقائق ثابتہ ہیں یا "وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ" اور "اِنَّ الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِيْهِ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ" (الآیہ) کی تفسیر میں ان روایات کی تفصیلات کو بھی قبول کر لیں اور یہ سمجھ کر تسلیم کریں کہ زیرِ بحث آیات کی تفسیر ان تفصیلات پر موقوف نہیں ہے بلکہ یہ امر زائد ہے جو آیات کی تفسیرِ صحیح کے لئے مؤید ہے۔

حیاتِ عیسیٰ علیہ السلام سورۂ آلِ عمران، مائدہ اور نسار کی زیرِ بحث آیات سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کے متعلق حکمتِ الٰہی کا یہ فیصلہ صادر ہوا کہ اُن کو بقیدِ حیات ملاءِ اعلیٰ کی جانب اُٹھا لیا جائے اور وہ دشمنوں اور کافروں سے محفوظ اُٹھا لئے گئے۔ لیکن قرآن نے اس مسئلہ میں صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ حسبِ موقعہ ان کی حیاتِ امروز پر نصوصِ قطعیہ کے ذریعہ متعدد جگہ روشنی ڈالی ہے اور ان مقامات میں اس جانب بھی اشارات کئے ہیں کہ حضرت مسیح (علیہ السلام) کی حیاتِ طویل اور رفع الی السمار میں کیا حکمت مستور تھی تاکہ اہلِ حق کے قلوب تازگیِ ایمان سے شگفتہ ہو جائیں اور باطل کوش اپنی کورباطنی پر شرمائیں۔

لیؤمنن بہ قبل موتہ

وَاِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكُوْنُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا (نساء)	اور کوئی اہلِ کتاب میں سے باقی نہ رہیگا مگر یہ کہ وہ ضرور ایمان لائیگا عیسیٰ پر اس (عیسیٰ) کی موت سے پہلے اور وہ (عیسیٰ) قیامت کے دن ان پر (اہلِ کتاب پر) گواہ بنے گا۔

اس آیت سے قبل آیات میں وہی مسطورۂ بالا واقعہ مذکور ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کو نہ صلیب پر چڑھایا گیا اور نہ قتل کیا گیا بلکہ اللہ تعالیٰ نے اپنی جانب اٹھا لیا یہ یہود و نصاریٰ کے اس عقیدہ کی تردید ہے جو انھوں نے اپنے باطل زعم اور اٹکل سے قائم کر لیا تھا، اُن سے کہا جا رہا ہے کہ حضرت مسیح (علیہ السلام) کے متعلق صلیب پر چڑھائے جانے اور قتل کئے جانے کا دعویٰ قابلِ لعنت ہے کیونکہ بہتان اور لعنت توام ہیں اس کے بعد اس آیت میں امرِ اول کی تصدیق میں اس جانب توجہ دلائی جا رہی ہے کہ آج اگر اس ملعون عقیدہ پر فخر کر رہے ہو تو وہ وقت بھی آنے والا ہے جب عیسیٰ بن مریم (علیہما السلام) خدائے برتر کی حکمت و مصلحت کو پورا کرنے کے لئے کائناتِ ارضی پر واپس تشریف لائیں گے اور اس عینی مشاہدہ کے وقت اہلِ کتاب (یہود و نصاریٰ) میں سے ہر ایک موجود ہستی کو قرآن کے فیصلہ کے مطابق عیسیٰ (علیہ السلام) پر ایمان لے آنے کے سوا کوئی چارۂ کار باقی نہ رہے گا اور پھر جب وہ اپنی مدتِ حیات ختم کر کے موت کی آغوش سے دوچار ہو جائیں گے تو قیامت کے دن اپنی امت (اہلِ کتاب) پر اُسی طرح گواہ ہوں گے جس طرح تمام انبیاء و مرسلین اپنی اپنی امتوں پر شاہد بنیں گے۔

یہ حقیقت کچھ مخفی نہیں ہے کہ عیسیٰ (علیہ السلام) کے متعلق اگرچہ یہود و نصاریٰ دونوں واقعۂ صلیب و قتل پر متفق ہیں لیکن اس سلسلہ میں دونوں کے عقائد کی بنیاد قطعاً متضاد اصول پر قائم ہے، یہود، حضرت مسیح (علیہ السلام) کو مفتری و کاذب کہتے اور دجّال[1] سمجھتے ہیں اور اس لئے فخر کرتے ہیں کہ انھوں نے یسوع مسیح کو صلیب پر بھی چڑھایا اور پھر اس حالت میں مار بھی ڈالا۔ اس کے برعکس نصاریٰ کا عقیدہ یہ ہے کہ دنیا

---

[1] دجال دجل سے ماخوذ ہے، جس کے معنی "فریب" ہیں۔

کا پہلا انسان آدم (علیہ السلام) گنہگار تھا اور ساری دنیا گنہگار تھی اس لئے خدا کی صفت "رحمت" نے ارادہ کیا کہ دنیا کو گناہوں سے نجات دلائے اس لئے اُس کی صفت "رحمت" نے ابنیت (بیٹا ہونے) کی شکل اختیار کی اور اس کو دنیا میں بھیجا تاکہ وہ یہود کے ہاتھوں سولی پر چڑھے اور مارا جائے اور اس طرح ساری کائناتِ ماضی و مستقبل کے گناہوں کا "کفارہ" بن کر دنیا کی نجات کا باعث بنے۔

سورۂ نساء کی آیات میں قرآن عزیز نے صاف صاف کہہ دیا کہ حضرت مسیح ؑ کے قتل کے دعوی کی بنیاد کسی بھی عقیدہ پر مبنی ہو لائقِ لعنت اور باعث ذلت وخسران ہے خدا کے سچے پیغمبر کو مفتری سمجھ کر یہ عقیدہ رکھنا بھی لعنت کا موجب اور خدا کے بندے اور مریم ؑ کے بطن سے پیدا انسان کو خدا کا بیٹا بنا کر اور "کفارہ" کا باطل عقیدہ تراش کر مسیح (علیہ السلام) کو مصلوب و مقتول تسلیم کرنا بھی گمراہی اور علم وحقیقت کے خلاف اٹکل کا تیر ہے اور اس سلسلہ میں صحیح اور مبنی برحقیقت فیصلہ وہی ہے جو قرآن نے کیا ہے اور جس کی بنیاد "علم ویقین اور وحیِ الٰہی" پر قائم ہے۔

پس آج جبکہ تمہارے سامنے اس اختلاف کے فیصلہ کے لئے جو شک وظن کی شکستہ بنیادوں پر قائم تھا علم ویقین کی روشنی آچکی ہے پھر بھی تم اپنے ظنونِ کاسدہ اور اوہامِ فاسدہ پر اصرار کر رہے ہو اور حضرت مسیح ؑ سے متعلق باطل عقیدہ کو ترک کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتے ہو تو قرآن کا ایک دوسرا فیصلہ اور وحیِ الٰہی کا یہ اعلان بھی سن لو کہ تمہاری نسلوں پر وہ وقت بھی آنے والا ہے جب قرآن کے اس صحیح فیصلہ اور اعلانِ حق کے مطابق حضرت مسیح ملاءِ اعلیٰ سے کائناتِ ارضی کو واپس ہوں گے اور اُن کی یہ آمد ایسی مشاہد ہوگی کہ یہود ونصاریٰ میں سے ایک فرد بھی ایسا نہ رہے گا جو بادلِ خواستہ یا بادلِ ناخواستہ اُس

ذاتِ گرامی پر یہ ایمان نہ لے آئے کہ بلاشبہ وہ خدا کے سچے رسول ہیں، خدا کے بیٹے نہیں، برگزیدہ انسان ہیں، مصلوب و مقتول نہیں ہوئے تھے بقیدِ حیات ہماری آنکھوں کے سامنے ہیں: "وَاِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ"

یہ بات خاص طور پر قابلِ توجہ ہے کہ سورۂ آل عمران اور سورۂ مائدہ کی طرح اس جگہ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کے لئے لفظ "توفی" نہیں بولا گیا بلکہ بصراحت لفظ "موت" استعمال کیا گیا ہے، یہ کیوں؟ صرف اس لئے کہ اُن دونوں مقامات پر جس حقیقت کا اظہار مقصود ہے اُس کے لئے "توفی" ہی مناسب ہے جیسا کہ سورۂ آل عمران سے متعلق آیات کی تشریح و تفسیر میں گذر چکا اور سورۂ مائدہ سے متعلق آیت کی تفسیر میں عنقریب بیان ہوگا اور اس جگہ چونکہ براہِ راست "موت" ہی کا تذکرہ مطلوب ہے اور اُس حالت کا ذکر ہے جس کے بعد حضرت مسیح (علیہ السلام) بھی "کُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ" کا مصداق بننے والے ہیں اس لئے یہاں "موت" کو بصراحت لانا ہی ازبس ضروری تھا اور یہ مزید برہان ہے اس دعویٰ کے لئے کہ آل عمران اور مائدہ میں لفظ "موت" کی جگہ "توفی" کا اطلاق بلاشبہ خاص مقصد رکھتا ہے ورنہ جس طرح ان دونوں مقامات پر توفی کا اطلاق کیا گیا تھا اُسی طرح یہاں بھی کیا جاتا یا جس طرح اس جگہ لفظ "موت" کا اطلاق کیا گیا ہے اسی طرح اُن دونوں مقامات پر بھی لفظ موت ہی کا استعمال ہونا چاہئے تھا مگر قرآنِ عزیز کے ان دقیق اسالیبِ بیان کے فرق کا فہم طالبینِ حق کا ہی حصہ ہے نہ کہ مرزائے قادیانی اور مسٹر لاہوری جیسے اصحابِ زیغ کا جو اپنی خاص اغراضِ ذاتی کے پیشِ نظر پہلے ایک نظریہ ایجاد کر لیتے ہیں اور بعد ازاں اس سلسلہ کی تمام آیاتِ قرآنی کو اسی کے سانچہ میں ڈھال کر اس کا نام "تفسیرِ قرآن" رکھتے ہیں۔

بہر حال جمہور کے نزدیک آیت زیرِ عنوان کی تفسیر یہی ہے جو سپردِ قلم کی جا چکی، مشہور

محدث، جلیل القدر مفسر اور اسلامی مورخ، عماد الدین بن کثیر (رحمہ اللہ) اس تفسیر کو حضرت عبداللہ بن عباس (رضی اللہ عنہما) اور حسن بصری (رحمہ اللہ) سے بسند صحیح نقل کرنے کے بعد تحریر فرماتے ہیں :-

قتادہ، عبدالرحمن اور بہت سے مفسروں کا یہی قول ہے اور یہی قولِ حق ہے جیسا کہ عنقریب ہم دلیلِ قاطع سے اس کو ثابت کریں گے (انشاء اللہ تعالیٰ) [۱]

اور سرتاجِ محدثین ابن حجر عسقلانی (رحمہ اللہ) بھی اسی کی تائید کرتے ہوئے فرماتے ہیں

"اسی تفسیر پر حضرت عبداللہ بن عباس (رضی اللہ عنہما) نے یقین کیا ہے اور ابن عباسؓ کی اس تفسیر کو ابن جریر نے بروایت سعید بن جبیر اور ابو رجاء نے بھی حسنؒ سے بسند صحیح روایت کیا ہے کہ ابن عباس (رضی اللہ عنہما) نے فرمایا "قبل موتہ" یعنی قبل موتِ عیسیٰ (علیہ السلام) قسم بخدا بیشک و شبہ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) بقیدِ حیات ہیں اور جب وہ آسمان سے اُتریں گے تو سب اہلِ کتاب ان پر ایمان لے آئیں گے اور ابن جریر (رحمہ اللہ) نے اسی تفسیر کو اکثر اہلِ علم سے نقل کیا ہے اور ابن جریرؒ وغیرہ نے اسی تفسیر کو ترجیح دی ہے"۔ [۲]

مگر اس صحیح تفسیر کے علاوہ کتب تفسیر میں احتمالِ عقلی کے طور پر دو قول اور بھی منقول ہیں مگر وہ دونوں بلحاظِ سند ضعیف اور ناقابلِ اعتماد اور بلحاظ سیاق و سباق (یعنی آیت زیرِ بحث سے قبل اور بعد کی آیات کے لحاظ سے) غلط اور ناقابلِ التفات ہیں یعنی ایسے احتمالاتِ عقلی ہیں جو نقل اور آیات کے باہمی نظم و ترتیب کے خلاف ہیں۔

ان ہر دو معانی میں سے ایک معنی یہ ہیں کہ "موتہ" میں جو ضمیر ہے اُس کو حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کی بجائے اہلِ کتاب کی جانب لوٹایا جائے اور آیت کا ترجمہ یوں کیا جائے

---

[۱] ابن کثیر جلد اول۔ [۲] فتح الباری شرح بخاری ج ۶ ص ۳۰۴۔

اُور اہل کتاب میں سے کوئی فرد ایسا نہیں ہے جو اپنی موت سے پہلے عیسیٰ پر ایمان نہ لے آتا ہو"
یعنی اگرچہ یہود و نصاریٰ اپنی زندگی میں حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) سے متعلق قرآن کے
بتائے ہوئے عقیدے پر ایمان نہیں لاتے اور اپنے اپنے عقیدہ پر قائم رہتے ہیں، لیکن جب
اُن کو "موت" آدباتی ہے تو وہ اُس آخری حالت میں "جو نزع کا وقت کہلاتا ہے" صحیح
عقیدہ کے مطابق ایمان لے آتے ہیں اور اہلِ کتاب کے ہر ایک فرد پر بلا استثنار یہی حالت
گذرتی ہے اور دوسرے معنی یہ ہیں کہ "اہل کتاب کا ہر ایک فردِ اپنی موت سے پہلے محمد
صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لے آتا ہے" یعنی جب وہ عالم دنیا سے منقطع ہو کر عالمِ غیب سے
وابستہ ہو رہا ہوتا ہے اُس وقت اُس پر اصل حقیقت منکشف ہو جاتی ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم
بیشک خدا کے سچے پیغمبر تھے۔

پس اس بات سے قطع نظر کہ یہ دونوں تفسیریں نقلِ روایت کے اعتبار سے
ناقابلِ اعتماد اور غیر صحیح اور آیات کے سیاق و سباق کے خلاف ہیں، عقلی نقطۂ نظر سے
بھی غلط ہیں اس لئے کہ اگر آیت کے معنی یہ ہیں جو سطورِ بالا میں نقل کئے گئے تب یہ
آیت اپنے مقصدِ بیان کے خلاف بے معنیٰ اور بے نتیجہ ہو جاتی ہے (العیاذ باللہ) کیونکہ
قرآنِ عزیز دوسرے مقامات پر صاف کہہ چکا ہے کہ جب انسان عالمِ دنیا سے کٹ کر عالمِ
غیب سے وابستہ ہو جاتا ہے اور نزع کی یہ کیفیت اس پر طاری ہو جاتی ہے کہ جو
معاملات اس ساعت سے قبل تک اُس کے لئے غیب کے معاملات تھے وہ مشاہدہ
میں آنے شروع ہو جاتے ہیں تو اُس وقت اس کے اعمال و کردار کا صحیفہ لپیٹ دیا جاتا
ہے اور اب تبدیلِ اعتقاد کا کوئی نتیجہ اور ثمرہ نہیں ملتا یعنی اس وقت کا نہ اقرار و اعتراف
معتبر اور نہ انکار مستند۔

فَلَمَّا جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَرِحُوْا بِمَا عِنْدَهُمْ مِّنَ الْعِلْمِ وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ۝ فَلَمَّا رَاَوْا بَاْسَنَا قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗ وَكَفَرْنَا بِمَا كُنَّا بِهٖ مُشْرِكِيْنَ ۝ فَلَمْ يَكُ يَنْفَعُهُمْ اِيْمَانُهُمْ لَمَّا رَاَوْا بَاْسَنَا سُنَّتَ اللّٰهِ الَّتِيْ قَدْ خَلَتْ فِيْ عِبَادِهٖ وَخَسِرَ هُنَالِكَ الْكٰفِرُوْنَ ۝

(المومن)

پس جب آئے ان کے پاس پیغمبر واضح دلائل لے کر تو اُس چیز سے خوش ہوئے جو اُن کے پاس علم سے تھی اور گھیر لیا اُن کو اُس چیز نے جس کی وہ مذاق بناتے تھے پس جب انھوں نے ہمارا عذاب دیکھا تو انھوں نے کہا ہم خدائے واحد پر ایمان لے آئے اور جن چیزوں کو ہم اس کا شریک بناتے تھے اُس سے منکر ہوئے پس نہیں مانع ہوا اُن کا (یہ) ایمان جب انھوں نے ہمارے عذاب کا مشاہدہ کرلیا، یہ اللہ کی سنت ہے جو اس کے بندوں میں ہمیشہ جاری رہی اور اس موقعہ پر کافروں نے زیان پایا۔

وَلَيْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ حَتّٰٓى اِذَا حَضَرَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ اِنِّيْ تُبْتُ الْـٰٔنَ وَلَا الَّذِيْنَ يَمُوْتُوْنَ وَهُمْ كُفَّارٌ اُولٰٓئِكَ اَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ۝

(النساء)

لیکن ان لوگوں کی توبہ، توبہ نہیں ہے جو (ساری عمر تو) برائیاں کرتے رہے لیکن جب اُن میں سے کسی کے آگے موت آکھڑی ہوئی تو کہنے لگا۔ "اب میں توبہ کرتا ہوں" (ظاہر ہے کہ ایسی توبہ سچی توبہ نہیں ہوئی) اسی طرح اُن لوگوں کی توبہ بھی توبہ نہیں ہے جو دنیا سے کفر کی حالت میں جاتے ہیں، ان تمام لوگوں کے لئے ہم نے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔

تو ایسی صورت میں حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) یا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا خصوصیت کے ساتھ ذکر کیا معنی رکھتا ہے؟ انسان جب اُس حالت پر پہنچ جاتا ہے تو اس کے سامنے

سے غیب کے پردے ہٹ جاتے ہیں اور برزخ، ملائکۃ اللہ، عذاب یا راحت، جنت و جہنم، غرض دینِ حق کی تعلیم کردہ غیب کی ساری حقیقتیں اس پر منکشف ہو جاتی ہیں اور اس میں یہود و نصارٰی کی ہی خصوصیت کیا ہے یہ حالت تو ہر ایک ابنِ آدم پر گذرنے والی ہے، نیز جب اس قسم کا ایمان قابلِ قبول ہی نہیں ہے تو اس کا ذکر اُسی اسلوب کے ساتھ ہونا چاہیے تھا جو غرقِ فرعون کے وقت فرعون کے ایمانی اعتراف و اقرار کے لئے اختیار کیا گیا اور جس میں اُس وقت کی ایمانی پکار کی بے وقتی ظاہر کی گئی ہے نہ کہ ایسے اسلوبِ بیان کے ساتھ گویا مستقبل میں ہونے والے کسی ایسے عظیم الشان واقعہ کی خبر دی جا رہی ہے جو مخاطبین (یہود و نصارٰی) کے عقائد و عزائم کے خلاف حضرت عیسٰی (علیہ السلام) سے متعلق قرآن کی تصدیق اور اس کے اٹل فیصلہ کی زندہ شہادت بن کر پیش آنے والا ہے ورنہ تو ایک عیسائی اور یہودی پنجۂ موت میں آجانے کے وقت جان عزیز سپرد کر دینے سے پہلے حضرت عیسٰی پر ایمان لایا تب کیا اور نہ لایا تب کیا اُس کی یہ تصدیق کائناتِ انسانی کے علم و ادراک سے باہر صرف اُس کے اور خدا کے درمیان تعلق رکھتی ہے اور ظاہر ہے کہ ایسی بات کا ایسے موقعہ پر تذکرہ کرنا قطعاً بے محل ہے جہاں ایک قوم کو اُس کے ایک خاص عقیدہ پر ملزم و مجرم بنانے کے لئے فیصلۂ حق کی تائید کے لئے ماضی اور مستقبل میں کائناتِ ارضی پر پیش آنے والے واقعات کو پیش کیا جا رہا ہے جیسا کہ آیت کے سیاق و سباق سے واضح ہو رہا ہے علاوہ ازیں ان احتمالات کی یہاں اس لئے بھی گنجائش نہیں ہے کہ غرغرہ کے وقت حضرت عیسٰی یا محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر اس قسم کا ایمان تو ہر اُس اہلِ کتاب سے متعلق ہے جو اس آیت کے نزول سے کچھ دن قبل یا صدیوں قبل گذر چکے اور مر کھپ چکے ہیں۔ لہٰذا اگر آیت میں یہ مضمون بیان کرنا مقصود تھا تو اس کے لئے موکد مستقبل کی یہ تعبیر

"لیؤمنن" فصاحت وبلاغت کلام کے بالکل خلاف ہے اس کے لئے تو ایسی تعبیر کی ضرورت تھی جو ماضی، حال اور استقبال تینوں زمانوں پر حاوی ہوتی تاکہ قرآن کا مفہوم اپنے توسع کے لحاظ سے پوری طرح ادا ہوتا۔

نیز دوسرے معنی تو اس لئے بھی قطعاً غلط اور بے محل ہیں کہ اس آیت سے قبل اور بعد کی آیات میں یعنی سیاق وسباق میں خاتم الانبیاء محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر ہی نہیں ہے کیونکہ شروع آیات میں صرف حضرت مسیح (علیہ السلام) کا ذکر ہو رہا ہے اور اس آیت کے آخر میں یہ ارشاد ہوا ہے "وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكُوْنُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا" اور واضح ہے یہ بات کہ اس جگہ شاہد سے حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) مراد ہیں اور علیھم کی ضمیر سے اُن کی امت تو پھر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر کئے بغیر درمیان کی کسی ضمیر کا مرجع ذاتِ اقدس کو قرار دینا نہ صرف یہ کہ فصاحت وبلاغت کے منافی ہے بلکہ قاعدۂ عربیت کے قطعاً خلاف اور انتشارِ ضمائر کا موجب ہے

غرض بے غل وغش صحیح معنی وہی ہیں جو جمہور نے اختیار کئے ہیں اور یہ دونوں خود ساختہ احتمالات آیت کی تفسیر تو کیا صحیح احتمال کہلانے کے بھی مستحق نہیں ہیں[1]

حیات ونزول عیسیٰ علیہ السلام اور احادیث صحیحہ

قرآنِ عزیز نے جس معجزانہ اختصار کے ساتھ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کے رفع سماوی، حیاتِ امروز اور علامتِ قیامت بن کر نزول

[1] اس مقام کے علاوہ سورۂ زخرف کی آیت ما المسیح بن مریم الا رسول قد خلت من قبلہ الرسل اور سورۂ آل عمران کی ابتداء سے اسی آیات تک جو وفدِ نجران سے تعلق رکھتی ہیں یہ سب مقامات دلالۃ النص یا اشارۃ النص کی شکل میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی حیات کے لئے دلیل وبرہان ہیں اور اگرچہ ان کی تفصیلات اور وجوہ استشہاد میرے پاس مدون ومرتب ہیں تاہم کتاب کی طوالت کے خوف سے اس جگہ ان کو نظر انداز کر دیا گیا ہے بوقتِ فرصت انشاء اللہ مستقل مضمون کی صورت میں ہدیۂ ناظرین ہوگا، اور یا پھر حجۃ الاسلام علامہ محمد انور شاہ نور اللہ مرقدہٗ کی کتاب "عقیدۃ الاسلام فی حیوۃ عیسیٰ علیہ السلام" اس مقصد کے لئے قابلِ مراجعت ہے۔

من السمآء کے متعلق تصریحات کی ہیں صحیح ذخیرۂ احادیث نبوی ہیں ان آیات ہی کی تفصیلات بیان کر کے ان حقائق کو روشن کیا گیا ہے، چنانچہ امامِ حدیث بخاری اور مسلم نے صحیحین (صحیح بخاری، صحیح مسلم) میں حضرت ابوہریرہ (رضی اللہ عنہ) سے بہ روایت متعدد طریقہائے سند سے نقل کی ہے۔

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
والذی نفسی بیدہٖ لیوشکن
ان ینزل فیکم ابن مریم
حکماً عدلاً فیکسر الصلیب
یقتل الخنزیر ویضع الجزیہ
ویفیض المال حتی لا یقبل
احداً وحتی یکون السجدۃ
خیرلہٗ من الدنیا وما فیہا
ثم قال ابوھریرۃ اقرؤا ان
شئتم (وَاِنْ مِّنْ اَھْلِ الْکِتَابِ
اِلَّا لَیُؤْمِنَنَّ بِہٖ قَبْلَ مَوْتِہٖ
وَیَوْمَ الْقِیٰمَۃِ یَکُوْنُ عَلَیْھِمْ
شَھِیْدًا)۔

(کتاب الانبیاء)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا "اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے ضرور وہ وقت آنے والا ہے کہ تم میں عیسیٰ بن مریم حاکم عادل بن کر اتریں گے وہ صلیب کو توڑیں گے اور خنزیر کو قتل کریں گے (یعنی موجودہ عیسائیت کو مٹائیں گے) اور جزیہ اٹھا دیں گے (یعنی نشانِ الٰہی کے مشاہدہ کے بعد اسلام کے سوا کچھ بھی قبول نہیں ہوگا اور اسلامی احکام میں بارشادِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جزیہ کا حکم اُسی وقت تک کے لئے ہے) اور مال کی اس درجہ کثرت ہوگی کہ کوئی اس کو قبول کرنے والا نہیں ملیگا اور خدا کے سامنے ایک سجدہ دنیا و مافیہا سے زیادہ قیمت رکھے گا (یعنی مالی کثرت کی وجہ سے خیرات وصدقات کے مقابلہ میں عبادتِ نافلہ کی اہمیت بڑھ جائیگی) پھر ابوہریرہ نے نے فرمایا اگر تم (قرآن سے اس کا استشہاد) چاہو تو یہ آیت پڑھو (وان من اهل الکتاب الآیہ) اور کوئی اہلِ کتاب میں سے نہ ہوگا مگر (عیسیٰ کی) موت سے پہلے اس پر (عیسیٰ پر) ضرور ایمان لے آئیگا اور وہ (عیسیٰ) قیامت کے دن اُن پر گواہ ہوگا۔

(۲) بخاری اور مسلم میں بسندِ نافع مولیٰ ابو قتادہ انصاری (رضی اللہ عنہ) حضرت ابوہریرہؓ سے یہ روایت بھی منقول ہے۔

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم كيف انتم اذا نزل ابن مريم فيكم وامامكم منكم ؎۱

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس وقت تمہارا کیا حال ہوگا جب تم میں ابنِ مریم اتریں گے اور اس حالت میں اُتریں گے کہ تم ہی میں سے ایک شخص تمہاری امامت کر رہا ہوگا۔

ان دونوں روایات کے علاوہ حضرت ابوہریرہ (رضی اللہ عنہ) سے متعدد طریقہائے سند سے اور روایات بھی صحیحین، مسند احمد اور سنن ؎۲ میں درج ہیں جو یہی مفہوم و معنی ادا کرتی ہیں ان میں سے ایک زیادہ مفصل ہے اور مسئلہ زیر بحث کے بعض دوسرے پہلوؤں کو بھی نمایاں کرتی ہے۔ مسند احمد میں ہے۔

(۳) ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال الانبياء اخوة لعلات امهاتهم شتى ودينهم واحد وانی اولى الناس بعيسى بن مريم لانه لم يكن نبی بينی وبينه وانه نازل فاذا رأيتموه فاعرفوه رجل مربوع الى الحمرة والبياض عليه ثوبان ممصران كأن رأسه يقطر وان لم يصبه بلل فيدق الصليب

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "تمام انبیاء اصولِ دین میں علاتی بھائیوں کی طرح ہیں دین سب کا ایک اور فروعِ دین مختلف اور میں دوسرے انبیاء کے مقابلہ میں عیسیٰ بن مریم سے زیادہ قریب ہوں اس لئے کہ اُن کے اور میرے درمیان کوئی نبی مبعوث نہیں ہوا اور بلاشبہ وہ کائناتِ ارضی پر اُتریں گے پس جب تم ان کو دیکھو تو اس حلیہ سے پہچان لینا: میانہ قد، سرخ و سپید رنگ ہوگا ان کے جسم پر دو سرخی مائل رنگ کی چادریں ہونگی ایسا معلوم ہوگا گویا فی الحال غسل کرکے آرہے ہیں اور سر سے پانی کے قطرے موتی

؎۱ کتاب الانبیاء ؎۲ ابوداؤد، نسائی، ترمذی، ابنِ ماجہ۔

ویقتل الخنزیر ویضع الجزیۃ و	کی طرح ٹیک پڑنے والے ہیں۔وہ صلیب کو توڑینگے اور
یدعوا الناس الی الاسلام و	خنزیر کو قتل کرینگے (موجبۂ عیسائیت کا خاتمہ کردینگے) اور
یھلك اللّٰہ فی زمانہ المسیح	جزیہ اٹھا دینگے اور لوگوں کو "اسلام" کی دعوت دینگے اور
الدجال ثم تقع الامانۃ علی	اللہ تعالیٰ اُن کے زمانہ میں تمام ادیان و ملل کو مٹا دے گا
الارض حتی ترتع الاسود مع	اور صرف ایک ہی دین "دین اسلام" باقی رہ جائیگا اور
الابل والنمار مع البقر و	اللہ تعالیٰ اُن ہی کے زمانہ میں مسیح دجال کو ہلاک کرے گا پھر کائنات
الذئاب مع الغنم ویلعب	میں "امانت" (امن چین) جگہ کرلیگی حتی کہ شیر، اونٹوں کے ساتھ
الصبیان بالحیات لاتضرھم	چیتے گائے بیلوں کے ساتھ، بھیڑیے بکریوں کے ساتھ
فیمکث اربعین سنۃ ثم	چرتے نظر آئیں گے اور بچے سانپوں کے ساتھ کھیلیں گے،
یتوفی ویصلی علیہ	اور ان کو کوئی گزند نہیں پہنچے گا، پس عیسیٰ (علیہ السلام)
المسلمون۔	چالیس سال اس زمین پر زندہ رہیں گے پھر وفات پاجائیں گے
۔[۱]	اور مسلمان اُن کے جنازہ کی نماز ادا کریں گے۔

اور صحیح مسلم میں حضرت ابوہریرہؓ سے ایک طویل حدیث روایت کی گئی ہے اس میں خروجِ دجال کا ذکر کرتے ہوئے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشادِ مبارک مذکور ہے۔

(۴) فاذا جاؤا الشام خرج	پس جب مسلمان ملک شام پہنچیں گے تو دجال کا خروج ہوگا
فبینا ھم یعدون للقتال	ابھی مسلمان اس کے مقابلہ میں جنگ کی طیاریاں کر رہے
یسوّون الصفوف اذا اقیمت	ہوں گے صفیں درست کرتے ہوں گے کہ نماز کیلئے اقامت
الصلوٰۃ فینزل عیسیٰ بن	ہونے لگے گی، اس درمیان میں عیسیٰ بن مریم کا نزول ہوگا اور
مریم الخ	وہ مسلمانوں کی امامت کا فرض انجام دیں گے۔

[۱] مسند احمد جلد اول۔

اور صحیح مسلم میں حضرت نواس بن سمعان رضی اللہ عنہ سے ایک طویل روایت منقول ہے جس میں یہ مذکور ہے:-

اذ بعث اللہ المسیح بن مریم (علیہ السلام) فینزل عند المنارۃ البیضاء شرقی دمشق بین مہرودتین واضعاً کفیہ علیٰ اجنحۃ ملکین اذا طأطأ رأسہ قطر واذا رفعہ تحدّر منہ جمانٌ کاللؤلؤ۔ (الخ)	(ابھی دجّال ایک مسلمان پر اپنے شیطانی کرشموں کی آزمائش کر ہی رہا ہوگا) کہ اللہ تعالیٰ مسیح بن مریم کو بھیج دیگا وہ جب کائناتِ ارضی پر اتریں گے تو مسجد دمشق کے مشرقی جانب کے سپید منارہ پر اتریں گے اور ان کے بدن پر (سرخی مائل) گہری زرد رنگ کی دو چادریں ہوں گی (یعنی ایک بدن کے اوپر کے حصہ پر اور دوسری زیریں حصہ بدن پر لپٹی ہوگی) اور دو فرشتوں کے بازوؤں پر سہارا لئے ہوں گے، جب سر جھکائیں گے تو سر سے پانی ٹپک پڑنے لگے گا اور جب سر اٹھائیں گے تو پانی کے قطرے موتیوں کی طرح ٹپکیں گے (یعنی غسل کئے آرہے ہوں گے)

اور مختلف طریقہائے سند سے امام احمد نے مسند میں اور ترمذی (رحمہ اللہ) نے سُنن میں حضرت مجمع بن جاریہ (رضی اللہ عنہ) سے بسند صحیح یہ روایت کیا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے۔

یقتل ابن مریم الدجال بباب لُدٍّ۔	ابن مریم، دجّال کو باب لُدّ[۱] پر قتل کریں گے۔

امام ترمذی اس روایت کو نقل کرکے فرماتے ہیں "ہذا حدیث صحیح" اور اس کے بعد اُن حضرات صحابہ کی فہرست شمار کراتے ہیں جن سے نزول عیسیٰ بن مریم اور اُن کے ہاتھوں قتلِ دجال سے متعلق روایات کتبِ حدیث میں منقول ہیں۔ فرماتے ہیں۔

---

[۱] شہر دمشق کی شہر پناہ کا ایک دروازہ ہے۔

اور اس باب میں حضرت عمران بن حصین، نافع بن عتبہ، ابو برزہ اسلمی، حذیفہ بن اسید، ابوہریرہ، کیسان، عثمان بن العاص، جابر بن عبد اللہ، ابو امامہ باہلی، ابن مسعود، عبد اللہ ابن عمرو بن العاص، سمرۃ بن جندب، النواس بن سمعان، عمرو بن عوف، حذیفہ بن الیمان، (رضی اللہ عنہم) سے بھی روایات منقول ہیں۔[1]

اور امام احمدؒ نے مسند میں، امام مسلم نے صحیح میں اور اصحاب سنن نے سنن میں، بروایت حضرت حذیفہ بن الاسید، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ روایت نقل کی ہے۔

قال اشرف علینا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من غرفۃ ونحن نتذاکر الساعۃ فقال: "لا تقوم الساعۃ حتی تروا عشر آیات، طلوع الشمس من مغربہا والدخان، والدابۃ، وخروج یاجوج وماجوج ونزول عیسی بن مریم والدجال وثلثۃ خسوف خسف بالمشرق وخسف بالمغرب وخسف بجزیرۃ العرب ونار تخرج من قعر عدن تسوق وتحشر الناس تبیت معہم حیث باتوا وتقیل معہم حیث قالوا۔	حضرت حذیفہؓ فرماتے ہیں ہم (صحابہ) ایک مجلس میں بیٹھے ہوئے قیامت کے متعلق بات چیت کر رہے تھے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بالاخانہ سے جھانکا اور ارشاد فرمایا "قیامت اس وقت تک قائم نہیں ہوگی جب تک تم دس نشان نہ دیکھ لوگے، آفتاب کا مغرب سے طلوع دخان (دھواں) دابۃ الارض، خروج یاجوج وماجوج عیسی بن مریمؑ کا نزول، دجال کا خروج، تین مقامات میں خسوف کا پیش آنا (زمین میں دھنس جانا) مشرق میں، مغرب میں اور جزیرۃ العرب میں، آگ کا قعر عدن سے نکلنا جو لوگوں کو سمیٹ لے جائیگی اور جب رات کو لوگ آرام کریں گے تو وہ بھی ٹھہر جائے گی اور جب دوپہر کو قیلولہ کریں گے تب بھی وہ ٹھہری رہے گی۔"

[1] ترمذی باب نزول عیسی بن مریمؑ۔ [2] اس حدیث میں جن علامات کا ذکر ہے وہ سب تشریح طلب ہیں مگر یہاں ان کی تشریحات بے محل ہیں اس لئے نظر انداز کر دی گئیں، عام تشریحات کتب تفسیر وحدیث میں اور شاہ رفیع الدین دہلوی کے منظوم کردہ رسالہ علامات قیامت میں قابل مطالعہ ہیں۔

اور محدث ابن ابی حاتمؒ نے اور جلیل القدر محدث و مفسر ابنِ جریر طبریؒ نے بروایت حسن بصری (رحمہ اللہ) بسند صحیح حیات و نزولِ عیسیٰ بن مریم سے متعلق ایک روایت نقل کی ہے اُس میں ہے :-

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم للیہود ان عیسیٰ لم یمت وانہ راجع الیکم قبل یوم القیٰمۃ	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہود سے فرمایا: "عیسیٰ (علیہ السلام) مرے نہیں اور بلاشبہ وہ قیامت سے پہلے تمہاری جانب لوٹ کر آئیں گے"

اسی طرح ابن ابی حاتم اور ابنِ جریر (رحمہما اللہ) نے سورۂ نسار کی آیات متعلقہ وفدِ نجران کی تفسیر کرتے ہوئے اصولِ حدیث کے نقطۂ نظر سے بہ سندِ حسن ایک طویل روایت ربیع بن انسؒ سے نقل کی ہے اس میں بھی بصراحت یہ مذکور ہے۔

فقال لھم النبی صلی اللہ علیہ وسلم الستم تعلمون ان ربنا حیٌّ لا یموت وان عیسیٰ یأتی علیہ الفناء؎	نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے وفد سے فرمایا: کیا تم نہیں جانتے کہ بلاشبہ ہمارا پروردگار زندہ ہے جس کے لئے موت نہیں ہے اور بلاشبہ عیسیٰ علیہ السلام کو فنا (موت) سے دوچار ہونا ہوگا۔

نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اس جگہ لفظ "یأتی" فرمایا ہے جو مستقبل کے لئے بولا جاتا ہے لفظ "اتیٰ" نہیں فرمایا جو ماضی کے لئے مخصوص ہے۔

اور بیہقی نے کتاب الاسماء والصفات میں اور محدث علی متقی گجراتی نے کنز العمال میں باسناد حسن و صحیح اس سلسلہ میں جو روایات نقل فرمائی ہیں ان میں نزولِ عیسیٰ (علیہ السلام) کے ذکر کے ساتھ "من السماء" کا لفظ صراحت سے موجود ہے۔ ؎

؎ [illegible] ۔ ؎ کتاب الاسماء والصفات صفحہ ۳۰۱ ؎ کنز العمال ج ۷ ص ۲۶۸ ۔

یہ اور اسی قسم کا کثیر ذخیرہ حدیث ہے جو حیات و نزول عیسیٰ ابن مریم پیغمبر بنی اسرائیل (علیہ الصلوٰۃ والسلام) سے متعلق کتب حدیث و تفسیر میں منقول ہے اور جو قوتِ سند کے لحاظ سے صحیح اور حسن سے کم رتبہ نہیں رکھتا اور باعتبار شہرت و تواتر روایات جن کا یہ حال ہے کہ حسب تصریح امام ترمذی، حافظ حدیث عماد الدین بن کثیر، حافظ حدیث ابن حجر عسقلانی اور دیگر ائمہ حدیث رسول جلیل القدر صحابہ رضی اللہ عنہم نے ان کو روایت کیا ہے جن میں سے بعض صحابہ کا یہ دعویٰ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ تصریحات سیکڑوں صحابہ کے مجمع میں خطبہ دے کر فرمائیں اور یہ صحابہ کرام بغیر کسی انکار و اجنبیت کے ان روایات کو خلفاء راشدین (رضی اللہ عنہم) کے دور خلافت میں علی رؤس الاشہاد سناتے تھے چنانچہ ان جلیل القدر صحابہ (رضی اللہ عنہ) سے جن ہزارہا شاگردوں نے سُنا ان میں سے یہ عظیم المرتبہ ہستیاں قابلِ ذکر ہیں جن میں ہر فرد روایت حدیث میں ضبط و حفظ، ثقاہت و علمی تبحر کے پیش نظر امامت و قیادت کا درجہ رکھتا ہے۔ مثلاً سعید بن المسیب، نافع مولیٰ ابو قتادہ حنظلہ بن علی الاسلمی، عبد الرحمٰن بن آدم، ابو سلمہ، ابو عمرہ، عطاء بن یسار، ابو سہیل، موثر بن غفارہ، یحییٰ بن ابی عمرو، جبیر بن نفیر، عروہ بن سعود ثقفی، عبد اللہ بن زید انصاری، ابو زرعہ، یعقوب بن عاصم، ابو نضرہ، ابو الطفیل (رحمہم اللہ)

پھر ان علماء کبار اور محدثین اعلام سے جن بے شمار تلامذہ نے سُنا اُن میں سے راویانِ حدیث کے طبقہ میں جن کو حدیث اور علوم قرآن کا رتبۂ بلند حاصل ہے اور جو اپنے وقت کے "امام فی الحدیث" اور "امیر المؤمنین فی الحدیث" تسلیم کئے گئے ہیں، بعض کے اسماء گرامی یہ ہیں:- ابن شہاب زہری، سفیان بن عیینہ، لیث، ابن ابی ذئب، اوزاعی، قتادہ، عبد الرحمٰن ابن ابی عمرہ، سہیل، حبلہ بن سحیم، علی بن زید، ابو رافع، عبد الرحمٰن بن جبیر، نعمان بن سالم،

معمر، عبداللہ بن عبیداللہ (رحمہم اللہ)

غرض ان روایات واحادیث صحیحہ کا صحابہ، تابعین، تبع تابعین یعنی خیرالقرون کے طبقات میں اس درجہ شیوع ہوچکا تھا اور وہ بغیر کسی انکار کے اس درجہ لائق قبول ہوچکی تھیں کہ ائمہ حدیث کے نزدیک حضرت مسیح علیہ السلام کی حیات ونزول سے متعلق ان احادیث کو مفہوم ومعنی کے لحاظ سے درجۂ "تواتر" حاصل تھا اور اسی لئے وہ بے جھجک اس مسئلہ کو "احادیث متواترہ" سے ثابت اور مسلّم کہتے تھے۔ اور حقیقت بھی یہ ہے کہ روایتِ حدیث کے تمام طبقات ودرجات میں ان روایات کو "تلقی بالقبول" کا یہ درجہ حاصل رہا ہے کہ ہر دور میں اس کے رواۃ میں "ائمہ حدیث" اور روایتِ حدیث کے "مدار" نظر آتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ان مرفوع وموقوف بر صحابہ (رضی اللہ عنہم) احادیث وروایات کے ناقلین میں امام احمد، امام بخاری، امام مسلم، ابوداؤد، نسائی، ترمذی، ابنِ ماجہ جیسے اصحابِ صحیح وسنن ائمہ حدیث کے اسماءِ گرامی شامل ہیں اور وہ باتفاق ان روایات کی صحت وحسن کے قائل ہیں۔ چنانچہ یہ اور اسی قسم کی احادیثِ صحیحہ کا ذکر کرتے ہوئے مشہور محدث ومفسر ابنِ کثیر اپنی تفسیر میں اول یہ عنوان قائم کرتے ہیں۔

ذکر الاحادیث الواردۃ فی نزول عیسٰی	ان احادیث کا ذکر جو حضرت عیسٰی بن مریم
بن مریم (علیہما الصلوٰۃ والسلام)	(علیہما السلام) کے آسمان سے زمین پر
الی الارض من السماء فی اٰخر الزمان	اترنے کے بارے میں نازل ہوئی ہیں۔
قبل یوم القیٰمۃ [1]	

اور اس کے بعد سلسلہ کی احادیث کو نقل کرنے کے بعد آخر میں یہ تحریر فرماتے ہیں۔

---

[1] تفسیر ابن کثیر ج اول ص ۵۸۲ و ۵۸۷۔

فهذه احاديث متواترة عن رسول الله صلى الله عليه وسلم من رواية ابي هريرة وابن مسعود وعثمان بن العاص وابي امامه والنواس بن سمعان وعبد الله بن عمرو بن العاص ومجمع بن حارثة وابي شريحة وحذيفة بن اسيد رضي الله عنهم وفيها دلالة على صفة نزوله ومكانه الخ[1]

پس یہ ہیں وہ احادیث جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے تواتر کے درجہ تک منقول ہوئی ہیں اور یہ نقل روایت (آپ کے صحابہ) ابوہریرہ، ابن مسعود، عثمان بن العاص، ابوامامہ، نواس بن سمعان، عبداللہ بن عمرو بن العاص، مجمع بن حارثہ، ابی شریحہ حذیفہ بن اسید (رضی اللہ عنہم) سے ثابت ہے اور ان روایات میں عیسیٰ بن مریم کے طریقۂ نزول اور مکان نزول سے متعلق بھی رہنمائی موجود ہے۔

اور حافظ حدیث ابن حجر عسقلانی (نور اللہ مرقدہٗ) علامہ ابوالحسین آبری (رحمہ اللہ) سے نزولِ عیسیٰ (علیہ السلام) سے متعلق احادیث کے تواتر کو فتح الباری میں ان الفاظ کے ساتھ نقل کرتے ہیں۔

قال ابو الحسن الخسعي الابري بان المهدي من هذه الامة وان عيسى يصلي خلفه الخ[2]

ابوالحسن خسعی ابری سے منقول ہے کہ احادیث رسول اس بارہ میں تواتر کو پہنچ چکی ہیں کہ مہدی اسی امت میں سے ہوں گے اور عیسیٰ علیہ السلام ان کے پیچھے نماز پڑھیں گے

اور تلخیص الحبیر کتاب الطلاق کے ضمن میں یہ تحریر فرماتے ہیں۔

واما رفع عيسى فاتفق اصحاب الاخبار والتفسير على انه ببدنه حيا الخ

لیکن رفع عیسیٰ (علیہ السلام) کا معاملہ تو تمام علماء حدیث و تفسیر کا اس پر اجماع ہے کہ وہ اپنے جسدِ عنصری کے ساتھ ہنوز زندہ ہیں (اور وہی قریب قیامت نازل ہوں گے)

[1] تفسیر ابن کثیر ج ۱ ص ۵۸۳ - ۵۷۹

اور محدثِ عصر محقق وقت علامہ سید محمد انور شاہ "عقیدۃ الاسلام" میں اس "تواتر" کی تائید میں یہ تحریر فرماتے ہیں۔

وللمحدث العلامۃ الشوکانی رسالۃ	اور محدث علامہ شوکانی نے ایک رسالہ تصنیف کیا ہے
سماھا التوضیح فی تواتر ما جاء فی	جس کا نام یہ رکھا ہے "التوضیح فی التواتر ما جاء فی المنتظر
المنتظر والدجال والمسیح ذکر فیھا	والدجال والمسیح" اُس رسالہ میں انھوں نے انتیس ۲۹
تسعۃ وعشرین حدیثا فی نزولہ	احادیث حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کے نزول سے
علیہ السلام ما بین صحیح و	متعلق نقل کی ہیں جو اصولِ حدیث کے لحاظ سے صحیح،
حسن وصالح ھذا ازینا	حسن، صالح تینوں درجات کو شامل ہیں اور مرفوع
منہ مرفوع واما الآثار فتفوت	احادیث اس تعداد سے بھی زیادہ موجود ہیں اور آثارِ صحابہ
الاحصاء الخ ؎	(رضی اللہ عنہم) تو بے شمار ہیں۔

اور یہی وجہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے رفع سماوی اور حیات و نزول من السماء پر امتِ محمدیہ (علیہا الصلوٰۃ والسلام) کا اجماع منعقد ہو چکا ہے چنانچہ علم عقائد و کلام کی مشہور و مستند کتاب عقیدۂ سفارینی میں امت کے اس اجماع کی تصریح موجود ہے۔

ومنھا ای من علامات الساعۃ	اور علاماتِ قیامت میں سے تیسری علامت یہ ہے کہ
العظمی العلامۃ الثالثۃ ان	حضرت (مسیح) عیسیٰ بن مریم (علیہ السلام) آسمان سے
ینزل من السماء سیدنا (المسیح)	اتریں گے اور اُن کا آسمان سے اُترنا کتاب، (قرآن) سنت
عیسیٰ بن مریم (علیہ السلام)	(حدیث) اور اجماع امت سے قطعاً ثابت ہے۔

؎ صفحہ ۲ حضرت استاذ کا یہ رسالہ اپنے موضوع میں بے نظیر تصنیف ہے۔ عربی زبان میں تحریر ہے اور علماء طلبہ دونوں کیلئے لائق مطالعہ ہے مصنف قصص القرآن اس سلسلہ کے اکثر مباحث میں اسی رسالہ کا خوشہ چیں ہے۔

ونزوله ثابت بالكتاب والسنة واجماع الامة ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ واما الاجماع فقد اجمعت الامة على نزوله ولم يخالف فيه احد من اهل الشريعة وانما انكر ذلك الفلاسفة والملاحدة مما لا يعتد بخلافه [1]

(قرآن وحدیث سے نزول ثابت کرنے کے بعد فرماتے ہیں) جہاں تک اجماعِ اُمت کا تعلق ہے تو اُس میں ذرا شبہ نہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے آسمان سے نازل ہونے پر امت کا اجماع ہے اور اس بارہ میں پیروانِ شریعتِ اسلامی میں سے کسی ایک کا بھی خلاف موجود نہیں البتہ فلسفیوں اور ملحدوں نے نزولِ عیسیٰ کا انکار کیا ہے اور اسلام میں ان کا انکار قطعاً بے وقعت ہے۔

حیات ونزولِ مسیح کی حکمت

گذشتہ سطور میں حیات ونزولِ مسیح (علیہ السلام) کو دلائل وبراہین کی روشنی میں بیان کیا گیا ہے جو ایک منصف اور طالبِ حق کو علمِ یقین عطا کرتے ہیں، اب مزید طمانیتِ قلب کے لئے ان چند حکمتوں کا ذکر بھی مناسب معلوم ہوتا ہے جن کو علمارِ حق نے اس سلسلہ میں بیان فرمایا ہے لیکن اس کے مطالعہ سے قبل یہ حقیقت بہرحال پیشِ نظر رکھنی چاہئے کہ اللہ تعالیٰ کی حکمتوں اور اس کی مشیت کی مصلحتوں کا احاطہ عقلِ انسانی کے لئے ناممکن ہے اور مخلوق، خالقِ کائنات کے اسرار وحکم پر عبور بھی کیسے کر سکتی ہے؟ تاہم علمارِ امت، فراستِ مومن اور علمِ حق کی راہ سے دین اور احکامِ دین کے اسرار ومصالح پر قلم فرسائی کرتے اور اپنی محدود دسترس کے مطابق اس موضوع پر علمی حقائق

[1] صحابہ، تابعین اور تبع تابعین کے تین زمانوں کو "خیر القرون" کہا جاتا ہے چونکہ نبی معصوم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ان تینوں کے متعلق یہ ارشاد فرمایا ہے "خیر القرون قرنی، ثم الذین یلونہم، ثم الذین یلونہم" سب سے بہتر میرا زمانہ ہے پھر ان لوگوں کا جو اس زمانہ سے قریب ہیں اور پھر اُن کا جو اس دوسرے زمانہ سے متصل ہیں اور اس کے بعد فرمایا "پھر جھوٹ کی کثرت ہو جائے گی یعنی ان ہر سہ ادوار کے بعد اکثریت کے اندر دینی انحطاط پیدا ہو جائیگا اور اسلامی خصوصیاتِ اخلاق مٹ جائے گی۔

کا اظہار کرتے آئے ہیں۔

اسلامی دور کی علمی تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ دورِ اول میں "علم الاسرار" کی امامت کا شرف عمر بن الخطاب، علی بن ابی طالب اور صدیقہ عائشہ (رضی اللہ عنہم) کو حاصل تھا اور اس کے بعد اگرچہ ہر ایک صدی میں دو چار علماء ربانی اس کے ماہر و محقق رہے ہیں لیکن خصوصیت کے ساتھ خلیفۂ اموی عمر بن عبد العزیز، امام ابو حنیفہ، علامہ عز الدین بن عبد السلام مصری، حافظ ابن تیمیہ، امام غزالی، روحی، سید مرتضیٰ زبیدی اور شاہ ولی اللہ دہلوی کو اس علم سے خاص مناسبت تھی اور اللہ تعالیٰ نے اس سلسلہ میں اُن کو فطری ملکہ عطا فرمایا تھا۔

بہر حال "حکمت کی حیثیت لطائف و نکات کی ہوتی ہے اور اس کو دلیل و حجت کا مرتبہ نہیں دیا جاسکتا اس لئے زیرِ بحث مسئلہ میں بھی "حکمت و مصلحت" کا ذکر اسی نقطۂ نظر سے سمجھنا چاہیئے۔ واللہ اعلم بالصواب ولکل شئ عندہ فصل الخطاب"

(۱) یہود بنی اسرائیل اپنی مذہبی کتابوں کی پیشینگوئیوں اور بشارتوں میں یہ پڑھ چکے تھے کہ ان کو دو شخصیتوں "مسیحِ ہدایت" اور "مسیحِ ضلالت" سے سابقہ پڑے گا اس لئے وہ منتظر تھے کہ موسیٰ (علیہ السلام) کے بعد "مسیحِ ہدایت" کا ظہور کب ہوتا ہے لیکن ہُوا یہ کہ جب مسیحِ ہدایت کا ظہور ہوا تو انھوں نے بغض و حسد کی راہ سے اس کو "مسیحِ ضلالت" کہہ کر رد کردیا اور صرف یہی نہیں بلکہ آمادۂ قتل ہوگئے اور چونکہ قتل انبیاء اُن کا دستور رہا تھا اس لئے وہ اس پر ہر وقت جری رہتے تھے۔ پس جبکہ وہ دوسرے انبیاء علیہم السلام کی طرح اُن کے قتل کے بھی قائل ہوگئے۔ تو یہ تعجب خیز بات نہ ہوئی کہ جب مسیحِ ضلالت (دجال) کا خروج ہو تو یہود اس کو مسیحِ ہدایت کہہ کر قومی حیثیت سے اُس کے پیرو ہو جائیں، کیونکہ مذہبی تعلیم کے پیشِ نظر اُن پر مسیحِ ہدایت کا اتباع ضروری تھا اور جب وہ مسیحِ ہدایت کو

مسیحِ ضلالت کہہ کر قتل کر چکے تو اب مسیحِ ضلالت کو ہی اُس کے دعوے کے مطابق مسیحِ ہدایت تسلیم کرنے پر آمادہ ہو جائیں گے مگر مشیتِ الٰہی فیصلہ کر چکی تھی کہ مسیحِ ضلالت کی گمراہی کا فتنہ چونکہ عظیم الشان ہو گا اور وہ اوّل خدائی کا دعویٰ کرے گا اور اس کے بعد مسیحِ ہدایت بنے گا اس لئے اس کا خروج قیامت کے قریب ہی ہونا چاہئے جو دورِ فتن یعنی فتنوں کی آماجگاہ ہو گا اس لئے حکمتِ الٰہی کا یہ بھی منشا ہوا کہ "مسیحِ ہدایت" کو یہود کے فتنہ سے اس طرح بچا لیا جائے کہ وہ اس کو ہاتھ بھی نہ لگا سکیں اور جب وہ وقت آ پہنچے کہ مسیحِ ضلالت اپنی گمراہی کا علم بلند کرے تو مسیحِ ہدایت ملاءِ اعلیٰ سے کائناتِ ارضی پر اُترے اور یہودیِ اسرائیل جو کہ بہ تعدادِ کثیر مسیحِ ضلالت کے پیرو ہو رہے ہوں گے اپنی آنکھوں سے حق و باطل کا مشاہدہ کر لیں اور جب مسیحِ ہدایت کے مقدس ہاتھوں سے مسیحِ ضلالت کا خاتمہ ہو جائے تو "جَاءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ إِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوقًا" حق الیقین بن کر ان کی نگاہوں کے سامنے آ جائے اور اس طرح قبولِ حق کے ماسوا ان کے لئے دوسرا چارۂ کار باقی ہی نہ رہے اور یا پھر وہ بھی مسیحِ ضلالت کے ساتھ "فی النار" کر دیئے جائیں۔

نیز یہ حقیقت بھی پیشِ نظر رہے کہ ادیان و ملل کی تاریخ میں صرف یہود ہی ایک ایسی جماعت ہے جس نے اپنے انبیاء (علیہم السلام) کو بھی قتل کرنے سے ہاتھ نہیں روکا لیکن حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کے بعد یہود نے جن انبیاء کے خونِ ناحق سے ہاتھ رنگے تھے وہ صرف "نبی" ہی تھے جو "علماء امتی کانبیاء بنی اسرائیل" کا مصداق تھے مگر کوئی صاحبِ شریعت رسول اُن کے اس قتلِ ناحق کا مظلوم نہیں بنا تھا اس لئے یہ پہلا موقعہ تھا کہ انھوں نے ایک جلیل القدر رسول (عیسیٰ بن مریم) کو قتل کرنے کا نہ صرف ارادہ کیا بلکہ دنیوی اسباب کے لحاظ سے مکمل تیاری کر لی تھی تب مشیتِ حق نے یہ فیصلہ کیا کہ مسیحِ ہدایت کو اس طرح

بچا لیا جائے کہ خود یہود کو بھی محسوس ہو جائے کہ وہ مسیح بن مریم پر دسترس نہ پا سکے، لہذا فیصلۂ مشیت بروئے کار آیا اور حضرت مسیح کو ملاءِ اعلیٰ کی جانب اٹھا لیا گیا اور تمام دنیوی اسباب ہیچ ہو کر رہ گئے۔ لیکن اس احساس کے باوجود چونکہ حقیقتِ حال تک نہ پہنچ سکے اور ظن و گمان ہی کے قعر میں پڑے رہے گو اپنی بات رکھنے کے لئے مشہور یہی کرتے رہے کہ ہم نے مسیح بن مریم کو قتل کر دیا۔ ادھر متبعین مسیح ہدایت (نصاریٰ) کی بدبختی دیکھئے کہ کچھ عرصہ کے بعد پولوس رسول نے اُن میں عقیدۂ تثلیث و کفارہ کی بدعت پیدا کر کے یہود کے گڑھے ہوئے افسانۂ صلیب کو بھی داخلِ عقیدہ کر دیا، اور اب یہود و نصاریٰ دونوں جماعتیں اس گمراہی میں مبتلا ہو گئیں کہ عیسیٰ بن مریم صلیب پر چڑھا کر قتل کر دئے گئے۔ تب قرآنِ عزیز نے نازل ہو کر حق و باطل کے درمیان فیصلہ سنایا اور حضرت مسیح (علیہ السلام) کے متعلق دونوں جماعتوں نے جو دو الگ الگ رُخ اختیار کئے تھے اور پھر ایک مسئلہ میں دونوں کا اتفاق بھی ہو گیا تھا اُن سب کے متعلق علم الیقین کے ذریعہ حقیقتِ حال کو واشگاف اور دونوں کی گمراہی کو واضح کر کے قبولِ حق کے لئے دعوت دی مگر جماعتی حیثیت سے دونوں نے انکار کر دیا اور حضرت مسیح سے متعلق اپنے اپنے گمراہ کُن عقیدہ پر قائم رہے مگر عالم الغیب والشہادۃ چونکہ ان حقائق کا اُن کے وقوع سے قبل عالم و دانا تھا اس لئے اُس کی حکمت کا یہ بھی تقاضا ہوا کہ مسیح ہدایت کو کائناتِ ارضی پر اس وقت دوبارہ بھیجا جائے جب مسیحِ ضلالت کا بھی خروج ہو چکے تاکہ یہود و نصاریٰ کے سامنے حقیقتِ حال مشاہدہ کے درجہ میں روشن ہو جائے، یہود آنکھوں سے دیکھ لیں کہ جس کے قتل کے مدعی تھے قدرتِ الٰہی کے کرشمہ کی بدولت وہ بقیدِ حیات موجود ہے اور نصاریٰ نادم ہوں کہ حضرت مسیح کی سچی پیروی چھوڑ کر جو گمراہ کُن عقیدہ اختیار کیا تھا وہ سرتاپا باطل اور ہیچ تھا اور اس طرح

ہدایت و ضلالت کے معرکہ میں حق کی سربلندی اور باطل کی پستی کا دونوں مشاہدہ کر کے قرآنِ عزیز کی تصدیق پر مجبور ہو جائیں اور دونوں جماعتیں ایمانِ حق کو برضا و رغبت اختیار کر لیں، اور اپنے باطل عقائد پر شرمسار و سرنگوں ہو جائیں۔ اور چونکہ ان دونوں جماعتوں کے علاوہ ہدایت و ضلالت کا یہ مشاہدہ و مظاہرہ دوسرے اہلِ باطل بھی کریں گے اس لئے وہ بھی حلقہ بگوشِ اسلام ہو جائیں گے اور اس طرح احادیثِ صحیحہ کے مطابق اس زمانہ میں کائناتِ ارضی کا صرف ایک ہی مذہب ہو گا اور وہ "اسلام" ہو گا۔ "هُوَالَّذِیۡۤ اَرۡسَلَ رَسُوۡلَهٗ بِالۡهُدٰی وَدِیۡنِ الۡحَقِّ لِیُظۡهِرَهٗ عَلَی الدِّیۡنِ کُلِّهٖ وَکَفٰی بِاللّٰهِ شَهِیۡدًا"

(۲) ادیان و ملل کی تاریخ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام اور معاندینِ حق کے درمیان "سنۃ اللہ" کے دو مستقل دور رہے ہیں، پہلا دور حضرت نوح (علیہ السلام) سے شروع ہو کر حضرت لوط (علیہ السلام) پر ختم ہوتا ہے، اس دور میں سنۃ اللہ یہ رہی کہ جب قوموں نے اپنے پیغمبروں کی صدائے حق پر کان نہ دھرا بلکہ برابر اُس کا تمسخر کرتی اور اس کے پیغامِ حق کے آڑے آتی رہیں، تب اللہ تعالیٰ کے عذاب نے ان کو ہلاک کر دیا اور دوسروں کے لئے اُن کو باعثِ عبرت و بصیرت بنا دیا۔ اور دوسرا دور حضرت ابراہیم (علیہ السلام) سے شروع ہو کر خاتم الانبیاء محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچا ہے۔ اس دور میں سنت اللہ کی خصوصیت یہ رہی ہے کہ جب اعدائے حق اور دشمنانِ دینِ قویم نے کلمۂ حق کی مخالفت پر اصرار کیا، اپنے پیغمبروں کو ایذا دہی اور اُن کے ساتھ تمسخر کو اپنا نصب العین بنا لیا تو اللہ تعالیٰ نے اُن قوموں کو ہلاک کرنے کی بجائے اپنے پیغمبروں کو یہ حکم دیا کہ وہ خدا کی راہ میں وطن چھوڑ دیں اور "ہجرت" کر جائیں چنانچہ حضرت ابراہیمؑ پہلے پیغمبر ہیں جنھوں نے قوم[1] کے سامنے یہ اعلان کیا "اِنِّیۡ مُهَاجِرٌ اِلٰی رَبِّیۡ اِنَّهٗ

---

[1] یہ حضرت ابراہیمؑ کی اپنی قوم نہیں تھی اس لئے کہ یہ بنی سام (سامی) تھے اور نماردۂ عراق اور ان کی قوم بنی حام (حامی) تھے

ھوالعزیز الحکیم" اور عراق سے شام کی جانب ہجرت فرما گئے۔

پھر یہی صورت حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کو پیش آئی اور وہ بنی اسرائیل کو ساتھ لے کر مصر سے شام کو ہجرت کر گئے مگر فرعون اور اس کے لشکریوں نے چونکہ مزاحمت کی اور ہجرت کے بیچ آڑے آئے اس لئے وہ بحر قلزم میں غرق کر دیے گئے۔

اور یہی صورت نبی اکرم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو پیش آئی کہ جب قریشِ مکہ نے اذیت، تمسخر، دینِ حق کے ساتھ تصادم، اعمالِ دین کی مزاحمت میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا تب مشیتِ الٰہی کا فیصلہ ہوا کہ آپ مکہ سے مدینہ کو ہجرت کر جائیں۔ چنانچہ ہر قسم کی نگرانی اور مکان کے ہر طرف محاصرہ کے باوجود کرشمۂ قدرت سے آپ محفوظ و مامون مدینہ ہجرت کر گئے۔

"سنت اللہ" کے اسی دور میں حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کی بعثت ہوئی اور اُن کی قوم بنی اسرائیل نے ان کے ساتھ اور ان کی دعوتِ حق کے ساتھ بھی وہ سب کچھ کیا جو معاندینِ حق اور دشمنانِ دین اپنے پیغمبروں کے ساتھ کرتے رہے تھے اور ان میں ایک یہ خصوصیت زیادہ تھی کہ وہ حضرت مسیح (علیہ السلام) سے قبل چند انبیاء کو قتل تک کر چکے تھے اور اب حضرت مسیح کے قتل کے درپے تھے، اسی کے ساتھ یہ مسطورۂ بالا حقیقت بھی فراموش نہیں رہنی چاہئے کہ یہود، مسیح ہدایت اور مسیح ضلالت دو مسیح کے منتظر تھے اور حضرت عیسیٰ ابن مریم کو مسیح ضلالت قرار دے کر آج بھی مسیح ہدایت کے منتظر ہیں۔ اس لئے اللہ تعالیٰ کی حکمتِ بالغہ کا یہ فیصلہ ہوا کہ حضرت مسیح (علیہ السلام) کی ہجرت مکانِ ارضی کی بجائے ملاءِ اعلیٰ کی جانب ہو تاکہ مقررہ وقت آنے پر وہ مسیح ہدایت اور مسیح ضلالت کے درمیان مشاہدہ سے امتیاز کر سکیں اور ایک جانب اگر مسیح ہدایت کو مسیح ہدایت سمجھیں تو دوسری جانب قرآن کے فیصلۂ حق کی صداقت و حقانیت کو دیکھ کر دینِ حق

"اسلام" کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیں اور ساتھ ہی نصاریٰ کو بھی اپنی جہالت اور یہود کی کورانہ تقلید پر ندامت ہو اور وہ بھی تعلیم قرآن کی صداقت پر یقین و اعتقاد کے ساتھ شہادت دینے پر آمادہ ہو جائیں۔

کچھ عجیب صورتِ حال ہے کہ حضرت مسیح (علیہ السلام) اور خاتم الانبیاء محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے درمیان دعوت و تبلیغِ حق، اور معاندین کی جانب سے حق کی معاندت و مخالفت، اور پھر اس کے نتائج و ثمرات میں بہت ہی زیادہ مشابہت پائی جاتی ہے۔ دونوں کی اپنی قوم نے دونوں کو جھٹلایا، دونوں کی قوموں نے سازشِ قتل کے بعد مکانوں کا محاصرہ کیا، قدرتِ حق کے کرشمۂ اعجاز نے دونوں کو دشمنوں کی دسترس سے ہر طرح محفوظ رکھا، دونوں کے لئے ہجرت کا معاملہ پیش آیا، البتہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت چونکہ بعثتِ عامہ تھی اور اس کی دعوت و تبلیغ کے لئے ذاتِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا کرۂ ارضی پر قیامِ مسلسل ضروری تھا اس لئے مکہ سے مدینہ کو ہجرت کا حکم ہوا اور عیسیٰ ابن مریم (علیہما الصلوٰۃ والسلام) چونکہ قوم کو دعوتِ حق پہنچا چکے تھے اور ایک خاص مقصدِ عظیم کے پیشِ نظر ان کا مدتِ مدیدہ کے بعد کائناتِ ارضی پر موجود ہونا ضروری تھا اس لئے اُن کو ہجرتِ ارضی کی بجائے ہجرتِ سماوی پیش آئی پھر جس طرح نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے زمانہ کے قائدِ ضلالت "امیہ بن خلف" کو اپنے حربہ سے قتل کیا عیسیٰ بن مریم (علیہما السلام) بھی اپنی قوم کے مسیحِ ضلالت دجال کو قتل کریں گے اور جس طرح نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہجرت کے بعد آپ کے وطن مکہ پر قدرتِ حق نے اقتدار عطا فرما دیا عیسیٰ بن مریمؑ کا نزول بھی شام ہی کے اس مشہور شہر میں ہوگا جس سے اپنی قوم کی معاندانہ سازشوں کی بنا پر ملاءِ اعلیٰ کی جانب ہجرت پیش آئی تھی اور بیت المقدس، دمشق اور شام کے پورے

ملک پر یہود کے علی الرغم ان کی حکومت ہوگی۔[1]

(۳) حضرت مسیح (علیہ السلام) سے پہلے قتلِ انبیاء (علیہم السلام) نے یہود کو اس درجہ گستاخ اور بے باک بنا دیا تھا کہ وہ یہ سمجھ بیٹھے کہ کسی ہستی کے متعلق یہ فیصلہ کہ وہ نبیِ صادق ہے یا متنبّیِ کاذب ہمارے ہاتھ میں ہے اور جس کو ہم اور ہمارے فقیہ "کاذب" قرار دیدیں وہ واجب القتل ہے چنانچہ اسی زعمِ باطل میں انھوں نے عیسیٰ بن مریم علیہما السلام کو مسیحِ ضلالت کہا اور ان کے فقیہوں نے قتل کا فتوی صادر کردیا۔ حالانکہ یہ وہ جلیل القدر ہستی تھی کہ موسیٰ (علیہ السلام) کے بعد بنی اسرائیل میں اس پایہ کا کوئی پیغمبر مبعوث ہی نہیں ہوا تھا اور اس نے جدید پیغامِ حق (انجیل) کے ذریعہ روحانیت کی مزرہ کھیتی میں دوبارہ جان ڈالدی تھی تب اللہ تعالیٰ کی مشیت کا فیصلہ ہوا کہ ہمیشہ کے لئے بنی اسرائیل کے اس زعمِ باطل کو پاش پاش کردیا جائے اور دکھا دیا جائے کہ رب العالمین، خالقِ کائنات جس کی حفاظت کا وعدہ کرلے کائنات کی کوئی ہستی یا مجموعۂ کائنات بھی اس پر دسترس نہیں پاسکتی، چنانچہ یدِ قدرت نے اُس وقت اُس مقدس ہستی کو جسدِ عنصری کے ساتھ ملاءِ اعلیٰ کی جانب اٹھا لیا جب کہ مکان کے محاصرہ کے ساتھ دشمنوں نے اس کی حفاظتِ جان کے تمام وسائلِ دنیوی مسدود کردیئے تھے۔

پھر اس واقعہ نے ایک نئی صورت پیدا کردی وہ یہ کہ مذاہب کی تاریخ میں صرف حضرت مسیح (علیہ السلام) ہی کی شخصیت ایسی ہے جن کے قتل و عدمِ قتل کے متعلق حق و باطل کے درمیان سخت اختلاف پیدا ہوا اور یہود و نصاریٰ کے باہم واقعۂ صلیب و قتل پر اتفاق کے باوجود دو باطل اور متضاد عقائد کی کشمکش نظر آنے لگی،

[1] خلاصہ از عقیدۃ الاسلام۔

یہود قتل وصلیب کی وجہ یہ ظاہر کرتے ہیں کہ ان کے نزدیک وہ "مسیح ضلالت" تھے اور نصاریٰ وجہ صلیب یہ بتاتے ہیں کہ وہ خدا کے بیٹے تھے جو کائنات کے گناہوں کا کفارہ بننے کے لئے بھیجے گئے تھے تاکہ پاپی دنیا پاپ سے پاک ہوجائے۔ اور صدیوں بعد جب قرآن نے "امرِ حق" کو واضح، اور مسیح بن مریمؑ سے متعلق حقیقتِ حال کو روشن کیا تب بھی دونوں جماعتوں نے جماعتی حیثیت سے اس کو قبول کرنے سے انکار کردیا لہٰذا قدرتِ حق کا فیصلہ ہوا کہ خود مسیح بن مریم (علیہما السلام) ہی وقتِ موعود پر نازل ہوکر قرآن کے فیصلہ کی تصدیق کردیں اور یہود ونصاریٰ کے باطل عقائد کا خود بخود اس طرح خاتمہ ہوجائے اور اس کے بعد مدعیانِ اہلِ کتاب کو شرک وباطل کی پیروی کے لئے کوئی گنجائش باقی نہ رہے اور خدا کی حجت اُن پر تمام ہوجائے۔

نیز جبکہ اللہ تعالیٰ نے کائناتِ ہست وبود کے لئے یہ فیصلہ کردیا ہے کہ خدا کی ہستی کے ماسوا ہر ایک وجود کو فنا اور موت ہے "كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ" "كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ" اور یہ ظاہر ہے کہ ملاءِ اعلیٰ اور عالمِ قدس مقامِ موت نہیں ہے بلکہ مقامِ حیات ہے اس لئے ازبس ضروری ہے کہ عیسیٰ بن مریم (علیہما السلام) بھی موت کا ذائقہ چکھیں اور اس کے لئے کائناتِ ارضی پر اتریں تاکہ زمین کی امانت زمین ہی کے سپرد ہو اس لئے "حیات ورفع" کے بعد "نزولِ ارضی" مقدر ہوا[1]۔

علماءِ حق نے حیات ونزولِ عیسیٰ علیہ السلام سے متعلق جو "اسرار وحِکَم" بیان فرمائے ہیں یہاں اُن کا احاطہ مقصود نہیں ہے اس لئے مختصر چند حکمتوں کا ذکر کردیا گیا ورنہ محدثِ عصر علامہ سید محمد انور شاہ نور اللہ مرقدہٗ نے اس مسئلہ میں ایک طویل مقالہ عقیدۃ الاسلام

[1] فتح الباری ج ۶

میں سپردِ قلم فرمایا ہے جو لائقِ مطالعہ ہے، حضرت استاذ نے نہایت لطیف مگر دقیق پیرایۂ بیان میں کائناتِ عالم کو "انسانِ کبیر" اور انسان کو "عالمِ صغیر" قرار دے کر ان ہر دو عالم کی حیات و موت پر جو بحث فرمائی ہے اُس سے حضرت مسیحؑ کے رفع اور قربِ قیامت میں کائناتِ ارضی کی جانب رجوع کی حکمت بہت اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے لیکن یہ کتاب چونکہ اس دقیق بحث کی متحمل نہیں ہے اس لئے اپنی جگہ قابلِ مراجعت ہے۔

آخر میں اب اپنی جانب سے چند جملے اس سلسلہ میں اضافہ کر کے اس مبحث کو ختم کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

(۴) قرآن عزیز میں "میثاقِ انبیاء" سے متعلق یہ ارشادِ باری ہے

وَإِذْ أَخَذَ اللّٰهُ مِيثَاقَ النَّبِيِّينَ لَمَا آتَيْتُكُمْ مِنْ كِتَابٍ وَحِكْمَةٍ ثُمَّ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مُصَدِّقٌ لِمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهِ وَلَتَنْصُرُنَّهُ قَالَ أَأَقْرَرْتُمْ وَأَخَذْتُمْ عَلَىٰ ذَٰلِكُمْ إِصْرِي قَالُوا أَقْرَرْنَا قَالَ فَاشْهَدُوا وَأَنَا مَعَكُمْ مِنَ الشَّاهِدِينَ ۝ (آل عمران)	اور وہ وقت قابلِ ذکر ہے جبکہ اللہ نے نبیوں سے (یہ) عہد لیا کہ جب تمہارے پاس (خدا کی جانب سے) کتاب اور حکمت آئے پھر ایسا ہو کہ تمہاری موجودگی میں ایک رسول (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) آئے جو تصدیق کرتا ہوا اُن کتابوں کی جو تمہارے پاس ہیں، ضرور تم اس پر ایمان لانا اور ضرور اس کی مدد کرنا، اللہ نے کہا: کیا تم نے اقرار کیا انھوں نے جواب دیا ہاں ہم نے اقرار کیا، اللہ نے کہا: پس تم اپنے اس عہد پر گواہ رہو اور میں بھی تمہارے ساتھ گواہ ہوں۔

آلِ عمران کی اِن آیات میں حسب تفسیر حضرت اِبنِ عباس (رضی اللہ عنہما) اُس عہد و بیان کا تذکرہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے ازل میں خاتم الانبیاء محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق انبیاء و رسل (علیہم السلام) سے لیا، قرآن کے اسلوبِ بیان کے مطابق اگرچہ یہ خطاب انبیاء و رسل کی معرفت اُن کی اُمتوں سے تھا کہ اُن میں سے جو اُمتیں خاتم الانبیا صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانۂ مبارک پائیں تو اُن پر ایمان لائیں اور دعوتِ حق میں اُن کی نصرت و یاری کریں چنانچہ ہر ایک پیغمبر نے اپنے دور میں تعلیمِ حق کے ساتھ ساتھ خدا کے اس وعدہ کو بھی یاد دلایا اور اُن میں سے اہلِ حق نے وعدہ دیا اور اقرار کیا کہ ضرور اُن پر ایمان لائیں گے اور پیغامِ حق میں اُن کی مدد کریں گے۔

تو یہ "میثاق النبیین" اگرچہ اس طرح پورا ہوتا رہا تاہم ازل میں چونکہ اس عہد و میثاق کے اول مخاطب حضراتِ انبیاء و رسل تھے اس لئے اس میثاق کی عملی حیثیت کا تقاضا تھا کہ خود انبیاء و رسل میں سے بھی کوئی نبی یا رسول اس عہد و میثاق کا عملی مظاہرہ کر کے دکھائے تاکہ یہ خطابِ اولیں براہِ راست بھی موثر ثابت ہو کہ "ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ" میں بقاعدۂ عربیت خطاب تھا اُن تمام انبیاء و رسل سے جو ذاتِ اقدس سے پہلے اس کائناتِ ارضی میں مبعوث ہونے والے تھے کیونکہ ازل ہی میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے لئے یہ مقرر ہو چکا تھا

لہ عن علی و ابن عباس فی تفسیر آیۃ "ما بعث اللہ نبیا من الانبیاء الا اخذ علیہ المیثاق لئن بعث اللہ محمداً وھو حی لیؤمنن بہ ولینصرنہ وامرہ ان یاخذ المیثاق علی امتہ لئن بعث محمد وھم احیاء لیؤمنن بہ ولینصرنہ (تفسیر ابن کثیر ج ۱)

اللہ تعالیٰ نے انبیاء میں سے جس نبی کو بھی کسی قوم کی رشد و ہدایت کے لئے مبعوث فرمایا تو اُس سے یہ عہد ضرور لیا ہے کہ اگر تم میں سے کوئی اس وقت زندہ ہو جبکہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہو گی تو تم ضرور اُس پر ایمان لانا اور ضرور اس کی مدد کرنا اور ان سے یہ بھی کہا کہ وہ اپنی اپنی اُمتوں سے بھی یہی عہد و پیمان لیں کہ اُن میں سے جو اس وقت موجود ہوں وہ اس پر ایمان لائیں اور اس کی مدد کریں۔

"وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ" پس محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی صفت "خاتم النبیین" اور ازل سے مقدر "میثاق النبیین" کا اجتماع صرف اسی ایک شکل میں ممکن تھا کہ انبیاء سابقین میں کوئی ایک پیغمبر بعثتِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نزول فرمائیں اور وہ اولاً اُن کی امت دنیاء انسانی کے سامنے خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائیں اور "دینِ حق" کی مدد و نصرت کا مظاہرہ کریں تاکہ "لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَلَتَنْصُرُنَّهٗ" کا وعدۂ حق پورا ہو۔

گذشتہ صفحات میں یہ حقیقت بخوبی عیاں ہو چکی ہے کہ اگرچہ تمام انبیا و رسل اپنے اپنے زمانہ میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد کی بشارات دیتے چلے آتے تھے لیکن یہ خصوصیت حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) ہی کے حصہ میں آئی کہ وہ ذاتِ اقدس کی بعثت کے لئے تمہید اور براہ راست منادو مبشر بنے اور بنی اسرائیل کو تعلیم حق دیتے ہوئے یہ ارشاد فرمایا "اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ مُّصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَمُبَشِّرًۢا بِرَسُوْلٍ يَّاْتِيْ مِنْۢ بَعْدِي اسْمُهٗۤ اَحْمَدُ" اور حقیقت یہ ہے کہ خاتمِ انبیاء بنی اسرائیل ہی کا یہ حق تھا کہ وہ خاتم الانبیاء والرسل کی بعثت کا "مناد" اور "مبشر" ہو۔ اس لئے حکمتِ ربانی کا یہ فیصلہ ہوا کہ "میثاق النبیین" کی وفاء کے لئے اُن ہی کو منتخب کیا جائے اور اس معاملہ میں وہی تمام انبیا و رسل کی نمائندگی کریں تاکہ امتوں کی جانب سے ہی نہیں بلکہ براہِ راست انبیاء و رسل کی جانب سے وفاءِ عہد کا عملی مظاہرہ ہو سکے، اسی حقیقت کے پیشِ نظر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ارشاد فرمایا "انا اولی الناس بعیسی بن مریم والانبیاء اولاد علات لیس بینی وبینہ نبی"

مگر قرآن چونکہ خدا کا آخری پیغام ہے اور "اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ" کے وعدۂ الٰہی نے رہتی دنیا تک اُس کو تحریف سے محفوظ کر دیا ہے اس لئے قدرتی طور پر اس کی تعلیم کے ثمرات دوسرے انبیاء علیہم السلام کی تعلیمات کے مقابلہ میں مدتِ طویل تک اپنا کام کرتے رہیں گے

اور اس کی روشنی سے قلوب کو گرمانے اور طاعت ربانی کے لئے منتقل کرنے کے لئے "علمارِ امت" انبیاء بنی اسرائیل کی طرح خدمتِ حق انجام دیتے رہیں گے لیکن جب بعثتِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو گذرے ہوئے بہت ہی طویل عرصہ ہو جائے گا اور امتِ مرحومہ کے علمی، قومی، اور اجتماعی اعضار میں انتہائی اضمحلال پیدا ہو کر یہ کیفیت ہو جائے گی کہ ان کی بیداری اور تیز روی کے لئے صرف علمارِ حق کی رہنمائیت ہی کافی ثابت نہیں ہوگی وہ وقت اس کا متقاضی ہوگا کہ کوئی "قائم بالحجۃ" ان کو سنبھالے اور اس لئے مشیتِ الٰہی نے مقدر کیا کہ جو ہستی (عیسیٰ ابن مریم) انبیاء و رسل کے میثاقِ ازل کی نمایندگی کے لئے مامور ہے اس کا ایسے ہی وقت نزول ہو اور وہ امت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان رہ کر ذاتِ قدسی کی نیابت اور امت کی امامت کا فرض انجام دے اور "لتؤمننّ بہٖ ولتنصرنّہٗ" کا عملی مظاہرہ کر کے دکھائے۔

اب کرشمۂ قدرت دیکھئے کہ ازل کے ان مقدرات نے جو کہ ملارِ اعلیٰ سے تعلق رکھتے تھے کائناتِ ارضی میں کس طرح اپنی بساط بچھائی ہے بنی اسرائیل اپنے جلیل القدر پیغمبر کے قتل کے لئے سازش مکمل کر چکے ہیں، شاہی دستہ چاروں جانب سے مکان کو محصور کئے ہوئے ہے مگر قدرتِ حق اپنا کام اس طرح نہیں کرتی کہ معجزانہ کرشمہ کے ذریعہ ان کو محفوظ وہاں سے نکال کر خدا کی وسیع زمین کے دوسرے حصہ میں "ہجرت" کرا دیتی، نہیں بلکہ ہوا یہ کہ ان کو ملارِ اعلیٰ کی ہجرت کے لئے محفوظ و مامون زندہ اٹھا لیا اور سازش و محصور کرنے والوں کو ظن و ریب کی دلدل میں پھنسا کر ان کے لئے خسر الدنیا والآخرہ کا نشان عطا کر دیا اور پھر ارضی انسان کے ارضی احکام کے لئے وہ وقت مقرر کر دیا جو "میثاق النبیین" کی نمایندگی کے لئے موزوں تھا، یہی ہے وہ حقیقت جس کو زبانِ وحی ترجمان نے اس طرح ظاہر فرمایا

"والّذی نفسی بیدہٖ لیوشکن ان ینزل فیکم ابن مریم حکماً عدلاً" اور اسی کو نصِ قرآن نے یوں واضح کیا ہے "وانّہ لعلمٌ للساعۃ"

پھر یہ ہستی میثاقِ انبیاء و رسل کی نمائندگی کا اس طرح حق ادا کرے گی کہ جب اس کا نزول ہوگا تو اس کرشمۂ قدرت کو دیکھ کر مسلمانوں کے قلوب تصدیقِ قرآن اور تازگیٔ ایمان سے روشن ہو جائیں گے اور وہ حق الیقین کے درجہ میں یقین کریں گے کہ بلاشبہ راہِ مستقیم صرف "اسلام" ہی ہے اور مخبرِ صادق کی جس طرح یہ خبر "صادق" نکلی عالمِ غیب سے متعلق اس کی تمام خبریں اسی طرح حق اور بلاشبہ حق ہیں، اور نصاریٰ بحیثیتِ قوم اپنے باطل عقیدے "تثلیث وکفارہ" پر نادم و شرمسار ہوں گے اور قرآن اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کو اپنے لئے راہِ نجات اور راہِ سعادت یقین کریں گے اور یہود جب مسیحِ ہدایت اور مسیحِ ضلالت کے معرکۂ حق و باطل کا مشاہدہ کرلیں گے اور مسیحِ ہدایت کے نزول سے اپنے دعوئے قتل و صلیب کے ملعون عقیدہ کو باطل پالیں گے تو اب اُن کو بھی "ایمان بالحق" کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں رہے گا اور مسیحِ ضلالت کے رفقا کے علاوہ وہ سب ہی "مسلم" بن جائیں گے۔ یہی ہے قرآن کی وہ خبرِ صادق "وان من اھل الکتٰب الا لیؤمننّ بہٖ قبل موتہٖ" مسلمانوں میں ایمان کی تازگی و شگفتگی، نصاریٰ اور یہود میں تبدیلیٔ عقائد کا حیرت انگیز انقلاب دیکھ کر اب مشرک جماعتوں پر بھی قدرتی اثر پڑے گا اور ساتھ ہی خدا کے مقدس پیغمبر کے زبردست روحانی اثرات کارفرما ہوں گے اور نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ بھی حلقہ بگوشِ اسلام ہو جائیں گے اور اس طرح وحی ترجمان، حاملِ قرآن محمد صلی اللہ علیہ وسلم، کا یہ ارشاد اپنی صداقت کو نمایاں کرے گا "ویدعو الناس الی الاسلام ویھلک اللہ فی زمانہ الملل کلھا الا الاسلام ویھلک اللہ فی زمانہ الدجال"۔

اس تفصیل سے یہ بھی روشن ہو گیا کہ قرآن اور احادیث کی تصریحات ثابت کر رہی ہیں کہ اگر اس فرض کی انجام دہی کے لئے کوئی جدید نبی مبعوث ہوتا تو ایک جانب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا خصوصی شرف "خاتم النبیین" باقی نہ رہتا اور دوسری جانب "میثاق النبیین" کے خطابِ اولین کا عملی مظاہرہ عالمِ وجود میں نہ آتا کیونکہ وہ ہستی بہرحال محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی امت ہی میں سے ہوتی۔ البتہ سابق نبی کی آمد نقلاً اور عقلاً دونوں حیثیت سے شرفِ خصوصی "خاتم النبیین" کے لئے بھی قادح نہیں ہے اور "میثاق النبیین" کو بھی پورا کرتی ہے۔

واقعاتِ نزول صحیح احادیث کی روشنی میں

گذشتہ صفحات میں نزولِ عیسیٰ (علیہ السلام) سے متعلق جو صحیح احادیث ذکر کی گئیں اور اُن سے اور بعض دوسری صحیح احادیث سے جو تفصیلات ظاہر ہوتی ہیں اُن کو ترتیب کے ساتھ یوں بیان کیا جا سکتا ہے۔

قیامت کا دن اگرچہ معین ہے مگر ذاتِ باری کے ماسوا کسی کو اُس کا علم نہیں ہے اور اُس کا وقوع اچانک ہو گا "وَعِنْدَهُ عِلْمُ السَّاعَةِ اور قیامت کا علم خدا ہی کو ہے"۔ "حَتّٰى إِذَا جَآءَتْهُمُ السَّاعَةُ بَغْتَةً۔ حتی کہ اُن پر اچانک قیامت کی گھڑی آ جائیگی" "لَا تَأْتِيهِمْ إِلَّا بَغْتَةً۔ قیامت اُن پر نہیں آئیگی مگر اچانک" اور حدیث جبرئیل میں ہے "ما المسئول عنها باعلم من السائل (جبرئیلؑ نے کہا) قیامت کے بارہ میں آپ سے زیادہ مجھے بھی علم نہیں جو اجمالی علم آپ کو ہے اسی قدر مجھ کو بھی ہے" اور ایک حدیث میں ہے "سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول قبل ان یموت بشھر: تسألون عن الساعۃ وانما علمھا عند اللہ۔ تم مجھ سے قیامت کے متعلق سوال کرتے ہو تو اُس کا علم تو اللہ ہی کو ہے" البتہ قرآن عزیز اور احادیثِ صحیحہ نے چند ایسی علامات بیان کی ہیں جو قیامت کے قریب پیش آئیں گی اور اُن سے صرف اُس کے نزدیک ہو جانے کا پتہ چل سکتا ہے، ان "اشراطِ ساعت" میں سے ایک بڑی علامت

حضرت مسیح (علیہ السلام) کا ملاءِ اعلیٰ سے نزول ہے جس کی تفصیلات یہ ہیں۔

"مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان سخت معرکۂ جنگ برپا ہو رہا ہوگا اور مسلمانوں کی قیادت و امامت سُلالۂ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں سے ایک ایسے شخص کے ہاتھ میں ہوگی جس کا لقب "مہدی" ہوگا، اس معرکہ آرائی کے درمیان ہی میں مسیحِ ضلالت "دجال" کا خروج ہوگا یہ نسلاً یہودی اور ایک چشم ہوگا، کرشمۂ قدرت نے اس کی پیشانی پر (ک، ا، ف، ر) کا فر لکھ دیا ہوگا جس کو اہلِ ایمان فراستِ ایمانی سے پڑھ سکیں گے اور اس کے دجل و فریب سے جدا رہیں گے۔ یہ اول خدائی کا دعویٰ کریگا اور شعبدہ بازوں کی طرح شعبدے دکھا کر لوگوں کو اپنی جانب توجہ دلائیگا۔ مگر اس سلسلہ کو کامیاب نہ دیکھ کر کچھ عرصہ کے بعد "مسیحِ ہدایت" ہونے کا مدعی ہوگا، یہ دیکھ کر یہود بہ کثرت بلکہ قومی حیثیت سے اس کے پیرو ہو جائیں گے، اور یہ اس لئے ہوگا کہ یہود، مسیحِ ہدایت کا انکار کر کے اُن کے قتل کا ادعا کر چکے ہیں اور مسیحِ ہدایت کی آمد کے آج تک منتظر ہیں، اسی حالت میں ایک روز دمشق (شام) کی مسجدِ جامع میں مسلمان مُنہ اندھیرے نماز کے لیے جمع ہوں گے، نماز کے لئے اقامت ہو رہی ہوگی اور مہدیِ موعود امامت کے لئے مصلے پر پہنچ چکے ہوں گے کہ اچانک ایک آواز سب کو اپنی جانب متوجہ کریگی مسلمان آنکھ اُٹھا کر دیکھیں گے تو سپید بادل چھایا ہوا نظر آئیگا اور تھوڑے سے عرصہ میں یہ مشاہدہ ہوگا کہ عیسیٰ (علیہ السلام) دو زرد حسین چادروں میں لپٹے ہوئے اور فرشتوں کے بازوؤں پر سہارا دئے ہوئے ملاءِ اعلیٰ سے اُتر رہے ہیں فرشتے اُن کو مسجد کے منارۂ شرقی پر اُتار دینگے اور واپس چلے جائیں گے، اب حضرت عیسیٰ کا تعلق کائناتِ ارضی کے ساتھ دوبارہ وابستہ ہو جائے گا اور وہ عام قانونِ فطرت کے مطابق صحنِ مسجد میں اُترنے کے لئے سیڑھی کے طالب ہوں گے، فوراً تعمیل ہوگی اور وہ مسلمانوں کے ساتھ نماز کی صفوں میں آکھڑے ہوں گے

مسلمانوں کا امام (مہدی موعود) ازرہِ تعظیم پیچھے ہٹ کر حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) سے امامت کی درخواست کریگا، آپ فرمائیں گے کہ یہ اقامت تمہارے لئے کہی گئی ہے اس لئے تم ہی نماز پڑھاؤ، فراغتِ نماز کے بعد اب مسلمانوں کی امامت حضرت مسیح (علیہ السلام) کے ہاتھوں میں آجائیگی اور وہ حربہ لے کر مسیحِ ضلالت (دجال) کے قتل کے لئے روانہ ہو جائیں گے اور شہر پناہ کے باہر اس کو بابِ لُدّ پر مقابل پائیں گے، دجال سمجھ جائیگا کہ اس کے دجل اور زندگی کے خاتمہ کا وقت آپہنچا اس لئے خوف کی وجہ سے رانگ کی طرح پگھلنے لگیگا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام آگے بڑھ کر اُس کو قتل کر دیں گے اور پھر جو یہودی دجال کی رفاقت میں قتل سے بچ جائیں گے وہ اور عیسائی سب اسلام قبول کر لیں گے اور مسیحِ ہدایت کی سچی پیروی کے لئے مسلمانوں کے شانہ بشانہ کھڑے نظر آئیں گے، اس کا اثر مشرک جماعتوں پر بھی پڑے گا اور اس طرح اس زمانہ میں اسلام کے ماسوا کوئی مذہب باقی نہیں رہے گا۔

ان واقعات کے کچھ عرصہ بعد یاجوج وماجوج کا خروج ہوگا اور اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے مطابق عیسیٰ علیہ السلام مسلمانوں کو اس فتنہ سے محفوظ رکھیں گے، حضرت مسیح (علیہ السلام) کا دورِ حکومت چالیس[۱] سال رہے گا اور اس درمیان میں وہ ازدواجی زندگی بسر کریں گے اور ان کے دورِ حکومت میں عدل وانصاف اور خیر وبرکت کا یہ عالم ہوگا کہ بکری اور شیر ایک گھاٹ پانی پئیں گے اور بدی اور شرارت کے عناصر دب کر رہ جائیں گے"۔[۲]

وفاتِ مسیح علیہ السلام | چالیس سالہ دورِ حکومت کے بعد عیسیٰ علیہ السلام کا انتقال ہو جائیگا اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پہلو میں دفن ہوں گے حضرت ابوہریرہؓ کی طویل حدیث میں ہے۔

۱؎ اور مسلم میں ہے کہ دورِ حکومت سات سال رہیگا حافظ ابن کثیرؒ فرماتے ہیں کہ تطبیق کی صورت یہ ہے کہ جب حضرت مسیح کا رفع سماوی ہوا اس وقت اُن کی عمر تینتیس سال تھی اور نزول کے بعد سات سال مزید بقید حیات رہیں گے اس طرح کل زمانہ ملاکر ان کی مدت حیات چالیس سال پوری ہو جائے گی۔ ۲؎ ماخوذ از صحیح احادیث عن ابن عساکر فی تاریخہ۔

فیمکث اربعین سنۃ ثم	پھر وہ کائناتِ ارضی پراتر کر چالیس سال قیام کرینگے اور
یتوفّٰی ویصلّی علیہ المسلمون	اس کے بعد وفات پاجائیں گے اور مسلمان اُن کے جنازہ کی
ویدفنونہ ؎۱	نماز پڑھیں گے اور اُن کو دفن کردیں گے۔

اور ترمذی نے بسندِ حسن محمد بن یوسف بن عبداللہ بن سلام کے سلسلہ سے حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ سے یہ روایت نقل کی ہے۔

قال مکتوبٌ فی التوراۃ	عبداللہ بن سلام (رضی اللہ عنہ) نے فرمایا: تورات میں محمد
صفۃ محمد وعیسی بن مریم	صلی اللہ علیہ وسلم کی صفت (حلیہ وسیرت) مذکور ہے اور
یدفن معہ۔۔	یہ بھی مسطور ہے کہ عیسیٰ بن مریم (علیہما السلام) اُن کے
؎۲	ساتھ (پہلو میں) دفن ہوں گے۔

ویوم القیٰمۃ یکون علیہم شہیداً

سورۂ مائدہ میں حضرت مسیح (علیہ السلام) کے مختلف حالات کا تذکرہ کیا گیا ہے پھر آخر سورت بھی اُن ہی کے تذکرہ پر ختم ہوتی ہے، اس مقام پر اللہ تعالیٰ نے اوّل قیامت کے اس واقعہ کا نقشہ کھینچا ہے جب انبیاء علیہم السلام سے ان کی امتوں کے متعلق سوال ہوگا اور وہ غایتِ ادب سے اپنی لاعلمی کا اظہار کریں گے اور عرض کریں گے خدایا آج کا دن تونے اس لئے مقرر فرمایا ہے کہ ہر معاملہ میں حقائقِ امور کے پیشِ نظر فیصلہ سنائے اور ہم چونکہ صرف ظواہر ہی پر کوئی حکم لگا سکتے ہیں اور قلوب اور حقائق کا دیکھنے والا تیرے سوا کوئی نہیں اس لئے آج ہم کیا شہادت دے سکتے ہیں، صرف یہی کہہ سکتے ہیں کہ ہمیں کچھ معلوم نہیں، تو علام الغیوب ہے اس لئے تو ہی سب کچھ جانتا ہے۔

؎۱ اس سے قبل یہ حدیث مکمل نقل کی گئی ہے۔ اس کو ابن ابی شیبہ نے مصنف میں امام احمد نے مسند میں، ابوداؤد نے سنن میں، ابن جریر نے تفسیر میں اور ابن حبان نے صحیح میں حضرت ابوہریرہؓ سے نقل کیا ہے۔

؎۲ تفسیر ابن کثیر ج ۱ ص ۵۸۴۔

يَوْمَ يَجْمَعُ اللّٰهُ الرُّسُلَ فَيَقُوْلُ	وہ دن (قابلِ ذکر ہے) جبکہ اللہ تعالیٰ پیغمبروں کو جمع کریگا
مَاذَآ اُجِبْتُمْ قَالُوْا لَا عِلْمَ لَنَا	پھر کہے گا تم (اپنی اپنی امتوں کی جانب سے) کیا جواب دیئے
اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ۔	گئے؟ وہ (پیغمبر) کہیں گے (تیرے علم کے سامنے) ہم کچھ نہیں جانتے
(مائدہ)	بلاشبہ تو ہی غیب کی باتوں کا خوب جاننے والا ہے۔

ظاہر ہے کہ انبیاء علیہم السلام کا "لاعلم لنا" فرمانا علمِ حقیقی کی نفی پر ہی مبنی ہوگا یہ مطلب نہیں ہوگا کہ وہ درحقیقت اپنی امتوں کے جواب سے لاعلم ہیں کہ کس نے ایمان کو قبول کیا اور کس نے انکار کیا کیونکہ جواب کا مقصد اگر یہ ہو تو یہ صریح جھوٹ اور کذب بیانی ہر ور انبیاء علیہم السلام کی جانب اس عیب کی نسبت ناممکن ہے اس لئے انبیاء علیہم السلام کا یہ جواب مسطورۂ بالا حقیقت کے ہی پیشِ نظر ہوگا، ظاہر حالات کے علم سے انکار پر مبنی نہیں ہوگا اس کے لئے خود قرآنِ عزیز ہی شاہدِ عدل ہے کیونکہ وہ متعدد جگہ یہ کہتا ہے کہ قیامت کے دن انبیاء علیہم السلام اپنی اپنی امتوں پر شہادت دیں گے کہ ہم نے ان تک خدا کا پیغام پہنچا دیا تھا اور یہ کہ انھوں نے ہماری دعوت کو قبول کیا یا رد کر دیا۔ تو ان ہر دو مقامات پر نظر رکھنے کے بعد یوں کہا جائیگا کہ پاسِ ادب کے طریقہ پر اول انبیاء علیہم السلام کا یہی جواب ہوگا جو مائدہ میں مذکور ہے، لیکن جب اُن کو خدائے برتر کا یہ حکم ہوگا کہ وہ صرف اپنے علم کے مطابق شہادت دیں تب وہ شہادت دیں گے۔

فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ	پھر (اے پیغمبر!) کیا حال ہوگا اس دن (یعنی قیامت کے دن) جب
كُلِّ اُمَّةٍ بِشَهِيْدٍ وَّ	ہم ہر ایک امت سے ایک گواہ طلب کریں گے (یعنی اس کے پیغمبر کو
جِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ	طلب کریں گے جو اپنی امت کے اعمال و احوال پر گواہ ہوگا) اور ہم
شَهِيْدًا۔ (نساء)	تمہیں بھی ان لوگوں پر گواہی دینے کے لئے طلب کریں گے۔

وَجِيۡٓءَ بِالنَّبِيّٖنَ وَالشُّهَدَآءِ وَقُضِيَ بَيۡنَهُمۡ بِالۡحَقِّ (زمر) اور لائے جائیں گے (قیامت کے دن) انبیاء اور شہداء اور فیصلہ کیا جائیگا اُن لوگوں کے درمیان اچھائی اور بُرائی کا حق کے ساتھ۔

حضرت عبداللہ بن عباس (رضی اللہ عنہما) نے بھی "لا علم لنا" کی یہی تفسیر بیان فرمائی ہے۔

عن ابن عباس یوم یجمع اللہ (الآیۃ) یقولوا لربہ عزوجل لا علم لنا الا علم انت اعلم بہ منا لہ	حضرت عبداللہ بن عباس (رضی اللہ عنہما) آیت یوم یجمع اللہ الرسل (الآیہ) کی تفسیر میں فرماتے ہیں: انبیاء علیہم السلام رب عزوجل سے عرض کریں گے ہم کو کوئی علم نہیں ہے مگر ایسا علم کہ جس کے متعلق تو ہم سے بہتر جانتا ہے۔

اور شیخ المحققین علامہ سید انور شاہ (رحمۃ اللہ) آیت کے جملہ "لا علم لنا" کو "علم حقیقی کے انکار" پر محمول کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں۔

"یہ بات مسلم ہے کہ ایک انسان کو ـــــ خواہ وہ کسی درجہ اور رتبہ کا ہو ـــــ دوسرے انسان کے متعلق جو کچھ بھی معلوم ہوتا ہے وہ علم حقیقی کے لحاظ سے "ظن" کے درجہ سے آگے "علم" تک نہیں پہنچتا، اسی بنا پر نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا ہے "نحن نحکم بالظواھر و اللہ متولی السرائر۔ ہم ظاہر معاملات پر حکم لگاتے ہیں اور بھیدوں اور حقیقتوں پر تو صرف خدا کو ہی قابو حاصل ہے۔ نیز ایک دوسری حدیث میں ہے ذاتِ اقدس نے ارشاد فرمایا، تم میرے پاس اپنے جھگڑے لاتے ہو اور بعض تم میں سے زیادہ چرب زبان ہوتے ہیں اور مجھ کو علم غیب نہیں ہے کہ حقیقت سے آگاہ ہو جایا کروں اس لئے جو بھی فیصلہ دیتا ہوں ظاہر حالات پر ہی دیتا ہوں تو یاد رہے کہ جو شخص بھی اپنی چرب زبانی سے کسی بھائی کا ادنیٰ سا ٹکڑا بھی ناحق حاصل کرے گا وہ بلا شبہ جہنم کا ٹکڑا حاصل کرے گا۔" ؎۲

؎۱ تفسیر ابن کثیر جلد ا۔ ؎۲ عقیدۃ الاسلام ص ۱۶۵۔

بہرحال قرآنِ عزیز، احادیثِ رسول، آثارِ صحابہ، اور اقوالِ علماء سب یہی ظاہر کرتے ہیں کہ اس موقعہ پر انبیاء علیہم السلام کا جواب "عدمِ ظلم" کو ظاہر نہیں کرتا بلکہ از راہِ پاسِ ادب "حقیقی علم پر انکار" کو واضح کرتا ہے۔

غرض، ذکر یہ تھا کہ اس مقام پر اصل تذکرہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اُس واقعہ کا ہو رہا ہے جو قیامت میں پیش آئے گا جبکہ اللہ تعالیٰ اُن پر اپنے انعامات شمار کرانے کے بعد اُن سے اُن کی امت کے متعلق سوال کریگا اور وہ حسبِ حال جوابات پیش کرینگے مگر سابق آیات میں چونکہ دوسرے مطالب ذکر ہوئے تھے اس لئے اُن سے امتیاز پیدا کرنے کے لئے تمہیداً قیامت میں ہونے والے اُن سوال و جواب کا ذکر ضروری ہوا جو عام طور پر انبیاء علیہم السلام سے اُن کی امتوں کے متعلق کئے جائیں گے اور اس لئے بھی یہ تذکرہ ضروری تھا کہ اگلی آیات میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے جواب کا جو ذکر کیا گیا ہے اُس کا پیرایۂ بیان بھی انبیاء علیہم السلام کے جواب کے ساتھ مطابقت رکھتا ہے۔

وَاِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِيْ وَاُمِّيَ اِلٰهَيْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ قَالَ سُبْحٰنَكَ مَا يَكُوْنُ لِيْٓ اَنْ اَقُوْلَ مَا لَيْسَ لِيْ بِحَقٍّ اِنْ كُنْتُ قُلْتُهٗ فَقَدْ عَلِمْتَهٗ تَعْلَمُ مَا فِيْ نَفْسِيْ وَلَآ اَعْلَمُ مَا فِيْ نَفْسِكَ اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ مَا قُلْتُ لَهُمْ اِلَّا	اور (وہ وقت بھی قابلِ ذکر ہے) جب اللہ تعالیٰ، عیسیٰ بن مریم سے کہے گا "کیا تو نے لوگوں (بنی اسرائیل) سے کہہ دیا تھا کہ مجھ کو اور میری ماں کو دونوں کو اللہ کے ماسوا خدا بنا لینا" عیسیٰ کہیں گے "پاکی تجھ کو ہی زیبا ہے میرے لئے کیسے ممکن تھا کہ میں وہ بات کہتا جو کہنے کے لائق نہیں، اگر میں نے یہ بات اُن سے کہی ہوتی تو یقیناً تیرے علم میں ہوتی (اس لئے کہ) تو وہ سب کچھ جانتا ہے جو میرے جی میں ہے اور میں تیرا بھید نہیں پا سکتا، بلاشبہ

مَا أَمَرْتَنِي بِهِ أَنِ اعْبُدُوا اللَّهَ رَبِّي وَرَبَّكُمْ وَكُنتُ عَلَيْهِمْ شَهِيدًا مَّا دُمْتُ فِيهِمْ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي كُنتَ أَنتَ الرَّقِيبَ عَلَيْهِمْ وَأَنتَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ إِن تُعَذِّبْهُمْ فَإِنَّهُمْ عِبَادُكَ وَإِن تَغْفِرْ لَهُمْ فَإِنَّكَ أَنتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ (مائدہ)

تو غیب کی باتوں کا خوب جاننے والا ہے میں نے اس بات کے سوا جس کا تو نے مجھ کو حکم دیا اُن سے اور کچھ نہیں کہا وہ یہ کہ عبادت اللہ کی ہی کرو جو میرا اور تمہارا سب کا رب ہے اور میں اُن پر اس وقت تک گواہ رہا جب تک میں اُن کے درمیان رہا پھر جب تو نے مجھ کو قبض کر لیا تب تو ہی اُن پر نگہبان تھا اور تو ہر چیز پر گواہ ہے اگر تو ان سب کو عذاب کرے تو یہ تیرے بندے ہیں اور اگر ان کو بخش دے پس تو ہی بلاشبہ غالب حکمت والا ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام جب اپنا جواب دے چکیں گے تب اللہ تعالیٰ یہ ارشاد فرمائے گا۔

قَالَ اللَّهُ هَٰذَا يَوْمُ يَنفَعُ الصَّادِقِينَ صِدْقُهُمْ لَهُمْ جَنَّاتٌ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا رَّضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ ذَٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ (مائدہ)

اللہ تعالیٰ فرمائیگا یہ ایسا دن ہے کہ جس میں راستبازوں کی راستبازی ہی کام آسکتی ہے اُن ہی کیلئے بہشت ہے جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں اور جن میں وہ ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے اور وہ خدا سے راضی اور خدا اُن سے راضی (رضامندی پائیں گے) یہ بہت ہی بڑی کامیابی ہے۔

حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کا جواب ایک جلیل القدر پیغمبر کی عظمت شان کے عین مطابق ہے، وہ پہلے بارگاہِ رب العزت میں معذرت خواہ ہوں گے کہ یہ کیسے ممکن تھا کہ میں ایسی نامناسب بات کہتا جو قطعاً حق کے خلاف ہے، سُبْحَانَكَ مَا يَكُونُ لِي أَنْ أَقُولَ مَا لَيْسَ لِي بِحَقٍّ پھر نہایت ادب کے طور پر خدا کے علم حقیقی کے سامنے اپنے علم کو ہیچ اور بے بضاعتی کے حرف زن ظاہر کریں گے إِن كُنتُ قُلْتُهُ فَقَدْ عَلِمْتَهُ تَعْلَمُ مَا فِي نَفْسِي وَلَا أَعْلَمُ مَا فِي نَفْسِكَ

"اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ" اور اس کے بعد اپنے فرض کی انجام دہی کا حال گذارش کریں گے "مَا قُلْتُ لَهُمْ اِلَّا مَآ اَمَرْتَنِيْ بِهٖٓ اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبَّكُمْ" اور پھر امت نے اس دعوتِ حق کا جواب کیا دیا؟ اس کے متعلق ظاہر امور کی شہادت کا بھی اسی اسلوب کے ساتھ ذکر کریں گے جس میں اُن کی شہادت خدا کی شہادت کے مقابلہ میں بے وقعت نظر آئے "وَكُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا مَّا دُمْتُ فِيْهِمْ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِيْ كُنْتَ اَنْتَ الرَّقِيْبَ عَلَيْهِمْ وَاَنْتَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ" اور اس کے بعد یہ جانتے ہوئے کہ امت میں مومنین قانتین بھی ہیں اور منکرین جاحدین بھی تو رعِ عذاب اور طلبِ مغفرت کا اس انداز میں ذکر کریں گے جس سے ایک جانب خدا کے مقرر کردہ پاداشِ عمل کے قانون کی خلاف ورزی بھی مترشح نہ ہو اور دوسری جانب امت کے ساتھ رحمت و شفقت کے جذبہ کا جو تقاضا ہے وہ بھی پورا ہو جائے "اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ وَاِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَاِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ" جب حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) عرضداشت یا جواب کے مضمون کو ختم کر چکے تو رب العالمین نے اپنے قانونِ عدل کا یہ فیصلہ سنا دیا تاکہ مستحقِ رحمت و مغفرت کو مایوسی نہ پیدا ہو بلکہ مسرت و شادمانی سے ان کے قلوب روشن ہو جائیں اور مستحقِ عذاب غلط توقعات قائم نہ کر سکیں "قَالَ اللّٰهُ هٰذَا يَوْمُ يَنْفَعُ الصّٰدِقِيْنَ صِدْقُهُمْ (الآیہ)

ان تمام تفصیلات کا حاصل یہ ہے کہ آیاتِ زیرِ بحث کا سیاق و سباق صراحت کرتا ہے کہ یہ واقعہ قیامت کے روز پیش آئے گا اور حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کے ملاءِ اعلیٰ پر اٹھائے جانے کے وقت پیش نہیں آیا، اس لئے کہ عیسیٰ علیہ السلام کے واقعہ کی ابتداء "يَوْمَ يَجْمَعُ اللّٰهُ الرُّسُلَ (الآیہ) سے کرنا اور انتہاءِ واقعہ "هٰذَا يَوْمُ يَنْفَعُ الصّٰدِقِيْنَ صِدْقُهُمْ (الآیہ) پر ہونا روزِ قیامت کے ماسوا اور کسی دن پر صادق نہیں آسکتا اور اس ایک قطعی بات کے علاوہ دوسرے

کسی احتمال کی مطلق گنجائش نہیں ہے۔

نیز یہ تفصیلات واضح کرتی ہیں کہ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) اپنی امت کے قبول و انکار کے حالات سے آگاہی کے باوجود آیاتِ مائدہ میں مذکور اسلوبِ بیان اس لئے اختیار فرمائیں گے کہ دوسرے انبیاء و رسل (علیہم السلام) بھی مقام کی نزاکتِ حال اور رب العزت کے دربار میں غایتِ پاسِ ادب کے لئے یہی اسلوبِ بیان اختیار فرمائیں گے۔

اور حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کے اور انبیاء علیہم السلام کے جوابات میں اسلوبِ بیان کی یکسانیت کے باوجود اجمال و تفصیل کا فرق صرف اس لئے ہے کہ زیرِ بحث آیات میں اصل مقصود حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) اور اُن کی امت کے قبول و انکار اور ان کے نتائج و ثمرات کا تذکرہ ہے اور انبیاء علیہم السلام کا ذکر صرف واقعہ کی تمہید کے طور پر ہے۔

حقیقتِ حال کے اس انکشاف کے بعد اب جمہور امتِ مسلمہ کے خلاف خلیفہ قادیانی مسٹر محمد علی لاہوری کی تحریفِ معنوی بھی قابلِ مطالعہ ہے، کہتے ہیں کہ سورۂ مائدہ میں مذکور حضرت عیسیٰؑ اور پروردگارِ عالم کا یہ سوال و جواب اُس وقت پیش آچکا جب حضرت عیسیٰؑ کی نعش ملنے پر شاگردوں نے اُن کا علاج کر کے چنگا کر لیا اور پھر وہ شام سے فرار ہو کر مصر اور مصر سے کشمیر پہنچے اور گمنامی کی حالت میں انتقال فرما گئے۔ مسٹر لاہوری نے اپنے دعوے میں دو دلائل پیش کئے ہیں ایک یہ کہ عربیت کے قاعدے سے لفظ "اذ" ماضی کے لئے مستعمل ہے نہ کہ مستقبل کے لئے اور دوسری دلیل یہ کہ اگر جمہور کے عقیدہ کے مطابق حضرت مسیح کا انتقال نہیں ہوا اور وہ قیامت کے قریب نازل ہوں گے تو ضروری ہے کہ ان کو اپنی امت (نصاریٰ) کے عقیدۂ الوہیتِ مسیح اور تثلیث کا علم ہو چکا ہو گا کیونکہ نصاریٰ نے اُن کے رفع کے زمانہ تک تثلیث کو نہیں اپنایا تھا اور اگر ایسا ہوتا تو حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کا جواب

ایسے اسلوب پر نہ ہوتا جس سے اُن کی لاعلمی ظاہر ہوتی ہے۔

مسٹر لاہوری نے قرآن کی تحریف معنوی پر یہ اقدام یا تو اس لئے کیا کہ اپنے مرشد متنبی قادیان (علیہ ما علیہ) کے دعوئے مسیحیت کو قوت پہنچائیں اور مغالطہ اور سفسطہ سے کام لے کر "خسران مبین" کا سامان مہیا کریں اور یا پھر وہ قواعدِ عربیت سے اس درجہ ناواقف ہیں کہ نہ اُن کو نحو کے معمولی استعمالات ہی کا علم ہے اور نہ وہ آیاتِ قرآنی کے سیاق سباق کا ہی کچھ درک رکھتے ہیں اور صرف جاہلانہ دعاوی پر دلیر نظر آتے ہیں۔

جن قوانین عربیت میں "اذ" اور "اذا" کے درمیان یہ فرق بیان کیا گیا ہے کہ "اذ" اگر فعلِ مستقبل پر بھی داخل ہو تب بھی "ماضی" کے معنی دیتا ہے اور "اذا" اگرچہ فعلِ ماضی پر بھی داخل ہو تب بھی مستقبل کے معنی دیا کرتا ہے اُن ہی قوانین میں علماءِ معانی و بلاغت یہ بھی تصریح کرتے ہیں کہ بسا ایسا ہوتا ہے کہ کسی گذرے ہوئے واقعہ کو اس طرح پیش کرنے کے لئے گویا وہ زمانۂ حال میں پیش آرہا ہے صیغۂ مستقبل سے تعبیر کرلیا کرتے ہیں یعنی اس کے لئے "اذا" کا استعمال جائز رکھتے بلکہ مستحسن سمجھتے اور اس کو "استحضار" اور "حکایۃ الحال" کہتے ہیں اور اسی طرح مستقبل میں ہونے والے ایسے واقعہ کو جس کے وقوع سے متعلق یہ یقین دلاتا ہو کہ وہ ضرور ہو کر رہے گا اور نا ممکن ہے کہ اس کے خلاف ہو سکے اکثر ماضی کے صیغہ سے تعبیر کرنا مستحسن سمجھتے بلکہ بلاغتِ تعبیر کے لحاظ سے ضروری اور مفید یقین کرتے ہیں، کیونکہ اس طرح مخاطب اور سامع کے سامنے ہونے والے واقعہ کا نقشہ اس طرح آجاتا ہے گویا وہ ہو گذرا ہے اور یہ بھی "استحضار" ہی کی ایک صورت سمجھی جاتی ہے، دور کیوں جائیے لفظ "اذ" کا استعمال مستقبل کے لئے خود قرآنِ عزیز میں متعدد مقامات پر ثابت ہے۔

سورۂ انعام میں قیامت کے دن مجرموں کی کیا کیفیت ہوگی اُس کا نقشہ کھینچتے

ہوئے کہا گیا ہے۔

وَلَوْ تَرٰٓی اِذْ وُقِفُوْا عَلَی النَّارِ	اور کاش کہ تو دیکھے جس وقت کہ وہ کھڑے کئے جائیں گے
فَقَالُوْا یٰلَیْتَنَا نُرَدُّ وَلَا نُکَذِّبَ	آگ (جہنم) کے اوپر پس کہیں گے اے کاش کہ ہم لوٹا دیئے
بِاٰیٰتِ رَبِّنَا وَنَکُوْنَ مِنَ	جائیں دنیا میں اور نہ جھٹلائیں ہم اپنے رب کی نشانیوں
الْمُؤْمِنِیْنَ۔ (الانعام)	کو اور ہو جائیں ہم ایمان والوں میں سے۔

اور اسی سورۂ انعام میں روزِ قیامت مجرموں کی حالت کا اس طرح ذکر کیا گیا ہے۔

وَلَوْ تَرٰٓی اِذْ وُقِفُوْا عَلٰی رَبِّهِمْ	اور کاش کہ تو دیکھے، جب وہ اپنے پروردگار کے سامنے
قَالَ اَلَیْسَ هٰذَا بِالْحَقِّ قَالُوْا	کھڑے کئے جائیں گے تو (پروردگار) کہے گا کیا یہ حق
بَلٰی وَرَبِّنَا قَالَ فَذُوْقُوا	نہیں ہے؟ وہ کہیں گے قسم ہے پروردگار کی یہ (روزِ حشر)
الْعَذَابَ بِمَا کُنْتُمْ تَکْفُرُوْنَ۔	حق اور سچ ہے، بس (پروردگار) کہے گا تو چکھو اس کے
(الانعام)	بدلہ میں عذاب جو تم کفر کیا کرتے تھے۔

اور ان ہی مجرمین کی روزِ قیامت حالت کا نقشہ سورۂ سبا میں اس طرح بیان کیا گیا ہے۔

وَلَوْ تَرٰٓی اِذْ فَزِعُوْا فَلَا فَوْتَ	اور کاش کہ تو دیکھے جبکہ وہ (منکرین) گھبرائیں گے پس
وَاُخِذُوْا مِنْ مَّکَانٍ قَرِیْبٍ	نہیں بھاگ سکیں گے اور پکڑے جائیں گے قریب سے اور
وَقَالُوْٓا اٰمَنَّا بِهٖ (سبا)	کہیں گے ہم (اب) اس پر ایمان لے آئے۔

اور سورۂ سجدہ میں اس حقیقت کو ان الفاظ کے ساتھ بیان کیا ہے۔

وَلَوْ تَرٰٓی اِذِ الْمُجْرِمُوْنَ نَاکِسُوْا	اور کاش کہ تو دیکھے جبکہ مجرم اپنا سر نیچے ڈالے ہوئے
رُءُوْسِهِمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ	ہوں گے اپنے رب کے سامنے۔

یہ اور اسی قسم کے متعدد مقامات ہیں جن میں مستقبل کے واقعات کو ماضی کے ساتھ

تعبیر کیا گیا اور اس نے لفظ "اذ" کا استعمال مفید سمجھا گیا۔ پس جس طرح ان مقامات میں "اذ وقفوا" "مقال" "قالوا" "اذ فزعوا" "واخذوا" "اذ المجرمون ناکسوا" تمام افعال لفظ "اذ" کے باوجود مستقبل کے معنی دے رہے ہیں اسی طرح "اذ قال اللہ یٰعیسیٰ" کے استعمال کو مستقبل کے لئے سمجھئے اور جس طرح ان تمام مقامات کے سیاق وسباق دلالت کر رہے ہیں کہ ان واقعات کا تعلق روزِ قیامت سے ہے ٹھیک آیاتِ مائدہ کی زیرِ بحث آیات کا سیاق و سباق صراحت کر رہا ہے کہ اس واقعہ کا تعلق قیامت کے دن سے ہے۔

قاعدۂ عربیت کی اس حقیقت افروز تحقیق کے بعد مسٹر لاہوری کی دوسری دلیل پر نظر ڈالئے تو وہ اس سے بھی زیادہ حقیر نظر آئیگی اس لئے کہ گذشتہ تحقیق سے یہ واضح ہو چکا کہ سورۂ مائدہ کی آیاتِ زیرِ بحث میں حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کا جواب ہرگز اس بات پر مبنی نہیں ہے کہ ان کو اپنی امت کی گمراہی کا علم نہیں ہوگا اور وہ اپنی لاعلمی ظاہر کریں گے ایک مرتبہ اُن آیات پر پھر غور کروگے تو صاف نظر آئیگا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا اصل جواب صرف یہ ہے "مَا قُلْتُ لَهُمْ إِلَّا مَا أَمَرْتَنِي بِهِ أَنِ اعْبُدُوا اللَّهَ رَبِّي وَرَبَّكُمْ" اور اول و آخر باقی آیات میں یا جواب کے مناسبِ حال تمہید ہے اور یا اللہ تعالیٰ کی جلالت وجبروت اور اپنی بیچارگی و درماندگی بلکہ عبودیت کا اظہار ہے جس میں ایک جلیل القدر پیغمبر کی شان کے مناسب حضرۃ القدس کے سامنے شہادت پیش کی گئی ہے علاوہ ازیں اگر مسٹر لاہوری کا یہ قول صحیح مان لیں کہ حضرت عیسیٰ کے رفع سماوی تک نصاریٰ نے چونکہ تثلیث کا عقیدہ نہیں اختیار کیا تھا اس لئے انھوں نے لاعلمی کا اظہار کیا تو اس صورت میں اللہ تعالیٰ کا یہ سوال کیا معنی رکھتا ہے "ءَأَنتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُونِي وَأُمِّيَ إِلَٰهَيْنِ مِن دُونِ اللَّهِ" کیا العیاذ باللہ اس کا یہ مطلب نہ ہوا کہ خدا نے عیسیٰ علیہ السلام کی امت پر جھوٹا الزام لگایا؟ پھر یہ کیا

کم حیرت کی بات ہے کہ قادیانی اور لاہوری ایک جانب تو یہ کہہ رہے ہیں مگر اس کے قطعاً متضاد آئینہ کمالات میں قادیانی نے یہ کہا ہے کہ جب عیسیٰ علیہ السلام کی روح کو یہ معلوم ہوا اور اس کو بتایا گیا کہ اس کی امت کس طرح شرک میں مبتلا ہوگئی تب عیسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کی، خدایا! تو میرا مثیل نازل فرما تاکہ میری امت اس شرک سے نجات پائے اور تیری سچی پرستار بنے۔ ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بکجا۔

حقیقت یہ ہے کہ قادیانی اور لاہوری کی تفسیر کا معیار یہ نہیں ہے کہ وہ قرآن کی آیات کے مطالب قرآن کی زبان سے سننا چاہتے ہیں بلکہ پہلے سے ایک باطل عقیدہ کو عقیدہ بناتے ہیں اور پھر اُس کے سانچہ میں قرآن کو ڈھالنا چاہتے ہیں اور جب قرآن اس سانچہ میں ڈھلنے سے انکار کرتا ہے تو تحریف کے حربہ سے زبردستی اس پر مشقِ ستم کرنا چاہتے ہیں، مگر وہ ایسا کرتے وقت اس حقیقت کو فراموش کر دیتے ہیں کہ قرآن اُمت کی ہدایت کے لئے رہتی دنیا تک امام الہدیٰ ہے۔ اس لئے کوئی "ملحد و زندیق" خواہ کتنی ہی تحریفِ معنوی کی کوشش کرے ہمیشہ ناکام اور خاسر رہے گا اور خود قرآنی اطلاقات ہی اس کے عقیدہ و فکر کے بطلان کے لئے ناطق ہوں گے بلکہ بمصداق دروغ گورا حافظہ نہ باشد وہ اکثر اپنے ہی متضاد اقوال کی بھول بھلیاں میں پھنس کر اپنی کذب بیانی اور تفسیری افترا پر مہر لگا لیتا ہے جس کی تازہ شہادت ابھی سطورِ بالا میں نقل ہو چکی ہے۔

فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي كُنْتَ أَنْتَ الرَّقِيبَ عَلَيْهِمْ

حیات و رفع مسیح (علیہ السلام) سے متعلق گذشتہ مباحث میں "توفی" کی حقیقت پر کافی روشنی پڑ چکی ہے اور سورۂ مائدہ کی آیات مسطورہ بالا کی تفسیر کے بھی تمام پہلو واضح ہو چکے ہیں، تاہم قرآن کے اعجازِ بلاغت اور اسلوبِ بیان کی لطافت سے مستفید ہونے کے لئے چند سطور اس مسئلہ پر بھی سپرد قلم کر دینا مناسب ہے

کہ اس مقام پر قرآن نے عیسیٰ (علیہ السلام) کے قیامِ ارضی کو "مادمت فیھم" سے اور کائناتِ ارضی سے انقطاعِ تعلقات کو "توفیتنی" سے کیوں تعبیر کیا؟

گذشتہ سطور میں لغت اور معانی کے حوالوں سے یہ تو ثابت ہو چکا کہ "توفی" کے حقیقی معنی "اخذ و تناول" (لے لینے اور قبضہ میں کر لینے) کے ہیں اور موت کے معنی میں بطور کنایہ اُس کا استعمال ہوتا ہے اور یہ کہ کنایہ میں حقیقی معنی برابر ساتھ رہتے ہیں مجاز کی طرح یہ نہیں ہوتا کہ حقیقی معنی سے جدا ہو کر لفظ غیر موضوع لہٗ میں استعمال ہونے لگے، پس اگر حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کے متعلق قرآن کا عقیدہ یہ ہوتا کہ ان کو موت آچکی اور سوال و جواب کا یہ سلسلہ موت کے اُسی وقت سے متعلق ہے کہ قیامت کے دن سے تو پھر بلاغت معانی کا تقاضا یہ تھا کہ اس موقعہ پر "حیات" اور "موت" ایک دوسرے کے متضاد الفاظ کو استعمال کیا جاتا تاکہ یہ حیثیت واضح ہو سکتی کہ سوال و جواب کا معاملہ "موت" کے ہم قریں ہے اور پھر لفظ "موت" کی صراحت اپنے مقابل لفظ "حیات" کی طالب ہوتی مگر قرآن نے ان دونوں الفاظ کی بجائے "مَا دُمْتُ فِیْھِمْ" کو "حیوٰة" کی اور "توفّی" کو "موت" کی جگہ استعمال کیا ہے تو یہ کس لئے اور کس مقصد سے یا بغیر کسی حکمت و مصلحت کے یہ اسلوب اختیار کر لیا؟ جمہور امت تو اس کا ایک ہی جواب رکھتی ہے اور وہ یہ کہ قرآن نے دوسرے مقامات کی طرح اس مقام پر بھی اعجاز و ایجاز سے کام لیا ہے اور ان دو لفظوں میں وہ حضرت مسیح علیہ السلام کی زندگی، رفع، نزول، اور موت: تمام مراحل کو سمو دینا چاہتا ہے، وہ اگر یہ کہتا "ما حییتُ میں جب تک زندہ رہا" اور "فلمّا امتنی پس جب تو نے مجھ کو موت دے دی" تو اس کا مطلب یہ ہوتا کہ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کو بھی عام حالات کے مطابق دو ہی مراحل پیش آئے ہیں "زندگی" اور "موت" اور ان دونوں مرحلوں کے درمیان کوئی خاص

صورتِ حال پیش نہیں آئی، لیکن جبکہ یہ خلافِ واقعہ تھا اور ان کی زندگی اور موت کے درمیان دو اہم مراحل پیش آچکے ہوں گے ایک "ملاءِ اعلیٰ کی جانب بقیدِ حیات رفع" اور دوسرا "کائناتِ ارضی پر دوبارہ رجوع (نزول)" اس لئے از بس ضروری ہوا کہ حیوٰۃ اور موت کی جگہ دو ایسے الفاظ اختیار کئے جائیں جو ان چاروں مراحل پر صادق آسکیں اور جبکہ متعدد مقامات پر حسب حال ان مراحل کی تفصیل بیان ہو چکی ہے تو اعجازِ بلاغت کا یہی تقاضا ہے کہ اب اُن کو ایجاز و اختصار کے ساتھ بیان کیا جائے۔

صورتِ حال کا یہی نقشہ تھا جس کے لئے قرآنِ عزیز نے "ماحییت" کی جگہ "مادمتُ فیھم" استعمال کیا تاکہ یہ جملہ اختصار کے ساتھ حضرت مسیح (علیہ السلام) کی زندگی کے دونوں حصوں پر حاوی ہو جائے، اس حصہ پر بھی جو ابتدائِ زندگی سے شروع ہو کر "رفع الی السماء" پر ختم ہوتا ہے اور اس حصہ پر بھی جو "نزول ارضی" سے شروع ہو کر "موت" پر جا کر ختم ہو جاتا ہے اور اسی طرح قرآن نے "فَلَمَّا امتنی" کی جگہ "فلما توفیتنی" کا اسلوبِ بیان اختیار کیا تاکہ یہ جملہ بھی پہلے جملہ کی طرح باقی دونوں مرحلوں کو اپنے اندر سمولے اس مرحلہ کو بھی جو "رفع الی السماء" کی صورت میں پیش آیا اور اس مرحلہ کو بھی جو نزول کے بعد "موت" کی صورت میں نمودار ہوا کیونکہ موت سے تو صرف ایک ہی حقیقت ظاہر ہو سکتی تھی مگر "توفی" میں بہ یک وقت دونوں حقیقتیں موجود تھیں، حقیقی معنی کے لحاظ سے صرف "اخذ و تناول" اور کنایہ کے اعتبار سے اخذ و تناول کے ساتھ ساتھ "موت" جیسا کہ سطور بالا میں "کنایہ" اور "مجاز" کے باہمی فرق سے معلوم ہو چکا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) عرض کریں گے، خدایا! جو وقت میں نے اُن کے درمیان گذارا اس کے لئے تو بیشک میں شاہد ہوں لیکن "توفی" کے اوقات میں اُن پر فقط تو ہی

نگہبان رہا. باقی تیری شہادت تو ہر حالت میں ہر وقت ہر شے پر حاوی ہے۔

مسئلہ متعلقہ کی یہ پوری بحث اس سے قطع نظر کہ نبی معصوم صلی اللہ علیہ وسلم نے آیات کی تفسیر میں کیا ارشاد فرمایا ہے، لغت، معانی، بلاغت کے پیشِ نظر تھی ورنہ ان آیات کی تفسیر میں ایک مومن صادق کے لئے وہ صحیح مرفوع احادیث کافی ہیں جن کو محدثین نے بسندِ صحیح روایت کیا ہے۔ مثلاً مشہور محدث حافظ ابنِ عساکرؒ نے بروایت ابو موسیٰ اشعری (رضی اللہ عنہ) نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے جو حدیث نقل کی ہے اُس کا ترجمہ یہ ہے۔

"جب قیامت کا دن ہوگا تو تمام انبیاء علیہم السلام کو اور اُن کی امتوں کو بلایا جائے گا اور عیسیٰ علیہ السلام بھی بلائے جائیں گے، اللہ تعالیٰ اول اُن کے سامنے اپنی اُن نعمتوں کو شمار کرائے گا جو دنیا میں اُن پر نازل ہوتی رہیں اور عیسیٰ (علیہ السلام) اُن سب کا اعتراف کریں گے اس کے بعد اللہ تعالیٰ ارشاد فرمائیگا "ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِیْ وَاُمِّیَ اِلٰهَیْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ"۔ تو حضرتِ عیسیٰ (علیہ السلام) انکار فرمائیں گے، پھر نصاریٰ بلائے جائیں گے اور اُن سے سوال کیا جائیگا تو وہ دروغ بیانی کرتے ہوئے کہیں گے کہ ہاں، عیسیٰ نے ہم کو یہی تعلیم دی تھی، یہ سُن کر حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) پر سخت خوف طاری ہو جائے گا، بدن کے بال کھڑے ہو جائیں گے اور خشیتِ الٰہی سے اُن کا رواں رواں بارگاہِ صمد میں سجدہ ریز ہو جائیگا اور یہ مدت ایک ہزار سال معلوم ہوگی حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے نصاریٰ کے خلاف حجت قائم کر دی جائیگی اور ان کی خود ساختہ صلیب پرستی کا راز فاش کر دیا جائے گا اور پھر اُن کو جہنم میں جھونک دیئے جانے کا حکم ہو جائے گا۔[1]

اور محدث ابن ابی حاتمؒ نے حضرت ابو ہریرہؓ سے بسندِ صحیح یہ روایت نقل کی ہے۔

---

[1] تفسیر ابن کثیر جلد ۱ سورۂ مائدہ

"حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں" کہ اللہ تعالیٰ جب قیامت کے دن عیسیٰ (علیہ السلام) سے اُن کی امت کے متعلق سوال کریگا تو اپنی جانب سے عیسیٰ علیہ السلام پر جواب بھی القار کردیگا" اور اس القار کے متعلق نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے حضرت عیسیٰؑ پر القار ہوگا کہ وہ یہ جواب دیں" سبحانک ما یکون لی ان اقول مالیس لی بحق"[1]

اور صحیحین (بخاری و مسلم) اور سُنن میں جو حدیثِ شفاعت منقول و مشہور ہے اُس سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ جس طرح قیامت میں تمام انبیار علیہم السلام اپنی اپنی امتوں سے متعلق اللہ تعالیٰ کے سامنے جوابدہ ہوں گے اور معاملہ کے پیش آنے سے قبل خائف و ہراساں ہونگے حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی ان میں سے ایک ہوں گے اور اُن پر یہ خوف طاری ہو رہا ہوگا کہ جب اُن سے امت کی مشرکانہ بدعت پر سوال ہوگا تو وہ درگاہِ صمدی میں کس طرح اُس سے عہدہ برآ ہو سکیں گے؟

الحاصل سورۂ مائدہ کی ان آیات کی تفسیر وہی صحیح ہے جو جمہور امت کی جانب سے منقول ہے اور کادیانی اور لاہوری کی تفسیر بالرائے الحاد و زندقہ سے زیادہ کوئی وقعت نہیں رکھتی۔

حضرت مسیحؑ کی دعوتِ اصلاح اور بنی اسرائیل کے فرقے

گذشتہ مباحث میں پڑھ چکے ہو کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کو انجیل عطا کی تھی اور یہ الہامی کتاب دراصل توراۃ کا تکملہ تھی یعنی حضرت مسیحؑ کی تعلیمی اساس اگرچہ توراۃ ہی پر قائم تھی مگر یہود کی گمراہیوں، مذہبی بغاوتوں، اور سرکشیوں کی وجہ سے جن اصلاحات کی ضرورت تھی اللہ تعالیٰ نے حضرت مسیح علیہ السلام کی معرفت انجیل کی شکل میں اُن کے سامنے پیش کردیا تھا، حضرت مسیحؑ

[1] تفسیر ابن کثیر جلد ا سورۂ مائدہ۔

کی بعثت سے پہلے یہود کی اعتقادی اور عملی گمراہیاں اگرچہ بے شمار حد تک پہنچ چکی تھیں اور حضرت مسیحؑ نے مبعوث ہو کر اُن سب کی اصلاح کے لئے قدم اُٹھایا تاہم چند اہم بنیادی باتیں خصوصیت کے ساتھ قابلِ اصلاح تھیں جن کی اصلاح کے لئے حضرت مسیح علیہ السلام بہت زیادہ سرگرمِ عمل رہے۔

(۱) یہود کی ایک جماعت کہتی تھی کہ انسان کے اعمالِ نیک وبد کی سزا اسی دنیا میں مل جاتی ہے باقی قیامت، آخرت، آخرت میں جزا وسزا، حشر ونشر، یہ سب باتیں غلط ہیں، یہ "صدوقی" تھے۔

(۲) دوسری جماعت اگرچہ ان تمام چیزوں کو حق سمجھتی تھی مگر ساتھ ہی یہ یقین رکھتی تھی کہ وصول الی اللہ کے لئے از بس ضروری ہے کہ لذاتِ دنیا اور اہلِ دنیا سے کنارہ کش ہو کر "زہادت" کی زندگی اختیار کی جائے چنانچہ وہ بستیوں سے الگ خانقاہوں اور جھونپڑیوں میں رہنا پسند کرتے تھے مگر یہ جماعت حضرت مسیح (علیہ السلام) کی بعثت سے کچھ پہلے اپنی یہ حیثیت بھی کھو چکی تھی اور اب ترکِ دنیا کے پردہ میں دنیا کی ہر قسم کی گندگی میں آلودہ نظر آتی تھی، ظاہر رسم وطریق زاہدوں کا سا ہوتا مگر خلوت کدوں میں وہ سب کچھ نظر آتا جن سے رندانِ بادہ خوار بھی ایک مرتبہ حیا سے آنکھیں بند کرلیں یہ "فریسی" کہلاتے تھے۔

(۳) تیسری جماعت مذہبی رسوم اور خدمتِ ہیکل سے متعلق تھی لیکن اُن کا بھی یہ حال تھا کہ جن رسوم اور خدمات کو لوجہ اللہ کرنا چاہئے تھا اور جن اعمال کے نیک نتائج خلوص پر مبنی تھے اُن کو تجارتی کاروبار بنا لیا تھا اور جب تک ہر ایک رسم اور خدمتِ ہیکل پر بھینٹ اور نذر نہ لے لیں قدم نہ اٹھائیں حتیٰ کہ اس مقدس کاروبار کے لئے انھوں نے تورات کے احکام تک میں تحریف کردی تھی یہ "کاہن" تھے۔

(۴) چوتھی جماعت ان سب پر حاوی اور مذہب کی اجارہ دار تھی۔ اس جماعت نے عوام میں آہستہ آہستہ یہ عقیدہ پیدا کر دیا تھا کہ مذہب اور دین کے اصول و اعتقادات کچھ نہیں ہیں مگر وہ جن پر وہ صاد کر دیں۔ اُن کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ حلال کو حرام اور حرام کو حلال بنا دیں۔ احکامِ دین میں اضافہ یا کمی کر دیں۔ جس کو چاہیں جنت کا پروانہ لکھ دیں، اور جس کو چاہیں جہنم کی سند تحریر کر دیں، خدا کے یہاں اُن کا فیصلہ اٹل اور ان مٹ ہے، غرض بنی اسرائیل کے "اربابًا من دون اللّٰہ" بنے ہوئے تھے اور توراۃ کی لفظی اور معنوی ہر قسم کی تحریف میں اس درجہ جری تھے کہ اس کو دنیا طلبی کا مستقل سرمایہ بنا لیا تھا اور عوام و خواص کی خوشنودی کے لئے ٹھہرائی ہوئی قیمت پر احکامِ دین کو بدل ڈالنا اُن کا مشغلہ دینی تھا، یہ "احبار" یا "فقیہ" تھے۔

یہ تھیں وہ جماعتیں اور یہ تھے اُن کے عقائد و اعمال جن کے درمیان حضرت مسیح (علیہ السلام) مبعوث ہوئے اور جن کی اصلاحِ حال کے لئے ان کی بعثت ہوئی، انھوں نے ہر ایک جماعت کے فاسد عقائد و اعمال کا جائزہ لیا، رحم و شفقت کے ساتھ اُن کے عیوب و نقائص پر نکتہ چینی کی، اُن کو اصلاحِ حال کے لئے ترغیب دی اور اُن کے عقائد و افکار اور اُن کے اعمال و کردار کی نجاستوں کو دور کر کے اُن کا رشتہ خالقِ کائنات اور ذاتِ واحد کے ساتھ دوبارہ قائم کرنے کی سعی کی۔ مگر ان بدبختوں نے اپنے اعمالِ سیاہ کی اصلاح سے یکسر انکار کر دیا اور نہ صرف یہ بلکہ اُن کو "مسیحِ ضلالت" کہہ کر ان کی دعوتِ حق و ارشاد کے دشمن اور اُن کے خلاف سازشیں کر کے اُن کی جان کے درپے ہو گئے۔

اناجیلِ اربعہ | حضرت مسیح (علیہ السلام) پر جو انجیل نازل ہوئی تھی کیا موجودہ چاروں انجیلیں وہی ہیں یا یہ حضرت مسیح کے بعد کی تصانیف ہیں؟ اس کے متعلق تمام اہلِ علم کا جن میں نصاریٰ

بھی شامل ہیں، اتفاق ہے کہ ان میں سے کوئی ایک بھی حضرت مسیح (علیہ السلام) کی انجیل نہیں ہے ورنہ اس کا ترجمہ ہے لیکن پھر ان موجودہ انجیلوں کے متعلق عیسائی کیا کہتے ہیں اور ناقدین کی رائے کیا ہے یہ مسئلہ تفصیل طلب ہے۔

یہ بات بہرحال تسلیم شدہ ہے کہ موجودہ چاروں انجیلوں کے متعلق نصاریٰ کے پاس کوئی ایسی سند موجود نہیں جس کی بنا پر وہ یہ کہہ سکیں کہ ان کی روایات کا سلسلہ یا ان کی ترتیب و تالیف کا زمانہ حضرت مسیح یا اُن کے شاگردوں (حواریوں) تک پہنچتا ہے نہ اس کیلئے کوئی مذہبی سند ہے اور نہ تاریخی بلکہ اس کے خلاف خود عیسائیت کی مذہبی تاریخ اس امر کی شاہد ہے کہ پہلی صدی عیسوی سے چوتھی صدی عیسوی کے اوائل تک عیسائیوں میں اکیس[۱۱] سے زیادہ انجیلیں الہامی یقین کی جاتی اور رائج و معمول بہا تھیں لیکن ۳۲۵ء میں نائسیا کی کونسل نے ان میں سے صرف چار کو منتخب کر کے باقی کو متروک قرار دیدیا اور سخت حیرت کا مقام ہے کہ کونسل کا یہ انتخاب کسی تاریخی اور علمی بنیاد پر نہیں ہوا بلکہ ایک طرح کی فال نکالی گئی اور اسی کو الہامی اشارہ تسلیم کر لیا گیا، چنانچہ ان اکیس سے زائد انجیلوں میں سے بعض یورپ کے قدیم کتب خانوں میں پائی گئی ہیں، مثلاً انیسویں صدی میں ویٹیکان کے مشہور کتب خانہ سے متی کی انجیل کا ایک نسخہ برآمد ہوا تھا جس میں موجودہ چاروں انجیلوں سے بہت کچھ زائد و جدید ہے۔ موجودہ نسخوں میں سے سینٹ لوقا کی انجیل میں خصوصیت کے ساتھ حضرت مسیح کی پیدائش کا واقعہ تفصیل سے مندرج ہے لیکن سورۂ مریم میں قرآنِ عزیز نے اس واقعہ کو جس طرح حضرت مریم کی پیدائش اور ہیکل میں تربیت کے ذکر سے شروع کیا ہے نہ لوقا کی انجیل میں اس کا ذکر ہے اور نہ باقی تینوں انجیلوں میں مگر ویٹیکان کے اس نسخہ میں یہ واقعہ ٹھیک سورۂ مریم میں مذکورہ واقعہ کی طرح مندرج ہے[۱]۔

[۱] ترجمان القرآن جلد دوم۔

اسی طرح سولہویں صدی میں روما کے مشہور پوپ سکٹس (Skits.) کے قدیم کتب خانہ میں ایک اور متروک انجیل کا نسخہ برآمد ہوا جس کا نام انجیل برناباہے، یہ نسخہ پوپ کے مقرب لاٹ پادری فرامرینو نے پڑھا اور پوپ کی اجازت کے بغیر کتب خانہ سے چرا لایا۔ چونکہ اس میں خاتم الانبیاء محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق کثرت سے واضح اور صاف بشارتیں موجود تھیں حتیٰ کہ "احمد" نام تک مذکور تھا، نیز الوہیت مسیح کے خلاف عقیدہ کی تعلیم پائی جاتی تھی اس لئے وہ لاٹ پادری مسلمان ہوگیا، حال ہی میں اُس کا عربی ترجمہ مصر میں علامہ سید رشید رضا مرحوم نے المنار پریس سے شائع کیا ہے جو قابلِ مطالعہ ہے، ڈاکٹر سعادہ نے اس کے مقدمہ میں جو قابلِ قدر علمی تحقیق پیش کی ہے اس میں ہے کہ اس انجیل کا پتہ پانچویں صدی عیسوی کے اواخر میں اُس تاریخی منشور (حکمنامہ) سے چلتا ہے جو خاتم الانبیاء محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے عیسائیوں کے پوپ گلیسیوس کی جانب سے کلیساؤں کے نام بھیجا گیا تھا اور جس میں اُن کتابوں کے نام درج تھے جن کا پڑھنا پڑھانا عیسائیوں پر حرام کیا گیا تھا اُن ہی میں انجیل برناباکا نام بھی شامل تھا۔

علاوہ ازیں محققین یورپ بھی آج اس کو تسلیم کرتے ہیں کہ حضرت مسیح کے بعد ابتدائی تین صدیوں میں ایک سو سے زائد انجیلیں پائی جاتی تھیں جو بعد میں چار کو چھوڑ کر باقی متروک کردی گئیں اور کلیسہ کے فیصلہ کے مطابق اُن کا پڑھنا حرام کردیا گیا اس لئے آہستہ آہستہ وہ سب مفقود ہوتی چلی گئیں اور کہتے ہیں کہ ان مفقود نسخوں میں ایک مشہور انجیل، انجیل ایگنٹس (انجیل اغنطسی) بھی تھی جواب ناپید ہے۔

نیز یہ بات بھی خصوصیت کے ساتھ قابلِ توجہ ہے کہ سینٹ پال (پولوس رسول) کے جو خطوط ہیں اور جن پر موجودہ عیسائیت کی بنیادیں قائم ہیں اُن کے مطالعہ سے جگہ جگہ

یہ پتہ چلتا ہے کہ وہ لوگوں کو خبردار کرتا اور ڈراتا ہے کہ وہ اِن انجیلوں کی جانب توجہ نہ دیں جو مسیح کے نام کی بجائے دوسرے ناموں سے منسوب ہیں کیونکہ مجھ کو روح القدس نے اِسی کے لیے مامور کیا ہے کہ میں انجیل مسیح کی حمایت کروں، اسی کو اسوہ بناؤں اور اُس کی تعلیم کو تمام عیسائی دُنیا میں پھیلاؤں، چنانچہ حسب ذیل جملے اس کی صراحت کرتے ہیں کہ اُس کے نزدیک مسیح کی انجیل عیسائیوں میں متروک ہو چکی تھی اور بعد کی بے سند انجیلوں کا عام رواج ہو گیا تھا اور اُن ہی میں سے یہ چار ہیں جو نائسیا کی کونسل نے بغیر کسی سند کے فال کے ذریعہ صحیح تسلیم کر لیں۔

اب اُن چار کا حال بھی سُنیئے۔ اِن میں سے سب سے قدیم متی کی انجیل تسلیم کی جاتی ہے باایںہمہ اُس کے متعلق نصاریٰ میں سے علمار متقدمین تو بالاتفاق اور علمار موجودہ میں سے اکثر اس کے قائل ہیں کہ موجودہ انجیل متی اصل نہیں ہے بلکہ اُس کا ترجمہ ہو اس لیے کہ اصل کتاب عبرانی میں تھی جو اب ناپید ہو اور ضائع ہو گئی لیکن یہ اصل کا ترجمہ ہے یا اس میں بھی تحریف ہوئی ہے اس کے متعلق کوئی تاریخی سند موجود نہیں، حتیٰ کہ مترجم کا نام تک معلوم نہیں اور نہ یہ پتہ کہ کس زمانہ میں یہ ترجمہ ہوا اور مشہور عیسائی عالم جرجیس زوبن الفتوحی اللبنانی نے اپنی کتاب میں تصریح کی ہو کہ متی نے اپنی انجیل بیت المقدس میں بیٹھ کر ۳۹ء میں عبرانی میں تصنیف کی تھی جیسا کہ مقدس ایرونیموس نے کہا ہے کہ اوسیبیوس نے اپنی تاریخ میں بیان کیا ہے کہ متی کی انجیل کا یونانی ترجمہ اصل نہیں ہے اور جب بانیتوس نے یہ ارادہ کیا تھا کہ وہ ہندوستان جا کر عیسائیت کی تبلیغ کرے تو اُس نے متی کی انجیل کو عبرانی میں مکتوب اسکندریہ کے کتب خانۂ قیصر میں محفوظ دیکھا تھا مگر وہ نسخہ مفقود ہو گیا

---

[1] اظہار الحق مولانا رحمۃ اللہ کیرانوی نور اللہ مرقدہ، جلد اول ص ۱۶۱

اور نہیں کہا جاسکتا کہ کس زمانہ میں کس شخص نے یونانی زبان میں موجودہ ترجمہ کو روشناس کرایا[1]

دوسری انجیل مرقس کی ہے اس کے متعلق مشہور عیسائی عالم پطرس گو اناگا اپنی کتاب مروج الاخبار فی تراجم الابرار میں مرقس کی سوانح حیات پر لکھتے ہوئے کہتا ہے کہ یہ نسلاً یہودی لاوی اور پطرس حواری عیسیٰ (علیہ السلام) کا شاگرد تھا۔ رومیوں نے جب عیسائیت اختیار کرلی تو اُن کے مطالبہ پر یہ انجیل تصنیف کی یہ الوہیت مسیح کا منکر تھا اور اس نے اپنی انجیل میں اُس حصہ کو بھی نہیں لیا جس میں حضرت مسیح (علیہ السلام) پطرس کی مدح کرتے ہیں، یہ ۶۸ء میں اسکندریہ کے قید خانہ میں قتل ہوا، بت پرستوں نے اس کو قتل کر دیا[2] اور عیسائی دنیا کو اس بارے میں اختلاف ہے کہ مرقس کی انجیل کب تصنیف ہوئی چنانچہ الفاروق کے مصنف مرشد الطالبین ص۱۷۰ کے حوالے سے نقل کرتے ہیں کہ علماء نصاریٰ کا خیال یہ ہے کہ یہ پطرس کی نگرانی میں ۶۱ء میں تصنیف ہوئی[3]۔

تیسری انجیل سینٹ لوقا کی انجیل ہے جس قدر اختلاف علماء نصاریٰ میں متیٰ کی انجیل سے متعلق ہے اُس سے کہیں زیادہ لوقا کی انجیل کی صحت و عدم صحت کے متعلق اختلاف ہے چنانچہ الفاروق کے مصنف نے اس سلسلہ میں خود علماء نصاریٰ کے ہی اقوال نقل کئے ہیں اور یہ ثابت کیا ہے کہ یہ الہامی کتاب نہیں ہے وہ فرماتے ہیں کہ مسٹر کڈل اپنے رسالہ الہام میں دعویٰ کرتا ہے کہ لوقا کی انجیل الہامی نہیں ہے وجہ یہ ہے کہ لوقا نے خود اپنی انجیل کی ابتداء میں یہ لکھا ہے کہ یہ (انجیل) اُس نے ثاوفیلس کے ساتھ خط و کتابت کی بناء پر لکھی ہے وہ اُس کو مخاطب کرکے لکھتا ہے کہ مسیح کی باتیں جن لوگوں نے آنکھوں سے

---

[1] الفاروق بین المخلوق والخالق جلد ا ص ۲۰ ماخوذ از کتاب جرجیس زدین لبنانی مطبوعہ بیروت

[2] قصص الانبیاء للنجار

[3] الفاروق ص ۱۶۔

دیکھی تھیں انہوں نے ہم تک جس طرح پہنچائی ہیں اُن کو بہت سے لوگ ہم سے نقل کر رہے ہیں اس لیئے میں ضروری سمجھتا ہوں کہ اُن کو خود ہی صحیح طریقہ پر جمع کر دوں تاکہ تم کو صحیح حقیقت معلوم ہو جائے اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اُس نے حضرت مسیح کا زمانہ نہیں پایا، اور محققین نصاریٰ یہ بھی تصریح کرتے ہیں کہ لوقا کی انجیل مرقس کی انجیل کے بعد وجود میں آئی ہے اور پطرس اور پولوس کے مرنے کے بعد تصنیف کی گئی ہے[1]۔

اصل بات یہ ہے کہ لوقا انطاکیہ میں طبابت کرتا تھا، اس نے مسیح کو نہیں دیکھا، اور مسیحیت کو سینٹ پال (پولوس) سے سیکھا ہے اور پولوس کے متعلق یہ بات پایۂ تحقیق کو پہنچ چکی ہے کہ وہ دراصل متعصب یہودی اور علیسائیت کا بدترین دشمن تھا اور نصاریٰ کے خلاف علی الاعلان اپنی جد و جہد جاری رکھتا تھا۔ مگر جب اُس نے یہ دیکھا کہ اُس کی ہر قسم کی مخالفتوں اور رکاوٹوں کے باوجود مسیحیت کی ترقی ہوتی جا رہی ہے اور روکے نہیں رُکتی تب اُس نے یہودیانہ مکر و فریب سے کام لیا اور اعلان کیا کہ عجیب معجزہ ہوا، میں بحالت صحت تھا کہ ایک دم اس طرح زمین پر گرا جیسا کہ کوئی کشتی میں پچھاڑ دیتا ہے اور اس حالت میں حضرت مسیح نے مجھ کو چھوا اور پھر سخت زجر و توبیخ کی کہ آئندہ تو ہرگز میرے پیروؤں کے خلاف کوئی اقدام نہ کرنا بس میں اُسی وقت حضرت مسیح پر ایمان لے آیا اور پھر حضرت مسیح کے حکم سے میں مسیحی دُنیا کی خدمت کے لیئے مامور ہو گیا، انہوں نے مجھ کو فرمایا کہ میں لوگوں کو مسیح کی انجیل کی بشارت سُنا دوں اور اُس کے اتباع کی ترغیب دوں چنانچہ اُس نے آہستہ آہستہ "کلیسہ" پر ایسا قبضہ کیا کہ دین عیسوی کی اصل صداقتوں کو مٹا کر بدعتوں اور برائیوں کا مجموعہ بنا دیا، الوہیت مسیح، تثلیث و ابنیت اور کفارہ کی بدعات ایجاد کر کے مسیحیت

---

[1] قصص الانبیاء للنجار ص ۴۷۸ - ۴۷۹

کو ثنیت میں تبدیل کر دیا اور شراب، مردار اور خنزیر سب کو حلال بنا دیا یہی وہ مسیحیت ہے
پولوس کے صدقہ میں جس سے آج دنیا روشناس ہے اس کے بعد کون کہہ سکتا ہے کہ پولوس
کے شاگرد لوقا کی انجیل الہامی انجیل ہے اور جیروم کہتا ہے کہ بعض قدیم علما نصاریٰ
اس کے قائل ہیں کہ لوقا کی انجیل کے ابتدائی دو باب الہامی نہیں الحاقی ہیں کیونکہ
یہ اُس نسخہ میں موجود نہیں ہیں جو مارسیون فرقہ کے ہاتھوں میں ہے اور مشہور نصرانی عالم
اکہارن لکھتا ہے کہ لوقا کی انجیل کے باب ۲۲ آیات ۴۳، ۴۴ الحاقی ہیں وہ یہ بھی
کہتا ہے کہ معجزات سے متعلق جو بیان ہے اُس میں کذب بیانی اور شاعرانہ مبالغہ سے
کام لیا گیا ہے جو غالباً کاتب کی جانب سے اضافہ ہیں لیکن اب صدق کا کذب سے
امتیاز حد درجہ دشوار ہے اور کلی میشس...... لکھتا ہے کہ متی اور مرقس کی انجیلیں بہت
جگہ آپس میں مخالف اور متضاد واقعات کی حامل ہیں لیکن جس معاملہ میں دونوں کا اتفاق ہو
اُس کو لوقا کی انجیل کے بیان پر ترجیح حاصل ہے[1] اور یہ واضح رہے کہ لوقا کی انجیل
میں ۵۲ سے زیادہ مواقع پر متی کی انجیل سے اضافہ ہے اور مرقس کی انجیل سے تو اس
سے بھی کہیں زیادہ[2]۔ پس ان تمام دلائل سے نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ لوقا کی انجیل ہرگز الہامی
نہیں ہے اور نہ کسی حواری کی تصنیف ہے۔

چوتھی انجیل یوحنا کی ہے اس کے متعلق نصاریٰ کا عام عقیدہ یہ ہے کہ یہ حضرت
مسیح (علیہ السلام) کے محبوب شاگرد یوحنا زبدی کی ہو زبدی صیاد، یوحنا کے والد کا نام تھا جلیل کے
بیتِ صیدا میں ولادت ہوئی اور حواری عیسٰی (علیہ السلام) کا شرف حاصل ہوا اور نصاریٰ میں
مشہور بارہ[3] حواریوں میں سے سب سے زیادہ اُن ہی کو تقدیس حاصل ہے جرجیس زدین اللبنانی لکھتا ہے

---

[1] قصص الانبیا، ص ۴۷۷ [2] ایضاً ص ۴۷۷

کہ جس زمانے میں شیرنیطوس اور ابیسیوں اور اُن کی جماعت اپنے عقیدہ کی تشہیر کر رہی تھی کہ الوہیت مسیح کا عقیدہ باطل ہے وہ بشر تھے اور حضرت مریم کے بطن سے پیدا ہوئے اور حضرت مریم سے قبل وہ عالم وجود میں نہیں تھے اُس زمانہ میں ۹۶ء میں پادریوں، لاٹ پادریوں کی مجلس مشاورت ہوئی اور انہوں نے یوحنا کی خدمت میں حاضر ہو کر درخواست پیش کی کہ وہ حضرت مسیح کی باتیں تحریر کریں اور جو باتیں دوسری انجیلوں میں پائی جاتی ہیں اُن کے ماسوا جو کچھ معلوم ہو وہ لکھیں خصوصیت سے الوہیت مسیح کا مسئلہ ضرور لکھیں تاکہ شیرنیطوس وغیرہ کی جماعت کے خلاف ہمارے ہاتھ مضبوط ہوں تب یوحنا اُن کی بات نہ ٹال سکے اور یہ انجیل لکھنے پر مجبور ہوئے[1] مگر اس کے باوجود مسیحی علماء، زمانہ تصنیف کی تعیین میں مختلف نظر آتے ہیں بعض کہتے ہیں ۶۵ء میں تالیف ہوئی اور بعض ۹۶ء اور بعض ۹۸ء میں تصنیف ہونا بیان کرتے ہیں۔

مگر ان کے مقابلہ میں اُن مسیحی علماء کی تعداد کم نہیں ہے جو یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ یوحنا کی انجیل، حواری یوحنا کی تصنیف ہرگز نہیں ہے چنانچہ کیتھولک ہیرالڈ جلد ۷[2] میں پروفیسر لِن سے منقول ہے کہ انجیل یوحنا از ابتدا تا انتہا مدرسہ اسکندریہ کے ایک طالب علم کی تصنیف ہے اور برٹش نیدر لکھتا ہے کہ انجیل یوحنا اور رسائل یوحنا ان میں سے کوئی ایک بھی حضرت مسیح کے شاگرد یوحنا کی تصنیف نہیں ہے بلکہ کسی شخص نے دوسری صدی کے اوائل میں اس کو تصنیف کر کے اس لئے یوحنا کی جانب منسوب کر دیا تاکہ وہ لوگوں میں مقبول و مشہور بن جائے اور صاحب الفارق کہتے ہیں کہ مشہور مسیحی عالم کروٹیس... کا بیان ہے کہ یہ انجیل شروع میں بیس ابواب پر مشتمل تھی بعد میں افاس کے کنیسہ نے اس میں اکیسویں باب کا اضافہ کر دیا جبکہ یوحنا کا انتقال ہو چکا تھا[3] ان حوالجات سے یہ بخوبی آشکارا ہوتا

۱؎ قصص الانبیاء، ص ۴۷۷ ۲؎ مطبوعہ ۱۸۴۴ء ۳؎ الفارق ص ۳۴۲-۳۴۱

ہے کہ بلا شبہ یوحنا حواری کی انجیل نہیں ہے اور صرف اس مقصد سے تصنیف کر کے یوحنا کی جانب منسوب کی گئی کہ الوہیتِ مسیح کے عقیدۂ کنیسہ کو قوت پہنچائی جائے اور اصلاح عقیدہ کی جو آواز کبھی کبھی مسیحی دنیا میں اٹھتی تھی اُس کو دبایا جائے۔

چہارگانہ اناجیل کے متعلق مسطورہ بالا مختصر تنقیدات کے علاوہ اُن کے الہامی نہ ہونے کی دو واضح دلائل یہ بھی ہیں کہ ان چاروں انجیلوں میں حضرت مسیح (علیہ السلام) کی زندگی کے وقائع درج ہیں حتیٰ کہ نصاریٰ کے زعم کے مطابق اُن کی گرفتاری، صلیب، قتل مرکر جی اُٹھنے اور حواریوں پر ظاہر ہونے وغیرہ تک کے حالات بھی موجود ہیں پس اگر یہ اناجیل انجیل مسیح یا اُس کا کوئی حصہ ہوتیں تو اُن میں ان باتوں کا قطعاً تذکرہ نہیں ہونا چاہیئے تھا وہ واقعات تو مسیح کے بعد اُن کے شاگرد جمع کرتے اور اُن کو ایک تاریخی حیثیت حاصل ہوتی نہ کہ وہ کتاب اللہ کہلانے کے مستحق ہوتے اور یہ کہ جس طرح ان انجیلوں کے مصنفین کے بارہ میں اختلاف ہے اسی طرح ان تصنیفات کے باہم روایات و واقعات میں بھی تناقض اور سخت اختلاف پایا جاتا ہے یعنی بعض معجزات و عجیب واقعات ایسے ہیں جو ایک انجیل میں پائے جاتے ہیں اور دوسری انجیل میں اُن کا اشارہ تک نہیں ہے یا بعض میں ایک واقعہ جس طرح مذکور ہے دوسری میں کچھ زیادتی یا کمی کے ساتھ ایسے طریقہ پر بیان ہوا ہے کہ پہلی انجیل کے بیان میں اور اس میں صریح تضاد اور خلاف نظر آتا ہے مثلاً صلیب مسیح علیہ السلام کا واقعہ اناجیل میں تضادِ بیان کے ساتھ منقول ہے۔

یہ بات بھی کم حیرت کے لائق نہیں ہے کہ یہ اناجیل اربعہ جن جن زبانوں میں منقول ہوئی ہیں ان کی عبارات و کلمات کے بقاء و تحفظ کی کبھی پرواہ نہیں کی گئی بلکہ ایک ہی زبان کے مختلف ایڈیشنوں اور اشاعتوں میں بہ کثرت الفاظ اور جملوں کی تبدیلی، کمی اور بیشی

موجود ہے خصوصاً جن مقامات پر علماء نصاریٰ اور علماءِ اسلام کے درمیان بشارات کے سلسلہ میں یہ بحث آگئی ہے کہ اُن کا مصداق خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم ہیں یا حضرت مسیح یا کوئی اور نبی نیز جن مقامات پر الوہیت مسیح کی صراحت میں فرق پڑتا نظر آتا ہوا نکو کانی تختۂ مشق بنایا جاتا رہا ہے۔۔۔۔۔۔ اگر تحریفاتِ لفظی ومعنوی اور تضاد بیان کی تفصیلات رد تصریحات کو بہ نظر وسیع مطالعہ کرنا ہو تو اُس کے لئے مولانا رحمت اللہ کیرانوی کی اظہار الحق حافظ ابن قیم کی ہدایۃ الحیاریٰ، باجہ جی زادہ کی الفارق بین المخلوق والخالق اور مولانا آل نبی امروہی کی اظہار حق لائق دید کتابیں ہیں

غرض موجودہ چاروں انجیلیں الہامی انجیلیں نہیں ہیں نہ اُن کے الہامی ہونے کی روائتی سند ہے اور تاریخی، نہ اُن کے مصنفین کے متعلق قطعی اور یقینی علم حاصل ہے اور نہ زمانہ لئے تصانیف ہی متعین ہیں بلکہ اس کے خلاف پولوس کے بیانات، ان کتابوں کی تاریخی حیثیت۔۔۔ مضامین ومطالب کا باہمی تضاد وتغیر اسی پر شاہد ہیں کہ یہ ہرگز انجیل مسیح یا اُس کا حصہ نہیں ہیں اور یہ کہ انجیل مسیح نصاریٰ کے ہی ہاتھوں اول تحریف لفظی ومعنوی کا شکار ہوئی اور اُس کے بعد مفقود ہوگئی بلکہ ان چہارگانہ انجیلوں میں سے کوئی بھی اصل نہیں ہے بلکہ یونانی اور اس سے منقول دوسری زبانوں کے تراجم ہیں جو تبدیلی وتغیر اور نقص وازدیاد کا برابر شکار ہوتے رہے ہیں اور صرف یہی نہیں کہ یہ اناجیل اربعہ انجیل مسیح نہیں ہیں بلکہ کسی علمی تاریخی اور مذہبی سند سے اُن کا شاگردانِ مسیح کی تصنیف ہونا بھی ثابت نہیں ہے بلکہ بعد کے مصنفین کی تصانیف ہیں البتہ ان تراجم میں مواعظ ونصائح اور مقاماتِ حکمت کے سلسلہ میں ایک حصہ ایسا ضرور ہے جو حضرت مسیح علیہ السلام کے ارشادات عالیہ سے ماخوذ ہے اس لئے نقل میں کہیں کہیں اصل کی جھلک نظر آجاتی ہے۔

قرآن اور انجیل | قرآن عزیز کی بنیادی تعلیم یہ ہو کہ جس طرح خدا ایک ہے اسی طرح اس کی صداقت بھی ایک ہی ہے اور وہ کبھی کسی خاص قوم، خاص جماعت اور خاص گروہ کی وراثت نہیں ہی بلکہ ہر قوم اور ہر ملک میں خدا کی رشد و ہدایت کا پیغام ایک ہی احساس و بنیاد پر قائم رہتے ہوئے اُس کے سچے پیغمبروں یا اُن کے نائبوں کے ذریعے ہمیشہ دنیا کے لئے راہ مستقیم کا داعی اور منادی رہا ہے اور اسی کا نام "صراط مستقیم" اور "اسلام" ہے اور قرآن اسی بھولے ہوئے سبق کو یاد دلانے آیا ہے اور یہی وہ آخری پیغام ہے جس نے تمام مذاہب ماضیہ کی صداقتوں کو اپنے اندر سمو کر کائنات ارضی کی ہدایت کا بیڑا اٹھایا ہے اور اس لئے اب اس کا انکار گویا خدا کی تمام صداقتوں کا انکار ہے۔ اسی بنیادی تعلیم کے پیش نظر اُس نے حضرت مسیح علیہ السلام کی عظمت شان کو سراہا اور یہ اعتراف کیا کہ بلاشبہ انجیل الہامی کتاب اور خدا کی کتاب ہے لیکن ساتھ ہی جگہ جگہ یہ بھی بہ دلائل بتلایا کہ علماء، اہل کتاب نے اس کی سچی تعلیم کو مٹا ڈالا بدل ڈالا اور ہر قسم کی تحریف کرکے اس کی تعلیم کو شرک و کفر کی تعلیم بنا دیا مگر بعض بعض مقامات پر اہل کتاب کو تورات و انجیل کے خلاف عمل پر ملزم بناتے ہوئے موجودہ تورات و انجیل کے حوالے بھی دیتا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ نزولِ قرآن کے وقت اصل نسخے بھی اگرچہ محرف شکل میں ہی کیوں نہ ہوں پائے جاتے تھے، بہرحال اس وقت بھی یہ دونوں کتابیں لفظی، اور معنوی دونوں قسم کی تحریفات سے اس درجہ مسخ ہو چکی تھیں کہ وہ تورات موسیٰ اور انجیلِ مسیح کہلانے کی مستحق نہیں رہی تھیں چنانچہ قرآن نے اصل کتابوں کی عظمت اور اہل کتاب کے ہاتھوں اُن کی تحریف اور اُن کا مسخ دونوں کو واضح طور پر بیان کیا ہے

نَزَّلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَاَنْزَلَ التَّوْرٰىةَ (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ نے تجھ پر کتاب کو اُتارا حق کے ساتھ جو تصدیق کرنے والی ہے اُن کتابوں کی

وَالْاِنْجِيْلَ ٥ مِنْ قَبْلُ هُدًى	جو اُس کے سامنے ہیں اور اُتارا اُس نے توراتؔ اور
لِّلنَّاسِ وَاَنْزَلَ الْفُرْقَانَ ط	انجیل کو (قرآن سے) پہلے جو ہدایت ہیں لوگوں کے لئے
(آل عمران)	اور اُتارا فرقان (حق و باطل میں فرق کرنے والی)
وَيُعَلِّمُهُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرٰىةَ	اور سکھاتا ہے وہ کتاب کو، حکمت کو، توراتؔ کو، انجیل کو
وَالْاِنْجِيْلَ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تُحَآجُّوْنَ	اے اہل کتاب! تم کس لئے ابراہیمؔ کے بارے میں
فِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمَآ اُنْزِلَتِ التَّوْرٰىةُ	جھگڑتے ہو اور حال یہ ہے کہ توراتؔ اور انجیل کا
وَالْاِنْجِيْلُ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِهٖ اَفَلَا	نزول نہیں ہوا۔ مگر ابراہیمؔ کے بعد پس کیا تم اتنا بھی
تَعْقِلُوْنَ (آل عمران)	نہیں سمجھتے۔
وَقَفَّيْنَا عَلٰٓي اٰثَارِهِمْ بِعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ	اور پیچھے بھیجا ہم نے عیسٰیؔ بن مریمؔ کو جو تصدیق کرنیوالا
مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرٰىةِ	ہے اُس کتاب کی جو سامنے ہے توراتؔ اور دی ہم نے
وَهُدًى وَّمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ وَلْيَحْكُمْ	اُس کو انجیل جس میں ہدایت اور نور ہے اور جو اپنے
اَهْلُ الْاِنْجِيْلِ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فِيْهِ	سے پہلی کتاب توراتؔ کی تصدیق کرتی ہے اور سرتا
وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ	سر ہدایت اور نصیحت ہے پرہیزگاروں کے لئے اور چاہیے
فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ٥	کہ اہل انجیل اُس کے مطابق فیصلہ دیں جو ہم نے
(المائدہ)	انجیل میں اُتار دیا ہے اور جو اللہ کے اتارے ہوئے
	قانون کے موافق فیصلہ نہیں دیتا پس یہی لوگ فاسق ہیں
وَلَوْ اَنَّهُمْ اَقَامُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ	اور اگر وہ توراتؔ اور انجیل کو قائم رکھتے (تحریف
وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ مِّنْ رَّبِّهِمْ لَاَكَلُوْا	کرکے اُن کو مسخ نہ کر ڈالتے) اور اُس کو قائم رکھتے
مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ	جو اُن کی جانب ان کے پروردگار کی جانب سے

مِنْهُمْ أُمَّةٌ مُّقْتَصِدَةٌ وَكَثِيرٌ مِّنْهُمْ سَاءَ مَا يَعْمَلُونَ ۔ (المائدہ)

ہوا ہو تو البتہ وہ رفاغ البالی کے ساتھ کھاتے اپنے اوپر سے اور اپنے نیچے سے بعض اُن میں میانہ رو صلاح کار ہیں اور اکثر اُن کے بدعمل ہیں۔

قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لَسْتُمْ عَلَىٰ شَيْءٍ حَتَّىٰ تُقِيمُوا التَّوْرَاةَ وَالْإِنْجِيلَ وَمَا أُنْزِلَ إِلَيْكُمْ مِّن رَّبِّكُمْ ۔ (المائدہ)

(اے محمدؐ) کہہ دیجئے: اے اہل کتاب، تمہارے لئے ٹھہرنے کی کوئی جگہ نہیں ہے جب تک تورات اور انجیل اور اُس شے کو جس کو تمہارے پروردگار نے تم پر نازل کیا قائم نہ کرو (تاکہ اُس کا نتیجہ قرآن کی تصدیق نکلے)

وَإِذْ عَلَّمْتُكَ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرَاةَ وَالْإِنْجِيلَ (المائدہ)

اور جب میں نے تجھ کو (اے عیسیٰ) سکھائی کتاب حکمت تورات اور انجیل۔

الَّذِينَ يَتَّبِعُونَ الرَّسُولَ النَّبِيَّ الْأُمِّيَّ الَّذِي يَجِدُونَهُ مَكْتُوبًا عِندَهُمْ فِي التَّوْرَاةِ وَالْإِنْجِيلِ (الاعراف)

(نکوکار) وہ شخص ہیں جو پیروی کرتے ہیں الرسول کی جو نبی امی ہے اور جس کا ذکر اپنے پاس تورات اور انجیل میں لکھا پاتے ہیں

إِنَّ اللَّهَ اشْتَرَىٰ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَنفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُم بِأَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَيَقْتُلُونَ وَيُقْتَلُونَ وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا فِي التَّوْرَاةِ وَالْإِنْجِيلِ (توبہ)

بلاشبہ اللہ نے خرید لیا ہے مومنوں سے اُن کی جانوں (اور) اُن کے مالوں کو اس بات پر کہ اُن کے لئے جنت ہے وہ اللہ کے راستہ میں جنگ کرتے ہیں پس قتل کرتے ہیں اور قتل ہوتے ہیں اُن کے لئے اللہ کا وعدہ سچا ہے جو تورات اور انجیل میں کیا گیا ہے۔

غرض یہ مدح و منقبت ہے اُس تورات اور انجیل کی جو تورات موسیٰ اور انجیل عیسیٰ کہلانے کی مستحق اور درحقیقت کتاب اللہ تھیں لیکن یہود و نصاریٰ نے

ان الہامی کتابوں کے ساتھ کیا معاملہ کیا۔ اس کا حال بھی قرآن ہی کی زبان سے سنیئے۔

اَفَتَطْمَعُوْنَ اَنْ یُّؤْمِنُوْا لَکُمْ وَ قَدْ کَانَ فَرِیْقٌ مِّنْهُمْ یَسْمَعُوْنَ کَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ یُحَرِّفُوْنَهٗ مِنْۢ بَعْدِ مَا عَقَلُوْهُ وَهُمْ یَعْلَمُوْنَ (بقرہ)	کیا تم توقع رکھتے ہو کہ وہ تمہاری بات مان لیں گے حالانکہ ان میں ایک گروہ ایسا تھا جو اللہ کا کلام سنتا تھا پھر اس کو بدل ڈالتا تھا باوجود اس بات کے کہ وہ اس کے مطالب کو سمجھتا تھا اور دیدہ و دانستہ تحریف کرتے تھے۔
فَوَیْلٌ لِّلَّذِیْنَ یَکْتُبُوْنَ الْکِتٰبَ بِاَیْدِیْهِمْ ثُمَّ یَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ لِیَشْتَرُوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِیْلًا ؕ فَوَیْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا کَتَبَتْ اَیْدِیْهِمْ وَوَیْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا یَکْسِبُوْنَ (بقرہ)	پس افسوس اُن (مدعیان علم) پر جن کا شیوہ یہ ہے کہ خود اپنے ہاتھ سے کتاب لکھتے ہیں پھر لوگوں سے کہتے ہیں یہ اللہ کی طرف سے ہے اور یہ سب کچھ اس لئے کرتے ہیں تاکہ اس کے معاوضہ میں ایک حقیر سی قیمت دنیوی فائدہ کی حاصل کرلیں پس افسوس اُنپر جو کچھ وہ لکھتے ہیں اور افسوس اس پر جو کچھ وہ اس ذریعہ کو کماتے ہیں۔
یُحَرِّفُوْنَ الْکَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ (المائدہ)	وہ اہل کتاب (کتاب اللہ توریت و انجیل) کے کلمات کو ان کے محل و مقام سے بدل ڈالتے ہیں یعنی تحریف لفظی اور معنوی دونوں کرتے ہیں)

ان کے علاوہ ثمن قلیل (معمولی پونجی) کے عوض آیات اللہ کی فروخت کرنے کے متعلق تو بقرہ، آل عمران، نساء، توبہ میں متعدد آیات موجود ہیں جن کا حاصل یہ ہے کہ یہود و نصاریٰ، توراۃ و انجیل کی بیع دونوں طرح کیا کرتے تھے تحریف لفظی کے ذریعہ بھی

اور تحریف معنوی کے سلسلہ سے بھی۔ گویا سیم وزر کے لالچ سے عوام وخواص کی خواہشات کے مطابق کتاب اللہ کی آیات میں لفظی ومعنوی تحریف اُن کے فروخت کرنے کی حیثیت رکھتی ہے جس سے بڑھ کر شقاوت وبدبختی کا دوسرا کوئی عمل نہیں اور جو ہر حالت میں موجب لعنت ہے

انجیل اور حواریِ عیسیٰ علیہ السلام

مفسرین عام طور پر حواری کو "حور" سے ماخوذ کہتے ہیں جس کے معنی کپڑے کی سپیدی کے ہیں جب کپڑا دھل جانے کے بعد سپید ہو جاتا ہے تو اہل عرب کہا کرتے ہیں "حار الثوب" اس لیے دھوبی کو "حواری" کہتے ہیں اور "حواریون" اُس کی جمع آتی ہے۔ اس معنی کے پیش نظر حضرت مسیح (علیہ السلام) کے شاگردوں کو یا اس لیے حواری کہتے ہیں کہ اُن میں سے اکثر دھوبی اور مچھیرے کا پیشہ کرتے تھے اور یا اس لیے کہ جس طرح دھوبی کپڑا صاف کر دیتا ہے یہ بھی حضرت مسیح کی تعلیم سے لوگوں کے قلوب کو روشن کر دیا کرتے تھے حواری کے معنی ناصر ومددگار اور ناصح کے بھی آتے ہیں اور عبدالوہاب نجار فرماتے ہیں کہ نصاریٰ حضرت مسیح کے حواریوں کو "شاگرد" کہتے ہیں یہ تعبیر بے اصل نہیں ہے بلکہ اس حقیقت پر مبنی ہے کہ یہ اصل کے اعتبار سے "حبور" عبرانی لفظ ہے جس کے معنی "شاگرد" کے ہیں اور اُس کی جمع "حبوریم" آتی ہے یہی حبوریم ہے جو عربی میں جا کر حواری اور حوارین کہلایا۔

حوارینِ عیسیٰ (علیہ السلام) کا گزشتہ صفحات میں تفصیل سے ذکر آچکا ہے لیکن قرآن عزیز نے صرف "حواریون" کہہ کر مجمل تذکرہ کیا ہے کسی کا نام مذکور نہیں ہے انجیل نے البتہ اُن کے نام بھی بتلائے ہیں اور تعداد بھی، چنانچہ متی کی انجیل کے باب ۱۰ میں بارہ نام شمار کرائے ہیں اور چار انجیلوں سے خارج برنابا کی متروک انجیل کے باب ۱۴ میں بھی یہی تعداد مسطور ہے البتہ چند ناموں میں اختلاف پایا جاتا ہے نقشہ حسب ذیل ہے۔

انجیل متی		انجیل برنابا	
شمار	نام	شمار	نام
(۱)	پطرس (سمعان)	(۱)	بطرس الصیاد (سمعان)
(۲)	اندراوس (پطرس کا بھائی)	(۲)	اندراوس
(۳)	یعقوب بن زبدی	(۳)	برنابا
(۴)	یوحنا (یعقوب کا بھائی)	(۴)	یعقوب بن زبدی
(۵)	فیلپس	(۵)	یوحنا بن زبدی
(۶)	برتولماوس	(۶)	فیلپس
(۷)	توما	(۷)	برتولماوس
(۸)	متی العشار	(۸)	تداوس
(۹)	یعقوب بن حلفی	(۹)	یعقوب بن حلفی
(۱۰)	لباوس (ملقب بہ تداوس)	(۱۰)	یہودا
(۱۱)	سمعان القانوی	(۱۱)	متی العشار
(۱۲)	یہوذا اسخریوطی	(۱۲)	یہودا اسخریوطی [۱]

دونوں انجیلوں کے درمیان صرف دو ناموں میں اختلاف ہے متی میں توما اور سمعان قانوی ہیں اور برنابا میں اُن کی جگہ خود برنابا اور تداوس ہیں ان میں کون صحیح کہتا ہے؟ اس کا فیصلہ مشکل ہے لیکن دلیل کی روشنی میں یہ کہنا بہت آسان ہے کہ کلیسہ کی کونسل نے بے دلیل اور بے سند صرف اس بنا پر برنابا اور اس کے رفیق تداوس کے

---

[۱] قصص الانبیاء للنجار ص ۴۸۲

کے نام منظور کر دیئے کہ ان دونوں کی روایات الوہیت مسیح اور کفارہ کے خلاف سچی عیسائیت پر مبنی تھیں اور یہ کلیسہ کے اُس عقیدہ کے قطعاً خلاف تھیں جو سینٹ پال کی محرف عیسائیت کا مقبول عقیدہ تھا اور یہ بھی عجیب بات یہ ہو کہ اگرچہ برنابا کا نام موجودہ عیسائیت میں رسول سے خارج سمجھا جاتا ہے تاہم اُن رسولوں کی فہرست میں آج بھی موجود ہے جنہوں نے ملکوں میں خدائی بادشاہت کا اعلان کیا اور مسیحی دین کی دعوت و تبلیغ کا فرض انجام دیا ہے۔

حضرت مسیح علیہ السلام اور موجودہ مسیحیت

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیم حق کا خلاصہ گزشتہ بیانات میں سپرد قلم ہو چکا ہے وہ خدا کے سچے پیغمبر، حق و صداقت کے داعی دین مبین کے ہادی و مبلغ تھے اور خدا کے تمام سچے پیغمبروں کی طرح اُن کی تعلیم بھی پہلی صداقتوں کی مؤید اور وقت کی انفرادی و اجتماعی ضروریات کے انقلابات و حوادث کے مناسب حال انجیل کی شکل میں اصلاح و انقلاب کے لیے منادی تھی، توحید خالص، معرفت کردگار کے لئے کردگار سے ہی بلا وسیلہ تقرب، محبت و شفقت، رحمت و عفو کی اخلاقی برتری اُن کی پاک تعلیم کا محور تھا: لیکن انسانی انقلابات کی ذہنی تاریخ میں اس سے زیادہ حیرت اور تعجب کی غالباً کوئی بات نہ ہو کہ حضرت مسیح کی مقدس تعلیم ہی کے نام پر موجودہ مسیحیت: توحید کی جگہ تثلیث، معرفت حق کے لیے ابنیت کا عقیدہ، نجات کے لئے علم و عمل کی درستکاری کی جگہ کفارہ پر ایمان جیسی مشرکانہ اور جاہلانہ بدعات کی تبلیغ اور نشر و اشاعت میں سرگرم عمل ہو۔

تثلیث: بستانی نے دائرہ المعارف (Encyclopadia) میں اس مسئلہ پر مسیحی نقطۂ نظر سے سیر حاصل بحث کی جس کا خلاصہ یہ ہو کہ عیسائی مذہب نے سب سے پہلے تثلیث کا نام رسولوں کے عہد میں سنا، اس سے قبل مسیحیت اس عقیدہ سے قطعاً ناآشنا تھی اور رسولوں کا عہد سینٹ پال (پولوس رسول) سے شروع ہوتا ہو

یہ وہی حضرت ہیں جن کی بدولت دین مسیحی نے نیا جنم لیا اور جن کی یہودیت نے ازرہ تعصب مسیحی صداقت و توحید کے عقیدہ کو وثنیت اور شرک سے آلودہ کر کے کامیابی کا سانس لیا، یہ عقیدہ دراصل وثنی (بت پرستانہ) فلسفہ کی موشگافیوں کی پیداوار اور صنم پرستانہ عقیدہ "اوتار" کی صدائے بازگشت ہے اور اس حقیقت پر مبنی ہے کہ ذات یا صفت خداوندی بشکل انسانی کائنات ارضی میں وجود پذیر ہو سکتی ہے گویا یہ عقیدہ فلاسفۂ میلانیین اور غنوسطینین کے عقائد فلسفیانہ کا ایک معجون مرکب ہے چنانچہ تاریخ قدیم سے پتہ چلتا ہے کہ دوسری صدی عیسوی میں انطاکیہ کے لشپ "Bishop" تھیوفیلوس نے سب سے پہلے اس سلسلہ میں ایک یونانی کلمہ "ٹریاس" کا استعمال کیا اس کے بعد ایک دوسرے لشپ ترتلیانوس نے اس کے قریب قریب ایک لفظ تیرنیتا ایجاد کیا۔ یہی وہ یونانی لفظ ہے جو موجودہ مسیحی عقیدہ "ثالوث (تثلیث) کے مرادف اور ہم معنی ہے۔ اگر اس مسئلہ کی حقیقت کو ذرا اور گہری نظر سے دیکھنے کی کوشش کی جائے تو تاریخی حقائق سے یہ بات نمایاں نظر آئے گی کہ ثالوث کا عقیدہ دراصل مسیحیت اور وثنیت کی اس آمیزش کا نتیجہ ہے جو مسیحیت کے غلبہ اور وثنیت (بت پرستی) کی مغلوبیت کی وجہ سے پیش آیا، خصوصاً جب مصری بت پرستوں نے اس مذہب کو قبول کیا تو انہوں نے اس عقیدہ کو بہت ترقی دی اور فلسفیانہ دقیقہ سنجیوں کے ساتھ اس کو علمی بحث بنا دیا۔ مسیحیت قبول کر لینے کے بعد بت پرستوں پر جو ردِ عمل ہوا اس کے نتیجہ میں سے ایک اہم بات یہ تھی کہ ان کی خواہش ہمیشہ یہ رہی کہ وہ کس طرح گزشتہ وثنیت کی موجودہ مسیحیت کے ساتھ مطابقت پیدا کریں؟ تاکہ اس طرح قدیم و جدید دونوں ادیان کے ساتھ ربط قائم رہ سکے چنانچہ بقول مولانا ابوالکلام آزاد

"اسکندریہ کے فلسفہ آمیز اصنامی تخیل سیراپیز (serapis) سے تثلیثی وحدت کی اصل لی گئی اور ایزیز (Isis) کی جگہ حضرت مریم (علیہا السلام) کو اور ہورس (Horus) کی حضرت مسیح کو دی گئی" اور اس یونانی اور مصری فلسفیانہ وثنیت کی بدولت موجودہ مسیحیت میں الوہیت مسیح اور تثلیث "کلیسہ کا مقبول عقیدہ" بن گیا۔

یہ عقیدۂ تثلیث ابھی سن طفولیت ہی میں تھا کہ علماء نصاریٰ میں اس کے رد و قبول پر معرکۃ الآراء بحثیں شروع ہوگئیں "نیقاد" کی کونسل میں مشرقی گرجاؤں میں اور خصوصی اور عمومی مجالس میں جب بحث نے طول کھینچا تو کلیسہ نے فیصلہ دیا کہ مسئلہ ثالوث (تثلیث) حق اور اس کے خلاف "الحاد" ہے اِن ملحد جماعتوں اور فرقوں میں نمایاں فرقہ "ابیونیین" ہے جو کہتا ہے کہ حضرت مسیح (علیہ السلام) انسان محض تھے دوسرا "سابلیین" ہے جس کا خیال ہے کہ خدا ذاتِ واحد ہے اور اب، ابن، روح القدس، یہ مختلف صورتیں ہیں، جن کا اطلاق مختلف حیثیتوں سے ذاتِ واحد ہی پر ہوتا ہے، تیسرا فرقہ "آریوسیین" ہے اُس کا عقیدہ ہے کہ حضرت مسیح اگرچہ "ابن اللہ" ہیں مگر "اُب" کی طرح ازلی نہیں ہیں بلکہ کائنات بلند و پست سے قبل "اب" کی تخلیق سے مخلوق ہوا ہے اور اس لئے وہ "اب" سے نیچے اور اُس کی قدرت کے سامنے منقاد و خاضع ہے اور چوتھا فرقہ "مقدونیین" ہے اُن کا کہنا ہے کہ "اب" اور "ابن" دو ہی اقنوم ہیں "روح القدس" اقنوم نہیں ہے بلکہ مخلوق ہے۔

کلیسہ نے اِن کو اور اسی قسم کے دوسرے فرقوں کو 'ملحد' قرار دے کر نیقادیہ کی کونسل منعقدہ ۳۲۵ء اور قسطنطنیہ کی کونسل منعقدہ ۳۸۱ء کے مطابق ثالوث (تثلیث) کو مسیحی عقیدہ کی بنیاد تسلیم کیا اور فیصلہ دیا کہ "اب" اور "ابن" اور "روح القدس"

تینوں جُدا جُدا مستقل اقنوم داصل ۃ ہیں اور عالم لاہوت میں تینوں کی وحدت ہی خدا ہے گویا اس طرح ریاضی اور علم ہندسہ کے اٹل اور ناقابل انکار بدیہی مسئلہ کے خلاف یا یوں کہیے کہ بداہۃً عقل کے خلاف یہ تسلیم کرلیا کہ "ایک" تین ہے اور "تین" ایک اور یہ بھی کہا کہ "ابن" ازل ہی میں "اب" سے پیدا ہوا اور "روح القدس" کا صدور بھی ازل ہی میں "اب" سے ہوا ہے اور پھر ۵۸۹ء میں طلیطلہ کونسل نے یہ ترمیم منظور کرلی کہ "روح القدس" کا صدور "اب" سے ہی نہیں بلکہ "اب" اور "ابن" دونوں سے ہوا ہے۔ اس ترمیم کو "لاطینی کلیسہ" نے تو بغیر چون وچرا تسلیم کرلیا اور اس کو کلیسہ کا عقیدہ بنا لیا۔ لیکن "یونانی کلیسہ" اول تو خاموش رہا۔ مگر اس کے کچھ عرصہ کے بعد اس ترمیم کو بدعت قرار دے کر تسلیم کرلینے سے انکار کردیا اور اس باہمی اختلاف نے اس قدر شدید صورت اختیار کرلی کہ "یونانی کلیسہ" اور "کیتھولک لاطینی کلیسہ" کے درمیان کبھی اتفاق واتحاد پیدا نہ ہوسکا۔

ثالوث یا تثلیث کا یہ عقیدہ دین مسیحی کے رگ وپے میں خون کی طرح ایسا سرایت کرگیا کہ مسیحی کے بڑے فرقوں رومن کیتھولک اور پراٹسٹنٹ کے درمیان سخت بنیادی اختلافات کے باوجود بنیادی طور پر اس میں اتفاق ہی رہا اور صرف یہی نہیں بلکہ اس سے بھی زیادہ قابل حیرت ہے یہ بات کہ لوتھر کی جماعت اور اصلاح پسند کلیساؤں نے بھی ایک عرصہ دراز تک اس کیتھولک عقیدہ کو ہی بغیر کسی اصلاح وترمیم کے عقیدہ تسلیم کرلیا۔ البتہ تیرہویں صدی عیسوی میں فرقہ لاہوتی کی اکثریت نے اور جدید فرقوں سوسینیائی ——— جرمانی ——— موحدین ——— اور عمومیین ——— وغیرہم نے

اس عقیدہ کو نقل و عقل کے خلاف کہہ کر تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔[1]

یہ ہے مسیحیت میں عقیدۂ تثلیث کی وہ مختصر تاریخ جس سے یہ حقیقت بخوبی آشکارا ہو جاتی ہے کہ دین مسیحی کی حقیقی صداقت کی تباہی کا راز اسی الحاد اور مشرکانہ بدعت کے اندر پوشیدہ ہے جو صنم پرستانہ تخیل کا رہین منت ہے۔

عقیدۂ ثالوث کیا شے ہے اور "اب" "ابن" "روح القدس" کی تعبیرات کی حقیقت کیا ہے یہ مسئلہ بھی مسیحیت کے اُن مباحث میں سے ہے جن کا فیصلہ کن جواب کبھی نہ مل سکا اور جس قدر اس کو صاف اور واضح کرنے کی کوشش کی گئی۔ اس میں الجھاؤ اور پیچیدگی کا اضافہ ہی ہوتا گیا اور نتیجہ یہ نکلا کہ جس عقیدہ کو مسیحیت میں اساسی اور بنیادی حیثیت حاصل تھی وہی "معمہ" بن کر رہ گیا اور قدیم و جدید علماء نصاریٰ کو یہ کہنا پڑا کہ تثلیث میں توحید ہے اور توحید میں تثلیث، یہ مذہب کا ایسا مسئلہ ہے جو دنیا میں حل نہیں ہو سکتا اور دوسرے عالم میں پہنچ کر ہی یہ عقدہ حل ہو گا۔ اس لیے یہاں اس کو عقل سے سمجھنے کی کوشش کرنا فضول ہے بلکہ خوش عقیدگی کے ساتھ قبول کر لینا ہی نجات کی راہ ہے چنانچہ اواخر انیسویں صدی کے مشہور عیسائی عالم پادری فنڈر نے "میزان الحق" میں یہی بات ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔

تاہم اس صنم پرستانہ فلسفہ کی جو تشریحات کی گئی ہیں اُن کو مختصر طور پر یوں سمجھنا چاہیئے کہ اس کائنات ہست و بود کو جس میں ہم بس رہے ہیں "عالم ناسوت" کہا جاتا ہے اور ملاء اعلیٰ کہ جس کا تعلق عالم غیب سے ہے وہ اور اس سے ماوراء جہاں نہ زمین و زماں کا گذر اور نہ مکین و مکان کا، جہاں سب کچھ ہی لیکن ما دیت سے بالاتر

---

[1] دائرۃ المعارف للبستانی جلد ۶ ص ۳۰۰ کلمہ (ثالوث)

اور ورا الورا ہے اُس کا نام "عالم لاہوت" ہے تو جب زیر و بالا اور بلند و پست کچھ بھی نہ تھا اور ازل کی غیر محدود وسعت میں "وقت" ایک بے معنی لفظ تھا اُس وقت تین اقنوم[1] تھے "باپ" "بیٹا" "روح القدس" اور ان ہی تین اقانیم کی مجموعی حقیقت کا نام "خدا" ہے رومن کیتھولک، پراٹسٹنٹ اور ان دونوں سے جدا کلیسۂ شرقی تینوں ہی اُس پر متفق ہیں اور اسی کو دینِ مسیحیت کی روح یقین کرتے ہیں اور بڑی جسارت کے ساتھ دعویٰ کرتے ہیں کہ کتابِ مقدس کی تصریحات اسی کا اعلان کرتی ہیں۔

اس عجوبۂ روزگار عقیدہ نے اس حد پر پہنچ کر جو نئے نئے مباحث و افکار پیدا کیے اُن کا مطالعہ کرنے سے دیدۂ حیرت اور چشمِ عبرت کے لئے بہت کچھ سامان مہیا ہو جاتا ہے بڑی بڑی مذہبی کونسلوں، بڑے بڑے کلیساؤں کے بشپوں اور پاپاؤں نے اس عقیدہ کی تشریح میں یہ عجیب و غریب مباحث پیدا کئے کہ "اقنوم اول" باپ سے کس طرح اقنوم ثانی بیٹے کی ولادت ہوئی اور پھر باپ سے یا باپ اور بیٹے دونوں سے کس طرح اقنومِ ثالث "روح القدس" پھوٹ کر نکلی یا کس طرح اس کا صدور ہوا اور یہ کہ اُن کے باہم نسبت کیا ہے اور اُن کے جدا جدا کیا القاب و صفات ہیں جو ایک دوسرے کو آپس میں ممتاز کرتے ہیں اور پھر جب یہ تثلیث، توحید بن جاتی ہے تو اس کی صفات و القاب کی کیا صورت ہو جاتی ہے، نیز یہ کہ جس کو ہم خدا کہتے ہیں اُس میں تینوں اقانیم برابر کے شریک ہیں یا کوئی ایک پورا اور دوسرے دو جزوی حصہ دار ہیں اور جزوی شرکت ہے تو کس نسبت اور

---

[1] اقنوم کے معنی ہیں "اصل"

تعلق ہے ہے؛ غرض خدائے برتر کی مقدس اور پاک ہستی کو معاذ اللہ کمہار کے چاک پر رکھا ہوا برتن فرض کر کے جس طرح اُس کو بنایا اور طیار کیا ہے اور توحید خالص کو تباہ و برباد کر کے جس طرح شرک ترکیب کا نیا سانچہ ڈھالا ہے دنیا، مذاہب و ادیان کی تاریخ میں ایسا مذہبی تغیر و انقلاب چشم فلک نے نہ کبھی دیکھا نہ سنا ان ھٰذا لشئ عجاب۔

بہرحال "باپ" "بیٹا" "روح القدس" کی جدا جدا تفصیلات و تشریحات اور پھر وحدت سے ترکیب اور ترکیب سے وحدت کی عجوبہ زا تعبیرات کی ایک بھول بھلیاں ہے جس کا کہیں اور چھور نظر ہی نہیں آتا اور جب کہنے والا ہی لفظی تعبیرات کے علاوہ "حقیقت" سمجھنے سے عاری ہے تو سننے والا کیا خاک سمجھ سکتا ہے۔

باپ اقانیم ثلاثہ میں "اب" پہلا اقنوم ہے۔ اسی سے اقنوم ثانی کی ولادت ہوئی اور عالم لاہوت میں یہ کبھی بھی دوسرے اور تیسرے اقانیم سے جدا نہیں ہوتا۔ مگر مسیحی فرقوں میں کنیسہ کی عام تعلیم کے مطابق اکثر فرقے یہ کہتے ہیں کہ وحدتِ لاہوت میں تینوں کا درجہ مساوی ہے اور کسی کو کسی پر برتری حاصل نہیں ہے اور آریوسی ... کہتے ہیں کہ ایسا نہیں ہے بلکہ دوسرا اقنوم "بیٹا" اقنوم اول کی طرح ازلی نہیں ہے البتہ عالم بالا دلیت سے غیر معلوم مدت پہلے اقنوم اول سے پیدا ہوا ہے اس لیے اُس کا درجہ "باپ" کے بعد اور اُس سے کم ہے اور مقدونی فرقہ کہتا ہے کہ صرف دو ہی اقنوم ہیں "باپ" اور "بیٹا" اور "روح القدس" مخلوق ہے اور فرشتوں میں سے ایک فرشتہ ہے جس کا پایہ تمام ملائکۃ اللہ سے بلند ہے اور طلیطلہ کی کونسل کا فیصلہ یہ ہے کہ روح القدس "باپ" اور "بیٹا" دونوں سے پھوٹ کر نکلی ہے یا دونوں سے ہی اُس کا صدور ہوا ہے مگر قسطنطنیہ کی کونسل روح القدس کو صرف باپ ہی سے صادر ہوتا بتلاتی

ہے اور قدیم و جدید فرقوں میں سے ایک بڑی جماعت اقنوم ثالث مریم (علیہا السلام) کو تسلیم کرتی اور روح القدس کے اقنوم ہونے کا انکار کرتی ہے۔

بیٹا عربی میں "ابن" فرینچ میں "فی" ——— اور انگریزی میں سن (SON) اور اردو میں "بیٹا" کہتے ہیں یہ اُس شکل انسانی پر بولا جاتا ہے جو عام قانونِ قدرت کے مطابق مرد و عورت کے جنسی تعلقات کا نتیجہ ہوتا ہے مگر عقیدہ ثالوث کے مطابق وہ عالم لاہوت میں "باپ" سے جدا بھی نہیں ہے اور پیدا بھی ہے اور پھر بعض کے نزدیک اس کی پیدائش ازلی ہے اور بعض کے نزدیک غیر ازلی آگے چل کر کہتے ہیں کہ جب "باپ" کی مشیت کا فیصلہ ہوا تو اقنوم ثانی "بیٹا" عالمِ ناسوت (کائناتِ ہست و بود) میں مریم کے بطن سے پیدا ہو کر "مسیح" کہلایا اور بعض کا تو یہ دعویٰ ہے کہ خود باپ ہی عالمِ ناسوت میں بیٹا بن کر مریم کے بطن سے تولد ہوا اور مسیح کی شکل میں روشناس ہوا اور طرفہ تماشا یہ کہ بعض کے نزدیک تو اقنوم ثانی "ابن" کو اقنوم اول "اب" پر برتری اور تفوق حاصل ہے۔

روح القدس اسی طرح "روح القدس" کے متعلق بھی سخت اختلاف ہے کوئی کہتا ہے کہ وہ اقنوم ہی نہیں ہے اس لئے عالم لاہوت میں اس کو الوہیت حاصل نہیں ہے چنانچہ مکدونی اور آریوسی کہتے ہیں کہ وہ ملائکۃ اللہ میں سے ہے اور اُن میں سب سے برتر و بلند ہے اور ان میں تو یہ کہتا ہے کہ روح القدس کی تعبیر مجاز ہے اور اللہ تعالیٰ کے افعال پر مجازاً اُس کا اطلاق کیا جاتا ہے ورنہ الگ سے کوئی حقیقت نہیں ہے اس بنا پر اس قول کے قائلین کو "مجازیین" کہا جاتا ہے اور علماء جدیدین کلارک کہتا ہے کہ الہامی کتابوں (عہد نامہ قدیم و جدید) میں کسی ایک جگہ بھی "الوہیت" کا درجہ نہیں دیا گیا، فرقہ مکدونی نے الوہیت روح القدس کا انکار کرتے ہوئے شد و مد سے یہ کہا ہے کہ اگر جوہر الوہیت میں روح القدس کو بھی دخل ہوتا تو یا وہ

مولود ہوتی یا غیر مولود، اگر مولود ہو تو اس کے اور "ابن" کے درمیان کیا فرق رہا اور اگر غیر مولود ہے تو اس کے اور "اب" کے درمیان کیا امتیاز ہے۔

ان کے مقابلہ میں دوسری جماعتیں کہتی ہیں کہ "روح القدس" کو بھی الوہیت حاصل ہے بوسیو رومانی کہتا ہے کہ روح القدس کا صدور "اب" اور "ابن" دونوں سے ہوا اور وہ ان دونوں کے جوہر نفس سے ہے اور دونوں کے ساتھ وحدتِ لاہوت میں "اللہ" ہے اور اتناسیوس کہتا ہے کہ روح القدس کی الوہیت ناقابل انکار ہے اور کتب سماویہ میں روح پر "اللہ" کا اور "الٰہ" پر روح کا اطلاق ثابت و مسلم ہے اور اس کی جانب ان ہی امور کی نسبت کی گئی ہے جن کا تعلق ذاتِ خدا کے ماسوا اور کسی سے نہیں ہے مثلاً تقدیس ذات، معرفتِ جمیع حقائق وغیرہ اور یہ عقیدہ قدیم سے چلا آتا ہے جیسا کہ نظم وسولجیا سے ثابت ہے جس کی قدامتِ تالیف سب کے نزدیک مسلم ہے اس میں الوہیتِ روح القدس کا اعتراف موجود ہے اور مولٹ لغیلوسیس نے انکار الوہیت روح پر تنقید کرتے ہوئے کہا ہے کہ نصاریٰ کے نزدیک خدائے حقیقی کی توحید کا تثلیث میں مضمر ہونا ایک مسلم حقیقت ہے پھر روح کو الوہیت سے خارج کرنا کوئی معنی نہیں رکھتا اور مکدونیوں کے اعتراض کا جواب دیتے ہوئے مار اتناسیوس کہتا ہے کہ کتب سماوی میں روح کو ابن نہیں کہا گیا بلکہ روح الاب اور روح الابن کے اطلاقات پائے جاتے ہیں لہٰذا اس کو "ابن" یا "اب" کہنا صحیح نہیں اور نہ اسکو الوہیت سے نکال کر مخلوق کہنا درست ہو سکتا ہے اور ادراک بشری عاجز ہے کہ ان فلسفیانہ بحثوں سے روح القدس کی حقیقت تک پہنچ سکے البتہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ فقط تولید (پیدا ہونا) ہی تنہا ایسا واسطہ نہیں ہے جو "اب" کے ساتھ قائم ہو بلکہ انبثاق (صدور یا پھوٹ نکلنا) بھی ایک شکل ہو سکتی ہے مگر ہم اس دنیا میں تولید و انبثاق کے درمیان فرق ظاہر کرنے پر قادر نہیں ہیں البتہ ضرور کہہ سکتے ہیں کہ تولید و انبثاق دونوں کا "اب" کے ساتھ ازلی و ابدی اور تلازم کا تعلق ہے پس ہمارے

لئے یہ ہرگز مناسب نہیں ہے کہ فلاسفۂ قدیم (فلاسفۂ یونان) کی طرح "روح القدس" اور "اب" کے درمیان فلسفیانہ موشگافیوں کے ذریعہ وہ اعتقادات قبول کرلیں جو انہوں نے خدا سے صدور ارواح کے متعلق پیدا کر لیے ہیں۔

اسی کے ساتھ ساتھ وہ اختلافات بھی پیش نظر رہنے چاہئیں جو گزشتہ سطور میں بیان ہو چکے ہیں کہ بعض کلیسہ "روح القدس" کا فقط اقنوم اول (باپ) سے صادر ہونا مانتے ہیں اور بعض کہتے ہیں کہ "باپ" اور "بیٹا" دونوں سے اس کا صدور ہوا ہے، یہ اختلاف بھی عیسائی فرقوں کے درمیان سخت کشاکش کا سبب رہا ہے کیونکہ ۳۸۱ء میں منعقدہ کونسل قسطنطنیہ نے "منشور ایمانی" میں یہ واضح کر دیا تھا کہ روح القدس کا صدور "باپ" ہی سے ہوا ہے اور عرصہ تک یہی عقیدہ مسیحی دنیا میں نافذ رہا لیکن ۴۴۷ء میں اول ہسپانیہ کے کلیسہ نے پھر فرانس کے کلیسہ نے اور اس کے بعد تمام لاطینی رومن کلیساؤں نے اس ترمیم کو جزء عقیدہ بنایا کہ "روح القدس" کا صدور (اقنوم اول (باپ) اور اقنوم ثانی "بیٹا") دونوں سے ہوا ہے عیسائی علماء کہتے ہیں کہ دراصل یہ بحث ۸۶۶ء میں سب سے پہلے مشرق کے بطریق فوتیوس نے اس لئے پیدا کی کہ اُس کی اور اُس کی جماعت کی یہ خواہش تھی کہ کسی طرح مشرق (یونان) کے کلیسہ کو غرب (روم) کے کلیسہ سے جدا کر دیا جائے اور مشرق و مغرب کے کلیساؤں کا اتحاد باقی نہ رہنے دیا جائے اسی خیال کی تائید و تقویت کے لئے ۱۰۴۳ء میں بطریق میخائیل کرولاریوس نے اس عقیدہ کو بہت جلد شائع کیا اور آخر کار صدیوں تک ان اختلافات نے کلیسہ ہائے مشرق و مغرب کے درمیان مخالفانہ کش مکش کو قائم رکھا اور دونوں کلیسہ ایک دوسرے پر یہ الزام قائم کرتے رہے کہ مخالف کلیسہ نے مسیحیت میں الحاد و بدعت کی آمیزش کر کے حقیقی

مذہب کو مٹا ڈالا ہے اور رومن کیتھولک اور پراٹسٹنٹ کی بالعموم اور کلیساؤں کے مختلف فرقوں کی بالخصوص کشمکش کا یہ سلسلہ اس وقت تو انتہائی شدت اختیار کر چکا تھا اور باہم ہولناک خونریزیوں اور بہیمانہ مظالم کا جہنم بن چکا تھا جبکہ اسلام، اعتقادات کی سادگی اعمالِ صالحہ کی پاکیزگی اور اپنی علمی و عملی روحانیت کی شگفتگی کی بدولت "امن عام" اور "رحمت" کا نیر درخشاں بنا ہوا تھا۔

ازمنہ مظلمہ اور اصلاح کنیسہ کی آواز

یہ وہ زمانہ تھا جب عیسائیوں کے مذہبی کلیسے معمولی معمولی اختلافات کی بناء پر پوپ کی حکومت اور پیروانِ پوپ کی حکومتوں کے ذریعہ ایک دوسری جماعت کو گردن زدنی اور کشتنی قرار دیتی اور ہزاروں اور لاکھوں انسانوں کو وحشتناک عذابوں میں مبتلا کر کے قتل کر دیا کرتی تھیں اسی بناء پر مورخین تاریخ کے اس دور کو ازمنۂ مظلمہ (زمانہائے تاریک) کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

قرآن نے حضرت مسیح (علیہ السلام) کے متعلق جس حقیقت اور صداقت کا اظہار کیا تھا پوپ اور کلیسا سے مرعوبیت نے اگرچہ ایک مدت مدید تک عیسائیوں کو اس طرف متوجہ نہیں ہونے دیا، مگر پھر بھی یہ صدائے حق اثر کئے بغیر نہ رہ سکی اسکی تفاصیل اگرچہ خاتم الانبیاء محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ میں مذکور ہونگی لیکن یہاں صرف اس قدر اشارہ کرنا مقصود ہے کہ رومن کیتھولک، پراٹسٹنٹ اور دوسرے فرقوں نے بغیر کسی جھجک کے سینٹ پال کی تحریف (تثلیث) مسیحیت کا بنیادی عقیدہ تسلیم کر لیا تھا اور اگرچہ بعض چھوٹی چھوٹی جماعتوں یا افراد نے کبھی کبھی اس کے خلاف آواز اُٹھائی۔ مگر وہ آواز دب کر رہ گئی اور نقار خانہ میں طوطی کی صدا سے زیادہ اُس کی حیثیت نہ بن سکی مثلاً ۳۲۵ء اور ۳۸۱ء میں جب نیقادیہ کونسل اور قسطنطنیہ کونسل نے تثلیث کو دینِ مسیحی کی بنیاد قرار دیا اس وقت

ابوئیین نے صاف صاف اعلان کر دیا کہ حضرت مسیح صرف انسان ہیں اور الوہیت کا ان سے کوئی علاقہ نہیں اور سابلیین کہتے تھے کہ اقانیم ثلاثہ تین مختلف جوہر نہیں ہیں بلکہ وحدت باہوتی کی مختلف صورتیں اور تعبیریں ہیں جن کو اللہ تعالیٰ صرف اپنی ذاتِ واحد کے لئے اطلاق کرتا ہے تاہم اس وقت تک چونکہ پوپ اور کلیسہ کے فیصلے خدائی فیصلے سمجھے جاتے تھے اور بشپ اور پاپا "ارباباً من دون اللہ" یقین کئے جاتے تھے اس لئے ان اصلاحی آوازوں کو "الحاد" کہہ کر دبا دیا گیا۔ مگر جب صلیبی جنگوں نے عیسائیوں کو مسلمانوں کے اتنے قریب کر دیا کہ انہوں نے اسلام کے اعتقادی اور عملی نظام کا بہت کچھ نقشہ اپنی آنکھوں سے دیکھا اور اسلام سے متعلق بطارقہ (Batariqa) بساقفہ (Bishapa) کی غلط بیانی اور بہتان اُن پر ظاہر ہونے لگی تب اُن میں بھی آزادیٔ فکر نے کروٹ لی اور کورانہ تقلید کو شکست و ریخت کرنے کا جذبہ پیدا ہوا چنانچہ لوتھر کی آواز پہلی صدائے حق تھی جس نے جرأت کے ساتھ "ارباباً من دون اللہ" کے بتوں کو ماننے سے انکار کر دیا اور پوپ کے مقابلہ پر کتاب مقدس کی پیروی کی دعوت دی مگر آپ کو تعجب ہوگا یہ سنکر کہ پوپ کی جانب سے لوتھر کے خلاف جو الحاد اور بد دینی کے الزامات لگائے گئے تھے ان میں سب سے بڑا الزام یہ تھا کہ یہ در پردہ "مسلمان" ہو گیا ہے اور پاپا کے خلاف اس کی صدا قرآن کی صدائے بازگشت ہے۔

بہر حال یہی وہ صدائے اصلاح تھی جو بلا شبہ اسلام کی دعوتِ تفکر و تعقل سے متاثر ہو کر آہستہ آہستہ "اصلاح کنیسہ" کے نام سے مسیحی دنیا میں گونج اٹھی اور آگ کی طرح ہر طرف اس کے شعلے نظر آنے لگے ان ہی اصلاحات میں سے ایک اہم اصلاحی تخیل یہ بھی تھا کہ عقیدۂ تالوث کتاب مقدس (عہد نامۂ جدید) کے قطعاً خلاف ہے چنانچہ تیرہویں صدی

عیسوی میں قدیم لاہوتی فرقہ کے جمہور نے نسطوری فرقہ کے جماعتی فیصلہ نے اور جدید جماعتوں میں سے سوسینیانیس ــــ جرمانیین ــــ موحدین ــــ اور عموبیین ــــ اور دوسری جماعتوں نے تعلیم کلیسا کے خلاف مذہبی بغاوت کرتے ہوئے صاف کہہ دیا کہ تثلیث کا عقیدہ نقل و عقل دونوں کے خلاف اور ناقابل تسلیم ہے اور اگرچہ قومی و مذہبی عصبیت نے اُن کو اسلامی عقیدہ کا پیرو ہونے سے باز رکھا تاہم انہوں نے عقیدہ تثلیث کی مختلف شکلوں کے ساتھ ایسی تعبیرات کرنی شروع کر دیں جس سے عقیدہ ثالوث باطل ہو کر توحید الٰہی کے پاک اور مقدس جراثیم پیدا ہونے لگے مثلاً سویڈنبرگ نے کہا "اقانیم ثلاثہ" باپ" "بیٹا" "روح القدس" کا تعلق حضرت مسیح کی ذات کے ماسوا ذات احدیت سے نہیں ہے یعنی مسیح کی ذات اپنی طبع لاہوتی کے پیش نظر "باپ" ہے اور عالم ناسوت میں انسانی شکل کی تقیید کی وجہ سے "بیٹا" اور اقنوم ثانی" ہے اور اس حیثیت سے کہ روح القدس کا صدور اُس سے ہوا ہے وہ اقنوم ثالث" روح" ہے غرض "ثالوث" کا تعلق صرف حضرت مسیح سے ہے اور کانٹ (kant) کہتا ہے کہ عقیدہ ثالوث کے یہ معنی نہیں ہیں کہ" باپ" "بیٹا" "روح القدس" بلکہ یہ عالم لاہوت میں خدائے برتر کی تین بنیادی صفات کی جانب اشارہ ہے جو باقی تمام صفات کے لیے مصدر اور منبع کی حیثیت رکھتی ہیں اور وہ "قدرت" (اب) حکمت (ابن) اور "محبت" (روح) ہیں یا اللہ کے اُن تین افعال کی جانب اشارہ ہے جو "خلق" "حفظ" اور ضبط کے نام سے بھی تعبیر کیے جاتے ہیں اور ہیگن اور شیلنگ نے اس خیال کی کافی اشاعت کی کہ عقیدہ ثالوث حقائق کی طرح کوئی حقیقت نہیں ہے بلکہ ایک تخیلی نظریہ ہے ان کی مراد یہ ہے کہ جہاں تک حقیقت کا تعلق ہے خدائے برتر کی ذات وحدہ لاشریک لہ ہے اور مسیح علیہ السلام، مخلوقِ خدا، لیکن عام خیال و تصور میں جب ہم لاہوتی عالم کی جانب

پرواز کرتے ہیں تو ہمارا خیال اُس عالم میں خدا، مسیح اور رُوح القدس کو "اب" "ابن" اور "رُوح" کی تعبیرات دیتا اور اُن کے باہم تعلق کو اقانیم ثلاثہ کی حیثیت میں دیکھتا ہے۔

"عقلیین" "لوتھرین" اور "موحدین" اور "جرمانیین" کے علاوہ بھی بہت لوگ ہیں جو سابلیین کے عقیدہ کو اختیار کر کے ایک بڑی جماعت کی شکل اختیار کر رہے ہیں۔

ان تمام باتوں کے باوجود اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ یورپ کی نشاۃ جدید میں بھی عام طور پر تمام کلیساؤں کا ثالوث (تثلیث) پر ہی عقیدہ ہے اور ان کے نزدیک اس کلمہ کی تعبیر وہی ہے جو چوتھی صدی عیسوی میں متعدد مذہبی کونسلوں نے کی اور جو بلا شبہ شرک جلی اور توحید کے یکسر منافی ہے۔

قرآن اور عقیدۂ تثلیث نزولِ قرآن کے وقت جمہور مسیحی جن بڑے فرقوں میں تقسیم تھے ثالوث کے متعلق اُن کا عقیدہ تین جُدا جُدا اصولوں پر مبنی تھا، ایک فرقہ کہتا تھا کہ مسیح عینِ خدا ہے اور خدا ہی شکل مسیح دُنیا میں اُتر آیا ہے اور دوسرا فرقہ کہتا ہے کہ مسیح ابن اللہ (خدا کا بیٹا) ہے اور تیسرا کہتا تھا کہ وحدت کا راز تین میں پوشیدہ ہے، باپ، بیٹا، مریم اور اس جماعت میں بھی دو گروہ تھے اور دوسرا گروہ حضرت مریم کی جگہ "رُوح القدس" کو اقنوم ثالث کہتا تھا غرض وہ حضرت مسیح کو ثالث ثلاثہ (تین میں کا تیسرا) تسلیم کرتے تھے اس لئے قرآن کی صدائے حق نے تینوں جماعتوں کو جُدا جُدا بھی مخاطب کیا ہے اور یکجا بھی اور دلائل و براہین کی روشنی میں مسیحی دُنیا پر یہ واضح کیا ہے کہ اس بارے میں راہِ حق ایک اور صرف ایک ہے اور وہ یہ کہ مسیح مریم کے بطن سے پیدا شدہ انسان اور خدا کا سچا پیغمبر اور رسول ہے، باقی جو کچھ بھی کہا جاتا ہے وہ باطل محض ہے ——— خواہ اس میں تفریط ہو جیسا کہ یہود کا عقیدہ ہے کہ (نعیاذ باللہ) وہ شعبدہ باز اور مفتری تھے

یا افراط ہو جیسا کہ نصاریٰ کا عقیدہ ہے کہ وہ خدا ہیں اور خدا کے بیٹے ہیں یا تین میں کے تیسرے ہیں۔

قرآنِ عزیز نے صرف یہی نہیں کیا کہ نصاریٰ کے تردیدی پہلو کو ہی اس سلسلہ میں واضح کیا ہو بلکہ اس کے علاوہ حضرت مسیح (علیہ السلام) کی شانِ رفیع کی اصل حقیقت کیا ہے اور عنداللہ اُن کو کیا قربت حاصل ہے اس پر بھی نمایاں روشنی ڈالی ہے تاکہ اس طرح یہود کے عقیدہ کی بھی تردید ہو جائے اور افراط و تفریط سے جدا "راہِ حق" آشکارا نظر آنے لگے۔

حضرت مسیح خدا کے مقرب اور برگزیدہ رسول ہیں

قَالَ اِنِّیْ عَبْدُ اللّٰہِ اٰتٰنِیَ الْکِتٰبَ وَجَعَلَنِیْ نَبِیًّا ۝ وَّجَعَلَنِیْ مُبٰرَکًا اَیْنَ مَا کُنْتُ وَاَوْصٰنِیْ بِالصَّلٰوۃِ وَالزَّکٰوۃِ مَا دُمْتُ حَیًّا ۝ وَّبَرًّا بِوَالِدَتِیْ وَلَمْ یَجْعَلْنِیْ جَبَّارًا شَقِیًّا ۝ وَالسَّلٰمُ عَلَیَّ یَوْمَ وُلِدْتُّ وَیَوْمَ اَمُوْتُ وَیَوْمَ اُبْعَثُ حَیًّا (مریم)

مسیح نے کہا بے شک میں اللہ کا بندہ ہوں اور اس نے مجھ کو نبی بنایا ہے اور مجھ کو مبارک ٹھہرایا جہاں بھی میں رہوں اور اس نے مجھ کو نماز کی اور زکوٰۃ کی وصیت فرمائی جب تک بھی زندہ رہوں اور اس نے مجھ کو میری والدہ کے لیے نکوکار بنایا اور مجھ کو سخت گیر اور بدبخت نہیں بنایا مجھ پر سلامتی ہو جب میں پیدا ہوا جب میں مرجاؤں اور جب حشر کے لئے زندہ اٹھایا جاؤں۔

اِنْ هُوَ اِلَّا عَبْدٌ اَنْعَمْنَا عَلَیْهِ وَجَعَلْنٰهُ مَثَلًا لِّبَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ ۝ وَلَوْ نَشَآءُ لَجَعَلْنَا مِنْكُمْ مَّلٰٓىِٕكَةً فِی

وہ (مسیح) نہیں ہے مگر ایسا بندہ جس پر ہم نے انعام کیا اور ہم نے اُس کو مثال بنایا ہے بنی اسرائیل کے لئے، اور اگر ہم چاہتے تو کر دیتے ہم تم میں سے فرشتے

الْاَرْضِ يَخْلُفُوْنَ ۝ وَاِنَّهٗ لَعِلْمٌ لِّلسَّاعَةِ فَلَا تَمْتَرُنَّ بِهَا وَاتَّبِعُوْنِ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ (زخرف)

زمین میں چلنے پھرنے والے اور بلا شبہ وہ (مسیح) نشان ہے قیامت کے لئے۔ پس اس بات پر تم شک نہ کرو اور میری پیروی کرو، یہی سیدھا راستہ ہے

وَاِذْ قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ مُّصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَمُبَشِّرًۢا بِرَسُوْلٍ يَّاْتِيْ مِنْۢ بَعْدِي اسْمُهٗٓ اَحْمَدُ

اور (وہ وقت یاد کرو) جب عیسیٰ بن مریم نے کہا اے بنی اسرائیل! بلا شبہ میں تمہاری جانب اللہ کا رسول ہوں تصدیق کرنے والا ہوں جو میرے سامنے ہے تورات اور بشارت دینے والا ہوں ایک رسول کی جو میرے بعد آئے گا اس کا نام احمد ہے۔

حضرت مسیح نہ خدا ہیں نہ خدا کے بیٹے

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ قُلْ فَمَنْ يَّمْلِكُ مِنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا اِنْ اَرَادَ اَنْ يُّهْلِكَ الْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَاُمَّهٗ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝ (المائدہ)

بلا شبہ ان لوگوں نے کفر اختیار کر لیا جنھوں نے یہ کہا بیشک اللہ وہی مسیح بن مریم ہے کہہ دیجیے کہ اگر اللہ یہ ارادہ کرے کہ مسیح بن مریم، مریم اور کائنات زمین پر جو کچھ بھی ہے سب کو ہلاک کر ڈالے تو کون شخص ہے جو اللہ سے اس کے خلاف کسی شے کے مالک ہونے کا دعویٰ کر سکے اور اللہ کے لئے ہی بادشاہت ہے آسمانوں کی اور زمین کی وہ جو چاہتا ہے اس کو پیدا کر سکتا ہے اور اللہ

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ وَقَالَ الْمَسِيْحُ يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ

بلا شبہ اُن لوگوں نے کفر اختیار کیا جنھوں نے کہا۔ بلا شبہ اللہ وہی مسیح بن مریم ہے۔ حالانکہ خود مسیح نے یہ کہا۔ اے بنی اسرائیل اللہ کی عبادت

اُعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبَّكُمْ اِنَّهٗ
مَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ حَرَّمَ
اللّٰهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ وَمَاْوٰىهُ النَّارُ
وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ ۝
(المائدہ)

جو میرا اور تمہارا پروردگار ہے بیشک جو اللہ کے ساتھ
شریک ٹھیراتا ہے پس یقیناً اللہ نے اس پر جنت کو حرام
کر دیا ہے اور اس کا ٹھکانہ جہنم ہے اور ظالموں کے
لیے کوئی مدد نہیں ہے۔

وَقَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا سُبْحٰنَهٗ
بَلْ لَّهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ
كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ
(بقرہ)

اور انھوں نے کہا۔ اللہ نے "بیٹا" بنا لیا ہے وہ ذات
تو ان باتوں سے پاک ہے بلکہ (اس کے خلاف)
اللہ کے لئے ہی ہے جو کچھ بھی آسمانوں اور زمین میں ہے
ہر شے اللہ کے لئے تابعدار ہے۔

اِنَّ مَثَلَ عِيْسٰى عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ
اٰدَمَ خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ
لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ (آل عمران)

بلاشبہ عیسیٰ کی مثال اللہ کے نزدیک آدم کی سی
ہے کہ اس کو مٹی سے پیدا کیا پھر اس کو کہا ہو جا
تو وہ ہو گیا۔

يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ
وَلَا تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ اِنَّمَا
الْمَسِيْحُ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ رَسُوْلُ
اللّٰهِ وَكَلِمَتُهٗ اَلْقٰىهَا اِلٰى مَرْيَمَ وَ
رُوْحٌ مِّنْهُ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ
وَلَا تَقُوْلُوْا ثَلٰثَةٌ اِنْتَهُوْا خَيْرًا
لَّكُمْ اِنَّمَا اللّٰهُ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ

اے اہل کتاب اپنے دینی معاملہ میں حد سے نہ گزرو
اور اللہ کے بارے میں حق کے ماسوا کچھ نہ کہو بلاشبہ
مسیح بن مریم اللہ کے رسول ہیں اور اس کا کلمہ ہیں
جس کو اس نے مریم پر ڈالا (یعنی بغیر باپ کے اس کے
حکم سے مریم کے بطن میں وجود پذیر ہوئے) اور اس کی
روح ہیں پس اللہ پر اور اس کے رسولوں پر ایمان لاؤ
اور تین (اقانیم) نہ کہو اس سے باز آجاؤ۔

سُبْحٰنَهٗ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗ وَلَدٌ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ كَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا	تمہارے لئے بہتر ہوگا بلا شبہ اللہ خدا ئے واحد ہے پاک ہو اس سے کہ اس کا بیٹا ہو اسی کے لئے (بلا شرکت غیرے) جو کچھ بھی ہے آسمانوں اور زمین میں اور کافی ہے اللہ "وکیل" ہو کر
بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اَنّٰى يَكُوْنُ لَهٗ وَلَدٌ وَّلَمْ تَكُنْ لَّهٗ صَاحِبَةٌ وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ (انعام)	وہ (خدا) موجد ہے آسمانوں اور زمین کا اس کے لئے بیٹا کیسے ہو سکتا ہے اور نہ اس کے بیوی ہے اور اس نے کائنات کی ہر شے کو پیدا کیا ہے اور وہ ہر شے کا جاننے والا ہے۔
مَا الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ وَاُمُّهٗ صِدِّيْقَةٌ كَانَا يَاْكُلٰنِ الطَّعَامَ (المائدہ)	مسیح بن مریم نہیں ہیں مگر خدا کے رسول بلا شبہ ان سے پہلے رسول گذر چکے ہیں اور ان کی والدہ صدیقہ ہیں، یہ دونوں کھانا کھاتے تھے یعنی دوسرے انسانوں کی طرح کھانے پینے وغیرہ امور میں وہ بھی محتاج تھے۔
لَنْ يَّسْتَنْكِفَ الْمَسِيْحُ اَنْ يَّكُوْنَ عَبْدًا لِّلّٰهِ وَلَا الْمَلٰٓئِكَةُ الْمُقَرَّبُوْنَ وَمَنْ يَّسْتَنْكِفْ	ہرگز مسیح اس سے ناگواری نہیں اختیار کرے گا کہ وہ اللہ کا بندہ کہلائے اور نہ مقرب فرشتے حتیٰ کہ روح القدس جبرئیل تک بھی چڑھائیں گے

عَنْ عِبَادَتِهٖ وَيَسْتَكْبِرْ فَسَيَحْشُرُهُمْ اِلَيْهِ جَمِيْعًا ط (النساء)	عبادت سے ناگواری کا اظہار کرے اور غرور اختیار کرے تو قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ ان سب کو اپنی جانب اکٹھا کرے گا۔ یعنی جزا و سزا کے دن سب حقیقت حال کھل جائے گی۔
وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ عُزَيْرُ اِبْنُ اللّٰهِ وَقَالَتِ النَّصَارَى الْمَسِيْحُ ابْنُ اللّٰهِ ذٰلِكَ قَوْلُهُمْ بِاَفْوَاهِهِمْ يُضَاهِئُوْنَ قَوْلَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَبْلُ ط قَاتَلَهُمُ اللّٰهُ اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ (توبہ)	اور یہود کہتے ہیں کہ عزیر خدا کا بیٹا ہے اور نصاریٰ کہتے ہیں مسیح خدا کا بیٹا ہے یہ اُن کے مُنہ کی باتیں ہیں ریس کرنے لگے اگلے کافروں کی بات کی اللہ ان کو ہلاک کرے کہاں سے پھرے جاتے ہیں۔
قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۝ اَللّٰهُ الصَّمَدُ لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ ۝ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ۝ (اخلاص)	(اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کہدیجے اللہ یکتا ہے اللہ بے نیاز ہستی ہے، نہ کسی کا باپ ہے اور نہ کسی کا بیٹا اور کائنات میں کوئی اُس کا ہمسر نہیں ہے۔

قرآن نے اس سلسلہ میں اپنی صداقت اور اصلاح عقائد و اعمال کا جو مدلل اور واضح اعلان کیا اس کے مطالعہ کے ساتھ یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ موجودہ کتاب مقدس کے محرف اور مسخ کر دیے جانے کے باوجود جس شکل و صورت میں آج موجود ہے وہ کسی ایک مقام پر بھی "ثالوث" کے اس عقیدہ کا پتہ نہیں دیتی جس کی تفصیلات و تشریحات ابھی سطور بالا میں علماء نصاریٰ، مذہبی کونسلوں اور کلیساؤں سے نقل ہو چکی ہیں اور بجز تعبیر کے جگہ جگہ حضرت مسیح کی زبان سے خدا کو "باپ" اور خود کو "بیٹا" ظاہر کیا گیا ہے اس کے لئے اور کوئی ثبوت واضح اور مصرح طور پر مہیا نہیں ہے پس اگر ہم اس سے قطع نظر بھی کرلیں کہ یہ تعبیرات "تحریفی" اور صنم پرستی کے تخیل کی رہین منت ہیں اور اگر بالفرض یہ تسلیم

کرلیں کہ خدائے برتر کی جانب سے سچی الہامی انجیل میں بھی یہ تعبیرات موجود تھیں تب بھی اُن سے نصاریٰ کا عقیدہ "تثلیث" کسی طرح صحیح ثابت نہیں ہو سکتا کیونکہ "ابن" کا لفظ اگرچہ حقیقی معنی کے لحاظ سے اُس انسان پر بولا جاتا ہے جو کسی کی صلب یا کسی کے بطن سے مادۂ منویہ کے ذریعہ پیدا ہوا ہو تاہم محاوراتِ زبان اور اہلِ زبان کے استعمالات و اطلاقات شاہد ہیں کہ یہ لفظ کبھی مجاز کے طور پر اور کبھی تشبیہ یا کنایہ کے طریق سے اور کبھی مختلف معانی پر بولا جاتا ہے، مثلاً ایک بڑی عمر کا شخص اپنے سے چھوٹے کو مجازاً "ابن" (بیٹا) کہہ دیا کرتا ہے، یا بادشاہ اپنی رعایا کو اولاد کہہ کر خطاب کرتا ہے یا استاد اپنے شاگردوں کو "بیٹا" کہہ کر پکارتا ہے یا جو شخص کسی علم و ہنر کا ماہر یا اُس کی خدمت میں سرشار رہتا ہو تو اُس کو کنایۃً اُس علم و ہنر کا بیٹا کہہ کر یاد کرتے ہیں اور کہا کرتے ہیں "ابن القانون" "ابن الفلسفہ" "ابن الفلاحۃ" "ابن الحدادہ" یا دنیا طلبی کی حرص و آز میں اگر حد سے گذر چکا ہے تو اُس کو "ابن الدراہم" "ابن الدنانیر" کہہ دیا کرتے ہیں اسی طرح مسافر کو "ابن السبیل" مشہور شخصیت کو "ابن جلا" بڑے ذمہ دار انسان کو "ابن لیلہا" آنے والے دن سے بے پرواہ شخص کو "ابن یومیہ" دنیا ساز ہستی کو "ابن الوقت" کہتے ہیں یا جس کے اندر کوئی وصف نمایاں طور پر موجود ہوتا ہے تو اُس وصف کی جانب لفظ ابن کو منسوب کرکے ذاتِ موصوف کو یاد کرتے ہیں مثلاً صبح کو "ابن ذکاء" کہتے ہیں اور ان تمام مثالوں سے زیادہ یہ کہ انبیاء بنی اسرائیل اپنی امتوں کو ابناء اور اولاد کے ساتھ ہی خطاب کرتے اور نصائح و مواعظ میں یہ ظاہر فرماتے ہیں کہ امم و اقوام انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی روحانی اولاد ہوتی ہیں

اور یہی حال "اب" اور "باپ" کے اطلاقات و استعمالات کا ہے، ایک چھوٹا اپنے بڑے کو، ایک ضرورت مند اپنے مربی کو، ایک شاگرد اپنے اُستاد کو، ایک امتی اپنے نبی کو

"اب" اور "باپ" کہنا فخر سمجھا ہے حالانکہ ظاہر ہے کہ اس قسم کے تمام اطلاقات مجاز، کنایہ اور تشبیہ کے طور پر کئے جاتے ہیں، اسی طرح بے نظیر مقرر اور خطیب کو "ابو الکلام" بہترین انشاء پرداز کو "ابو القلم" ماہر نقاد کو "ابو النظر" ڈراونی اور ہیبت ناک شے کو "ابو الہول" سخی کو "ابو الانجاد" فن کاشتکاری کے ماہر کو "ابو الفلاحۃ" صنعت و حرفت کے حاذق کو "ابو الفتح" شب و روز بولتے رہتے ہیں۔

تو اِن اطلاقات کے پیش نظر بآسانی یہ کہا جا سکتا ہے کہ کتاب مقدس میں ذاتِ احدیث پر اب (باپ) کا اطلاق رب حقیقی کی حیثیت میں اور حضرت مسیح پر ابن (بیٹا) کا اطلاق محبوب و مقبول الٰہی کی حیثیت میں ہوا ہے یعنی جس طرح باپ اور بیٹے کے درمیان محبت و شفقت کا رشتہ مضبوط و مستحکم ہوتا ہے اس سے کہیں زیادہ محبت و شفقت کا وہ رشتہ ہے جو اللہ تعالیٰ کے اور اُس کے مقدس پیغمبر مسیح (علیہ السلام) کے درمیان قائم ہے ایک صحیح حدیث میں بھی نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اس استعارہ اور تشبیہ کو استعمال فرماتے ہوئے کہا ہے "الخلق عیال اللہ" (تمام مخلوق خدا کا کنبہ ہے)

پس روزمرہ کے محاورات و اطلاقات کو نظر انداز کر کے کتاب مقدس کے لفظ "اب" اور "ابن" کے ایسے معانی و مطالب مراد لینا جو صریح شرک کے مرادف ہوں بلکہ اُس سے بھی زیادہ قباحت و شناعت کے ساتھ خدا کی ہستی کو تین اقانیم سے مرکب ظاہر کرتے اور خدا کے حصّے بخرے بناتے ہوں "کسی طرح بھی جائز نہیں ہو سکتا اور صریح ظلم اور اقدام شرک ہے "تعالی اللہ علواً کبیراً" بالخصوص ایسی صورت میں جبکہ اِن ہی اناجیل میں بصراحت حضرت مسیح کے انسان اور مخلوق خدا ہونے پر نصوص موجود ہوں مثلاً یوحنا کی انجیل میں حضرت مسیح کا یہ ارشاد مذکور ہے[1]

[1] ۵ باب آیت ۵۱

"میں تم سے سچ سچ کہتا ہوں کہ تم آسمان کو کھلا ہوا اور خدا کے فرشتوں کو اوپر جاتے ہوئے اور ابن آدم (مسیح) پر اترتے دیکھو گے"

اور باب ۱۳ میں بصراحت خود کو "رسول" کہا ہے[1]

"میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ نوکر اپنے مالک سے بڑا نہیں ہوتا اور نہ "رسول" اپنے بھیجنے والے سے۔

اور باب ۴ میں ہے[2]

کیونکہ یسوع نے خود گواہی دی کہ نبی اپنے وطن میں عزت نہیں پاتا"

اور باب ۳ میں ہے۔

"اور آسمان پر کوئی نہیں چڑھا سوائے اس کے جو آسمان سے اترا یعنی ابن آدم جو آسمان میں ہے۔

اور باب ۶ میں ہے۔

پس جو معجزہ اس نے دکھایا وہ لوگ اسے دیکھ کر کہنے لگے جو نبی دنیا میں آنے والا تھا فی الحقیقت یہی ہے۔

اور انجیل متی میں ہے[3]

"لیکن اس لئے کہ تم جان لو کہ ابن آدم (مسیح) کو زمین پر گناہوں کے معاف کرنے کا اختیار ہے۔

علاوہ ازیں اگر عہد نامہ جدید میں حضرت مسیح (علیہ السلام) کے لئے "ابن" کا اطلاق موجود ہے تو نکوکار انسانوں پر بھی "ابناء اللہ" اور بدکاروں کے لئے "ابناء ابلیس"

---

[1] باب ۱۳- آیت ۱۶، [2] باب ۴ آیت ۴۴، باب ۳ آیت ۱۳، باب ۶ آیت ۱۴، [3] باب ۹ آیت ۶

کا اطلاق پایا جاتا ہے چنانچہ انجیل متی میں ہے [1]

"مبارک ہیں وہ جو صلح کراتے ہیں کیوں کہ وہ خدا کے بیٹے کہلائیں گے۔"

اور انجیل یوحنا میں ہے [2]

"یسوع نے اُن سے کہا۔ اگر تم ابراہیم کے فرزند ہوتے تو ابراہیم کے سے کام کرتے"

.... انہوں نے اُس سے کہا ہم حرام سے پیدا نہیں ہوئے ہمارا ایک

باپ ہے یعنی خدا"

لہٰذا عقیدہ تثلیث میں نصاریٰ کے لئے موجودہ کتاب مقدس سے بھی کوئی حجت و دلیل نہیں ملتی اور اس لئے بغیر کسی شک و ریب کے یہ کہنا حق ہے کہ یہ عقیدہ تثلیث صنم پرستانہ عقائد کے امتزاج کا نتیجہ ہے۔

لائق توجہ بات یہ بات کبھی فراموش نہیں ہونی چاہیئے کہ ادیانِ ملل سابقہ کے مسخ و تحریف میں تحریف کرنے والوں کو اس سے بہت زیادہ مدد ملی کہ بنیادی عقائد میں صراحت اور وضاحت کی جگہ وقت کے معبروں، مفسروں اور ترجمانوں نے کنایات، استعارات اور تشبیہات سے بہت زیادہ کام لیا۔ اِن تعبیرات کا نتیجہ یہ نکلا کہ جب اِن مذاہبِ حق کا صنم پرستوں اور فلسفیوں سے واسطہ پڑا اور انہوں نے کسی نہ کسی طرح اس دینِ حق کو قبول کر لیا تو اپنے فلسفیانہ اور مشرکانہ افکار و خیالات کے لئے اِن ہی استعارات اور تشبیہات کو پشت پناہ بنایا اور آہستہ آہستہ ملتِ حقیقی کی شکل و صورت بدل کر اس کو معجونِ مرکب بنا ڈالا، اسی حقیقت کے پیشِ نظر قرآنِ عزیز نے وجود باری، توحید، رسالت، الہامی کتب، ملائکۃ اللہ، غرض بنیادی عقائد میں ذو معنی الفاظ، پیچ پیچ تشبیہات اور توحید میں خلل انداز استعارات و کنایات کی بجائے واضح صریح اور غیر مبہم اطلاقات کو اختیار کیا ہے

[1] باب ۵ آیت ۹ [2] باب ۸ آیت ۴۰، ۴۱

تاکہ کسی ملحد، زندیق اور مشرک فلسفی کو توحیدِ خالص میں شرک اور اوہام وظنون کی نکتہ آفرینیوں کا موقعہ ہاتھ نہ آنے پائے اور اگر کوئی شخص اس کے باوجود بھی بے جا جسارت کرے تو خود قرآنِ عزیز کی نصوصِ صریحہ ہی اُسکے الحاد کو پاش پاش کر دیں۔

کفارہ | موجودہ مسیحیت کا دوسرا عقیدہ جس نے دینِ مسیحیت کی حقیقت کو برباد کر ڈالا "کفارہ" کا عقیدہ ہے اس کی بنیاد اس تخیل پر قائم ہے کہ تمام کائنات "جس میں نکوکار اور انبیاء و رسل سب ہی شامل ہیں" ابتدار آفرینش سے ہی گنہگار رہی آخر رحمتِ الٰہی کو جوش آیا اور اُس کی مشیت نے ارادہ کیا کہ بیٹے کو کائنات ارضی میں بھیجے اور وہ مصلوب ہو کر اول و آخر تمام کائنات کے گناہوں کا کفارہ ہو جائے اور اس طرح دُنیا کو نجات اور مُکتی حاصل ہو سکے لیکن اِس عقیدے کے قوام بنانے کے لئے چند ضروری اجزاء کی ضرورت تھی جن کے بغیر یہ عمارت کھڑی نہیں کی جا سکتی تھی اس لئے عہدِ رسول میں سب سے پہلے مسیحیت نے یہودیت کے اس عقیدے کو تسلیم کر لیا کہ اُن کو صلیب پر بھی چڑھایا گیا اور مار بھی ڈالا گیا اور اس کو شرفِ قبولیت دینے کے بعد دوسرا قدم یہ اُٹھایا کہ "الوہیت" کے باوجود مسیح کا صلیب پانا اور قتل ہونا اپنے لئے نہیں بلکہ کائنات کی نجات کے لئے تھا۔ چنانچہ جب اُس پر یہ حادثہ گذر لیا تو اُس نے پھر الوہیت کی چادر اوڑھ لی اور عالمِ لاہوت میں باپ اور بیٹے کے درمیان دوبارہ لاہوتی رشتہ قائم ہو گیا۔

پس جس مذہب میں خدائے برتر کے ساتھ صحتِ عقیدہ اور نیک عملی عفو دہ کر نجات کا دار و مدار عمل و کردار کی بجائے "کفارہ" پر قائم ہو جائے اُس کا حشر معلوم؟

قرآن نے اسی لئے جگہ جگہ یہ واضح کیا ہے کہ نجات کے لئے عقیدہ کی صحت یعنی صحیح خدا بینی اور نیک عملی کے ماسوا کوئی دوسری راہ نہیں ہے اور جو شخص بھی اِس

"راہ مستقیم" کو ترک کر کے خوش عقیدگی اور اوہام و ظنون کو اسوہ بنائے گا اور نیک عملی اور صحیح خدا پرستی پر گامزن نہ ہوگا بلاشبہ گمراہ ہے اور راہ مستقیم سے یکسر محروم

اِنَّ الذین آمنوا والذین ھادوا	جو لوگ اپنے کو مومن کہتے ہیں اور جو یہودی ہیں اور جو
النصٰری والصابئین من آمن	نصارٰی ہیں اور جو صابی ہیں اُن میں سے جو بھی
باللہ والیوم الاخر وعمل صالحًا	اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان لے آیا اور اُس نے
فلھم اجرھم عند ربھم ولا خوف	نیک عمل کئے تو یہی وہ شخص ہیں جن کا اجر اُن کے پروردگار کے پاس
علیھم ولا ھم یحزنون (بقرہ)	ہے نہ اُن پر خوف طاری ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

یعنی قرآن کی دعوت اصلاح ادیان و ملل کا مقصد یہ نہیں ہے کہ یہودی نصرانی صابی گروہوں کی طرح ایک نیا گروہ مومنوں کے نام سے اس طرح اضافہ کر دے کہ گویا وہ بھی ایک قومی نسلی یا ملکی گروہ بندی ہے کہ خواہ اس کی خدا پرستانہ زندگی اور عملی زندگی کتنی ہی غلط اور برباد ہو یا سرے سے مفقود ہو مگر اس گروہ بندی کا فرد ہونے کی وجہ سے ضرور کامیاب اور خدا کی جنت و رضا کا مستحق ہے، قرآن کا مقصد ہرگز یہ نہیں ہے بلکہ وہ یہ اعلان کرنے آیا ہے کہ اس کی دعوتِ حق سے پہلے کوئی شخص کسی بھی گروہ اور مذہبی جماعت سے تعلق رکھتا ہو اگر اُس نے قرآن کی تعلیم حق کے مطابق خدا پرستی اور نیک عملی کو اختیار کر لیا ہے تو بلاشبہ وہ نجات یافتہ اور کامیاب ہے ورنہ تو وہ اگر مسلمان گھر میں پیدا ہوا پلا اور بڑھا اور اسی سوسائٹی میں زندگی گذار کر مر گیا مگر قرآن کی دعوت حق کے مطابق خدا پرستی اور نیک عملی دونوں سے محروم رہا یا مخالف تو اس کے لیے نہ کامیابی ہے اور نہ فوز و فلاح ۔ باقی رہا مسیحیت کفارہ کا خصوصی مسئلہ تو قرآن نے اس کے ابطال اور اس کی تردید کے لیے یہ راہ اختیار کی کہ جن بنیادوں پر اس کو قائم کیا گیا تھا اُنکی ہی جڑ کاٹ دی چنانچہ گذشتہ سطور میں صلیب اور قتل مسیح کے انکار اور رفع الی السماء کے اثبات کے مباحث میں اس پر کافی روشنی پڑ چکی ہے۔

(حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم)

محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اور قرآن۔ بشارات النبی (صلی اللہ علیہ وسلم)۔ صبح سعادت۔ تاریخ ولادت کی تحقیق۔ نسب مبارک۔ یتیمی۔ بت پرستی سے نفرت۔ خلوت پسندی اور عبادت الٰہی کا ذوق۔ حقیقت وحی۔ حسب وحی کی معرفت کی وجدانی دلیل۔ بعثت۔ حدیث بخاری۔ بشریت اور نبوت کا باہمی تعلق۔ نبی اور مصلح۔ کیفیت وحی اور بعض مستشرقین کی گمراہی۔ نزول وحی کا پہلا دور۔ نزول وحی کا دوسرا دور۔ دعوت ارشاد کی پہلی منزل۔ دعوت ارشاد کی دوسری منزل۔ دعوت ارشاد کی تیسری منزل (بعثت عامہ)۔ دعوت اسلام کا مجمل خاکہ۔ قرآن اور تجدید دعوت۔ توحید۔ رسالت۔ یوم آخرت۔ اسریٰ (معراج)۔ ہجرت۔ غزوات۔ غزوہ بدر۔ غزوہ احد۔ غزوہ خندق یا احزاب۔ واقعہ حدیبیہ۔ معاہدہ صلح۔ فتح مکہ و الفتح الاعظم۔ حاطب بن بلتعہ کا واقعہ۔ بت شکنی۔ خطبہ۔ غزوہ حنین۔ غزوہ تبوک اور قبول توبہ کا عجیب واقعہ۔ غزوات اور نتائج و لطفیات قرآنی۔ حرانی داستان۔ بنو نضیر۔ بنو نضیر۔ بصیرت۔ واقعہ افک۔ موعظت۔ نماز فاسق۔ موعظت۔ مسجد ضرار۔ وفات یا وصل بالرفیق الاعلیٰ۔ عبرت و موعظت

محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن

قرآن کلام الٰہی ہے اور خاتم الانبیاء محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس کے مہبط ہیں وہ اُن پر نازل ہوا ہے قرآن علم و یقین کی روشنی ہے اور ذات اقدس اُس کا عملی نمونہ اسوہ اور نقشہ ہیں "لقد کان لکم فی رسول اللہ اُسوۃ حسنۃ" قرآن رشد و ہدایت ہے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم راشد و ہادی، قرآن حق و صداقت کے لئے دعوت و پیغام ہے

اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس کے داعی اور پیغامبر، اس لیے قرآن کا ہر ایک جملہ اور اُس کی ہر ایک آیت کسی نہ کسی حیثیت میں ذات قدسی صفات سے تعلق رکھتی ہے تو اب کس طرح یہ کہا جائے کہ قرآن میں اتنی جگہ اُس مقدس ہستی کا ذکر ہے۔

ایک مرتبہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے چند صحابہ رضی اللہ عنہم، نے عرض کیا کہ آپ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے کچھ حالات زندگی ہم کو سنائیں صدیقہ عائشہ نے نگاہِ تعجب سے دریافت کیا۔ کیا تم قرآن نہیں پڑھتے جو مجھ سے خلق نبی کے متعلق سوال کرتے ہو فان خلقہ کان القرآن آپ کی تمام اخلاقی زندگی قرآن کے سانچہ میں ڈھلی ہوئی تھی قرآن جو کچھ کہتا ہے محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی کو کر دکھایا، پس قرآن کے کسی حصہ کو سامنے لانا گویا حیاتِ طیبہ کا پیش نظر آنا ہے۔

البتہ قرآن عزیز نے جن آیات میں آپ کے اسمائے گرامی یا اوصاف عالی کا خصوصیت کے ساتھ ذکر کیا "یا ایھا النبی" اور "یا ایھا الرسول" کہہ کر خطاب کیا اسکی تفصیل مسطورہ ذیل نقشہ سے ظاہر ہوتی ہے۔ اس نقشہ میں نبی اور رسول کے علاوہ جن اسماء اور اوصاف کی تفصیل مسطور ہے وہ یہ ہیں۔

(۱) محمد	(۲) احمد	(۳) عبداللہ	(۴) شاہد	(۵) بشیر
(۶) نذیر	(۷) مبشر	(۸) مذکر	(۹) عزیز	(۱۰) رؤف
(۱۱) رحیم	(۱۲) امین	(۱۳) مزمل	(۱۴) مدثر	(۱۵) منذر
(۱۶) ہادی	(۱۷) یٰسین	(۱۸) رحمۃ	(۱۹) نعمۃ	(۲۰) طٰہٰ
(۲۱) نور	(۲۲) حق	(۲۳) سراج منیر	(۲۴) شہید	(۲۵) داعی الی اللہ
(۲۶) خاتم النبیین	(۲۷) نبی	(۲۸) رسول	(۲۹) عبدہٗ	

نقشہ

نام یا صفت	سورۃ	آیات	نام یا صفت	سورۃ	آیات
(۱) رسول	آل عمران	۱۴۴	(۷) نذیر	ہود	۲
	احزاب	۴۰		سبا	۲۸
	محمد	۱		فاطر	۲۴
	الفتح	۲۹		بقرہ	۱۱۹
				عنکبوت	۵۰
(۲) احمد	صف	۶		نساء	۱۹
	حدید	۹		اعراف	۱۸۸
(۳) عبداللہ	جن	۱۹		ہود	۲
	کہف	۱		حجر	۸۹
(۴) شاہد	الفتح	۹		فاطر	۲۳-۲۴-۳۷ ۴۲-۴۶
	احزاب	۴۶		الفتح	۹
	مزمل	۱۵		الذاریات	۵۰-۵۱
(۵) مبشر	احزاب	۴۶		ملک	۸-۹-۱۷-۲۶
	الفتح	۹		فرقان	۵۶
	فرقان	۵۶		بقرہ	۱۱۹
(۶) بشیر	نساء	۱۹		سبا ص	۲۸-۴۶ ۷
	اعراف	۱۸۸		احقاف	۵

نام یا صفت	سورۃ	آیات	نام یا صفت	سورۃ	آیات
(۸) مُذکر	الغاشیہ	۲۱	(۲۵) خاتم النبیین	احزاب	۴۰
(۹) سراج منیر	فاطر	۴۶	(۲۶) نبی	آل عمران	۶۱
(۱۰) داعی الی اللہ	فاطر	۴۶		اعراف	۱۵۷-۱۵۶
(۱۱) حق	یونس	۱۰۸		مائدہ	۸۱
(۱۲) عزیز	توبہ	۱۲۸		انفال	۷۰-۶۷-۶۵-۶۴
(۱۳) رؤف	توبہ	۱۲۸		براۃ	۱۱۳-۷۳-۶۱
(۱۴) رحیم	توبہ	۱۲۸		حجرات	۲
(۱۵) امین	دخان	۱۹		احزاب	۴۰-۳۸-۳۲-۲۸-۱
(۱۶) نور	مائدہ	۱۵		فاطر	۵۲-۵۰
(۱۷) نعمۃ	بقرہ	۲۳۱		تحریم	۹-۸-۳-۱
(۱۸) هادی	نمل	۸۱		طلاق	۱
	روم	۵۳		ممتحنہ	۱۲
(۱۹) رحمۃ	انبیاء	۱۱۷	(۲۷) رسول	بقرہ	۲۰۵-۱۲۲
(۲۰) طٰہٰ	طٰہٰ	۱		آل عمران	۱۰۱-۸۶-۸۱-۲۳
					۱۷۲-۱۵۳-۱۴۴
					۱۸۳-۱۷۹
(۲۱) یٰسٓ	یٰسٓ	۱			
(۲۲) مزمل	مزمل	۱		نساء	۶۴-۶۱-۵۲-۱۴
					۱۰۰-۸۰-۷۹-۴۹
					۱۷۰-۱۳۶-۱۱۵
(۲۳) مدثر	مدثر	۱		مائدہ	۵۶-۵۵-۴۱-۳۲-۱۵
					۱۲۰-۹۹-۹۲-۸۲-۷۶
(۲۴) منذر	نمل	۹۲		اعراف	۱۵۸-۱۵۷

نام یا صفت	سورۃ	آیات	نام یا صفت	سورۃ	آیات
رسول	انفال	۱-۱۲-۲۴	رسول	منفقون	۱-۷-۸
	توبہ	۱-۲-۷-۱۶-۲۴-۲۶-۲۹-۳۳-۵۴-۵۹-۶۳-۶۵-۸۰-۸۱-۸۴-۸۶-۸۸-۹۱-۹۴-۹۷-۹۹-۱۰۵-۱۰۷،۱۲۸		تغابن	۸-۱۲
				فرقان	۷-۲۷-۳۰-۴۱
				طلاق	۱۱
	نحل	۱۱۳		جمعہ	۲
	اسراء	۹۳		صف	۹-۱۱-۶۶
	حج	۷۸		حشر	۴-۶-۷-۸
	مومن	۷۸		ممتحنہ	۱
	زخرف	۲۹		جن	۲۲-۲۸
	عنکبوت	۱۸		الحاقہ	۴۲
	حجرات	۱-۳-۸-۱۴-۱۵		نور	۴۷-۴۸-۵۱-۵۲-۵۴-۵۶-۶۲-۶۳
	الفتح	۹-۱۲-۱۳-۱۷-۲۶-۲۷-۲۸-۲۹-	(۲۸) نبی	بقرہ	۱۴۳
	احزاب	۶-۲۱-۲۹-۳۱-۳۳-۳۶-۴۰-		نساء	۴۱
	فاطر	۵۲-۵۷-۷۱		نحل	۸۹
	دخان	۱۴-۱۹		حج	۷۸
	حدید	۷-۸-۲۹	(۲۹) عبداللہ	الفرقان	۱
	مجادلہ	۵-۸-۹-۱۲-۱۳-۲۰-۲۲-		اسراء	۱
	محمد	۲۲-۳۳			

قرآنِ عزیز اور صحیح احادیث میں نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کے جن اسمار و صفات کا ذکر ہے علمار اسلام نے اُس پر مستقل تصانیف کی ہیں اور ابن دحیہؒ پہلے بزرگ ہیں جنھوں نے اس پر قلم اُٹھایا۔ ان کے علاوہ ابن کثیر، بیہقی، ابن عساکر (رحمہم اللہ) جیسے محدثین نے اُن تمام احادیث و آثار کو یکجا جمع کر دیا ہے جن میں آپ کے اسمائے صفات اور القاب مذکور ہیں مشہور محدث ابو بکر بن عربی نے شرح ترمذی میں اُن کی شمار چونسٹھ کرائی ہے بعض نے ننانوے بعض نے تین سو اور بعض اہل علم نے ان کو ایک ہزار تک پہنچایا ہے۔ مگر یہ کثرت تعداد اس لیے صحیح نہیں ہے کہ اس شمار میں اُن تمام انتسابات کو بھی شامل کر لیا گیا ہے جو کسی مناسبت حال سے آپ کی جانب منسوب ہیں اگرچہ بحیثیت اسمار صفات یا القاب کے اُن کا اطلاق ذاتِ اقدس پر صحیح نہیں ہو سکتا مثلاً آپ نے انبیار علیہ السلام اور اپنے درمیان صفتِ نبوت کے تعلق کو ظاہر اور ختم نبوت کو واضح کرنے کے لیے خود کو قصر نبوت کی آخری لَبِنہ (اینٹ) فرمایا ہے تو جن بزرگوں کو آپ کے اسمار وصفات کی کثرت سے شغف تھا انھوں نے صفات النبی میں "اللَبِنة" کو بھی شمار کر لیا[1]

بخاری کی ایک مرفوع حدیث میں ہے کہ آپ نے ارشاد فرمایا "میرے پانچ[2] نام ہیں۔ محمد[1] ہوں۔ احمد[2] ہوں۔ ماحی[3] ہوں یعنی کفر و شرک کو مٹانے والا ہوں حاشر[4] ہوں، اس لئے کہ قیامت کے دن تمام کائنات سے پہلے میں حضرتِ حق کی درگاہ میں حاضر ہوں گا اور عاقب[5] ہوں (بعول زہری آخری پیغمبر ہوں) حافظ ابن حجر عسقلانیؒ فرماتے ہیں پانچ کا یہ عدد حصر کے لئے نہیں ہے بلکہ اس جگہ اُن اسمار وصفات کا ذکر ہے جو کتب سابقہ اور امم و اقوام ماضیہ میں آپ سے متعلق مشہور و معروف اور بشارات و

---

[1] فتح الباری ج ۶ ص ۴۳۵ [2] ایضاً ج ۶ ص ۴۳۶۔

پیشین گوئیوں میں مسطور تھے۔ ابن حجرؒ یہ بھی فرماتے ہیں کہ باتفاق علماء اسلام قرآن میں آپ کے جو اسماء و صفات مذکور ہیں وہ یہ ہیں۔

الشاہد، المبشر، النذیر المبین، الداعی الی اللہ۔ السراج المنیر، المذکر، الرحمۃ النعمۃ، الہادی، الشہید، الامین، المزمل، المدثر لیکن ہماری فہرست کے مقابلہ میں یہ فہرست ناقص ہے، جن اسماء و صفات کا ذکر نقشہ میں ہے وہ بھی جمہور کے نزدیک مسلّم ہیں۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ احادیث میں مذکورہ اسماء و صفات میں سے حسب ذیل صفات بہت مشہور و معروف ہیں۔

المتوکل، المختار، المصطفیٰ، الشفیع المشفع، الصادق المصدوق۔

بہرحال محمد اور احمد (صلی اللہ علیہ وسلم) دو اسماء اعلام (نام) ہیں اور باقی اسماء صفات و القاب ہیں اور قرآن میں آپ کے نام پاک کے انتساب سے ایک سورۃ کا نام سورہ محمد ہے جس کے شروع میں ہی آپ کا اسم گرامی مذکور ہے "وامنوا بما نزل علی محمد وھو الحق من ربھم" اور صرف ایک جگہ سورۂ صف میں احمد منقول ہے یعنی حضرت مسیح (علیہ السلام) کی اس بشارت کے تذکرہ میں یہ نام آیا ہے جو آپ کی آمد سے متعلق انہوں نے بنی اسرائیل کو سنائی تھی "ومبشراً برسول یاتی من بعدی اسمہ احمد"

یہ حقیقت بھی قابل فراموش نہیں ہے کہ آپ کے اسماء و صفات محض رسمی نہیں ہیں کہ والدین نے جو چاہا نام رکھدیا اور احباب و اصحاب نے جس صفت و لقب سے جی چاہا پکار لیا بلکہ ان اسماء صفات کا آپ کی زندگی اور آپ کے اخلاق و اعمال کے ساتھ بہت گہرا تعلق ہے جیسا کہ ابھی ماحی، حاشر اور عاقب کے متعلق خود زبان وحی ترجمان سے سن چکے ہو یا مثلاً محمد اس ہستی کو کہتے ہیں جس کے تذکرے ہمیشہ خوبی اور نیک گوئی کے ساتھ ہوتے

ہوں یہ انبیاء سابقین (علیہم السلام) کی بشارات اور مستقبل میں تذکرہائے حیات کی جانب اشارہ ہے اور احمد اس ذات پر اطلاق ہوتا ہے جو سب سے زیادہ حمدِ الٰہی کے لیے نغمہ سنج ہو، یہ ذاتِ اقدس کی عبدیت کاملہ اور انسان کامل ہونے کو ظاہر کرتا ہے بلا شبہ آپ خدا پرست انسانوں کے لئے مبشر و بشیر اور فتنہ جو مفسدوں، کافروں اور مشرکوں کے لیے منذر و نذیر ہیں، روزِ قیامت، صادق و کاذب دونوں پر شاہد و شہید ہیں، چشم حق بیں اور گوش حق نیوش کے لیے مذکر (ناصح) ہیں، راہِ حق سے بھٹکے ہوؤں کے لئے ہادی اور خدا سے بھاگے ہوؤں کے لئے داعی ہیں، اُن کا وجود رحمت ہے کائناتِ عالم کے لئے اور اُن کی ہستی نظامِ کائنات کے لیے نعمت ہے جہل و شرک کے لئے نور ہیں اور پیغامِ الٰہی کے لئے نبی و رسول، مصائب و آلام میں عزیز ہیں اور نوعِ انسان کے ہر ایک گوشۂ حیات کے لئے رؤف و رحیم، اُن کی صدا، صدائے حق ہے اور اُن کی ذات الصادق الامین، قرآن خدا کا آخری پیغام ہے اس لیے وہ خاتم النبیین ہیں اُن کی بعثت عالمگیر ہے اس لئے طہٰ و یٰس ہیں اور آسمانِ نبوت کے سراج منیر ہیں اور کائناتِ رسالت کے بشیر و نذیر، عالم ادیان و ملل کی سلطانی کے باوجود کملی پوش ہیں اس لئے مزمل ہیں اور مدثر اور ربشر با نہم حسن کمال "انما انا بشر" اور لما قَامَ عبدُ اللّٰہ کے مصداق ہیں اللّٰھم صلّ و سلّم و بارک علیہ۔

خدا پر توکل اس کا شعار ہے اس سے متوکل اس کا وصفِ عالی وقار ہے اور وہ خدائے برحق کا برگزیدہ مختار ہے بارگاہ الٰہی میں ابرار و مقربین سے بھی زیادہ مصطفیٰ، مجتبیٰ، نکوکار و صالحین کے لئے الشفیع المشفع اور ہر ایک شعبۂ حیات میں الصادق المصدوق ہے صلی اللہ علیہ وسلم۔

ہم جانتے ہیں کہ اظہار مقصد کے لئے یہ اشارات کافی نہیں ہیں بلکہ اپنے معنوی مناسبات کے لحاظ سے ہر ایک وصف و نام قرآن سے شہادت کا طالب ہے اور قرآن کی شہادت بلاشبہ ہر ایک گوشہ کی تفصیل کے لئے شاہد عدل لیکن افسوس کہ کتاب کا موجودہ ترتیبی نقشہ اس کا متحمل نہیں ہے اس لئے صرف آیات کے جو کنایات اور ارشادات پر ہی اکتفا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

بشارات النبی صلی اللہ علیہ وسلم

وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَآ اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّحِكْمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَلَتَنْصُرُنَّهٗ ۭ قَالَ ءَاَقْرَرْتُمْ وَاَخَذْتُمْ عَلٰي ذٰلِكُمْ اِصْرِيْ ۭ قَالُوْٓا اَقْرَرْنَا ۭ قَالَ فَاشْهَدُوْا وَاَنَا مَعَكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِيْنَ "

(آل عمران)

اور وہ وقت یاد کرو جب اللہ نے پیغمبروں سے عہد کیا کہ میں تم کو جو کچھ کتاب اور حکمت عطا کروں اور پھر تمہارے پاس وہ پیغمبر آئے جو ان کتابوں کی تصدیق کرتا ہو جو تمہارے پاس ہیں تم ضرور اس پر ایمان لانا اور ضرور اسکی مدد کرنا پھر اللہ نے فرمایا کیا تم اس عہد کا اقرار کرتے ہو اور اس کو میرا اہم عہد سمجھ کر قبول کرتے ہو تو انہوں نے کہا۔ بیشک ہم اقرار کرتے ہیں اللہ نے فرمایا۔ اب تم اس عہد پر گواہ رہو اور میں بھی تمہارے ساتھ گواہ بنتا ہوں۔

حضرت عبداللہ بن عباس، اور حضرت علی رضی اللہ عنہم، فرماتے ہیں کہ اس آیت "میثاق" میں اس عہد و میثاق کا تذکرہ ہے جو ازل میں تمام انبیاء و رسل (علیہم السلام) سے خاتم الانبیاء محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق لیا گیا، خطاب اگرچہ براہ راست انبیاء علیہم السلام سے ہے مگر مقصود و مراد میں اُن کی اُمتیں بھی شامل ہیں کیونکہ عمومی طور پر اُن ہی کے ذریعہ وفاء عہد کا مظاہرہ ہونے والا تھا۔

اس عہد و میثاق کو اس درجہ اہمیت کیوں حاصل ہے؟ یہ بات کچھ تمہید کی محتاج ہے
مادیات و روحانیت پر فاعلِ مختار ایک ہی ہستی ہے اور وہ خدا ہے مگر مادیات میں
خدائے برتر کے جاری قانونِ فطرت کا ہم شب و روز مشاہدہ کرتے رہتے ہیں اور وہ ہم کو
محسوس نظر آتا ہے اس کے برعکس عالم روحانیات حواس خمسہ سے بلند احساسات تعقل و
تفکر کا محتاج ہے یہاں وجدان و شعور جب عقل و فکر کو رہنما بناتے اور دونوں راہنما ریب
و شک اور اوہام و ظنون سے محفوظ "سلیم" بن کر رہنمائی کا حق ادا کرتے ہیں تو انسان
کے سامنے روزِ روشن کی طرح یہ حقیقت جھک اٹھتی ہے کہ خدائے واحد کی احدیت
و یکتائی عالم مادیات و روحانیت میں ایک ہی قسم کے قانون فطرت کو نافذ رکھتی ہے۔

اب ذرا دیدۂ عبرت کو وا کیجئے اور کائنات ہست و بود پر نظر ڈالیئے تو یہ حقیقت
ہر جگہ ابھری ہوئی ملیگی کہ ذاتِ واحد کے ماسوا یہاں کائنات کی ہر ایک شے کے لیے
دو ہی سرحدیں مقرر ہیں، آغاز و انجام اور درمیان کی تمام کڑیاں نشو و ارتقاء کے لیے
وقف ہیں ایک چیز شروع ہوتی، اور درمیانی دور میں ترقی پذیر رہتی اور پھر حدِ کمال کو
پہنچ کر اپنی ضرورت کو پورا کر دیتی ہے اس کو انجام اور شروع کو آغاز کہتے ہیں۔

روحانیات میں بھی یہی سلسلہ جاری ہے نسل انسانی کا جب آدم سے آغاز ہوا
تو مادی وجود کے ساتھ خدا کی معرفت یعنی خدا پرستی کی امانت کو بھی ساتھ لایا وہ اگر ایک
جانب نسل انسانی کے مادی باپ تھے تو دوسری جانب خدا کی بخشی ہوئی ہدایت و صداقت
کے لئے "نبی" اور "ایلچی" بھی تھے اور جب کہ خدا کی ہستی ایک اور اس کی بنیادی صداقت
و ہدایت کا پیغام بھی ایک ہی تو ضروری ہوا کہ نوع انسانی کی رشد و ہدایت اور خدا پرستی
کی بنیادی تعلیم کا سلسلہ بھی ایک ہی لڑی میں پرو دیا جائے اور آغاز سے انجام تک اس سلسلہ

کی تمام کڑیاں ایک دوسرے سے اس طرح وابستہ ہوں کہ اُن میں سے کسی ایک کی بھی تکذیب گویا پورے سلسلۂ روحانیت کی تکذیب کے مرادف ہو چنانچہ اسی حقیقت کو قرآن نے اس طرح ظاہر کیا ہے "لا نفرق بین احد من رسلہ" ہم ایمان و تصدیق میں خدا کے کسی ایک پیغمبر کے درمیان بھی تفریق جائز نہیں رکھتے" اور اسی کو زبانِ وحی ترجمان نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے نحن بنو علّات و دیننا واحد "ہم تمام انبیاء و رسل کی تعلیمات اصل و بنیاد میں اسی طرح ایک ہیں جیسا کہ علاتی بھائی کہ ان سب کا باپ ایک ہی ہے۔"

پھر اس سلسلہ روحانیت کی اگرچہ تمام کڑیاں ایک دوسرے سے وابستہ و پیوستہ ہیں مگر آغاز، دورِ نشو و نما اور دورِ کمال و انجام کے پیشِ نظر اسی طرح باہم فرقِ مراتب رکھتی ہیں جس کا مظاہرہ ہم کو عالم مادیات کے مختلف سلسلوں میں نظر آتا ہے اور جس کو ہم فطری (Natural) کہتے ہیں اور ان درجات و مراتب میں بھی درجہ کمال کو جس سے کہ انجام کی سرحد ملتی ہے سب سے زیادہ رفعت و بلندی حاصل ہوتی ہے کیونکہ وہی اس سلسلہ کا محور و مرکز (Centre) اور قطب رحیٰ (چکی کی کیلی) ہوتا اور روابستہ و پیوستہ کی منزلِ مقصود سمجھا جاتا ہے۔

چنانچہ کائنات کی ہر شے کی طرح خود عالمِ انسانی نے بھی اس ربع مسکون پر عہدِ طفولیت گذارا ہے اُس وقت دنیائے انسانی ایک چھوٹے سے کنبے کی طرح آباد تھی اور نسلِ انسانی کا باپ ہی رُوحانی طبیب بھی تھا لیکن جب سلسلہ بود و ماند آہستہ آہستہ خاندانوں برادریوں، قبیلوں سے آگے بڑھ کر قوموں اور جغرافیائی نسلوں میں تقسیم ہونے لگا اور وحدت نے کثرت کی ہی شکل نہیں اختیار کر لی بلکہ کثرت میں بھی تنوع پیدا ہونے لگا تو ان مادی

نشو ونما اور ترقیوں کے ساتھ ساتھ روحانی رشد وہدایت نے بھی نقطۂ وحدت پر قائم رہتے ہوئے تنوع اور کثرت کی شکل اختیار کر لی یعنی ہر ایک قوم و ملک میں جدا جدا ہادی و رہنما اور پیغمبر مبعوث ہونے لگے بلکہ بعض حالات میں ایک قوم میں بیک وقت متعدد نبیوں نے دعوتِ حق میں ایک دوسرے کی اعانت کا فرض انجام دیا۔ اگرچہ اُن کی دعوتوں کی بنیاد سر تا سر ایک ہی "اصل و بنیاد" پر قائم تھی۔

كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَاحِدَةً فَبَعَثَ	ابتدا میں ایسا تھا کہ لوگ الگ الگ گروہوں میں
اللّٰهُ النَّبِيِّينَ مُبَشِّرِينَ وَمُنْذِرِينَ	بٹے ہوئے نہیں تھے۔ ایک ہی قوم و جماعت تھے پھر
وَأَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ	ایسا ہوا کہ باہم دگر مختلف ہو گئے اور الگ الگ ٹولیاں
بَيْنَ النَّاسِ فِيمَا اخْتَلَفُوا فِيهِ وَمَا	بن گئیں، پس اللہ نے یکے بعد دیگرے نبیوں کو
اخْتَلَفَ فِيهِ إِلَّا الَّذِينَ أُوتُوهُ	مبعوث کیا وہ (ایمان وعمل کی برکتوں کی) بشارت
مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَتْهُمُ الْبَيِّنَاتُ	دیتے اور (انکار و بدعملی کے نتائج سے) ڈراتے تھے
بَغْيًا بَيْنَهُمْ فَهَدَى اللّٰهُ الَّذِينَ	نیز اُن کے ساتھ کتاب الٰہی نازل کی گئی تاکہ جن
آمَنُوا لِمَا اخْتَلَفُوا فِيهِ مِنَ الْحَقِّ	باتوں میں لوگ اختلاف کرنے لگے تھے اُن میں
بِإِذْنِهِ وَاللّٰهُ يَهْدِي مَنْ يَشَاءُ	وہ فیصلہ کر دینے والی ہو اور تمام لوگوں کو راہِ
إِلَىٰ صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ	حق پر متحد کر دے، جو لوگ باہم دگر مختلف ہوئے
(البقرہ)	تو اس لئے نہیں ہوئے کہ ہدایت سے محروم اور

حقیقت سے بے خبر تھے نہیں وحی الٰہی کے واضح احکام ان کے سامنے تھے مگر پھر بھی محض آپس کی ضد اور مخالفت سے اختلاف کرنے لگے تھے بالآخر اللہ نے ایمان والوں کو دربری کی؛ وہ حقیقت دکھا دی جس میں لوگ مختلف ہو رہے تھے اور اللہ جسے چاہتا ہے دین کی سیدھی راہ دکھا دیتا ہے

وَمَا كَانَ النَّاسُ اِلَّا اُمَّةً وَّاحِدَةً	(اور ابتدا میں) انسانوں کی ایک ہی اُمت تھی پھر لوگ
فَاخْتَلَفُوْا وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ	الگ الگ ہوگئے اور اگر تمہارے پروردگار کی جانب سے
رَّبِّكَ لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ فِيْمَا فِيْهِ	پہلے سے ایک بات نہ ٹھہرا دی گئی ہوتی تو جن باتوں
يَخْتَلِفُوْنَ ۝ (یونس)	میں لوگ اختلاف کر رہے ہیں ان کا فیصلہ کبھی کا ہو چکا ہوتا۔

لیکن خدائے واحد کی جانب سے رشد و ہدایت کا یہ سلسلہ اگرچہ وقتی تقاضہ کے پیشِ نظر ہزاروں برس تک قوموں اور ملکوں میں تنوع اختیار کیے رہا۔ تاہم وہ اپنے مقصدِ وحدت کو فراموش نہ کر سکا اور بنیادی وحدت کے ساتھ اس عارضی کثرت کو بھی ایک ہی نقطۂ وحدت پر لانے کے۔ لیے اس وقت تک برابر حرکت کرتا رہا جب تک کہ اپنے مرکزِ وحدت اور مقصدِ کمال کو نہ پا سکا۔

یعنی خدا کی صداقت کا پیغام اگرچہ جدا جدا قوموں اور ملکوں میں نبیوں اور پیغمبروں کی زبانی پہنچایا جاتا رہا اور گو اُن تمام پیغامات میں فروعی اور وقتی تنوع سے قطع نظر اساسی اور بنیادی وحدت قائم رہی مگر خدا کی وحدانیت اور اس کے پیغام کی اساسی وحدت کا تقاضہ یہی تھا کہ یہ مختلف دعوتیں اور پیغامات سمٹ کر ایک ایسے نقطہ اور مرکز پر آجائیں کہ وہ تمام کائنات کے لیے بیک وقت اور رہتی دُنیا تک ایک ہی پیغام بن کر اپنی نمود دکھلائے اور ایک ایسا پیغمبر مبعوث ہو جس کی بعثت، بعثتِ عام ہو اور جس کی دعوت، عالمگیر دعوت ہو تاکہ پھر اس تنوع اور کثرت کی ضرورت باقی نہ رہے۔

عالمِ روحانیات کی اپنی "مثلِ اعلیٰ" یا اپنے محور و مرکز کی جانب یہ حرکت جب کہ عالمِ مادیات کے نشو و ارتقا کے متناسب حالات سے وابستہ تھی اور خالقِ کائنات کا قانونِ فطرت جب کہ دونوں سمتوں میں ایک ہی اصل پر کارفرما ہے تو یہ بھی از بس ضروری ہوا

کہ روحانیت کے کمال و ارتقاء کا یہ دور مادی عالم کے ایسے دور کے ساتھ رونما ہو کہ کائنات انسانی کے ارتقاء، دماغی و عقلی کی استعدادات اپنے رشد و کمال کے ایسے نقطہ پر پہنچ جائیں کہ حجاب مستقبل میں مستور تمام ترقیاں اسی ارتقاء کا نتیجہ کہلائیں اور گو اس سلسلہ میں ایک مدت کیوں نہ ہو جائے مگر کائناتِ ارضی کا یہ پورا مادی کارخانہ اسباب مادی کی بنا پر ایک کنبہ اور ایک خاندان بن کر رہ جائے اور ملکوں اور قوموں کی بہتات و کثرت کے باوجود کسی ایک گوشہ کے حرکت و سکون کے اثر سے تمام کائنات متاثر ہونے پر مجبور ہو جائے تاکہ اس وقت عالمِ روحانیات کا آخری نقطۂ ارتقاء کائناتِ انسانی کے عقل و دماغ کو اپنی دعوت کی یکتائی و وحدت سے متاثر کر سکے، اور دنیا دانستہ یا نادانستہ اسی کے بتلائے ہوئے سوسائٹی کے نظام کو آہستہ آہستہ اپنا کر عملاً خدا کا ایک کنبہ بن جائے اور مساواتِ عالم و اخوت ہمہ گیر کا مظاہرہ کر دکھائے اور نتیجہ یہ نکلے کہ دینِ حق صرف "تعلیم قرآن" ہی میں منحصر ہو کر رہ جائے۔[1]

تاریخ اقوام و ملل شاہد ہے کہ قرآن کی دعوت و اصلاح کی صدائے حق نے جب چھٹی صدی عیسوی میں دنیا کو پکارا ہے اس وقت دنیا کے تمام مذاہب و ادیان خود اصحابِ مذاہب کی تاریخی اقوال کے مطابق اپنی حقیقی روشنی کو یکسر فراموش کر چکے تھے اور دنیا کے ہر گوشے اور ہر سمت میں مذہب و دھرم اور نظامِ سوسائٹی تنگی و تاریکی اختیار کر چکا تھا اس وقت قرآن کی آواز پہلی آواز تھی جس نے دنیا کے مذاہب اور ان کی سوسائٹی کے ابتر نظام میں نیا انقلاب پیدا کر دیا اور اقوام و امم نے بہ عجلت یا بہ دیر، اعتراف و اقرار کے ساتھ یا جاحدانہ انکار کے ساتھ مذہب اور سوسائٹی دونوں میں اسی کی اصلاحات کو اپنایا اور قبول اصلاحات کے بغیر آنے والی دنیا میں اپنے وجود کو قائم نہ رکھ سکے۔

---

[1] اس سلسلہ کے حوالجات آئندہ تعلیم الاسلام اور مسئلہ خاتم النبیین کے مباحث میں ذکر ہوں گے۔

توحید کامل اور خالص خدا پرستی، نسل و خاندان یا کفارہ کی جگہ خدا پرستی اور نیک عملی پر مدار نجات، نسلی غرور و تفاخر کا انہدام، کاسٹ سسٹم کا خاتمہ، حقوق انسانیت میں تمام افراد انسانی کی مساوات، اخوتِ عام کی داغ بیل، رواجی غلامی کے خلاف اصلاح و انقلاب کی تشکیل، عورتوں کے لئے حقوق انسانیت میں مساوات کا اعلان اور حقوق صنفی میں امتیازی احکامات، انقلاب و اصلاح، وراثت، ازدواجی زندگی میں ظالمانہ رواج کا خاتمہ اور جدید مفید اصلاحات (خلع و طلاق وغیرہ)، زکوٰۃ کے وجوب، سود و قمار کی حرمت اور دوسری اصلاحات کے ذریعہ اقتصادی نظام میں بنیادی انقلاب، انفرادی اور اجتماعی ملکیت کی تسلیم اور دونوں کے مابین تحدید اعتدال کا اعلان، سیاسی اور ملکی نظام میں بادشاہت، شخصی اور پارٹی اقتدار کے خاتمہ کے ساتھ شوروی نظام کی تشکیل ایسے اہم اُمور ہیں کہ آج کی دنیا میں ہر ایک انصاف پسند عاقل کے نزدیک اُن کی صداقت و افادیت تسلیم ہے اور اگر یہ صحیح ہو تو بلاشبہ یورپ و ایشیا میں افریقہ و امریکہ میں سوسائٹی کے نظام اور مذہب و دھرم کی اصلاح کے نام سے جو صدائیں بھی اس تعلیم اور اعلانِ حق کے بعد اُٹھیں اگر بغیر کسی تعصب کے تاریخی انقلابات پر غور کیجیے گا تو اُن میں بالواسطہ یا بلا واسطہ اسی صدا کی بازگشت پائیں گے جو چھٹی صدی عیسوی میں فاران کی چوٹی سے بلند ہوئی اور جس نے وَمَا اَرسلنٰک الا رحمۃ للعٰلمین کو تاریخ عالم میں سچ کر دکھایا

تاریخی حقائق کی اس روشنی میں اب پھر ہم کو گزشتہ مضمون کی جانب واپس جانا چاہیئے کہ جبکہ مادی استعدادات نشوونما پا رہے تھے اور چند صدیوں بعد جو قوموں کے انقلابات و اصلاحات کے لئے چند برسوں سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتیں مادی اسباب

کی بدولت یہ سارا کارخانۂ عالم ایک کنبہ بن جانے والا تھا۔ اُس وقت از بس ضروری ہوا کہ "وحدت مذہب" کی روحانی صدا بلند ہو اور اس کی صدائے حق کسی خاص قوم اور ملک کی بجائے کائنات کے ہر گوشہ کے لئے یکساں حیثیت رکھے۔

پس منشائے تقدیرِ الٰہی یہ ہوا کہ ایسے پیغام اور پیغامبر کی نصرت و حمایت کے لئے ازل ہی میں انبیاء و رسل سے عہد میثاق لیا جائے اور اُن کو مطلع کیا جائے کہ جب وہ پیغامِ کامل اور آخری "صدائے حق" بلند ہو جس کا تعلق رہتی دنیا تک تمام کائناتِ ارضی کے ساتھ یکساں طور پر وابستہ ہے تو وہ اور اُن کی اُمتیں اس کو قبول کریں اور اس کی نصرت کریں کیونکہ کائناتِ روحانی کا یہی مرکزِ وحدت اور نقطۂ اجتماع ہے چنانچہ یہی وہ "عہدِ میثاق" ہے جس کو تمام اُمتوں نے اپنے اپنے دور میں اپنے پیغمبروں اور نبیوں کی معرفت "بشارات" کی شکل میں سُنا اور آج بھی دنیا کے تمام مذاہب و ادیان میں خواہ وہ امتدادِ زمانہ کی بنا پر شرک کی آلودگیوں سے قطعاً منحرف ہو چکے ہوں یا ان میں تحریف و صداقت کا امتزاج قریبی دور سے وابستہ ہو۔۔ اوتار یا نبی مرسل کی معرفت کے ساتھ ایک "منتظر ہستی" کا مشترک عقیدہ پایا جاتا ہے، یہود "مسیح" کے علاوہ بھی "ایلیا" یا وہ نبی کہہ کر اُس کی آمد کے منتظر ہیں، نصاریٰ بھی ہر قسم کی تحریف کے باوجود مسیح کے بعد فارقلیط (پیراکلیوطاس) بمعنی احمد یا "روح حق" یا "ناصر" وغیرہ صفات کے تعارف سے اُسی کے انتظار میں ہیں، مجوس آج تک ایک "نجات دہندہ" کا انتظار کر رہے ہیں اور ویدک دھرم (سناتن دھرم) ہندوؤں میں بھی ایک "اوتار" کا انتظار ہو رہا ہے ۔۔۔ اور آج عقلیت کے نام پر اس "ہستی منتظر" کے عقیدہ کو کتنا ہی مضحکہ خیز سمجھا جائے اور خود مذہبی افراد اپنے مذہب کے اس عقیدہ کو کیسا ہی غیر معقول کیوں

نہ ٹھہرائیں لیکن ان کے پاس اس کا جواب کچھ نہیں ہے کہ مذاہب و ادیان کے موجودہ
اختلافات و افتراقات کے باوجود چھوٹے سے ناستک گروہ کو چھوڑ کر ہزار ہا برس کائنات
انسانی میں اس عقیدہ کا کسی نہ کسی شکل میں مشترک عقیدہ بنا رہنا اس کے "حقیقت" ہونے
کی ناقابل انکار دلیل ہے البتہ یہ بات جدا ہے کہ جس طرح یہود نے از راہ حسد مسیح ہدایت
کے انتظار کے باوجود "حضرت عیسیٰ (علیہ السلام)" کو قبول نہ کیا اسی طرح مذاہب عالم کی
اقلیت کو چھوڑ کر جو کہ حلقہ بگوش اسلام ہوگئی ان کی اکثریت نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو قومی
و ملکی عصبیت اور گروہ بندی کی بندشوں کی وجہ سے تسلیم کرنے سے انکار کر دیا یا ان کی
دعوتِ حق کو عرب کے لئے محدود قرار دے کر خود کو اس سے علیحدہ کر لیا۔

بہرحال ہندوستان کا قدیم مذہب چونکہ حقیقت مذہب کو فراموش کر چکا اور
اس کی موجودہ شکل نے کسی طرح قدیم شکل و صورت کو بدل کر نیا رخ اختیار کر لیا اور
اس کی تاریخ خود اس کے اپنے پاس بھی نہیں ہے اور اب اس کی تمام بنیاد صرف آبائی
رسوم پر یا چند مخصوص فلسفیانہ عقائد پر قائم ہے اس لئے ہم نہیں کہہ سکتے کہ وہ "منتظر ہستی"
کے متعلق جو روایات رکھتے ہیں ان کی اصل حقیقت کیا تھی، اور یہی حال بدھ مت کا بھی ہے
اس لئے ہم ابوریحان بیرونی اور بعض دیگر مفسروں اور مورخوں کے ان بیانات سے قطع
نظر کرتے ہیں جو انہوں نے ہندوؤں کے عقیدہ "کلنکی اوتار" کے "شنبل" میں نزول کو محمد
صلی اللہ علیہ وسلم پر منطبق کرنے کی سعی کی ہے۔

اور یہاں صرف یہود و نصاریٰ پر نازل کتب سماویہ تورات، زبور اور انجیل
سے ہی ان بشارات کو پیش کر دینا مناسب سمجھتے ہیں جن میں تحریفات کے باوجود اب بھی اصل
کتاب کی چمک باقی ہے اور علماء یہود و نصاریٰ کے پاس اس انطباق کے انکار

کی موجہ دلیل موجود نہیں ہو، چنانچہ حضرت مولانا رحمت اللہ (نور اللہ مرقدہ) کی میزان الحق اور حافظ ابن قیم کی ہدایۃ الحیاری اور باجہ جی زادہ کی الفاروق وغیرہ کتب سے اور اُن مناظرات مطبوعہ سے ظاہر ہوتا ہے جو علماء نصاریٰ اور علماء اسلام کے درمیان اُن بشارات سے متعلق پیش آئے ہیں اور جن کے متعلق بعض علماء نصاریٰ کو اقرار و اعتراف کے ماسوا کوئی چارہ کار نظر نہیں آتا۔

تورات اور بشارات	تورات کتاب استثناء میں ہے۔

خداوند تیرا خدا تیرے لیے تیرے ہی درمیان سے تیرے ہی بھائیوں میں سے تیری مانند ایک نبی برپا کرے گا، تم اُس کی طرف کان دھریو، اُس سب کی مانند جو تُونے خداوند اپنے خدا سے حوریب میں مجمع کے دن مانگا اور کہا کہ ایسا نہ ہو کہ میں خداوند اپنے خدا کی پھر سنوں اور ایسی شدت کی آگ پھر دیکھوں تاکہیں مر نہ جاؤں اور خداوند نے مجھ کو کہا کہ انہوں نے (بنی اسرائیل) نے جو کچھ کہا سو اچھا کیا۔ میں ان کے لئے اُن کے بھائیوں میں سے تجھ سا ایک نبی برپا کرونگا اور اپنا کلام اُس کے مُنہ میں ڈالوں گا اور جو کچھ میں اُسے فرماؤں گا وہ سب اُن سے کہیگا۔ اور ایسا ہوگا کہ جو کوئی میری باتوں کو کہ جنہیں وہ میرا نام لے کر کہے گا نہ سنے گا تو میں اُس کا حساب اُس سے لوں گا۔ لیکن وہ بھی اگر ایسی گستاخی کرے کہ کوئی بات میرے نام سے کہے جس کے کہنے کا میں نے اُسے حکم نہیں دیا اور معبودوں کے نام سے کہے تو وہ نبی قتل کیا جائے[1]

نشان زدہ جملوں کو غور سے پڑھیے اور پھر ہر ایک جملہ کی حقیقت کو تاریخی روشنی میں دیکھیے تو تاریخ کا بے لاگ فیصلہ ایک اور صرف ایک ہی ہوگا اور وہ یہ کہ اس بشارت کا مصداق ذاتِ اقدس محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ماسوا دوسری کوئی ہستی نہیں ہے۔

---

[1] باب ۱۸، آیت ۲۱-۱۵

بشارت کا پہلا جملہ یہ ہے" میں اُن کے بھائیوں میں سے تجھ سا ایک نبی برپا کردں گا"
تاریخ کہتی ہے کہ بنی اسرائیل کے بھائیوں میں بنی اسمٰعیل کے علاوہ دوسرا کوئی نہیں جو
اس کا مصداق بن سکے اور بنی اسمٰعیل میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ماسوا کوئی نبی ہی نہیں
ہوا جو موسیٰ کی مانند کہلایا جاسکے اور دوسرا جملہ ہے" میں اپنا کلام اُس کے منہ میں ڈالوں
گا اور جو کچھ میں اُس سے فرماؤں گا وہ سب اُن سے کہے گا" اس جملہ کو ایک بار پھر غور سے
پڑھیے اور اس کے بعد قرآن کی اُن آیات کا مطالعہ کیجیے جن میں بعینہٖ یہی صفات نبی اکرم صلی
اللہ علیہ وسلم کے لیے مذکور ہیں۔

وَمَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ (النجم)

وہ (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) اپنی خواہش سے کچھ نہیں کہتے وہ جو کچھ بھی کہتے ہیں خدا کی وحی سے کہتے ہیں جو ان پر وحی کی جاتی ہے

فَإِنَّمَا يَسَّرْنَاهُ بِلِسَانِكَ لِتُبَشِّرَ بِهِ الْمُتَّقِينَ وَتُنذِرَ بِهِ قَوْمًا لُّدًّا ۝ (مریم)

پس بے شبہ ہم نے اُس (قرآن) کو تیری زبان پر آسان کردیا تاکہ تو اُس کے ذریعہ متقیوں کو بشارت دے اور کج راہوں کو (عذاب الٰہی) سے ڈرائے۔

وَإِنَّهُ لَتَنزِيلُ رَبِّ الْعَالَمِينَ ۝ نَزَلَ بِهِ الرُّوحُ الْأَمِينُ ۝ عَلَىٰ قَلْبِكَ لِتَكُونَ مِنَ الْمُنذِرِينَ

اور یقیناً یہ جہانوں کے پروردگار کا اُتارا ہوا ہے اس کو روح الامین (جبرئیل) نے تیرے قلب پر اُتارا تاکہ تو گمراہوں کو اعمال بد کے نتائج سے) ڈرانے والوں میں سے ہو یہ صاف عربی زبان میں اور اس کا ذکر پہلی کتابوں میں موجود ہے

بشارت کے جملوں اور قرآن کی ان آیات کے اسلوب بیان کا مطالعہ کرنے کے
بعد کون انکار کرسکتا ہے کہ یہ دونوں کسی ایک ہی ہستی کی صفات کا ذکر ہے اب تیسرے
جملہ کو پڑھیے جو کوئی میری باتوں کو جنہیں وہ میرا نام لے کر کہے گا نہ سنے گا تو میں اُس کا

حساب اُس سے لونگا" اور ساتھ ہی اِن آیاتِ قرآن کا مطالعہ کیجیے۔

فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ بِشَهِيْدٍ وَّجِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ شَهِيْدًا ۝ يَوْمَئِذٍ يَّوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَعَصَوُا الرَّسُوْلَ لَوْ تُسَوّٰى بِهِمُ الْاَرْضُ وَلَا يَكْتُمُوْنَ اللّٰهَ حَدِيْثًا ۝

(النسا)

اور پھر (اے پیغمبر!) کیا حال ہوگا اُس دن (قیامت کے دن) جب کہ ہم ہر ایک اُمت میں سے اُن پر ایک گواہ طلب کریں گے اور ہم تم کو اُن سب پر گواہ بنائیں گے سو جن لوگوں نے کفر کی راہ اختیار کی اور الرسول (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کی نافرمانی کی وہ اس دن یہ پسند کریں گے کاش کہ (وہ دھنس جائیں) اور زمین اُن کے اوپر برابر ہو جائے اور اس دن یہ اللہ سے کوئی بات بھی پوشیدہ نہ رکھ سکیں گے۔

غور کیجیے کہ دونوں عبارتوں میں کس درجہ مطابقت ہے اور سب کے بعد اس فقرہ کو بامعان نظر دیکھیے "لیکن وہ نبی جو ایسی گستاخی کرے کہ کوئی بات میرے نام سے کہے جس کے کہنے کا میں نے حکم نہیں دیا اور معبودوں کے نام سے کہے تو وہ نبی قتل کیا جائے" اور پھر قرآن کی اس آیت کو بھی پڑھیے اور فرمایئے کہ کیا یہ دونوں مضامین ایک ہی حقیقت کے دو نقش نہیں ہیں؟

وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الْاَقَاوِيْلِ لَاَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِيْنِ ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِيْنَ ۝ فَمَا مِنْكُمْ مِّنْ اَحَدٍ عَنْهُ حَاجِزِيْنَ ۝ وَاِنَّهٗ لَتَذْكِرَةٌ لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝

(الحاقہ)

اور یہ پیغمبر بعض باتوں کو اپنی جانب سے گڑھ کر ہماری جانب منسوب کر دے تو بے شبہ ہم اُس کا داہنا ہاتھ پکڑ لیں اور پھر اُس کی گردن کی رگ کاٹ ڈالیں (قتل کر دیں) اور اُس وقت تم میں سے کوئی بھی اُس کو ہماری گرفت سے باز نہیں رکھ سکتا۔

توراۃ کی پیشگوئی اور آیاتِ قرآنی کے مسطورہ بالا تطابق کے بعد تحدی (یہ چیلنج)

ساتھ دعوی کیا جا سکتا ہے کہ بشارات میں ذکر کردہ مجموعۂ صفات کا مصداق ذات اقدس محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ماسوا دوسری کوئی ہستی تاریخی دنیا میں نہیں پائی جاتی یہ مجموعۂ صفات نہ حضرت مسیح (علیہ السلام) پر صادق آتے ہیں نہ حضرت داؤد و سلیمان (علیہما السلام) پر اور نہ حضرت زکریا و یحییٰ (علیہما السلام) پر اور نہ دوسرے انبیاء بنی اسرائیل پر صادق ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب علماء یہود سے اس کے متعلق دریافت کیا جاتا ہے تو وہ ایک "منتظر ہستی" کے مزید انتظار کے ماسوا دوسرا کوئی جواب نہیں رکھتے اور خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کا مصداق نہ سمجھنے میں بے دلیل انکار اور خموشی کے علاوہ ان کے پاس اور کچھ نہیں ہے۔ اسی طرح نصاریٰ بھی حضرت مسیح (علیہ السلام) کو اس بشارت کا مصداق ثابت کرنے میں مجموعۂ صفات کے پیش نظر عاجز و درماندہ نظر آتے اور صاف اور واضح باتوں کو دور از کار تاویلات کا جامہ پہنا کر اعتراف حقیقت سے گریز کرنا چاہتے ہیں۔

اور تورات استثناء میں حضرت موسیٰ کا ایک نغمہ باب ۳۱ میں مذکور ہے جو انہوں نے موت سے چند لمحات قبل بحکم الٰہی بنی اسرائیل کو سنایا۔ اس میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا کہ میدان تیہ میں اپنی قوم کو جمع کرو اور خدا کا یہ پیغام سناؤ کہ جب بنی اسرائیل خدا کے وعدے کے مطابق شہروں میں جا بسیں گے تو حکومت، تمول اور فارغ البالی میں بدمست ہو کر خدا کی نافرمانیوں میں مبتلا ہو جائیں گے حتیٰ کہ بت پرستی سے بھی باز نہیں رہیں گے پس جب ان کی حالت اس درجہ ابتر ہو جائے گی تو میں ان سے خفا ہو جاؤں گا اور ان سے اپنا منہ چھپا لوں گا اور اس کے بعد میری غیرت حق حرکت میں آئے گی اور میں بھی ان (بنی اسرائیل) کو ایک ایسی قوم کے ذریعہ خفا کروں گا اور ان سے اپنی نعمت (نبوت) چھین کر اس قوم کو بخش دوں گا جو ناپڑھ اور تمدن سے دور، بے عقل، خانہ بدوش ہو گی جس کو تم

ماحاشیہ بر صفحہ آئندہ

اور دُنیا کی قومیں "متمدن جماعت" نہ سمجھیں گی۔ اس کے بعد باب ۳۲ میں اس نغمہ کی تکمیل اِن الفاظ کے ساتھ کی گئی ہے۔

اور اُس خدا کو جس نے تجھے صورت بخشی بھول گیا۔ اور جب خداوند نے یہ دیکھا تو اُن سے (بنی اسرائیل سے) نفرت کی اِس لئے کہ اُن کے بیٹوں اور بیٹیوں نے اُسے غصہ دلایا۔ اور اس نے یہ فرمایا کہ میں اُن سے اپنا منہ چھپاؤں گا تاکہ میں دیکھوں کہ اُن کا انجام کیا ہوگا۔ اس لئے وہ کج نسل ہیں ایسے لڑکے کہ جن میں امانت نہیں۔ انہوں نے اس کے سبب سے جو کہ خدا نہیں ہے مجھے غیرت دلائی اور اپنی واہیات باتوں سے مجھے غصہ دلایا۔ سو میں بھی انہیں اُس سے جو گروہ نہیں غیرت میں ڈالوں گا اور ایک اَن پڑھ[1] قوم سے اُن کو خفا کر دوں گا۔[2]

تم اِس بشارت یا پیغمبرانہ پیشین گوئی کے لئے تاریخ ماضی پر نظر ڈالو اور دیکھو کہ بنی اسرائیل کی متمردانہ سرگرمیاں، باغیانہ اور سرکشانہ شر انگیزیاں جب حد سے زیادہ متجاوز ہوگئیں اور اُنہوں نے مسیح ہدایت جیسی جلیل القدر ہستی کو بھی رد کر دیا اور حضرت یحیٰی جیسے مقدس پیغمبر کو قتل کر ڈالا تو اُن کی جگہ خدا نے کس قوم کو پسند کیا، کس کو شرف رسالت سے نوازا اور کس نے ساری کائنات میں حیرت زا انقلاب بپا کر کے سچی خدا پرستی اور نیک عملی کا

---

[1] کتاب مقدس کے قدیم نسخوں میں "اَن پڑھ" کا لفظ تمام زبانوں میں موجود ہے مگر بعد کے ایڈیشنوں میں اس کی جگہ کہیں "بے عقل" اور کہیں اسی کے مرادف الفاظ پائے جاتے ہیں حاصل اگرچہ پھر بھی وہی رہتا ہے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ چونکہ قرآن میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی صفت امی اور آپ کی قوم کی "اُمیین" مذکور ہے جس کا لفظی ترجمہ اَن پڑھ قوم ہوتا ہے اس لئے محض اس لئے کہ پیشینگوئی کا یہ صاف تطابق باقی نہ رہے قدیم لفظ کو بدل کر اس قسم کے الفاظ رکھے گئے۔ مختلف ایڈیشنوں کی اس قسم کی لفظی تحریفات کے لئے میزان الحق کا مطالعہ ازبس ضروری ہے

[2] آیت ۱۸-۲۱

غلغلہ بلند کر دیا اور نبی اسرائیل نے کس کے عظمت وجلال کو دیکھ کر حاسدانہ اس کے رد کرنے کی سعی کی۔ کیا یہ عرب قوم نہیں تھی اور کیا یہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی مقدس ہستی اور اور ان کی قوم نہ تھی جس پیغمبر نے دنیوی وسائل و اسباب کی نظر میں "اُمی" ان پڑھ" ہونے کے باوجود متمدن قوموں کے ظالمانہ وجابرانہ تمدن کو فنا کے گھاٹ اتار کر اس عظیم الشان عادلانہ تمدن کی بنیاد ڈالی کہ ہر قسم کے اسباب و وسائل کے فقدان اور موانع کے باوجود جس کی عظمت وسرعت رفتار نے ماہرین فلسفۂ تاریخ کو یہ کہنے پر مجبور کر دیا کہ اسلام کی دعوت و اصلاح اور انقلاب دنیا، تاریخ کی مستثنیات میں سے ہے۔ یہی وہ اُمی اور گلہ بان قوم تھی جو ایک "اُمی" کی خدا پرستانہ تعلیمات سے تربیت پا کر چند ہی برسوں میں دنیا کی قوموں کی تربیت و اصلاح کے لئے "بہترین معلم" ثابت ہوئی اور اونٹوں اور بکریوں کے چرانے والے دیکھتے ہی دیکھتے انسانوں کے چرواہے" بن گئے اور بنی اسرائیل کی ہمہ قسم کی حاسدانہ اور معاندانہ جد وجہد اس کی راہ ترقی میں پرکاہ کی برابر بھی سنگِ راہ نہ بن سکی تو کیا تاریخ کے اِن اُبھرے ہوئے نقوش کے بعد بھی اس انکار کے لئے کوئی گنجائش رہ جاتی ہے کہ تورات کی اس پیشین گوئی کا مصداق محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور بنی اسمٰعیل (علیہ السلام) کے ماسوا کوئی اور ہستی ہے؟ نہیں ہرگز نہیں۔

یہی وہ صاف اور واضح حقیقت ہے جس کو قرآن نے اس طرح بیان کیا ہے۔

اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ يَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهٰىهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ	(بس میں اُن کے لئے رحمت لکھ دوں گا، جو الرسول (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کی پیروی کریں گے کہ وہ نبی اُمی ہوگا (یعنی دنیا کے سلسلۂ تعلیم وتعلم کے لحاظ سے ان پڑھ ہوگا اور اس کے ظہور کی خبر وہ اپنے یہاں تورات اور انجیل میں لکھی

الطَّيِّبَاتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبَائِثَ
وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي
كَانَتْ عَلَيْهِمْ فَالَّذِينَ آمَنُوا بِهِ وَعَزَّرُوهُ
وَنَصَرُوهُ وَاتَّبَعُوا النُّورَ الَّذِي أُنْزِلَ
مَعَهُ أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ قُلْ يَا
أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ
جَمِيعًا الَّذِي لَهُ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَ
الْأَرْضِ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ يُحْيِي وَيُمِيتُ
فَآمِنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ النَّبِيِّ الْأُمِّيِّ[لہ]
الَّذِي يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَكَلِمَاتِهِ وَاتَّبِعُوهُ
لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ ۝

پائیں گے وہ اُنہیں نیکی کا حکم دیگا، بُرائی سے روکیگا
پسندیدہ چیزیں حلال کرے گا گندی چیزیں حرام ٹھہرائیگا
اُس بوجھ سے نجات دے گا جس کے تلے وہ دبلے
ہوں گے اُن پھندوں سے نکالے گا جن میں گرفتار
ہوں گے تو جو لوگ اُن پر ایمان لائے اُس کے
مخالفوں کے لئے روک ہوئے (راہ حق میں) اُس کی
مدد کی اور اُس روشنی کے پیچھے ہوئے جو اس کے
ساتھ بھیجی گئی ہے (یعنی) قرآن سو وہی ہیں جو کامیابی
پانے والے ہیں (اے پیغمبر) تم لوگوں سے کہو۔ اے
افرادِ نسلِ انسانی میں تم سب کی طرف خدا کا بھیجا ہوا آیا
ہوں وہ خدا کہ آسمانوں کی اور زمینوں کی بادشاہت
اُسی کے لئے ہے، کوئی معبود نہیں مگر وہی ایک ذات وہی
جلاتا ہے وہی مارتا ہے پس اللہ پر ایمان لاؤ اور اُس کے رسول اور نبی امی پر کہ اللہ
اور اسکے کلمات (یعنی اُس کی تمام کتابوں) پر ایمان رکھتا ہے اُسکی پیروی کرو تاکہ کامیابی
کی راہ تم پر کھل جائے۔

لہ اُمّی، لفظ اُمّ کی جانب منسوب ہے جس کے معنی ماں کے ہیں اہل عرب یہ لفظ اس شخص کے لیے بولتے ہیں جس نے پڑھا لکھا نہ ہو
گویا وہ ماں کے پیٹ سے آج ہی پیدا ہوا ہے اہل عرب چونکہ عام طور سے اَن پڑھ تھے اس لیے "اُمیین" کہلائے اور پیغمبر
اسلام نے بھی چونکہ "وحی الہیٰ" کے ذریعہ تعلیم و تربیت کے علاوہ دنیا کے اسباب تعلیم و تعلم کے لحاظ سے کسی کے سامنے زانوائے
ادب تہ نہیں کیا اس لیے اُن کی صفت بھی اُمی رہی اسی لیے آپ نے خود بھی یہ ارشاد فرمایا ہے "نحن اُمۃ اُمّیۃ لا نکتب ولا نحسب"

اور تورات استثنار میں ہے۔

اور یہ وہ برکت ہے جو موسیٰ مردِ خدا نے اپنے مرنے سے آگے بنی اسرائیل کو بخشی اور اُس نے کہا کہ خداوند سینا سے آیا اور شعیر سے اُن پر طلوع ہوا، فاران ہی کے پہاڑ سے وہ جلوہ گر ہوا، دس ہزار قدسیوں کے ساتھ آیا اور اُس کے داہنے ہاتھ میں ایک آتشی شریعت اُن کے لئے تھی۔

موسیٰ (علیہ السلام) نے یہ بشارت بھی بنی اسرائیل کو اپنی موت سے قبل ایسی حالت میں سُنائی تھی کہ وہ موسیٰ (علیہ السلام) کی وداعی حالت کو دیکھ کر دل تنگ اور دل گیر ہو رہے تھے اور یہ سمجھ بیٹھے تھے کہ اب خداوند خدا موسیٰ جیسا کوئی پیغمبر مبعوث نہ کرے گا۔

سینا جو طور کے نام سے مشہور اور وادی سینا میں واقع ہے اور زبانِ حال سے شہادت دے رہا ہے کہ آگ کی جستجو کے بہانے موسیٰ کو یہیں خدا سے ہم کلامی کا شرف حاصل ہوا تھا اور "کلّم اللّٰہ موسیٰ تکلیمًا" کا مظاہرہ میرے ہی سینہ پر ہوتا رہا ہے اور شعیر (ساعیر یا سراۃ) اِس پہاڑی سلسلہ کا نام ہے جو عرب میں سب سے زیادہ طویل اور شام سے یمن تک شمالاً وجنوبًا پھیلا ہوا ہے اور القدس (یروشلم) کے سامنے ہو کر گذرتا ہے یہیں وہ جگہ ہے جو بیت اللحم کے نام سے آج بھی حضرت مسیح (علیہ السلام) کی ولادتِ مبارک کی گواہ اور بعثت مسیح کا مناد ہے اور فاران عبرانی (حجرہ) میں عرب کے اُس حصّہ کو کہتے ہیں جو حجاز کے نام سے مشہور ہے یہی مقام اُس وادی غیر ذی زرع (بن کھیتی کی سرزمین) کو اپنے آغوش میں لئے ہوئے ہے جس کو مکہ کہتے ہیں اور جو بہت مشہور و معروف ہے اور مقام ولادت و بعثت ہے خاتم الانبیا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا۔

اس تفصیل کے بعد پیشنگوئی کا مطلب واضح ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا خدائے برتر کی صداقت و ہدایت کا پیغام نور ہدایت بن کر سینا سے حضرت موسیٰ

کی شکل میں نمودار ہوا، اور سراۃ (شعیر) پر حضرت مسیح (علیہ السلام) کی صورت میں طلعت افروز ہوا اور فاران پر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا رُخ انور بن کر جلوہ گر ہوا۔

فراعنۂ مصر کی طویل و مدید غلامی سے، اس خانوادۂ نبوت (بنی اسرائیل) کے قلوب میں یاس و حرمان نے ایسی جگہ کر لی تھی کہ اب اُن کو وہم و گمان بھی نہ تھا کہ اس بنجر زمین پر خدا کی رحمت کی بارش ہوگی اور تو بر تو چھائے ہوئے تاریکی سے "نور ہدایت" اپنی نمود دکھلائے گا۔ اس لئے حضرت موسیٰ کی صدائے حق گویا نور ہدایت کی وہ نمود تھی جس نے صدیوں بعد پھر اُن کے گھرانے پر رونمائی کی اور موسیٰ علیہ السلام کے بعد اگرچہ بہت انبیاء علیہم السلام احیائے حق کے لئے مبعوث ہوئے مگر حضرت مسیح (علیہ السلام) کے وجود گرامی نے جس شان و عظمت کے ساتھ اس درمیان کی پیدا شدہ اندھیاریوں کا پردہ چاک کر کے ہدایت و رشد کی روشنی چمکائی گویا وہ طلوع تھا اُس نور ہدایت کا جو حضرت موسیٰ کی حیات طیبہ میں اپنی نمود دکھا چکا تھا اور جس کے ذریعہ آسمان ہدایت کے اُفق میں صبح سعادت نے شب ظلمت سے جھانکنا شروع کر دیا تھا اور تاریخ شاہد ہے کہ یہی نور ہدایت بنی اسرائیل سے منتقل ہو کر جب بنی اسمٰعیل تک پہنچا تو خاتم الانبیاء محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) میں اس طرح جلوہ گر ہوا کہ فاران کی چوٹیوں سے جب اُس کی کرنیں کائنات کے چہار جانب پھیلیں تو تمام عالم انسانی کو روشن و منور بنا دیا اور ظلمت شرک و کفر کو مٹا کر نور توحید سے ہر گوشۂ عالم کو تاباں و درخشاں کر دیا چنانچہ تورات میں مذکور اس حقیقت کو قرآن عزیز نے اس سے زیادہ بہتر اور معجزانہ اسلوب بیان کے ساتھ ادا کیا ہے۔

وَالتِّينِ وَالزَّيْتُونِ ۝ وَطُورِ سِينِينَ ۝ وَهَٰذَا الْبَلَدِ الْأَمِينِ ۝ لَقَدْ

شاہد ہو وہ مقام جو مرکز ہو۔ انجیر و زیتوں کے باغوں کا یعنی حضرت عیسیٰ السلام کا مقام ولادت "بیت اللحم" اور شاہد ہے

خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ ۔ طور سینا اور شاہد ہیں یہ بلد امین کہ، یقیناً ہم نے انسان کو
ثُمَّ رَدَدْنٰہُ اَسْفَلَ سٰفِلِیْنَ ۝ بہترین مخلوق بنایا پھر اس کو انتہائی پستی میں پھینک دیا
اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ بلوا اُن انسانوں کے جو ایمان لائے اور کام کیے نیک
فَلَھُمْ اَجْرٌ غَیْرُ مَمْنُوْنٍ ۝ پس انکے لیے اجر ہے بے منت (یعنی خدا کا فضل ورضا اور جنت

الواو للشہادۃ، واو کا استعمال شہادت کے لیے بھی ہوتا ہے" عربیت کا مشہور قاعدہ ہے اور اس قسم کی شہادت اکثر ایسے مواقع کے لیے مخصوص ہے کہ متکلم جس حقیقت کو ظاہر کرنا چاہتا ہے مختلف وجوہ کی بنا پر مخاطب کو اس کے سمجھنے میں مشکل پیش آتی ہے تب بعض بدیہی اور محسوس مثالیں دے کر مخاطب کے لیے اس حقیقت کا سمجھانا آسان بنا دیتا ہے سورۂ والتین کی آیات میں بھی صورت حال ایسی ہی ہے اس لیے کہ بتلانا یہ مقصود ہے کہ خدائے تعالیٰ نے انسان کو بہترین مخلوق بنایا ہے اس کے باوجود اگر سچا خدا پرست اور نیک کردار نہیں ہے تو انجام کار وہ انتہائی پستی میں پھینک دیا جائے گا اور اس کی حقیقت چوپایوں سے بھی بدتر ہو جائے گی اولٰئک کالانعام بل ھم اضل" مگر یہ کہ سچا خدا پرست اور نیک اعمال ثابت ہو تو پھر انسانیت کے بلند سے بلند درجہ کا مستحق اور بے حساب و بے منت خدا کی نعمتوں کا مستوجب ہے" ظاہر ہے کہ یہ بات کافی تفکر و تدبر کی محتاج ہے ایک ہستی تمام مخلوقات سے اپنی تخلیق و تکوین میں احسن بھی ہو اور پھر قعر ذلت کی گہرائیوں میں بھی پھینکا دی جائے اس لیے بطور شہادت نہایت لطیف پیرایہ میں تین مشہور اور نمایاں دور ہدایت کا ذکر کر کے اس جانب توجہ دلائی کہ اگر تاریخ کا مقصد یہ ہے کہ ماضی کے آئینہ میں مستقبل کی تصویر دیکھی جا سکے تو اُن پر سہ ادوار تاریخ کا مطالعہ کرو اور دیکھو کہ خدائے برتر نے کائنات کی رشد و ہدایت کا شرف "انسان" ہی کو بخشا اور پھر غور کرو کہ

بھی انسان ہی تھے جنہوں نے خدا کے پیغمبروں کی پیروی میں سچی خدا پرستی اور نیک عملی اختیار کی اور نتیجہ یہ نکلا کہ روزِ قیامت کے فیصلہ سے قبل بھی اسی دنیا میں انہوں نے عزت شرافت، حکومت سب کچھ پایا اور آخرت کا اجر تو بے منت و بے حساب الگ رہا اور وہ بھی انسان ہی تھے جو سرکشی، بغاوت اور پیغمبرانہ تعلیم کے خلاف فساد انگیزی کی بدولت آخرت سے پہلے ہی ذلت و رسوائی اور ہلاکت و بربادی کے قعر ہائے مذلت سے دوچار ہوئے اور جہنم کے اسفل سافلین سے جو واسطہ آئندہ پڑنے والا ہے وہ جدا ہے پس اگر اِن حقائق کو پیش نظر رکھو گے اور تاریخ ماضی کے اِن اوراق کو دیدۂ عبرت سے دیکھو گے تو پھر تمہاری یہ حیرت، اعترافِ حقیقت سے بدل جائے گی اور آئینہ عقل و فکر میں یہ سب کچھ روشن ہو جائے گا۔ تورات کی بشارت کے یہ الفاظ بھی خصوصیت کے ساتھ قابلِ توجہ ہیں" وہ دس ہزار قدوسیوں کے ساتھ آیا اور اُس کے داہنے ہاتھ میں آتشی شریعت اُن کے لیے تھی" قابلِ توجہ اس لئے ہے کہ جب ہم تاریخ کے اِس واقعہ کا مطالعہ کرتے ہیں کہ" رمضان ۸ھ ہجری مطابق جنوری ۶۳۰ء میں فتح مکہ کی غرض سے جب محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) روانہ ہوئے ہیں تو دس ہزار صحابہ (رضی اللہ عنہم) جلو میں تھے اور آتشی شریعت یعنی" جہاد بالسیف کا حکم الٰہی ... اُن کے ہاتھ میں تھی" تو قدرتِ الٰہی کے اس اعجاز کو دیکھ کر حیران رہ جاتے ہیں کہ جس ذات برتر نے موسیٰ (علیہ السلام) کی لسانِ حق سے اِن جملوں کو ادا کرایا۔ اُسی نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں اس کو پورا کر دکھایا" واللہ علیٰ کل شئ قدیر" تو کیا کسی حق پرست حق آگاہ کو ذرا سا بھی تامل ہو سکتا ہے کہ بلا شبہ موسیٰ (علیہ السلام) کی بشارت کا مصداق خاتم الانبیاء محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی ذاتِ گرامی ہے۔

تورات کی یہ اور اسی قسم کی دوسری بشارات ہیں جن کے پیش نظر بعثت محمد صلی اللہ علیہ وسلم،
سے صدیوں پہلے یہود کو نبی آخر الزماں کا انتظار تھا اور وہ یہ یقین رکھتے تھے کہ اب وہ وقت دور
نہیں ہے کہ نورِ ہدایت "آفتاب عالمتاب" بن کر جلوہ گر ہونے والا ہے، اسی لئے جب کبھی اُن کے
اور مشرکین کے درمیان جنگ پیش آجاتی تو کہا کرتے تھے کہ وہ وقت قریب آرہا ہے کہ نبی آخر
الزماں مبعوث ہوں گے اور ہم اُن پر ایمان لاکر اُن کی قیادت میں تم سے حق و باطل کی جنگ
کریں گے اور کامیاب ہوں گے چنانچہ جب قومی اور نسلی تعصب اور بغض وحسد کی بنا پر انہوں نے
آفتاب ہدایت کی روشنی سے منہ پھیر لیا اور آنکھیں بند کرلیں تو قرآن عزیز نے اُن کو یاد ایام کے
ساتھ ملزم و مجرم بناتے ہوئے یہ کہا۔

وَلَمَّا جَآءَهُمْ كِتَابٌ مِّنْ عِندِ اللَّهِ	چنانچہ جب ایسا ہوا کہ اللہ کی طرف سے اُنکی ہدایت کے لئے
مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ وَكَانُوا مِن قَبْلُ	ایک کتاب نازل ہوئی اور وہ اس کتاب کی تصدیق کرتی تھی
يَسْتَفْتِحُونَ عَلَى الَّذِينَ كَفَرُوا فَلَمَّا	جو پہلے سے اُن کے پاس موجود ہے تو باوجودیکہ وہ تورات
جَآءَهُم مَّا عَرَفُوا كَفَرُوا بِهِ فَلَعْنَةُ	کی پیشینگوئیوں کی بنا پر اس ظہور کے منتظر تھے، اور کافروں
اللَّهِ عَلَى الْكَافِرِينَ ۝ (البقرہ)	کے مقابلہ میں اُس کا نام لے کر فتح و نصرت کی دعائیں مانگتے

تھے، لیکن جب وہی جانی بوجھی ہوئی بات سامنے آگئی تو صاف انکار کر گئے اور
مخالفت پر کمر باندھ لی پس ان لوگوں کے لئے جو دیدہ و دانستہ کفر کی راہ اختیار کریں اللہ
کی لعنت ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، فرماتے ہیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت
سے پہلے ایک دفعہ قبیلۂ غطفان اور یہود کے درمیان جنگ ہوئی تو خیبر کے یہود اُن کے
مقابلہ میں فتح و نصرت کے لئے یہ دعا مانگتے تھے[۱]

[۱] البدایہ والنہایہ جلد۲ عن البیہقی بسند

اللّٰھم انا نسئلک بحق محمد النبی الامی — خدایا! ہم تجھ سے اُس نبی امی کا واسطہ دیکر دعا مانگتے ہیں

الذی وعدتنا ان تخرجہ فی اٰخر — جس کے متعلق تو نے ہم سے وعدہ کیا ہے کہ وہ آخر الزماں

الزمان ان تنصرنا علیھم — ہوں گے" کہ تو ہم کو اُن پر فتح و نصرت عطا فرما۔

اور علی ازدیؓ سے منقول ہے کہ "یثرب" (مدینہ) کے یہود ہمارے مقابلہ کے وقت اکثر یہ دعا کرتے تھے۔

اللّٰھم ابعث ھذا النبی یحکم بیننا و — خدایا! اُس نبی موعود کو مبعوث فرما جو ہمارے اور لوگوں

بین الناس — (مشرکوں) کے درمیان حق کا فیصلہ کر دے[1]

اور عقبہ ثانیہ میں جب مدینہ کے ستر اشخاص آپ سے دعوتِ اسلام کی حقیقت معلوم کرنے آئے اور آپ نے اُن پر حقیقتِ حال ظاہر فرمائی تو انہوں نے اسی وقت ایک دوسرے کو مخاطب کرتے ہوئے کہا، بلاشبہ یہ وہی پیغمبر ہیں جن کی بعثت سے متعلق ہم اکثر یہودی علماء سے سُنا کرتے ہیں[2] اور کیا اس تاریخی پہلو سے اُن نقول کی صداقت پر روشنی نہیں پڑتی کہ جب رومیوں کے ہاتھوں بنی اسرائیل کی آخری اور فیصلہ کن تباہی عمل میں آئی تو آخر شام، فلسطین، شرق اردن یمن جیسے شاداب و زرخیز علاقوں کو چھوڑ کر وہ کونسی اہم وجہ تھی جس نے یہود کے نمایاں اور مشہور قبائل (بنو قریظہ اور بنو نضیر وغیرہ) کو یثرب اور نواح یثرب میں آباد ہونے کی ترغیب دی، یقیناً صرف ایک ہی وجہ تھی اور وہ یہ کہ انہوں نے حضرت موسیٰؑ اور اُن کے بعد اپنے انبیاؑ کی بشارات میں یہ بھی سُنا تھا کہ اُس "منتظر ہستی" کا ظہور یثرب اور نواح یثرب میں ہوگا۔ مگر وائے بدبختی کہ قبول حق کا سب سے بڑا مانع اُن کو یہ پیش آیا کہ قومی، جماعتی اور نسلی حسد نے اُن کو اُس کی اطاعت سے باز رکھا۔ حتیٰ کہ جب انصار (رضی اللہ عنہم) میں سے بعض حضرات

---

[1] بدائع الفوائد جلد ۲ از مسند بزاز [2] تفسیر ابن کثیر جلد ۱

علمائے یہود کے سامنے یہ کہہ گزرتے کہ ہم نے تو اس نبی امی پر ایمان لانے کی بات سب سے پہلے تمہاری ہی زبانی سنی تھی اور اس کے ظہور سے قبل تم ہی اس کے چرچے کیا کرتے اور ان کتابوں سے متعلق بشارات سنایا کرتے تھے، پھر اب کیا ہوا کہ جب اس کا ظہور ہوا تو تم انکار کر بیٹھے تو وہ علانیہ جھوٹ بول دیتے اور کہتے کہ ہم کو یاد نہیں کہ کب ہم نے تم سے ایسی باتیں کہی تھیں[1]۔

توراۃ کی طرح عہد نامۂ جدید (اناجیل) میں بھی تحریف لفظی و معنوی کے باوجود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے متعلق یہ بشارات ملتی ہیں۔ متیٰ کی انجیل میں ہے۔

لیکن بہت سے اول آخر ہو جائیں گے اور آخر اول کیونکہ آسمان کی بادشاہت اس گھر کے مالک کی مانند ہے جو سویرے نکلا تاکہ اپنے انگوری باغ میں مزدور لگائے اور اس نے مزدوروں سے ایک دینار روز ٹھہرا کر انہیں اپنے باغ میں بھیج دیا پھر پہر دن چڑھے کے قریب نکل کر اس نے اوروں کو بازار میں بیکار کھڑے دیکھا اور ان سے کہا تم بھی باغ میں چلے جاؤ جو واجب ہے تمہیں دوں گا پس وہ چلے گئے پھر اس نے دوپہر اور سہ پہر کے قریب نکل کر ویسا ہی کیا اور کوئی ایک گھنٹہ دن رہے پھر نکل کر اوروں کو کھڑا پایا اور ان سے کہا تم کیوں یہاں تمام دن بیکار کھڑے رہے انہوں نے اس سے کہا، اس لئے کہ کسی نے ہم کو مزدوری پر نہیں لگایا۔ اس نے ان سے کہا تم بھی باغ میں چلے جاؤ جب شام ہوئی تو باغ کے مالک نے اپنے کارندے سے کہا کہ مزدوروں کو بلاؤ اور پچھلوں سے لے کر پہلوں تک انہیں مزدوری دیدو جب وہ آئے جو گھنٹہ بھر دن رہے لگائے گئے تھے تو انہیں ایک ایک دینار ملا جب پہلے مزدور آئے تو انہوں نے یہ سمجھا کہ ہمیں زیادہ ملے گا اور ان کو بھی ایک ہی دینار ملا تو گھر کے مالک سے یہ شکایت کرنے لگے کہ ان پچھلوں نے ایک ہی گھنٹہ کام کیا ہے اور تو نے انہیں

---

[1] تفسیر ابن کثیر جلد ا

ہمارے برابر کر دیا جنہوں نے (ہم نے) دن بھر کا بوجھ اُٹھایا اور سخت دھوپ سہی ۰ اس نے جواب دیکر اُن میں سے ایک سے کہا،" میاں میں تیرے ساتھ بے انصافی نہیں کرتا، کیا تیرا مجھ سے ایک دینار نہیں ٹھہرا تھا جو تیرا ہے اُٹھالے اور چلا جا، میری مرضی یہ ہے کہ جتنا تجھے دیتا ہوں اُس پچھلے کو بھی اتنا ہی دوں ۰ کیا مجھے روا نہیں کہ اپنے مال کو جو چاہوں سو کروں؟ یا تو اس لئے کہ میں نیک ہوں بُری نظر سے دیکھتا ہے ۰ اس طرح آخر، اول ہو جائیں گے اور اول آخر ۰

اس بشارت میں حضرت مسیح (علیہ السلام) نے مثالی رنگ میں اقوام و اُمم عالم کی عملی زندگی اور خدا کی جانب سے اُن پر اجر و ثواب کا مرقع پیش فرمایا ہے پہلے مزدور حضرت موسیٰ (علیہ السلام) سے قبل کی دُنیا کے لوگ ہیں اور دوسری جماعت سے حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کی اُمت بنی اسرائیل مراد ہیں تیسرا گروہ نصاریٰ ہیں اور چوتھی جماعت خاتم الانبیا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی اُمت ہی کائناتِ ارضی کی عمر کے لحاظ سے پہلی، دوسری اور تیسری جماعت کے مقابلہ میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت کا زمانۂ حیات یوں سمجھیے گویا دن کا آخری حصہ ہے اور اجر و ثواب میں اس آخری اُمت کو پہلی اُمتوں کے مقابلہ میں برابر کر دینے کا مطلب یہ ہے کہ خدا کے یہاں اُن کو دوسری تمام اُمتوں پر برتری حاصل ہے اس لیے کہ اگرچہ اُن کا وجودِ حیات اُمتوں کے آخر میں ہوا ہے لیکن چونکہ یہ خدا کے آخری پیغام "قرآن" کی حامل اور "سرخیل انبیاء ورسل" کی اُمت ہیں اور تمام اُمتوں سے اُن ہی کے رسول پر ایمان لانے کا وعدہ و میثاق لیا گیا ہے لہٰذا حیاتِ دُنیا کے لحاظ سے گو اُن کا زمانہ آخر ہے مگر مرتبہ اور عظمت کے اعتبار سے وہ سب سے "اول" ہیں یہی ہے مراد بشارت کے پہلے اور آخری جملہ کی "یعنی بہت سے اول آخر ہو جائیں گے اور آخر اول اور اس طرح آخر اول ہو جائیں گے اور اول آخر" ۰

نبی آخرالزماں صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ٹھیک اسی طرح ایک مثال بیان فرمائی ہے جو بخاری میں منقول ہے۔

دوسری اُمتوں کے مقابلہ میں دنیا کے اندر تمہاری مثال ایسی ہے جیسا کہ دن کے طویل عرصہ میں عصر (شام) سے غروب آفتاب کے وقت کی اہل تورات (یہود) کو تورات عطا کی گئی اور انہوں نے اس پر عمل کیا حتیٰ کہ وہ دوپہر ڈھلے عاجز رہ گئے (یعنی خدا کی تعلیم حق کو فراموش کر بیٹھے) تب اُن کو مالک نے ایک قیراط مزدوری دیدی اور پھر اہل انجیل (نصاریٰ) کو کام پر لگایا اور انہوں نے دوپہر ڈھلے سے عصر (شام) تک کام کیا اور پھر وہ بھی عاجز رہ گئے تب اُن کو بھی مالک نے ایک ایک قیراط مزدوری دیدی، آخر میں ہم کو قرآن ملا اور ہم نے دنیا کی زندگی کے دن غروب ہونے تک کام کیا۔ تب مالک نے ہم کو دو دو قیراط عطا کئے اس پر پہلوں نے شکایت کی کہ ہم نے زیادہ محنت کی مگر تو نے اُن کو اور ہم کو برابر کر دیا، مالک نے کہا میں نے تمہاری مزدوری میں سے تو کم نہیں کیا۔ تب مالک نے فرمایا: تو پھر میری یہ مرضی ہے کہ میں اپنے پاس سے جس کو چاہوں (مزدوری کی کیفیت و نوعیت کے فرق اور کام کی صلاحیت و استعداد کے پیش نظر) زیادہ دوں فھو فضل اوتیہ من اشاء"

اور اُمم ماضیہ و اقوام سالفہ کے مقابلہ میں اُمتِ محمدیہ کی یہی فضیلت ہے جس کو قرآن نے بصراحت اس معجزانہ اسلوب میں بیان کیا ہے۔

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (آل عمران)	تم تمام امم و اقوام میں بہترین اُمت ہو جو کائنات انسانی کی خدمت کے لئے وجود میں لائی گئی ہے، تم لوگوں کو بھلائی کا حکم کرتے ہو اور برائیوں سے باز رکھتے ہو۔

بہرحال آخری جماعت کا اول ہو جانا اگر اس کا مصداق اُمت محمد صلی اللہ علیہ وسلم

نہیں تو اور کون ہے جس کا ذکر توراۃ کی اس بشارات میں ہو رہا ہو اور جس کی تصدیق "نبی امی" اور "قرآن" دونوں کر رہے ہیں، عقلاً بھی یہ فرق مراتب واضح ہے اس لیے کہ جبکہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم تمام انبیاء و رسل کے بعد مبعوث ہوئے اور آپ کے قبول کرنے والوں میں آپ کی قوم سے بھی زیادہ دنیا کی دوسری اقوام و امم کے افراد شامل ہیں تو یہ ظاہر ہے کہ جب کوئی فرد یا جماعت پہلے سے کسی مذہبی جماعت میں شامل ہے تو اُس کے لیے جدید دعوتِ حق کو قبول کرنے میں قومی جماعتی اور نسلی عصبیت وغرور سب بڑی رکاوٹ بنکر سامنے آجاتا ہے پس جو شخص اس رکاوٹ کو پاؤں تلے روند کر دعوتِ حق پر "لبیک" کہتا ہے وہ بلاشبہ اس کا مستحق ہے کہ اپنے اپنے زمانہ میں پہلی صداقتوں پر ایمان لانے والوں کے مقابلہ میں اُس کو دو چند بلکہ چند در چند اجر و ثواب عطا ہو۔

اور انجیل یوحنا میں ایک بشارت اس طرح مسطور ہے:-

اور یوحنا کی گواہی یہ ہے کہ جب یہودیوں نے یروشلم سے کاہن اور لیوی یہ پوچھنے کو اس کے پاس بھیجے کہ تو کون ہے؟ تو اس نے اقرار کیا اور انکار نہ کیا کہ میں تو مسیح نہیں ہوں۔ انہوں نے اُس سے پوچھا کہ پھر کون ہے؟ کیا تو ایلیاہ ہے؟ اُس نے کہا نہیں ہوں۔ کیا تو وہ نبی ہے؟ اُس نے جواب دیا نہیں پس انہوں نے اُس سے کہا پھر تو کون ہے تاکہ ہم اپنے بھیجنے والوں کو جواب دیں کہ تو اپنے حق میں کیا کہتا ہے؟[1]

اس پیشنگوئی کا تاریخی زمانہ وہ ہے جب حضرت یحییٰ (یوحنا علیہ السلام)[2] اپنی صدائے حق سے بنی اسرائیل کو مسحور کر رہے تھے اور حضرت مسیح علیہ السلام کے ظہور کی بشارت دیتے تھے اس وقت یہود کے مقدسین کی ایک جماعت اُن کی خدمت میں حاضر ہوئی اور

[1] باب ۱ آیات ۱۹-۲۲ [2] یوحنا عبرانی میں حضرت یحییٰ کا نام ہے اور حضرت [illegible] حامد [illegible] کا نام کبھی [illegible] کی جانب انجیل یوحنا منسوب ہے۔

اُس نے یہ سوالات کیے ؛۔

سوالات میں تین پیغمبروں کے متعلق اُن سے دریافت کیا گیا کہ وہ اُن میں سے کون ہیں اگر انھوں نے انکار کیا کہ وہ ان تینوں میں سے کوئی نہیں ہیں تو یہ سوالات ظاہر کرتے ہیں کہ یہود تین یا دو پیغمبروں کے ظہور کے منتظر تھے حضرت مسیح کے، حضرت ایلیاؑ کے اور ایک ایسے پیغمبر کے جس کا ذکر اُن کے درمیان اس درجہ مشہور تھا کہ انہوں نے سوالات کے وقت دو ناموں کی طرح نام لینا ضروری نہیں سمجھا اور صرف "وہ نبی" کہنا ہی کافی خیال کیا۔

یہ بشارت اس درجہ واضح اور صاف ہے کہ نصاریٰ بجز بے دلیل انکار کے تاریخ کے اس سوال کا جواب دینے سے قاصر ہیں کہ اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم "وہ نبی" کا مصداق نہیں ہیں تو پھر کون ہے۔ کیا معاملہ کی صورت یہ نہیں ہے کہ جس طرح یہود، ظہور مسیح علیہ السلام کے منتظر تھے مگر اُن کی آمد پر از رہ حسد اُن کو رد کر دیا، اسی طرح یہود و نصاریٰ دونوں "وہ نبی" کی شہرت عام کے پیش نظر اس کے ظہور کے سخت منتظر ہونے کے باوجود اُس کی بعثت و ظہور کے نسلی و قومی عصبیت کی بدولت منکر ہو گئے چنانچہ اسی حقیقت کو قرآن حکیم نے اس طرح بیان کیا ہے۔

اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰھُمُ الْکِتٰبَ یَعْرِفُوْنَهٗ کَمَا یَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَھُمْ ؕ وَاِنَّ فَرِیْقًا مِّنْھُمْ لَیَکْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَھُمْ یَعْلَمُوْنَ ؁	وہ لوگ جن کو ہم نے کتاب عطا کی وہ تم کو اس طرح "پیغمبر حق" پہچانتے ہیں جیسا اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں اور بلاشبہ ان میں سے ایک فریق حق کو چھپاتا ہے اور وہ خوب جانتے ہیں کہ وہ حق کو چھپا رہے ہیں۔

[1] کہا جاتا ہے کہ کتب قدیمہ میں ایلیا بھی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی صفت منقول تھی اور اسی لیے خواص علماء یہود ایلیا اور فارقلیط کو ایک ہی تسلیم کرتے تھے مگر بعد کو تحریف کی بدولت ایک اور "منتظر ہستی" کا اضافہ ہو گیا اور وہ الیاس علیہ السلام ہیں ہوتے اب یہ گھڑ لیا کہ حضرت الیاس کا دوبارہ ظہور ہوگا اور اس لیے اب اناجیل بھی دو کی جگہ تین کے ظہور کا ذکر نظر آتا ہے

یوحنا کی انجیل میں حضرت مسیح (علیہ السلام) کی وصیت بھی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بشارت کے لئے شاہد عدل ہے، فرماتے ہیں۔

تم میں سے کوئی مجھ سے نہیں پوچھتا کہ تو کہاں جاتا ہے؟ بلکہ اس لئے کہ میں نے یہ باتیں تم سے کہیں تمہارا دل غم سے بھر گیا۔ لیکن میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ میرا جانا تمہارے لئے فائدہ مند ہے کیونکہ اگر میں نہ جاؤں تو وہ مددگار تمہارے پاس نہ آئیگا۔ لیکن اگر جاؤں گا تو اُسے تمہارے پاس بھیجدونگا اور وہ آکر دنیا کو گناہ اور راست بازی سے اور عدالت کے بارہ میں قصوروار ٹھہرائے گا[1]

یہ بشارت حضرت مسیح کی وصیت ہے اور تمثیلی استعاروں اور تشبیہوں کی بجائے صاف الفاظ میں ایک "موعود پیغمبر" کی خبر دیتی ہے اور موعود ہستی کی جن صفات کا اس میں ذکر ہے وہ حرف بحرف خاتم الانبیاء محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر صادق آتی ہیں۔

حضرت مسیح حواریوں اور شاگردوں کو دیکھ رہے ہیں کہ وہ اُن کی جدائی سے کس درجہ متاثر ہیں، دل غم سے بھرے ہوئے ہیں آنکھیں پُرنم ہیں حسرت و یاس چہرے سے ٹپک رہی ہے کیوں؟ کیا اس لئے کہ ایک انسان اُن سے جُدا ہو رہا ہے نہیں، نہیں بلکہ خدا کا ایک ہادی، نبی و رسول پیغمبر صداقت کی وداعی گھڑیاں قریب ہیں اور اب نہیں کہا جا سکتا کہ دنیا ایسی مقدس ہستیوں سے بہرہ ور ہو گی یا نہیں کیونکہ منکروں اور باطل پرستوں نے خدا کی اس نعمت کی کوئی قدر نہ کی اور اُس کو رد کر دیا۔ اِس غم آگیں منظر میں حضرت مسیح (علیہ السلام) اُن کو تسلی و تشفی دیتے اور یقین دلاتے ہیں کہ "میرا جانا تمہارے لئے فائدہ مند" ہے اور پھر اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں "اگر میں نہ جاؤں تو وہ "مددگار" تمہارے پاس نہ آئے گا" یعنی میرا کائنات ارضی پر یہ قیام اُس "مددگار" کی آمد کے لئے تاخیر کا باعث ہو رہا ہے جس کا آنا تمہارے لئے اس درجہ مفید ہے کہ باہمی محبت، خلوص

[1] باب ۱۶

میرا جانا ہی تمہارے لئے فائدہ مند ہو پھر اس کی معرفت کے لئے مزید باتیں بیان فرمائیں کہ وہ دنیا کو گناہوں (برائیوں) سے باز رکھیگا، راست بازی کا حکم کرے گا اور افراط و تفریط کی اُن روشوں کے خلاف جو انسانی دُنیا کے ہر معاملہ میں رگ و ریشہ کی طرح پھیلی ہوں گی "عدل" سے گریز پر مجرم اور قصوروار ٹھہرائے گا۔

قدرتی طور پر اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر وہ ہستی کون ہے جو ان مجموعۂ صفات کا مصداق بن سکے۔ علماء نصاریٰ کہتے ہیں کہ اس سے مراد "رُوح القدس" ہے اور وہ حضرت مسیح کے قبر میں جی اُٹھنے اور آسمان پر باپ کے پاس چلے جانے کے بعد شاگردوں پر نمودار ہوئی لیکن جب اس باطل تاویل پر اُن سے یہ کہا گیا کہ ماضی یا مستقبل میں کون سا زمانہ آچکا ہے یا آئے گا جس پر بشارت کا یہ جملہ صادق آسکے جو دراصل پوری وصیت کی رُوح ہے" وہ آکر دنیا کو گناہ سے اور راستبازی سے اور عدالت کے بارے میں قصوروار ٹھہرائے گا" اور کس طرح یہ عبارت صرف اُس نور پر صادق آسکتی ہے جو شاگردوں پر روح القدس) ایک کبوتر کی شکل میں نازل ہو کر دکھلائی گئی۔

یہ وصیت تو اس تاویل کے برعکس صاف یہ ظاہر کر رہی ہے کہ حضرت مسیح ایک ایسے عظیم المرتبہ، جلیل القدر پیغمبر کے ظہور کی بشارت سُنا رہے ہیں جس کی آمد کائنات انسانی کے لئے حضرت مسیح علیہ السلام، کی موجودگی سے بھی زیادہ سودمند ثابت ہوگی اور جو ایک مرتبہ پھر کائنات کو اس کا بھولا ہوا سبق یاد دلائے گی اور اس کی تعلیم حق کا معیار سرتاسر "عدل" پر مبنی ہوگا کہ یہی تمام اخلاق کریمانہ اور شعبۂ حیات کے لئے اساس و بنیاد کار ہے اور اس حقیقت پر نظر رکھتے ہوئے جب ہم تاریخی مذاہب سے دریافت کرتے ہیں کہ اس کا مصداق کون ہے تو اس کے ماسوا اور کوئی جواب نہیں ملتا کہ حضرت

مسیح کے بعد وصیت میں مذکورہ اوصاف کی مصداق ہستی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ماسوا کوئی ظہور میں نہیں آئی۔ یہی مقدس ہستی ہے جس نے ایسے زمانے میں جبکہ دنیا کی قوموں اور ان کی سوسائیٹوں میں "عدل" ایک اجنبی شے رہ گئی تھی اور جب کہ سچی نیک عملی اور خدا پرستی قومی اور اجتماعی زندگی سے خارج ہو چکی تھی دنیائے انسانی کو یہ پیغام سنایا۔

اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ	بیشک اللہ حکم دیتا ہے "عدل" کا "احسان" کا قرابت
وَاِیْتَآئِ ذِی الْقُرْبٰی وَیَنْھٰی عَنِ	داروں کے ساتھ سلوک کا اور یقیناً منع کرتا ہے فحش کاموں
الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ وَالْبَغْیِ یَعِظُکُمْ	اور باتوں سے .... اور بغاوت و سرکشی
لَعَلَّکُمْ تَذَکَّرُوْنَ ۝ (النحل)	سے وہ تم کو نصیحت کرتا ہے تاکہ تم نصیحت قبول کرو،

اور یہی وہ مقدس ہستی ہے جس کے ظہور کی بدولت اس کی امت کا مقصد حیات یہ ظاہر کیا گیا۔

کُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّۃٍ اُخْرِجَتْ	(اے امت محمد صلی اللہ علیہ وسلم) تم بہترین امت ہو جو لوگوں کی خدمت
لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ	کے لئے عالم وجود میں لائی گئی ہو تم لوگوں کو بھلائی اور نیکیوں کا حکم کرتے
وَتَنْھَوْنَ عَنِ الْمُنْکَرِ (آل عمران)	اور ان کو برائیوں سے باز رکھنے کی تلقین کرتے ہو۔

مضمونِ وصیت کے اس نمایاں پہلو کے ماسوا ایک اور روشن اور واضح بات اس وصیت یا بشارت میں وہ جگہ ہے جس میں موعود ہستی کو ایک خاص وصف کے ساتھ یاد کیا گیا ہے۔ یہ وصف اگرچہ جدید ایڈیشنوں میں "مددگار"۔ "وکیل"۔ "معزی" اور "شفیع" ہے لیکن قدیم یونان، فرنچ، لیٹن اور انگریزی تراجم میں "پیراکلیوناس" اور عبرانی رجبری اور عربی تراجم میں "فارقلیط" پایا جاتا ہے جو عربی لفظ احمد کے ہم معنی اور مرادف ہے۔ یہ بات تو علماء نصاریٰ اور ہر ایک تاریخ داں کے نزدیک متفق علیہ اور

مسلم ہے کہ موجودہ اناجیل میں سے کوئی ایک بھی حضرت مسیح (علیہ السلام) کی اصل انجیل نہیں ہے بلکہ جن ناموں سے یہ منسوب ہیں اُن کے بھی اصل نسخے نہیں بلکہ تراجم ہیں اور یہ مسیح کی انجیل کا اور یحنّا (اصل) نسخہ قدیم جبرو (عبرانی) زبان میں تھا اس لئے یہ دعویٰ بسہولت کیا جاسکتا ہے کہ اور یحنّا نسخہ میں یہ لفظ بلاشبہ احمد ہی ہوگا۔ جیساکہ سورۂ صف میں قرآن عزیز نے حضرت مسیح کا یہ قول نقل کیا ہے ومبشراً برسول یاتی من بعدی اسمہ احمد" اور دلیل یہ ہے کہ موجودہ انجیل کے تراجم میں فارقلیط اسی لفظ احمد کا ہم معنی اور مرادف لفظ اختیار کیا گیا مگر جب علماء نصاریٰ نے یہ دیکھا کہ صداقتِ خاتم الانبیاء محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے کتابِ مقدس سے بصراحت تام بہت بڑی دلیل ہاتھ آئی اور علماء اسلام کی جانب سے ہم پر قوی حجت قائم ہوئی جاتی ہے تو بعد کے ایڈیشنوں میں لفظ فارقلیط یا پیراکلیوٹاس نکال دیا گیا اور اب اُس کی جگہ کبھی ناصر (مددگار) کبھی وکیل، کبھی شفیع اور کبھی معزّی (تسلی دینے والا) لکھا جانے لگا۔ تاکہ واضح نام کی بجائے ایک ایسی صفت آجائے جس کا اطلاق بغیر کسی تعین کے ہر ایک ذات حق پر ہوسکے۔ اناجیل کے قدیم وجدید نسخوں اور پھر قدیم وجدید کے مختلف ایڈیشنوں میں لفظ فارقلیطا و اسی قسم کی دوسری گوناگوں تحریفات کا مطالعہ کرنا ہو تو اُس کے لئے میزان الحق اور الفاروق کا مطالعہ از بس مفید ہے یہاں اس حقیقت کو ثابت کرنے کے لئے کہ اناجیل کے عربی تراجم میں مسطورہ بالا الفاظ کی بجائے فارقلیط تھا صرف یہ ایک ثبوت کافی ہے کہ ایک صدی قبل کے عربی نسخہ میں جو لندن سے ۱۸۴۴ء میں شائع ہوا تھا یہ لفظ یوحنا باب ۱۴ آیت ۱۶ میں موجود تھا

"انا اطلب من الاب فیعطیکم فارقلیطا آخر"

تاہم علماء نصاریٰ کی اس واضح تحریف کے بعد بھی اُن کا مقصد حل نہیں

ہو سکتا اور ایک مرتبہ اُن سے پھر یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ اس بشارت میں لفظ فارقلیط احمد کی جگہ مسطورہ بالا الفاظ میں سے ہی کوئی لفظ سہی مگر جبکہ اس بشارت کا مصداق رُوح القدس کا کبوتر کی شکل میں شاگردوں پر نمودار ہو جانا" کسی طرح نہیں بنتا تو پھر حضرت مسیح علیہ السلام کے بعد تاریخ ادیان میں وہ کون سی ہستی ہے جس کو اِس کا مصداق سمجھا جائے کیا علماء نصاریٰ اس بے دلیل انکار کے ساتھ کہ اُس کا مصداق ذاتِ اقدس محمد صلی اللہ علیہ وسلم نہیں ہیں جرأت کر کے یہ کہہ سکتے ہیں کہ فلاں ہستی اس مجموعہ صفات کا مصداق تھی یا آج ہے یا آئندہ آئے گی؟ نہیں وہ نہیں کہہ سکتے۔ کیونکہ ان کے پاس اس انکار کے لئے صرف یہی ایک مثبت دلیل ہے کہ روح القدس" اس کا مصداق ہے کاش کہ وہ قدرت بھی رکھتے کہ روح القدس کو انسانی شکل میں کائنات کی ہدایت کے لئے لا سکتے کہ وہ پیغمبرانہ صداقت کے ساتھ لوگوں کو بھلائی کا حکم دیتی، برائیوں سے روکتی اور عدل ترک کر کے افراط و تفریط کی راہ بداختیار کرنے پر لوگوں کو قصوروار ٹھہراتی تب شاید اُن کا یہ قول الفاظ بشارت کی مطابقت کر سکتا۔ ورنہ تو یہ روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ اس بشارت کو ذاتِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں تسلیم نہ کرنا صرف نسلی، قومی اور جماعتی گروہ بندی سے پیدا شدہ عصبیت و حسد کا نتیجہ ہے۔

اس سے قطع نظر ہم تسلیم کئے لیتے ہیں کہ مسیح کی انجیل میں احمد (فارقلیط) کی بجائے مسطورہ بالا الفاظ ہی میں سے کوئی لفظ تھا تب بھی اس کا مصداق خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے ماسوا کوئی نہیں ہو سکتا اس لئے کہ قرآنِ عزیز نے مختلف مقامات پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے جو اوصافِ حمیدہ بیان کیے ہیں وہ اُن ہی مسطورہ بالا الفاظ کے ہم معنی ہیں مثلاً سورہ توبہ میں آپ کو عزیز، رؤف، رحیم کہا گیا ہے۔

لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ۝ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ حَسْبِيَ اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَهُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ (توبہ)	(ایمان والو!) تمہارے پاس (اللہ کا) ایک رسول آگیا ہے جو تم ہی میں سے ہے تمہارا رنج و کلفت میں پڑنا اس پر بہت شاق گزرتا ہے وہ تمہاری بھلائی کا بڑا ہی خواہشمند ہے وہ ایمان والوں کے لئے شفقت رکھنے والا، رحمت والا ہے (اے پیغمبر!) اگر اس پر بھی یہ لوگ سرتابی کریں تو اُن سے کہدے میرے لئے اللہ کا سہارا بس کرتا ہے کوئی معبود نہیں ہے مگر صرف اس اس کی ذات ہیں نے اس پر بھروسہ کیا وہ تمام عالم ہستی کی جہانداری کے عرشِ عظیم کا خداوند ہے۔

اور سورۂ انبیاء میں ارشاد ہے۔

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ (انبیاء)	اور ہم نے تجھ کو نہیں بھیجا مگر جہاں والوں کے لئے رحمت بنا کر۔

اور اگر صحیح احادیث کی تصریحات کو بھی ان آیات کی تفسیر کے طور پر شامل کرلیا جائے تب تو اناجیل کے تراجم میں مذکورہ صفات بعینہ آپ کو مل جائیں گے مثلاً الشافع المشفع الشفیع، الناصر (مددگار) وغیرہ

پھر اسی باب کی آیت ۱۳ کو اس مضمون کے ساتھ اگر ملائیے تو معاملہ اور زیادہ واضح اور صاف ہو جائے گا حضرت مسیح علیہ السلام فرماتے ہیں

لیکن جب وہ سچائی کی روح آئے گا تو تم کو سچائی کی راہ دکھلائے گا اس لئے کہ وہ اپنی طرف سے نہ کہے گا اور تمہیں آئندہ کی خبریں دے گا۔

غور فرمائیے کیا یہ مضمون "روح القدس" پر صادق آسکتا ہے جس نے چند شاگردوں

ظاہر ہو کر اپنی موجودگی دکھلائی یا ایسی ہستی پر جو لوازم بشریت سے متصف ہونے کے باوجود کائنات انسانی میں رہ کر سچائی کی راہ دکھلائے اور اُمورِ غیب سے متعلق خدا نے جو کچھ بتلایا ہے (علامات قیامت، جنت وجہنم، حشر و نشر وغیرہ کی تفصیلات) اُس کو مخلوقِ خدا تک پہنچانے اور پھر معلوم کہ و تاریخ ماضی ہے کہ حضرت مسیح کے بعد محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ کون آیا جس نے خدا سے بھٹکے ہوئے انسانوں کا رشتہ دوبارہ خدا سے لایا اور ادیان و ملل کی گم شدہ صداقتوں کو قرآن کے ذریعہ روشن و نمایاں کیا، کیا موافق و مخالف دونوں شہادتیں اس پر متفق نہیں ہیں کہ اُس کی قوم، دوست و دشمن سب ہی اُس کو "الصادق الامین" کہہ کر پکارتے تھے اور کیا انجیل کا یہ فقرہ "اس لئے کہ وہ اپنی طرف سے نہ کہیگا" اور قرآن کی یہ آیت "وما ینطق عن الھوی ان ھو الا وحی یوحی" وہ اپنی خواہش سے کچھ نہیں کہتا، جو کچھ کہتا ہے اُس وحی سے کہتا ہے جو خدا کی جانب سے اُس پر اُتاری جاتی ہے ایک ہی مقدس ہستی کی تقدیس حیات اور صداقتِ قول و عمل کے دو عکس نہیں ہیں، پس سچائی کی روح میں لفظ "روح" سے فائدہ اٹھا کر اور بقیہ تمام مضمون بشارت سے آنکھ بند کر کے اُس کو "روح القدس" کہہ دینا علمی دیانت ہے؟ ہرگز نہیں۔

غرض وصیت یا بشارت حضرت مسیح (علیہ السلام) کی جانب سے واضح اور صاف اعلان ہے۔ ظہور قدسی صفات صلی اللہ علیہ وسلم کا اور اس کا انکار بداہت کا انکار ہے اور تعصب بے جا کی دلیل۔[1]

بشارات النبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ باب بہت وسیع ہے اور چھٹی صدی ہجری میں

---

[1] اس پیشینگوئی یعنی فارقلیط سے متعلق مفصل محققانہ بحث کے لئے میزان الحق از مولانا رحمۃ اللہ نور اللہ مرقدہ الفارق ہدایۃ الحیاری اور رسالہ تہذیب الاخلاق مضمون فارقلیط قابل مراجعت ہیں۔

ایک مسیحی عالم سعید بن حسن اسکندرانی نے جب کتاب مقدس میں ان بشارات کو دیکھ کر اسلام قبول کیا تو محیط النظر ایک مستقل کتاب اسی موضوع پر تصنیف کی اور ہمیشہ سے علماء اسلام بھی اس موضوع پر تفصیل کے ساتھ لکھتے رہے ہیں۔ حتیٰ کہ بعض علمائے ہندوؤں کی قدیم کتابوں اور مجوس کے قدیم نوشتوں میں بھی "منتظر ہستی" سے متعلق جو کچھ مذکور ہے اس کو بشارات النبی میں شامل کیا ہے مگر ہم اسی قدر پر اکتفا کرتے ہوئے قرآن عزیز کی ان آیات پر اس مضمون کو ختم کر دینا چاہتے ہیں جو نزولِ قرآن کے وقت سے یہود و نصاریٰ کے سامنے برابر اعلان کرتی رہی ہیں کہ قدیم سماوی کتابوں میں اس مقدس پیغمبر کا تذکرہ برابر رہا ہے اور چونکہ خدا کی تقدیر یہ فیصلہ کر چکی تھی کہ اُس کا آخری اور کامل و مکمل قانون اسی ذات اقدس کے ہاتھوں کائنات ہست و بود تک پہنچے گا۔ اس لئے ازبس ضروری تھا کہ اُس کا ذکر پہلے نوشتوں میں ہوتا کہ جب اُس کے ظہور کا وقت آپہونچے تو تمام صادق ادیان و ملل سے متعلق اُمتیں میثاقِ الٰہی کے مطابق اُس پر ایمان لائیں اور اس کی پیش کردہ صداقت اور قانونِ ہدایت "قرآن" کو اپنے لئے راہ عمل بنائیں چنانچہ سورہ الفتح میں ارشاد ہے۔

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ	محمد اللہ کے رسول ہیں اور جو لوگ (صحابہ) اُن کے ساتھ ہیں
اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ	وہ منکروں پر سخت ہیں اور آپس میں نرم خو ہیں (اے
تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا	مخاطب!) تو اُن کو دیکھیگا خدا کے سامنے جھکنے والے
مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا سِيْمَاهُمْ فِيْ	سجدہ کرنے والے اور اس طریقہ سے خدا کے فضل اور
وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ ذٰلِكَ	اُس کی رضا کے خواہشمند ہیں اُن کی نشانی یہ ہے کہ
مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَمَثَلُهُمْ فِي	اُن کے چہروں (پیشانیوں) پر سجدے کے نشانات ہیں
الْاِنْجِيْلِ (الفتح)	توراۃ اور انجیل میں اُن کا ذکر اسی طرح ہے۔

یہ ذکر انجیل برنابا میں تفصیل کے ساتھ موجود ہے اور آپ کی صفات بہت نمایاں الفاظ میں مذکور ہیں لیکن وہ نصاریٰ کے نزدیک متروک ہے مگر جیسا کہ سابق میں کہا جا چکا ہے اس کا ترک کسی دلیل پر قائم نہیں ہے بلکہ وہ اور بعض دوسری اناجیل کا ترک محض ایک فال کی بنا پر ہوا جو اسی غرض سے نکالی گئی تھی۔

اور سورۂ شعرا میں ہے۔

وَإِنَّهُ لَتَنْزِيلُ رَبِّ الْعٰلَمِينَ ۝ نَزَلَ بِهِ الرُّوحُ الْأَمِينُ ۝ عَلٰى قَلْبِكَ لِتَكُونَ مِنَ الْمُنْذِرِينَ ۝ بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِينٍ ۝ وَإِنَّهُ لَفِي زُبُرِ الْأَوَّلِينَ ۝ (الشعراء)

اور یقیناً یہ قرآن جہانوں کے پروردگار کا اتارا ہوا ہے کہ روح الامین (جبرئیل) نے (خدا کی جانب سے) تیرے قلب پر نازل کیا تاکہ تو خدا کے نافرمانوں کو ڈرانے والوں میں سے ہو یہ صاف عربی زبان میں ہے۔ اور اس کا ذکر پہلوں (گذشتہ پیغمبروں) کی کتابوں میں ہے

اور ایک مرتبہ خود نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ان ہی بشارات کی جانب اشارہ کرتے ہوئے فرمایا۔

دعوۃ ابی ابراهیم و بشری عیسیٰ — میں اپنے باپ ابراہیم کی دعا ہوں اور عیسیٰ مسیح کی بشارت ہوں

(یعنی) دعاء خلیل اور نوید مسیحا

قرآن عزیز نے دعاء ابراہیم (علیہ السلام) کا ذکر اس طرح کیا ہے۔

رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ ۚ إِنَّكَ أَنْتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ۝ (بقرہ)

اے ہمارے پروردگار ان (اہل عرب) میں ایک رسول بھیج جو ان پر تیری آیات پڑھے اور ان کو کتاب اور حکمت سکھائے اور ان کو ہر قسم کی برائیوں سے پاک کرے۔ بے شبہ تو غالب اور حکمت والا ہے۔

اور بشارت مسیح کا ذکر سورۂ صف میں اس طرح منقول ہے۔

وَإِذْ قَالَ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ يَا بَنِي إِسْرَائِيلَ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُم مُّصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرَاةِ وَمُبَشِّرًا بِرَسُولٍ يَأْتِي مِن بَعْدِي اسْمُهُ أَحْمَدُ فَلَمَّا جَاءَهُم بِالْبَيِّنَاتِ قَالُوا هَٰذَا سِحْرٌ مُّبِينٌ ○

اور وہ وقت قابل ذکر ہے جب عیسیٰ بن مریم نے کہا کہ اے بنی اسرائیل میں تمہاری جانب خدا کا رسول آیا ہوں۔ تصدیق کرنے والا ہوں توراۃ کی جو میرے سامنے موجود ہے اور بشارت دینے والا ہوں ایک رسول کی جو میرے بعد آئے گا اور اس کا نام احمد (صلعم) ہوگا پس جب اُن کے پاس وہ (خدا کا پیغمبر) دلائل لے کر آیا تو یہ کہنے لگے یہ تو کھلا جادو ہے۔

صبح سعادت | تاریخ ادیان و ملل شاہد ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ظہور پر تقریباً چھ صدیاں گذر چکی ہیں اور معمورۂ عالم خدا کے پیغمبروں کی معرفت حاصل کی ہوئی صداقتِ حق کو فراموش کر چکا ہے تمام کائنات انسانی خدا پرستی کی بجائے مظاہر پرستی میں مبتلا ہے اور ہر ملک میں نوع انسانی سے لے کر نوع جمادات تک کی پرستش سرمایۂ نازش بنی ہوئی ہے۔ کوئی انسان کو اوتار (خدا) کہہ رہا ہے تو کوئی خدا کا بیٹا۔ ایک اگر وہ پرست ہے تو دوسرا خود اپنی آتما (روح) کو ہی خدا سمجھ رہا ہے سورج کی پوجا ہے، چاند اور تاروں کی پرستش ہے حیوانوں درختوں اور پتھروں کی عبادت ہے، آگ پانی، جن بھوت کے سامنے ناصیہ فرسائی ہے غرض کائنات کی ہر شے پرستش اور پوجنے کے لائق ہے اور نہیں ہے تو صرف ذات واحد قابل پرستش نہیں ہے نہ اُس کی احدیت کا تصور خالص ہے اور نہ صمدیت کا۔ اُس کو اگر مانا بھی جاتا ہے تو دوسروں کی پرستش اور عبادت کے ذریعہ، وہ اگر خالق موجودات ہے تو دوسروں کے واسطہ اور احتیاج کے ساتھ اور وہ رزاق ہے تو غرض سب ہی باتوں کا محتاج ہے

وہ اگر یا الٰہ موجودات ہی کبھی تو انسان، حیوان، درخت، پتھر کے بل بوتہ پر غرض ساری دُنیا میں اصل کارفرمائی مظاہر کی تھی اور ذاتِ حق "صرف نام کے لئے، حقیقت سے چشم پوشی تھی مگر مجاز کے ساتھ ذوقِ عشق، ذاتِ حق سے بُعد تھا مگر مظاہر سے قربت سرمایۂ سعادت خالق سے بیگانگی تھی مگر مخلوقات کی عبادت گذاری شعارِ عام تھا اور ہر طرف ما نعبدھم الا لیقربونا الی اللہ زلفیٰ۔ ہم اُن کو نہیں پوجتے مگر اس لئے تاکہ وہ خدا کی جانب ہماری قربت کا ذریعہ بنجائیں" کا مظاہرہ نظر آتا تھا۔

یہی وہ تاریک دور تھا جب ہی "سنۃ اللہ" یعنی خدا کے قانون ہدایت و ضلالت نے ماضی کی تاریخ کو پھر دہرایا اور غیرتِ حق نے فطرت کے قانون ردعمل RESACTION کو حرکت دی یعنی آفتاب ہدایت بُرجِ سعادت سے نمودار ہوا اور چہار جانب چھائی ہوئی شرک و جہالت اور رسم و رواج کی تاریکیوں کو فنا کر کے عالم ہست و بود کو علم و یقین کی روشنی سے منور کر دیا۔

۹ ربیع الاول مطابق ۲۰ اپریل ۵۷۱ء کی صبح، وہ صبح سعادت تھی جب مدنیت و حضارت سے محروم، بن کھیتی کی سرزمین مکہ کے ایک معزز قبیلہ قریش (بنی ہاشم) میں عبداللہ بن عبدالمطلب کے یہاں آمنہ بنت وہب کے مشکوئے معلّیٰ سے آفتاب رسالت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ظہور کیا۔

خدایا! وہ صبح کیسی سعادت افروز تھی جس نے کائناتِ ارضی کو رشد و ہدایت کے طلوع کا مژدہ جانفزا سنایا، اور وہ ساعت کیسی مبارک و محمود تھی جو معمورۂ عالم کے لئے پیغام بشارت بنی، عالم کا ذرہ ذرہ زبانِ حال سے نغمے گا رہا تھا کہ وقت آپہنچا کہ اب دُنیائے ہست و بود کی دورِ سعادت اور سعادتِ مجسم سے عالم معمور ہو، ظلمت شرک و کفر کا

پردہ چاک ہو اور آفتاب ہدایت روشن و تابناک ہو، مظاہر پرستی، باطل ٹھہرے اور خدائے واحد کی توحید مقصد حیات قرار پائے۔

دُنیا تو کیا ملک، قبیلہ اور خاندان کو بھی یہ علم نہ تھا کہ مذاہب عالم جس آفتاب رسالت کے طلوع ہونے کے منتظر ہیں وہ اس غیر متمدن سرزمین اور عبد المطلب کے گھرانے سے جلوہ گر ہوگا کہ اس کی ولادت باسعادت کو خاص اہمیت دیتے اور تاریخ ولادت کو اپنے سینہ میں محفوظ رکھتے مگر جب خالق کائنات کے فرشتۂ تقدیر نے اُس کو مقدس ہستی بنانے کا فیصلہ کیا، اسی کے ید قدرت نے ولادتِ باسعادت کے لیے ایک معجزانہ تاریخی نشان بھی ظاہر کر دیا اور وہ "اصحاب الفیل" کا واقعہ تھا۔

معتبر اور مستند روایات شاہد ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت اس واقعہ سے چند ماہ بعد ہوئی[1]

یہ واقعہ جن خصوصیات کا حامل ہے اُن کے پیشِ نظر یہ عرب کے لیے عموماً اور اہل حجاز کے لیے خصوصاً نہایت عجیب اور حیرت زا تھا۔ اور اس لیے وہ کبھی اس کو فراموش نہیں کر سکتے تھے۔ اسی لیے انہوں نے اس کا نام ہی عام الفیل (یعنی ہاتھیوں والا سال) رکھ دیا، مگر وہ یہ سمجھنے سے قاصر تھے کہ دراصل یہ واقعہ ایک نشان ہے اس جلیل القدر ہستی کے ظہور کا جو ایک روز تمام معمورۂ انسانی کو مرکز توحید اور قبلہ ابراہیمی پر جمع کر دے گی اور اس کو غیر اللہ (بتوں) کی آلودگیوں سے پاک کر کے توحید الٰہی کے نغموں کے لئے مخصوص کرائے گی، کیونکہ یہی وہ پہلا مقام ہے جو صرف خدائے واحد کی پرستش کے لیے بنایا گیا، یہ مندر نہیں تھا کہ مورتی کی پوجا کی جاتی نہ یہ گرجا اور کلیسا بھی نہ تھا کہ یسوع مسیح اور کنواری مریم کے مجسموں کے سامنے سر جھکایا جائے نہ یہ آتش کدہ تھا کہ آگ کو نور کا مظہر قرار دے کر

[1] واقعہ کی تفصیلات قصص القرآن جلد ۳ میں گذر چکی ہیں۔

اُس کی پرستش کی جائے اور نہ یہ صلوات یہود تھا کہ حضرت عزیر کو خدا کا بیٹا بنا کر اس کی
تقدیس کے نغمے گائے جائیں بلکہ یہ تو خدا اور صرف ایک خدا کی عبادت کے لئے بنایا گیا
تھا "اِنَّ اَوَّلَ بَیْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِیْ بِبَکَّۃَ مُبٰرَکًا وَّھُدًی لِّلْعٰلَمِیْنَ"

غرض بعثت کے بعد جب قدرت کے اعجاز نما ہاتھوں نے عام الفیل میں آپ کی
ولادت کا راز سربستہ آشکارا کر دیا تب دنیا نے یہ سمجھا کہ ابرہۃ الاشرم اور اس کے لشکر سے
کعبۃ اللہ کی یہ حفاظت اس لئے تھی کہ وہ وقت قریب آ پہنچا جب دوبارہ یہ مقدس مقام
خدائے واحد کی عبادت اور توحید خالص کی مرکزیت کا شرف حاصل کرنے والا ہے
پس یہ طاقت کہ اس مقصد عظمیٰ سے متصادم ہو گی خود ہی پاش پاش ہو کر رہ جائے گی
ابرہہ عیسائی تھا اور اہل عرب اور قریش مشرک، پھر کون کہہ سکتا ہے کہ ابرہہ
اور اس کے لشکر کی بربادی قریش کی نصرت و حمایت کے لئے تھی نہیں، بلکہ اس لئے
سب کچھ ہوا کہ مشیت الٰہی کے خلاف ابرہہ کی خواہش تھی کہ یمن (صنعاء) میں جو خوبصورت
گرجا (قلیس) باپ، بیٹا، روح القدس (تثلیث) کے فروغ دینے کو بنایا گیا تھا
مرکز توحید کعبۃ اللہ کی جگہ وہ مرجع خلائق بنے اور اس مقصد کی خاطر اس نے انہدام
کعبہ کے لئے لشکر کشی کی ادھر قریش بلکہ سارا عرب اُس کی مقاومت سے عاجز و درماندہ
تھا، ابرہہ وقت کے تمام جنگی اسلحہ و سروسامان کا مالک اور قریش اُن سب سے یکسر محروم
تب غیرت حق حرکت میں آئی اور دنیا نے دیکھ لیا کہ دنیوی طاقت کے گھمنڈ پر مشیت
الٰہی سے ٹکرانے والا خود ہی فنا کے گھاٹ اتر گیا اور محور توحید "کعبہ" خدا ہی کی حفاظت کے
سایہ میں اسی طرح قائم رہا "اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَعِبْرَۃً لِّمَنْ یَّخْشٰی" بلاشبہ اس بات میں بڑی ہی
عبرت ہے اُس شخص کے لئے جو خوف خدا رکھتا ہے قرآن عزیز نے سورۂ الفیل میں اسی

حقیقت کو معجزانہ اسلوب بیان کے ساتھ نقل کیا ہے۔

اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِاَصْحٰبِ	اے پیغمبر! کیا تجھے نہیں معلوم کہ تیرے پروردگار نے ہاتھی
الْفِيْلِ ○ اَلَمْ يَجْعَلْ كَيْدَهُمْ فِيْ	والوں کے ساتھ کیا معاملہ کیا؟ کیا اُن کے فریب کو نا کام
تَضْلِيْلٍ ○ وَّاَرْسَلَ عَلَيْهِمْ طَيْرًا	نہیں بنا دیا؟ اور اُن پر فوج در فوج پرند بھیج دیئے
اَبَابِيْلَ ○ تَرْمِيْهِمْ بِحِجَارَةٍ مِّنْ	وہ پرند ان پر کنکریاں پھینکتے تھے پھر (خدا نے) اُن
سِجِّيْلٍ ○ فَجَعَلَهُمْ كَعَصْفٍ مَّاْكُوْلٍ	ہاتھیوں والوں کو کھائے ہوئے بھس کے مانند کر دیا

بہرحال عام الفیل، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت کا سال ہے اور یہ واقعہ آپ کے ظہور قدسی کا سب سے بڑا نشان ہے اور یہ حقیقت اُس شخص پر بخوبی عیاں ہے لِمَنْ كَانَ لَهٗ قَلْبٌ اَوْ اَلْقَى السَّمْعَ وَهُوَ شَهِيْدٌ جس کے پاس قبول حق کے لئے دل ہے یا وہ حاضر دماغی کے ساتھ امر حق کی جانب کان لگائے ہوئے ہو۔

تاریخ ولادت کی تحقیق

تمام ارباب تاریخ و سیر کا جن باتوں پر کلی اتفاق ہے ایک یہ کہ ولادت کا سال "عام الفیل" تھا چنانچہ سیرت و مغازی کے مشہور امام محمد بن اسحٰق اور جلیل القدر محدث و مورخ حافظ ابن کثیرؒ جمہور کی یہی رائے نقل کرتے ہیں۔

وكان مولده عليه الصلاة والسلام	چونکہ زیادہ یہی قول مشہور ہے کہ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام
عام الفيل وهذا هو المشهور عن	کی ولادت عام الفیل میں ہوئی اور ابراہیم بن منذر کہتے
الجمهور وقال ابراهيم بن المنذر	ہیں کہ اس بات میں کسی عالم کو بھی شک و شبہ نہیں کہ
الحزامي وهو الذي لا يشك فيه	نبی علیہ السلام عام الفیل میں پیدا ہوئے۔
احد من علمائنا انه عليه الصلاة والسلام	
ولد عام الفيل[1]	

---

[1] تاریخ ابن کثیر جلد ۲ ص ۲۶۱

والمجتمع علیہ انہ علیہ السلام ولد عام الفیل[۱]	اور اس پر سب کا اتفاق ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم عام الفیل میں پیدا ہوئے۔

اور دوسری اور تیسری بات یہ کہ آپ کی ولادت ربیع الاول کے مہینہ میں دوشنبہ (پیر) کے دن صبح صادق کے وقت ہوئی۔

وھذا مالا خلاف فیہ انہ ولد صلی اللہ علیہ وسلم یوم الاثنین ثم الجمھور علی ان ذلک کان فی شھر ربیع الاول[۲]	اور اس پر کلی اتفاق ہے کہ آپ دوشنبہ (پیر) کے دن پیدا ہوئے . . . پھر جمہور کا یہ بھی فیصلہ ہے کہ ربیع الاول کا مہینہ تھا۔
قال ابو قتادۃ (رضی اللہ عنہ) ان اعرابیا قال یارسول اللہ ماتقول فی صوم یوم الاثنین فقال ذلک یوم ولدت فیہ انزل علی فیہ[۳]	ابو قتادہ (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں۔ گاؤں کے ایک آدمی نے کہا۔ اے اللہ کے رسول! آپ پیر کے دن کے متعلق کیا فرماتے ہیں۔ آپ نے ارشاد فرمایا "یہ وہ دن ہے جس میں میری ولادت ہوئی اور جس میں مجھ پر سب سے پہلی وحی نازل ہوئی۔

لیکن اہل سیر تاریخ اس باب میں مختلف الرائے ہیں کہ ربیع الاول کی کون سی تاریخ تھی عوام میں تو مشہور قول یہ ہے کہ ۱۲۔ ربیع الاول تھی اور بعض کمزور روایات اس کی پشت پر ہیں اور اکثر علماء ۸۔ ربیع الاول کہتے ہیں لیکن صحیح اور مستند قول یہ ہے کہ ۹۔ ربیع الاول تاریخ ولادت ہے اور مشاہیر علماء تاریخ وحدیث اور جلیل المرتبہ ائمہ دین اسی تاریخ کو "صحیح" اور "ثابت" کہتے ہیں چنانچہ حمیدی، عقیل، یونس بن یزید، ابن عبداللہ، ابن حزم

---

[۱] تاریخ ابن کثیر جلد ۲ ص ۲۶۱ [۲] ایضاً جلد ۲ ص ۲۶۱ [۳] مسلم

محمد بن موسیٰ خوارزمی، ابوالخطاب ابن وحیہ، ابن تیمیہ، ابن قیم، ابن کثیر، ابن حجر عسقلانی شیخ بدرالدین عینی جیسے مقتدر علماء کی یہی رائے ہے۔

محمود پاشا فلکی نے (جو قسطنطنیہ کا مشہور ہیئت داں اور منجم گذرا ہے) ہیئت کے مطابق جو زائچہ اس غرض سے مرتب کیا تھا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے زمانے سے اپنے زمانہ تک کے کسوف و خسوف (سورج گرہن و چاند گرہن) کا صحیح حساب معلوم کرے پوری تحقیق کے ساتھ یہ ثابت کیا ہے کہ سنِ ولادت باسعادت میں کسی حساب سے بھی دوشنبہ (پیر) کا دن ۱۲۔ ربیع الاول کو نہیں آتا بلکہ ۹۔ ربیع الاول کو ہی آتا ہے اس لئے بلحاظ قوت و صحت روایات اور باعتبار حساب ہیئت و نجوم ولادت مبارک کی مستند تاریخ ۹۔ ربیع الاول ہے[1]

اصحاب فیل کے واقعہ سے کس قدر عرصہ بعد ولادت ہوئی؟ متعدد اقوال میں سے مشہور قول یہ ہے کہ پچاس دن بعد ظہور قدسی ہوا ہے۔

وقیل بخمسین یوماً — ایک قول یہ ہے کہ اصحاب فیل کے واقعہ سے پچاس دن بعد
وهو اشهر[2] — ولادت باسعادت ہوئی اور یہی قول زیادہ مشہور ہے۔

نسب مبارک | نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) عربی النسل ہیں اور عرب کے معزز قبیلہ قریش کی سب سے زیادہ مقتدر شاخ بنی ہاشم سے ہیں قرآنِ عزیز نے اہل عرب کو خطاب کرتے ہوئے متعدد مقامات پر آپ کے عربی نژاد ہونے کا ذکر کیا ہے۔

هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا — (خدا) وہ ذات ہے جس نے امیین (ان پڑھ لوگوں) میں سے
مِّنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ — ہی ایک رسول بھیجا جو ان پر اس کی آیات پڑھتا

---

[1] ۸، ۱۰ اور ۹ کا اختلاف حقیقی اختلاف نہیں ہے بلکہ مہینے کے ۲۹۔ اور ۳۰ کے حساب پر مبنی ہے اور جبکہ حساب سے ثابت ہو گیا کہ صحیح تاریخ ۲۰ر اپریل تھی تو ۸ کے متعلق تمام اقوال درحقیقت ۹ر کی تائید میں پیش ہو سکتے ہیں [2] فتح الباری جلد ۶ و تاریخ ابن کثیر جلد ۲ ص ۲۶۰

وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ (جمعه) — اور انکا تزکیہ کرتا اور انکو الکتاب (قرآن) اور حکمت سکھاتا ہے

لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ (توبہ) — بالتحقیق تمہارے پاس تم ہی میں سے ایک رسول (محمد) آیا

اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ (آل عمران) — جبکہ بھیجا اللہ نے اُن میں ایک رسول جو بلحاظ نسب اُن ہی میں سے ہے۔

وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا لِّتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰى وَمَنْ حَوْلَهَا (شوریٰ) — اسی طرح ہم نے آپ پر اسکو قرآن بزبان عربی اُتارا ہے تاکہ (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) تم مکہ والوں اور اُن کے گردوپیش کے بسنے والوں کو (برائیوں سے) ڈراؤ۔

ءَاَعْجَمِيٌّ وَّهٰذَا لِسَانٌ عَرَبِيٌّ مُّبِيْنٌ (النحل) — کیا (اس قرآن کو سکھاتا ہے کوئی عجمی) درحالیکہ یہ واضح عربی زبان ہے

ماہرین انساب عرب کا اس پر اتفاق ہے کہ آپ حضرت اسمٰعیل بن ابراہیم علیہما الصلوٰۃ والسلام کی نسل سے ہیں اس لئے قریش بغیر کسی اختلاف رائے کے عدنانی ہیں اور عدنان کے اسمٰعیلی ہونے میں دو رائے کی گنجائش ہی نہیں ہے۔

عرب کے علم الانساب کے مشہور عالم محدث ابن عبد البر تحریر فرماتے ہیں۔

واجمعوا ان محمدا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من ولد عدنان وان عدنان من ولد اسمٰعیل وان ربیعۃ ومضر من ولد اسمٰعیل [1] — اور علماء انساب کا اس پر اتفاق ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عدنان کی نسل سے ہیں اور عدنان اسمٰعیل (علیہ السلام) کی نسل سے ہیں اور ربیعہ اور مضر بھی اسمٰعیل (علیہ السلام) کی اولاد ہیں۔

علماء انساب نے نسب نامہ کی تفصیل اس طرح بیان کی ہے

---

[1] القصد والامم ص ۲۲ والانباہ علی قبائل الرواۃ ص ۷۶

محمد بن عبداللہ بن عبدالمطلب بن ہاشم بن عبد مناف بن قصی بن کلاب بن مرہ

بن کعب بن لوی بن غالب بن فہر بن مالک بن نضر بن کنانہ بن خزیمہ بن مدرکہ

بن الیاس بن مضر بن نزار بن معد بن عدنان

اور والدہ کی جانب سے آپ کا نسب نامہ کلاب پر جاکر پدری سلسلۂ نسب کے ساتھ مل جاتا ہے یعنی آمنہ بنت وہب بن عبد مناف بن زہرہ بن کلاب، کلاب کو حکیم بھی کہتے ہیں۔

البتہ عدنان اور حضرت اسمٰعیل کے درمیان سلسلے کے ناموں سے متعلق ماہرین انساب کی آراء مختلف ہیں[1] اسی لیے نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اس کے متعلق ارشاد فرما کر "کذب النسابون۔ نسب بیان کرنے والوں نے غلط بیانی کی ہے" کسی رائے کی توثیق نہیں فرمائی اور اپنے سلسلۂ نسب کے متعلق صرف اس قدر ارشاد فرمایا ہے۔

ان اللہ اصطفیٰ کنانۃ من ولد	اللہ تعالیٰ نے اسمٰعیل (علیہ السلام) کی نسل میں سے کنانہ
اسمٰعیل واصطفیٰ قریشا من	کو ممتاز بنایا اور کنانہ میں سے قریش کو عزت و عظمت بخشی
کنانۃ واصطفیٰ من قریش بنی	اور قریش میں سے بنی ہاشم کو امتیاز عطا فرمایا اور بنی ہاشم
ہاشم واصطفانی من بنی ہاشم[2]	میں سے مجھ کو منتخب فرمایا۔

گویا اس طرح سلسلۂ نسب کے صرف اُن حصوں کی تصدیق فرمائی جو ماہرین انساب کے درمیان بلا اختلاف مسلم تھے۔

اسلام نے نسبی تفاخر اور اُس پر مبنی سماجی رسم و رواج کو بہت بڑا گناہ اور جرم قرار دیا ہے۔ وہ کہتا ہے خدا کے یہاں فضیلت کا معیار "ایمان اور عمل صالح" ہو

[1] البدایہ والنہایہ جلد ۲ [2] مسلم

اور وہاں حسب و نسب کی کوئی پرسش نہیں ہے نیز نسبی تفاخر اسلام کے بنیادی قانون "اخوت اسلامی" کے قطعاً منافی ہے اس لئے اسلام کے اجتماعی دستور میں اس کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے۔

تاہم واقعاتی طور پر تاریخ یہ پتہ دیتی ہے کہ ہمیشہ انبیاء و رسل (علیہم السلام) اپنی قوم اور اپنے ملک کے معزز خاندان میں سے ہوتے رہے ہیں حکمتِ خداوندی کا یہ فیصلہ غالباً اس لئے ہوا کہ قوموں اور ملکوں کے رسم و رواج اور نسبی تفاخر کے خلاف اُن کی دعوتِ حق اور اُن کا پیغام صداقت کہیں ذاتی مفاد کے لئے نہ سمجھ لیا جائے اور اس طرح اُس کا اخلاقی پہلو کمزور نہ ہو جائے مثلاً کسی سماجی زندگی میں ذات پات کی تقسیم اور کاسٹ سسٹم اس طرح موجود ہے کہ اُس کی وجہ سے بعض انسان بعض کو حقیر و ذلیل سمجھنے لگے ہیں تو اگر اس قوم یا ملک میں کوئی پیغمبر اُس خاندان سے تعلق رکھتا ہو جسکو قومی اور ملکی رواج نے پنچ اور پست اقوام کا لقب دے رکھا ہو ایسی حالت میں اس ظلمِ صریح اور باطل کوشی کے خلاف اُس پیغمبر کی صدائے حق اتنی سرعت کے ساتھ کامیاب ہوتی جس قدر اس حالت میں ہو سکتی ہے جبکہ وہ خود اس قوم و ملک کے اونچے خاندان سے تعلق رکھتا ہو اور صرف ایک اسی خاص مسئلہ میں نہیں بلکہ اُس کے پیغام حق کی تمام اصلاحات میں یہ فرق ضرور نظر آئے گا۔

بہر حال یہ حکمت ہر مقام اور ہر موقعہ پر مفید ہو یا نہ ہو عرب کے حالات و واقعات کے لئے ازبس مناسب اور مفید ثابت ہوئی چنانچہ صدائے اسلام نے جب اپنی انقلابی اور اصلاحی گرج سے روحانیت کی خفتہ کائنات میں تہلکہ ڈال دیا تو ایک جانب نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اہل عرب کو یہ سنایا کہ جہاں تک خاندانی امتیاز کا

تعلق ہے تو میں قریشی بھی ہوں اور ہاشمی بھی اور یہ امتیاز تمہارے نقطۂ نظر سے بہت بلند ہو مگر میری نگاہ میں اس کی حیثیت صرف یہ ہے "ولا فخر یہ کوئی فخر کرنے کی چیز نہیں ہے" اور دوسری جانب نسبی تفاخر کی بنیادوں کے انہدام اور مساوات انسانی کی دعوتِ عام کے لیئے اس خدائی فرمان کا اعلان کر کے کائنات انسانی کی تمام تاریک ذہنیت کے خلاف انقلاب عظیم برپا کر دیا۔

یَاَیُّھَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰکُمْ مِّنْ	لوگو! ہم نے تم سب کو ایک مرد و عورت سے پیدا کیا ہے یعنی
ذَکَرٍ وَّ اُنْثٰی وَجَعَلْنٰکُمْ شُعُوْبًا	تخلیق انسانی کی ابتداء آدم اور اسکی بیوی حوا علیہما السلام
وَّ قَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا اِنَّ اَکْرَمَکُمْ	سے ہوئی ہے اور تم کو خاندانوں اور قبیلوں میں صرف اس لئے
عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ (الحجرات)	بانٹ دیا ہے کہ آپس میں صلۂ رحمی کے لئے پہچان اور معرفت

کا طریقہ قائم کر لو اور اصل یہ ہے کہ، بلاشبہ اللہ کے نزدیک وہی عزت والا ہے جو تم میں سے پرہیزگاری کی زندگی بسر کرنے والا ہے۔

اور حجۃ الوداع کے موقعہ پر جب آپ ہزارہا صحابہ کی موجودگی میں وداعی پیغام سنا رہے اور اسلام کے بنیادی اصول کے استحکام کے لیئے اہم وصایا پیش فرما رہے تھے اس حکم خداوندی کی تائید میں یہ انقلاب آفریں پیغام بھی ارشاد فرمایا۔

ان اللہ یقول یایھا الناس انا	اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے اے افراد نسل انسانی
خلقنٰکم من ذکر و انثی وجعلنٰکم	بلاشبہ ہم نے تم کو ایک مرد و عورت سے پیدا کیا ہے اور
شعوبا و قبائل لتعارفوا ان	ہم نے تمہارے درمیان خاندان اور قبائل بنا دیئے
اکرمکم عند اللہ اتقٰکم"	ہیں تاکہ صلۂ رحمی کے لئے، تعارف پیدا کرو بلا
فلیس لعربی علی عجمی فضل،	شبہ تم میں اللہ کے نزدیک وہی برگزیدہ ہے جو زیادہ

ولا لعجمی علی عربی فضل ولا لاسود علی ابیض فضل ولا لابیض علی اسود فضل الا بالتقوی یا معشر قریش لا تجیئوا بالدنیا تحملونها علی رقابکم ویجئ الناس بالاخرۃ فانی لا اغنی عنکم من اللہ شیئا الخ[1]

متقی و نیک کردار ہی ہیں خوب یاد رکھو کہ نہ عربی کو عجمی پر کوئی فضیلت ہے اور نہ عجمی کو عربی پر کوئی برتری حاصل ہے نہ کالے کو گورے پر کوئی فضیلت ہے اور نہ گورے کو کالے پر کوئی برتری، بلکہ ان سب کے لئے فضیلت کا معیار صرف تقوی و نیک عملی ہے۔ اے گروہ قریش ایسا نہ ہو کہ تم خاندانی فخر کے زعم باطل کی وجہ سے قیامت میں، دنیا کو کاندھے پر لاد کر لاؤ اور دوسرے لوگ نیک عملی کی بدولت آخرت کا سامان لے کر آئیں واضح رہے کہ تمہارے محض قریشی ہونے کی وجہ سے میں تم کو خدا کے فیصلے سے قطعاً بے پرواہ نہیں بنا سکتا (خدا کے یہاں تو صرف عمل ہی کام آئے گا)

اور ایک مرتبہ نسبی فخر کے خلاف تبلیغ حق کرتے ہوئے اس کو "جاہلی تعصب" فرمایا اور مسلمانوں کو اس سے بچنے کے لئے سخت تاکید فرمائی۔ ارشاد فرمایا۔

ان اللہ تعالی قد اذھب عنکم عبیۃ الجاھلیۃ وفخرھا بالآباء وانما ھو مؤمن تقی او فاجر شقی الناس کلھم بنو آدم وآدم خلق من تراب[2]

اللہ تعالی نے دعوت اسلام کے ذریعہ تمہارے درمیان سے جاہلیت کے تعصب اور نسبی فخر کو مٹا دیا ہے اور اب انسان یا نکوکار مومن ہے اور یا بدکار باغی ہے انسان آدم کی اولاد ہیں اور آدم کی پیدائش مٹی سے ہوئی ہے (پھر فخر کرنے کا کیا موقع ہے)؟

اسی مقدس تعلیم کا نتیجہ تھا کہ اسلام کے دور اولیں میں نہ ذات پات کا کوئی

---

[1] جمع الفوائد جلد ا از معجم طبرانی کبیر [2] ابوداؤد، ترمذی

سوال باقی رہ گیا تھا اور نہ خاندانی تفاخر کی کوئی حیثیت سمجھی جاتی تھی اور اس صدائے حق نے غلاموں تک کو سروری بخشدی تھی چنانچہ اسامہ بن زید کی سالاری لشکر اور امامت تھا اور بلال حبشی کے لئے صدیق اکبر کا یہ ارشاد "سیدنا بلال" تھا اس امت کے سردار قریشی اور ہاشمی صحابہ کے درمیان ایک عجمی النسل ابو ہریرہ کی جلالت عظمت، صہیب رومی اور سلمان فارسی کی رفعت و بلندی مرتبت اور اسی قسم کے ہزاروں واقعات تھے جو چشم فلک نے آنکھوں سے دیکھے اور تاریخ نے آغوش صفحات میں محفوظ رکھے ہیں مگر وائے بدبختی کہ بیرونی اثرات اور عرب سے باہر عجمی ماحول نے ایک عرصہ کے بعد مسلمانوں کو پھر اسی لعنت سے دوچار کر دیا جس کا مرثیہ اقبال مرحوم کو اس طرح کرنا پڑا۔

فرقہ بندی ہے کہیں اور کہیں ذاتیں ہیں　　کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں

سرور دو عالم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے یہ فرما کر "انما ھو مومن تقی او فاجر شقی" اس مسئلہ کو اس درجہ صاف کر دیا تھا کہ مسلمانوں کی زندگی میں کبھی اس کے برعکس زندگی کا کوئی اثر پڑنا ہی نہیں چاہیئے تھا۔ ذات پات تو صرف اس لئے تھیں کہ چھوٹے چھوٹے حلقوں میں باہمی تعارف، صلہ رحمی اور حسن سلوک کا معاملہ ایک دوسرے کے ساتھ آسانی ہو سکے ورنہ کیسی ذات، کہاں کا خاندان؟ کون برادری؟ یہاں تو صرف دو ہی فطری اور نیچرل تقسیمیں ہیں یا "نکوکار" یا "بدکار" کسی قوم، کسی خاندان اور کسی ملک کا انسان ہو اگر سچی خدا پرستی اور نکوکاری رکھتا ہے تو وہ سب ایک برادری اور ایک قوم ہیں اور اگر مشرک و کافر اور بدکار یا پاپی تو یہ سب ایک گروہ اور ایک ٹولی ہیں۔

یتیمی | خاتم الانبیاء محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے والد ماجد کا نام عبداللہ اور والدہ

ماجدہ کا آمنہ تھا۔ ابھی آفتابِ ہدایت نے کائناتِ ہست و بود میں طلوع نہیں کیا تھا اور حضرت آمنہ کی مشکوئے معلی اس ودیعت کی امین ہی تھی کہ والد ماجد کا انتقال ہو گیا اور ارباب سیرت کہتے ہیں کہ حضرت عبداللہ ایک قافلۂ تجارت کے ساتھ شام تشریف لے گئے تھے واپسی میں جب قافلہ مدینہ (یثرب) پہنچا تو وہ بیمار ہو گئے اور اس لئے اپنے ننہال بنی نجار میں قیام پذیر رہے۔ قافلہ جب مکہ پہنچا تو عبدالمطلب نے بیٹے کے متعلق دریافت کیا۔ قافلہ نے اُن کی بیماری اور مدینہ میں قیام کا واقعہ کہہ سنایا، تب عبدالمطلب نے اپنے بڑے لڑکے حارث کو دریافتِ حال کے لئے مدینہ بھیجا۔ حارث جب مدینہ پہنچے تو معلوم ہوا کہ حضرت عبداللہ نے ایک ماہ چند روز بیمار رہ کر داعیٔ اجل کو لبیک کہہ دیا، واپس آکر جب حارث نے باپ کو حادثہ کی اطلاع دی تو عبدالمطلب اور تمام خاندان کو اس صدمہ جانکاہ نے بے حال کر دیا۔ کیوں کہ عبداللہ اپنے باپ اور بھائیوں کے بہت چہیتے تھے۔

غرض جب ولادت باسعادت ہوئی تو اُس سے قبل ہی آپ کو یتیمی کا شرف حاصل ہو چکا تھا، چنانچہ قرآن نے آپ کی یتیمی دنیوی وسائل سے محرومی کے باوجود آغوشِ رحمتِ کردگار میں نشو و نما پاکر ہادیٔ عالم بننے کا معجزانہ اختصار کے ساتھ سورۂ والضحیٰ میں تذکرہ کیا ہے۔

اَلَمْ یَجِدْكَ یَتِیْمًا فَاٰوٰی ۝ وَوَجَدَكَ	(اے پیغمبر!) کیا تجھ کو خدا نے یتیم نہیں پایا پھر اپنی
ضَآلًّا فَهَدٰی ۝ وَوَجَدَكَ	آغوشِ رحمت میں (جگہ دی) اور کیا تجھ کو ناواقف
عَآئِلًا فَاَغْنٰی ۝	نہیں پایا پھر تجھ کو (کائنات کی ہدایت کے لئے) ہدایت

تاب بنایا اور کیا تجھ کو دہر تہ کے وسائل سے محروم و محتاج نہیں پایا پھر تجھ کو ہر قسم کی سروری دے کر، غنی بنا دیا۔

بقول حضرت ابو قتادہ (رضی اللہ عنہ) ان آیات میں عجیب و غریب اعجاز اور اسلوبِ بیان کے ساتھ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ کے تمام ارتقائی مدارج کا تذکرہ ہے تم سمجھتے ہو کہ "فآوٰی" کے معنی یہ ہیں کہ پروردگارِ عالم نے آپ کو رہنے سہنے کی صورت پیدا کردی یا آپ کو بے یارومددگار نہیں رہنے دیا، یہ بھی صحیح ہے مگر اس کلامِ ربانی کی اصل روح یہ ہے کہ اُس نے ذاتِ اقدس کو ہر قسم کے مادی اسباب و وسائل سے بے پرواہ رکھ کر اپنی آغوشِ رحمت میں لے لیا اور آپ کے نشوو ارتقار کو خالص اپنی تربیت میں کامل و مکمل کیا۔[1] اور "وَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى" کی تفسیر کو خود قرآن ہی نے دوسری جگہ روشن کردیا ہے مثلاً سورۂ شوریٰ میں ہے۔

وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ	اور اسی طرح ہم نے تیری جانب اپنے "امر" کی روح کا القاء کیا
رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا مَا كُنْتَ تَدْرِيْ	(حالانکہ اس سے پہلے) نہ تو کتاب (قرآن) سے واقف تھا اور نہ
مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ وَلٰكِنْ	ایمان (کی حقیقت) سے لیکن ہم نے اس کو "نور" (روشنی) بنادیا
جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِيْ بِهٖ مَنْ	ہم اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتے ہیں (اُس کی صلاحیت و
نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا (شوریٰ)	استعداد کے پیشِ نظر) اس کے ذریعہ ہدایت دیتے ہیں۔

اور آیت "عَآئِلًا فَاَغْنٰى" میں دنیوی احتیاج و غنیٰ کا ذکر روحِ کلام نہیں ہے بلکہ اس جانب اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو قربت و کمال کا وہ مرتبۂ عظمیٰ عطا فرمایا ہے کہ مادی اور روحانی ہر قسم کی احتیاج سے بالاتر بنا کر صفاتِ حمیدہ اور اخلاقِ کریمانہ کی مثلِ اعلیٰ "غنیٰ" سے بہرہ ور بنا دیا، یہی وہ غنیٰ ہے جس کا خود ذاتِ اقدس (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اس طرح ذکر فرمایا ہے۔

[1] تفسیر ابن کثیر۔

لیس الغنیٰ عن کثرۃ العرض — غنیٰ مالداری کی بہتات کا نام نہیں ہے حقیقی غنیٰ "نفس کا
ولکن الغنیٰ غنی النفس [۵] — ماسوی اللہ سے مستغنی ہوجانا" ہے۔

عمر مبارک ابھی چھ سال ہی کی تھی کہ آپ کی والدہ ماجدہ آمنہ کا بھی انتقال ہوگیا، بی بی آمنہ آپ کو آپ کے ننہال (مدینہ) میں لے کر گئی تھیں، واپسی میں مقام ابواء میں بیمار ہوگئیں اور چند روز علیل رہ کر انتقال فرمایا اور سن مبارک ابھی آٹھ منزلیں ہی طے کر پایا تھا کہ دادا عبد المطلب نے بھی دنیا سے منہ موڑ لیا اور اس طرح عہد طفلی ہی میں وسائلِ تربیت اور دنیوی اسباب کفالت سے محرومی نے گویا مشیتِ الٰہی کی جانب سے یہ اعلان کر دیا کہ جس ذاتِ قدسی صفات کو خدائے واحد نے خالص اپنی تربیت کے لئے منتخب کر لیا ہے کیسے ممکن ہے کہ اُس کو دنیوی اسبابِ و وسائلِ تربیت کا محتاج بنائے؟

اللہ تعالیٰ نے ایک یتیم و یسیر اور مادی وسائل سے محرومِ ہستی کو اپنے لئے چن کر کس طرح اپنی ربوبیتِ کاملہ کا مظہر بنایا۔ سورۂ انشراح میں اس حقیقت کو اچھوتے انداز میں بیان فرمایا ہے۔

اَلَمۡ نَشۡرَحۡ لَكَ صَدۡرَكَ ۝ — کیا ہم نے (قبول حق و صداقت کیلئے) تیرا سینہ نہیں کھول دیا اور
وَوَضَعۡنَا عَنۡكَ وِزۡرَكَ ۝ — معرفتِ الٰہی کی حقیقی طلب اور قوم اور کائناتِ انسانی کی بے راہ روی
الَّذِیۤ اَنۡقَضَ ظَهۡرَكَ ۝ — پر ان کی ہدایت کی تڑپ کا) وہ بوجھ ہم نے تجھ سے دور کر دیا جس نے تیری
وَرَفَعۡنَا لَكَ ذِكۡرَكَ ۝ — کمر توڑ رکھی تھی اور ہم نے تیرے ذکر کو کائناتِ ہست و بود میں بلند کر دیا

"شرح صدر" یہ کہ اب وسائلِ تعلیم و تعلم کے ذریعہ حاصل ہونے والے تمام علوم و معارف اُس عطاءِ الٰہی اور وہبی معرفت و علم کے سامنے ہیچ ہوکر رہ گئے ہیں جس کی سمائی کے لئے ہم نے تیرے سینہ کو کھول دیا ہے، اب علوم و معارف کے بحرِ ناپیدا کنار بھی ہوں تو تیرے سینہ کا

[۵] تفسیر ابن کثیر

دامنِ وسیع ان کے لئے کافی ووافی ہے اور اسی "شرحِ صدر" نے معرفتِ الٰہی کے تمام پوشیدہ گنجینے تجھ پر [illegible] اور وہ سارا بوجھ تیرے سینہ پر سے ہٹ گیا جس نے تیری کمر کو اس لئے شکستہ کر رکھا تھا کہ قلبی جستجو اور دلی تڑپ کے باوجود تو اس سے قبل نہیں جانتا تھا کہ معرفتِ الٰہی کی راہِ مستقیم کون سی ہے اور گم کردہ راہوں کی راہنمائی کی سبیل کیا ہے؟ مگر اب یہ سب کچھ روشن ہو جانے کے بعد ہم نے عالمِ بالا و پست میں تیرے ذکر کو وہ بلندی اور رفعت عطا فرمائی کہ تیرا مقام "بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر" قرار پایا، چنانچہ نام احمدؐ و محمدؐ ہے اور مقام، مقامِ محمود، سورۂ الحمد وظیفۂ حیات ہے اور لواءِ حمد قیامت میں طغرائے امتیاز۔

حسنِ یوسف، دمِ عیسٰی یدِ بیضا داری   آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

یہی نہیں بلکہ "قرآن کی تجدیدِ دعوت کے ذریعہ تیری صدائے حق نے اعتقاد و عمل اور ایمان و کردار کی راہ سے تمام دنیا کے نظامہائے اجتماعی و سماجی میں جو عظیم الشان انقلاب بپا کر دیا اور سوسائٹی کے ہر شعبہ کی پرانی اور فرسودہ بساط کو الٹ کر جو نئی بساط بچھا دی اس نے تیرے ذکر کو وہ رفعت و برتری عطا کی کہ کوئی قوم، کوئی مذہب اور کوئی جماعت کسی نہ کسی شکل میں اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔

بت پرستی سے نفرت، خلوت پسندی اور عبادتِ الٰہی کا ذوق

عہدِ طفولیت سے ازدواجی زندگی کے ابتدائی مراحل تک کے حالات و واقعات تفصیل کے ساتھ کتبِ سیرت و حدیث میں منقول ہیں، اس لئے وہیں لائقِ مراجعت ہیں۔ مختصر یہ کہ دادا عبدالمطلب کے انتقال کے بعد آپ کے چچا ابوطالب آپ کے ساتھ بہت اُنس رکھتے تھے اور زندگی بھر آپ کی رفاقت کا حق ادا کرتے رہے، انبیاء و رسل کی سنت کے مطابق آپ نے اپنی روزی کا بار کسی پر نہیں ڈالا اور دنیوی مشاغل میں آپ نے بکریاں بھی چرائیں اور تجارت بھی کی، شام کے

مشہور تجارتی شہر بُصریٰ میں بھی اس غرض سے تشریف لے گئے اور پچیس ۲۵ سال کی عمر میں یہی سفر حضرت خدیجۃ الکبریٰ (رضی اللہ عنہا) سے عقد کا باعث ہوا، آپ خدیجہ رضؓ کا مالِ تجارت مضاربت پر بُصریٰ کی منڈی میں لے گئے، خدیجہؓ کا غلام میسرہ بھی رفیق سفر تھا اس درمیان میں آپ کی صداقت و امانت، ایک یہودی راہب کی بشارت اور بیش بہا منافع تجارت کا جو تجربہ اور مشاہدہ کیا تھا میسرہ نے وہ سب حضرت خدیجہؓ سے کہہ سنایا چنانچہ یہی تاثر ازدواجی رشتہ کا باعث بن گیا۔

اب زندگی میں ایک اور انقلاب ہوا کہ آپ کو خلوت گزینی کی رغبت ہوئی اور غارِ حرا میں روز و شب بسر ہونے لگے، بت پرستی سے شروع ہی میں نفرت تھی اس لئے کبھی نہ کسی صنم کے آگے سر جھکایا اور نہ کسی ایسی مجلس میں شرکت فرمائی جو صنم پرستی کے میلے کہلاتے تھے، اب خلوت میں فطرتِ سلیم جس طرح راہنمائی کرتی، خدائے واحد کی عبادت کرتے مگر ایک خلش سینہ میں ایسی تھی جو اس حالت میں بھی بے چین ہی رکھتی، اکثر یہ سوچ کر تڑپ جاتے تھے کہ میری قوم خصوصاً اور دنیاءِ انسانی عموماً کس طرح خدائے واحد کو چھوڑ کر صنم پرستی اور مظاہر پرستی میں مبتلا ہے اور یہ کہ اخلاق کی دنیا کس طرح اُلٹ گئی ہے آخر وہ کونسا نسخۂ کیمیا ہے جو اس حالت میں انقلاب پیدا کر دے اور سچی خدا پرستی اور نیک عملی پھر ایک مرتبہ اپنی نمود دکھلائے۔

یہی جذبات و تاثرات تھے جو قلبِ مضطرب میں موجزن تھے اور خلوت کدۂ حرا میں انہی کیفیات کے ساتھ ذاتِ اقدس مصروفِ یادِ الٰہی رہتی اور جب کئی کئی دن اس طرح گذر جاتے تو کبھی حضرت خدیجہؓ حاضر ہو کر آذوقۂ حیات دے جاتیں اور کبھی خود بنفسِ نفیس جا کر چند روز کا سامانِ خورد و نوش لے آتے اور حرا میں پھر مشغولِ عبادت ہو جاتے چنانچہ

چودہ صدیاں گذرنے کے بعد بھی آج حرا زبان سے اس کیف آگیں منظر کا شاہد ہے جس کا لطف اس نے برسوں اٹھایا ہے، مشہور محدث و مورخ حافظ عماد الدین بن کثیر نے اس واقعہ کو ان مختصر الفاظ میں حسن و خوبی کے ساتھ بیان کیا ہے۔

وانما کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم	اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (دور شباب میں) خلوت پسند
یحب الخلاء والانفراد علی قومہ لما	ہوگئے تھے اور قوم سے الگ تنہائی میں وقت گذارتے تھے
یراھم علیہ من الضلال المبین	کیونکہ وہ قوم کی اس کھلی گمراہی کو دیکھ کر کہ وہ بت پرستی
من عبادۃ الاوثان والسجود	میں مبتلا اور بتوں کے سامنے سجدہ گذار رہے' کرتے تھے
للاصنام وقویت محبتہ للخلوۃ	اور جوں جوں آپ پر وحی الٰہی کے نزول کا زمانہ قریب ہوتا
عند مقاربۃ ایحاء اللہ الیہ	جاتا تھا (مشیت الٰہی سے) اسی قدر آپ کی خلوت پسندی
صلوات اللہ وسلامہ علیہ۔	میں اضافہ ہوتا جاتا تھا' صلوات اللہ وسلامہ علیہ اس
لہ	ذاتِ اقدس پر خدا کی رحمتیں اور سلامتی نازل ہو۔

بہرحال یہی وہ خلوت کدۂ عبادت تھا جہاں ذاتِ اقدس پر سب سے پہلے "وحی الٰہی" کا نزول ہوا اور بالترتیب سورۂ "اقرأ" اور سورۂ "مدثر" کی چند آیات سُنانے کے لئے بشیر و نذیر بنا دیا۔

حقیقتِ وحی؟ | یہ "وحی" و "تنزیل" کیا ہے جس کو "نبوت و رسالت" کے خصائص میں سے کہا جاتا ہے اور یہ "منصب نبوت و رسالت" کیا شے ہے جس کا "وحی و تنزیل" کے ساتھ اتنا گہرا اور قریبی تعلق ہے کہ منطقی اصطلاح میں "لازم و ملزوم" کہا جا سکتا ہے، اور اس اصطلاحی گفتگو سے قطع نظر سادہ الفاظ میں اس سوال کو کیوں نہ اس طرح پیش کر دیا جائے کہ

لہ البدایۃ والنہایۃ جلد ۳ ص ۵

کائناتِ انسانی کے ہر معاملہ میں جبکہ حسن و قبح کے درمیان امتیاز پیدا کرنے کے لئے فطرت نے ہم کو "جوہرِ عقل" عطا کر دیا ہے اور انسان کے اندر کی یہ سرچ لائٹ (Search light.) ہر ایک مادی شعبۂ حیات میں راہنمائی کرتی ہے تو پھر "رسول و نبی کے ذریعہ پیغامِ الٰہی" کی حاجت کیا ہے؟ اور عالمِ روحانیات کے مسائل اور معرفت الٰہی کے حصول میں تنہا "عقل" ہی کیوں کافی نہیں سمجھی جاتی؟ یہی وہ سوال ہے جس کے حل ہو جانے پر "وحی" اور "نبوت" دونوں کی حقیقت بھی خود بخود واضح ہو جا سکتی ہے۔

اس سوال کو حل کرنے کے لئے پہلے ایک تمہید قابلِ توجہ ہے اور در اصل وہی اس مسئلہ کی کلید ہے۔

تم جب کائنات کے وجود و خلق کو عمیق فکر و نظر سے مشاہدہ کرتے ہو تو یہ حقیقت ہر جگہ اُبھری ہوئی نظر آتی ہے کہ خالقِ کائنات نے اپنی ربوبیتِ کاملہ کے فیض و عطا سے ہر شے کو جس طرح وجود بخشا اور خلق کیا اس کو "ہدایت" (راہنمائی) سے بھی سرفراز کیا ہے اور اگر یہ نہ ہوتی تو کائنات کا وجود و خلق مہمل اور بیکار ہو جاتا، کیونکہ یہی "ہدایت" ہر ایک جاندار پر زندگی اور معیشت کی راہ کھولتی اُن کی حیات کو مفید بناتی اور ضروریاتِ حیات کی طلب و حصول میں راہنمائی کرتی ہے، اور یہی ناموسِ فطرت کا وہ فیضِ عام ہے جس کے بغیر کوئی مخلوق بھی سامانِ حیات اور وسائلِ تربیت سے استفادہ نہیں کر سکتی اور نہ وجود و حیات کی یہ گرمجوشیاں ہی ظہور پذیر ہو سکتیں۔

"مچھلی کے جائے کِن تیرائے" اسی حقیقت کی جانب اشارہ ہے، وہ جب اس دنیا میں آنکھ کھولتے ہیں تو خود بخود پانی میں تیرنے لگتے اور اپنی غذا کی جستجو میں مصروف ہو جاتے ہیں، پرندوں کے بچے انڈے سے باہر آتے ہی ہوا میں اُڑنے کی کیوں کوشش کرتے نظر

آتے ہیں، حیوان اور انسان کا بچہ جب اس کارگاہِ ہستی میں قدم رکھتا ہے تو بھوک و پیاس دور کرنے کے لئے ماں باپ سے تعلیم حاصل نہیں کرتا بلکہ خود بخود ماں کے سینہ پر منہ رکھ کر غذا کے خزانہ سے دودھ کیوں چوسنے لگتا ہے۔ آخر یہ سب کیا ہے؟ اور کیوں ہے؟ تم کہتے ہو کہ یہ فطرت کا قانون ہے جو ان سب کو "فیضِ ہدایت" سے فیضیاب کر کے مخلوق کی نشو و نما کا سامان مہیا کرتا ہے، یہ "ہدایت" ہے جو ہر حرکتِ حیات میں اپنا کام کر رہی ہے اور یہ "فیضِ ہدایت" ہے جو خالقِ کائنات کی جانب سے مخلوقات کی نشو و نما کے لئے "فیضِ عام" ہوا ہے۔

لیکن ابھی وسعتِ نظر کے قدم کو آگے بڑھنے دیجئے اور قدرتِ حق کے مشاہدہ کے لئے تیز گام ہو جئے تو کارگہِ قدرت اور نوامیسِ فطرت کی کرم فرمائیاں اور زیادہ جلوہ آرا نظر آئیں گی اور تم دیکھو گے کہ یہ "ہدایت" بھی دوسری موجودات کی طرح ارتقائی درجات رکھتی ہے اور ہر ایک درجہ اپنی افادیت کی نمود جدا رکھتا ہے۔ چنانچہ اس راہ میں سب سے پہلے "وجدان کی ہدایت" سامنے آتی ہے اور یہ "طبیعتِ حیوانی کے فطری اور باطنی الہام" کا نام ہے، یہی وہ ابتدائی درجہ ہے جو بچہ کو قیدِ ہستی میں آنے کے فوراً بعد ہی کسی خارجی تعلیم و تربیت کے بغیر اُس کی غذا کا پتہ دیتا اور اسبابِ حیات کے لئے معلم بنتا ہے اور یہی وہ حقیقت ہے جو انسان کی ارتقائی منزل پر پہنچ کر اور "ضمیر کی آواز" "اندر کی صدا" بن کر حقائق کی معرفت کے لئے خارجی دلائل و براہین سے زیادہ قوی حجت ثابت ہوتی ہے۔ اس کے بعد "ہدایتِ حواس" کا درجہ ہے یہ پہلے درجہ سے بلند ہے اور اس کی عطا و بخشش سے ہر ایک ذی روح دیکھنے، سننے، سونگھنے، چکھنے، چھونے کی قوتیں حاصل کرتا ہے اور ان کے ذریعہ کائناتِ عالم میں اپنی افادیت اور استفادہ دونوں کو ترقی دیتا ہے۔

قدرتِ حق کی جانب سے یہ دونوں درجے انسان اور حیوان دونوں کو عطا ہوئے ہیں اور دونوں کی یکساں طور پر راہنمائی کرتے ہیں، مگران دونوں سے بلند ایک درجہ اور ہے جو "ہدایتِ عقل" کہلاتا اور صرف "انسان" ہی کے لئے مخصوص ہے اور یہ بھی پہلے دو درجوں کی طرح بدیہی اور فطرت کے قوانین و نوامیس میں نمایاں جگہ رکھتا ہے۔ یہی وہ "ہدایت" ہے جو انسان کو بقیہ تمام حیوانات سے امتیاز بخشتی، اس کے سامنے فکر و نظر اور ترقیوں کی راہیں کھولتی ہے اور اسی کی بدولت وہ "اشرف المخلوقات" کہلانے کا مستحق سمجھا جاتا ہے۔

عطیۂ الٰہی "ہدایت" کے یہ تینوں درجے اپنے اپنے حلقۂ اثر میں حضرت انسان کی راہنمائی کا حق ادا کرتے رہتے ہیں چنانچہ "وجدان" اس میں سعیِ پیہم کا جوش و ولولہ پیدا کرتا ہے "حواس" اس کے لئے معلومات فراہم کرتے ہیں اور "عقل" اس کو جزئیات و کلیات کا علم بخشتی اور اُن سے متعلق احکام و نتائج ترتیب دیتی ہے۔

غرض یہی وہ "ہدایت" ہے، قرآن عزیز نے جس کا ذکر انسانی تخلیق و تربیت کے سلسلہ میں کیا ہے۔ مثلاً حضرت موسیٰؑ اور فرعون کے باہمی مکالمہ میں حضرت موسیٰؑ نے خدائے برحق کی ربوبیت کاملہ کا جس طرح اظہار فرمایا ہے اس کا ذکر یوں کیا ہے۔

سورہ طٰہٰ میں ہے۔

رَبُّنَا الَّذِیْ اَعْطٰی کُلَّ شَیْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰی۔	ہمارا پروردگار وہ ہے جس نے ہر چیز کو اس کی بناوٹ دی پھر اس پر راہ عمل کھول دی۔

اور سورۂ اعلیٰ میں ہے۔

اَلَّذِیْ خَلَقَ فَسَوّٰی وَالَّذِیْ	وہ پروردگار جس نے ہر چیز پیدا کی، پھر اس کو درست کیا

فَقَدَّرَ فَهَدٰى ؎ | پھر ہر وجود کے لئے ایک اندازہ ٹھہرا دیا پھر اُس پر راہِ عمل کھول دی

اور سورہ "بلد" میں ہے۔

اَلَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ عَيْنَيْنِ وَلِسَانًا وَّشَفَتَيْنِ وَهَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ (بلد) | کیا ہم نے اُس کو (دیکھنے کے لئے) دو آنکھیں نہیں دیں اور کیا (بولنے کے لئے) زبان اور دو ہونٹ نہیں دیئے، اور ہم نے اُس کو اچھی اور بُری دونوں راہیں دکھا دیں۔

اور سورۂ "دہر" میں ہے۔

اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ اَمْشَاجٍ نَّبْتَلِيْهِ فَجَعَلْنٰهُ سَمِيْعًا بَصِيْرًا۔ اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا۔ | ہم نے انسان کو (مرد و عورت کے) ملے جلے نطفہ سے پیدا کیا، جس کو (ہم) مختلف حالتوں میں پلٹتے ہیں پھر اُسے سننے والا اور دیکھنے والا بنا دیا، ہم نے اس پر راہِ عمل کھول دی۔ اب یہ اُس کا کام ہے کہ شکر گذار بنے یا ناشکر گذار۔

مگر یہ بات بھی بہت صاف ہے کہ ہدایت کے ان ہر سہ مراتب "وجدان"، "حواس" "عقل" کی راہِ عمل اپنے اپنے دائرۂ عمل ہی تک محدود ہے یعنی "وجدان" ایک جاندار کے اندر زندگی کے لئے جوشِ عمل اور سعیِ مسلسل ولولہ تو پیدا کر سکتی ہے مگر حیوان یا انسان سے باہر، محسوساتِ خارجیہ کا ادراک اور علم اس کے دائرۂ عمل سے خارج ہے، اسی طرح "ہدایت حواس" محسوسات کا ادراک ضرور پیدا کر دیتی ہے لیکن یہ اس کے احاطۂ عمل سے باہر ہے کہ

؎ اس آیت میں وجود کائنات کے چار مراتب بیان کر کے قرآن نے ایک عظیم الشان "حقائق علیہ" کا باب کھول دیا ہے، یہ چار مراتب بالترتیب "خلق، تسویہ، تقدیر، ہدایت" ہیں اور یہی چار مراتب خلاصۂ حقائق ہیں، خلق یہ کہ وجود بخشا، تسویہ یہ کہ اس کی استعداد کے مطابق اس کی درست کاری کی، تقدیر یہ کہ ہر شے سے متعلق اس کے بدء خلق سے اس کے نتیجۂ حیات تک کے لئے پہلے سے ایک مقررہ اندازہ طے کر دیا اور ہدایت یہ کہ اس پر ہر قسم کی راہِ عمل کھول دی۔ تفصیلات کتب تفاسیر میں مطالعہ فرمائیں۔

وہ محسوسات کے نتائج و احکام اور جزئیات سے کلیات کا اور کلیات سے جزئیات کا استنباط کر سکے کیونکہ یہ کارفرمائی "ہدایتِ عقل" سے متعلق ہے جو عام حیوانات کے لئے نہیں بلکہ صرف انسان کے ساتھ ہی مخصوص ہے۔

تو "ہدایتِ عقل" اگرچہ پہلی دونوں ہدایات کے مقابلہ میں بلند مرتبہ رکھتی اور کائنات کی بلند ترین ہستی (حضرت انسان) کی راہنمائی کرتی ہے تاہم اس سے بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ "عقل کا دائرہ" وسیع تر ہونے کے باوجود پھر محدود ہے کیونکہ یہ ایک حقیقتِ ثابتہ ہے کہ عقل جو کچھ اور جس قدر بھی نتائج و احکام کا استنباط و استخراج کرتی ہے اس کا دائرہ محسوسات ہی تک محدود رہتا ہے اور حواسِ خمسہ (قوتِ باصرہ، سامعہ، لامسہ، شامہ، ذائقہ) نے اپنی اپنی خدمات انجام دے کر جو کچھ ہمارے لئے فراہم کیا ہے "عقل" اسی پر اپنا تصرف کرتی اور کر سکتی ہے لیکن یہ بات کہ محسوسات کی سرحد سے پرے کیا کچھ ہے اور اس پردہ کے پیچھے کیا ہے؟ اس مقام پر پہنچ کر "عقل" بھی عاجز و درماندہ ہو کر رہ جاتی ہے اور یہ "درجۂ ہدایت" بھی اس سلسلہ میں ہم کو کسی قسم کی روشنی پہنچانے سے معذور نظر آتا ہے۔

علاوہ ازیں اگر وجدان کی تکمیل کے لئے حواس اور حواس کی تکمیل کے لئے عقل کی ہدایت موجود نہ ہوتی تو انسان ہرگز اُن مدارجِ ارتقاء اور مراتبِ رفیع پر نہ پہنچ پاتا جن تک آج پہنچا ہوا ہے اور آئندہ جن تک پہنچنے کے لئے میدانِ عمل میں گامزن ہے، اگر انسان میں وجدان کی قوت نہ ہوتی تو کس طرح حواس کی دنیا تک اپنی حیات کو پہنچا سکتا اور اگر محسوسات کے ادراک کے لئے حواس کی قوتیں نہ ہوتیں تو انسان کس طرح اپنی ذات سے خارج اشیاء کا ادراک کر سکتا اور ترقی کے لئے کوئی قدم اُٹھا سکتا اور جبکہ حواس کے وسائلِ ادراک محدود ہیں اور نہ صرف محدود بلکہ بسا اوقات گمراہی اور غلطی میں مبتلا کر دیتے ہیں

مثلاً ہم کو طویل فاصلہ کی بڑی سے بڑی چیز چھوٹی نظر آتی ہے یا خلطِ صفرار کے بڑھ جانے سے شیریں سے شیریں چیز ذائقہ میں تلخ معلوم ہوتی ہے یا فاصلہ ہونے کی وجہ سے ہم رنگوں کے امتیاز میں اکثر غلطی کر جاتے ہیں تو ان تمام حالتوں میں "عقل کی ہدایت" کام آتی اور صحیح راہنمائی کرتی ہے اور اصل حقیقت کو پیشِ نظر لاتی ہے، وہ کہتی ہے کہ اگر طویل فاصلہ کی بنا پر تم کو "جہاز" ایک چھوٹی سی چیز نظر آتا ہے تو یہ نگاہ اور قوتِ باصرہ کا قصور ہے ورنہ جہاز ایک لمبی چوڑی اور بڑی شے کا نام ہے اسی طرح شیریں اور تلخ کا فیصلہ کرتی ہے اور کہتی ہے کہ حقایق میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی شیریں ہر حالت میں شیریں ہے، اس لئے ذائقہ کی یہ تلخی مرض کی وجہ سے ہے، غرض حواس کی غلطیوں سے محفوظ رکھ کر اصل حقیقت کو واضح کرنا "عقل کی ہدایت" کا فریضہ ہے اس لئے ہم ایک قدم اور آگے بڑھا کر یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ اس سے قطع نظر ——— کہ عقل محسوسات کی حدود سے آگے کچھ نہیں جانتی ——— انسان کی عملی زندگی کے تمام حالات میں عقل کی ہدایت بھی کافی اور مؤثر ثابت نہیں ہوتی اس لئے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ نفسِ انسانی جذبات، رجحانات اور قسم قسم کی خواہشات سے متاثر و مغلوب ہے بلکہ اکثر یہ مشاہدہ ہوتا رہتا ہے کہ جب "عقل" اور "جذبات" کے درمیان کشمکش ہوتی ہے تو فتح "جذبات" ہی کی ہوتی ہے اور "عقل" درماندہ ہو کر رہ جاتی ہے تو ان حالات میں "عقل" ہی تقاضا کرتی ہے کہ یہاں "عقل سے بھی بلند" اور کوئی درجہ ہونا چاہئے جو عقل سے زیادہ مؤثر رہنما اور ہر قسم کی کوتاہیوں سے پاک اور بے لوث ثابت ہو

اس تمہید کا حاصل یہ نکلا کہ انسان محسوسات کے دائرہ میں محدود رہ کر بھی اور ماورار محسوسات کے ادراک کے لئے بھی "ہدایتِ عقل" سے بلند (ایک چوتھے) درجۂ ہدایت کا محتاج ہے تو اب لائقِ غور و فکر ہے یہ بات کہ جس "رب العلمین" نے اپنی ربوبیتِ کاملہ سے انسان کے

ارتقائی کمالات کی حاجات وضروریات کے پیشِ نظر ہدایتِ وجدان سے بلند ہدایتِ حواس اور ہدایتِ حواس سے رفیع ہدایتِ عقل عطا فرمائی تو جبکہ عقل کی ہدایت بھی خاص حدود سے آگے نہیں جا سکتی اور حصولِ کمالات اور اعمال کے صحیح ضبط و نظم کے لئے ہی کافی نہیں ہے، نیز ماورا محسوسات کے عدمِ علم کے باوجود اس کے انکار پر کوئی مثبت علمی دلیل موجود نہیں ہے بلکہ اس کے برعکس وجدانی جذبات واحساسات اور شعورِ نفس اس کے "حقیقت" ہونے کا پتہ دیتے ہیں تو کیا اُس خدائے برحق کی ربوبیت اور فیضِ رحمت کے لئے یہ منافی نہ تھا کہ وہ انسان کو "ہدایتِ عقل" سے بلند کوئی "مرتبۂ ہدایت" عطا نہ کرے؟ ضرور منافی تھا اور اس لئے ایسا نہیں ہوا بلکہ اس نے اس کو ایک اور بلند تر مرتبہ "ہدایتِ وحی" بخشا۔ یہ مرتبۂ ہدایت اپنی راہنمائی میں ہر قسم کی کوتاہیوں اور خطاء و قصور سے مامون و محفوظ ہے کیونکہ یہ خدا کی جانب سے ہر شے کی حقیقت کا علم و یقین عطا کرتا ہے اور ہدایتِ وحی کے افاضہ کی صورت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک ایسی مقدس ہستی کو جو ہر قسم کے گناہوں اور عیوب سے "معصوم" ہوتی ہے اس مقصد کے لئے چن لیتا ہے کہ وہ اس کی جانب سے کائناتِ انسانی تک "ہدایتِ وحی" کو پہنچا دے، اس لئے یہ مقدس ہستی ایک جانب لوازمِ بشریت کے ساتھ مقید رہ کر دوسرے انسانوں کی طرح "انسان" اور "بشر" کہلاتی ہے اور دوسری جانب عیوب و مآثم سے "معصوم" رہ کر خدا کے ساتھ وہ تعلق رکھتی ہے جو دوسرے مقدس سے مقدس انسانوں کو بھی حاصل نہیں ہوتا اور اس طرح خدا اور اس کے بندوں کے درمیان افاضۂ "ہدایتِ وحی" کے لئے ایلچی اور واسطہ بنتی ہے، ایسی حقیقت کا نام مذہب کی اصطلاح میں "نبوت و رسالت" ہے۔

قرآنِ حکیم نے ہدایت کے اس "مرتبۂ عالی" کا جگہ جگہ ذکر کیا ہے۔ حسب ذیل

چند شواہد ملاحظہ ہوں۔

وَاَمَّا ثَمُوْدُ فَهَدَيْنٰهُمْ فَاسْتَحَبُّوا الْعَمٰى عَلَى الْهُدٰى (حٰمٓ سجدہ)

لیکن قوم ثمود، تو اُسے بھی ہم نے راہِ حق (ہدایت) دکھلائی تھی لیکن اس نے اندھے پن کو پسند کیا اور "ہدایت" کی راہ چھوڑ دی"

قُلْ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى وَاُمِرْنَا لِنُسْلِمَ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (انعام)

(اے پیغمبر!) کہدیجئے، یقیناً اللہ کی ہدایت ہی "حقیقی ہدایت" ہے اور ہم سب کو اس کا حکم دیا گیا ہے کہ تمام کائناتِ عالم کے پروردگار کے آگے سرِ عبودیت جھکا دیں۔

وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا وَاِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِيْنَ ۝ اِنَّ عَلَيْنَا لَلْهُدٰى ۝ وَاِنَّ لَنَا لَلْاٰخِرَةَ وَالْاُوْلٰى۔

اور جن لوگوں نے ہماری راہ میں سعی و جانفشانی کی تو ضرور ہے کہ ہم بھی ان پر اپنی راہیں کھول دیں اور بلاشبہ اللہ ان لوگوں کا ساتھی اور مددگار ہے جو نیک کردار ہیں۔ بلاشبہ یہ ہمارا کام ہے کہ ہم رہنمائی کریں (ہدایت وحی عطا کریں) اور یقیناً آخرت اور دنیا دونوں ہمارے ہی لئے ہیں۔

ارتقائی نقطۂ نظر سے "ہدایتِ وحی" اور مسئلہ نبوت و رسالت کی وضاحت کے لئے اشہبِ فکر کو یوں بھی مہمیز کیا جا سکتا ہے کہ جبکہ یہ عقلی اور علمی نظریہ مسلمات میں سے ہے کہ "بقاءِ انفع" یا "بقاءِ اصلح" کے فطری قانون کے مطابق کائنات کی گوناگوں موجودات میں ہر ایک شے اپنے موجود رہنے کے لئے کوئی "حکمت و مصلحت" ضرور رکھتی ہے اور حکیم مطلق کا قانونِ فطرت کسی شے کو اسی وقت تک باقی رکھتا ہے جب تک اس کا وجود "نافع" اور "مفید" ہونے کی صلاحیت رکھتا اور جس غرض و غایت کے لئے اس کو پیدا کیا گیا ہے اس کو پورا کرتا ہے اور اسی قانون "بقاءِ انفع و اصلح" سے یہ بات بھی بہت واضح اور نمایاں طور پر ثابت ہوتی ہے کہ "نفع" اور "افادیت" کا سب سے اہم جزو یہ ہے کہ ہر شے

اپنے سے بلند مخلوق اور سلسلۂ مخلوقات میں سے ہر نوع اپنے سے بلند نوع کی بقاء کے لئے مفید و معاون ثابت ہو، پس جبکہ حضرت انسان کو عقل بھی موجوداتِ عالم کی سب سے بلند مخلوق اور مدارجِ ارتقاء کی بلند ترین کڑی تسلیم کرتی ہے اور اسی قانون کی رو سے موجوداتِ عالم کی ہر شے اس کی خدمت، اس کے نفع اور اس کی افادیت میں مصروفِ عمل نظر آتی ہے تو یہ کیوں کر ممکن تھا کہ اس اشرف المخلوقات (انسان) کا وجدان، اس کے جذباتِ عالیہ، اور اس کے افکار و خیالات کی پرواز جبکہ عالمِ مادیات سے کہیں زیادہ بلند اور رفیع ہیں اور اس کی عقل یہ جاننے کے باوجود کہ وہ ماورائِ مادہ سے ناواقف ہے پھر بھی اس پردہ کے پیچھے کچھ ہونے کا احساس رکھتی اور اس کی معرفت کے لئے چپک محسوس کرتی ہے۔ فطرتِ الٰہی کا فیضان اور بقاء انفع کا ناموس اس کو عالمِ مادیات و محسوسات ہی کے اندر محصور رکھتا، اگر ایسا ہوتا تو بلاشبہ فطرت "بخیل" ٹھہرتی بلکہ یہ فطرت کا بہت بڑا ظلم ہوتا اور یہ ظاہر ہے کہ تنہا عقل اس کو اس منزل تک پہنچانے کے لئے قاصر و ناکام ہے، لہٰذا ازبس ضروری تھا کہ "فطرتِ الٰہی" اس کی رہنمائی کے لئے مزید کوئی سامان مہیا کرتی اور انسان کی ذہنی و فکری ترقیوں کو درجۂ تکمیل تک پہنچاتی۔ پس ماورائِ مادہ علوم و معارف اور کائناتِ انسانی کی فلاح و نجات کے مقصدِ عظمیٰ کے لئے عقل کی رہنمائی کا یہی وہ فیضانِ الٰہی ہے جس کو قرآن کی اصطلاح اور مذہبی بول چال میں "وحی و نبوت" کہا جاتا ہے اور آیاتِ ذیل اسی حقیقت کا اعلان کرتی ہیں۔

وَاُوْحِیَ اِلَیَّ هٰذَا الْقُرْاٰنُ	اس نے (خدا نے) مجھ پر اس قرآن کی وحی کی تاکہ اس کے ذریعہ
لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ وَمَنْۢ بَلَغَ	تمہیں (اہلِ عرب کو) اور انھیں جن تک اس کی تعلیم پہنچ جائے
(انعام)	(ربع مسکون کو) "انکار اور بد عملی کے نتیجہ سے" ڈراؤں۔

إِنَّآ أَوْحَيْنَآ إِلَيْكَ كَمَآ أَوْحَيْنَآ
إِلَىٰ نُوحٍ وَّالنَّبِيِّينَ مِن بَعْدِهِۦ ۚ
وَأَوْحَيْنَآ إِلَىٰٓ إِبْرَٰهِيمَ وَ
إِسْمَٰعِيلَ وَإِسْحَٰقَ وَيَعْقُوبَ
وَالْأَسْبَاطِ وَعِيسَىٰ وَأَيُّوبَ وَ
يُونُسَ وَهَٰرُونَ وَسُلَيْمَٰنَ ۚ وَ
ءَاتَيْنَا دَاوُۥدَ زَبُورًا وَرُسُلًا قَدْ
قَصَصْنَٰهُمْ عَلَيْكَ مِن قَبْلُ
وَرُسُلًا لَّمْ نَقْصُصْهُمْ عَلَيْكَ ۚ
وَكَلَّمَ اللَّهُ مُوسَىٰ تَكْلِيمًا ۝
رُسُلًا مُّبَشِّرِينَ وَمُنذِرِينَ
لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَى اللَّهِ
حُجَّةٌۢ بَعْدَ الرُّسُلِ ۚ وَكَانَ
اللَّهُ عَزِيزًا حَكِيمًا ۝

(النساء)

(اے پیغمبر!) ہم نے تمہاری جانب اسی طرح "وحی" بھیجی جس
طرح نوحؑ پر اور اُن نبیوں پر جو نوحؑ کے بعد ہوئے بھیجی تھی
اور جس طرح ابراہیم، اسمٰعیل، اسحاق، یعقوب اور اولادِ
یعقوب، عیسٰی، ایوب، یونس، ہارون، سلیمان پر بھیجی اور
داؤد کو زبور عطا فرمائی، نیز خدا کے وہ رسول جن کا حال ہم
(قرآن میں) پہلے سُنا چکے ہیں اور وہ جن کا حال ہم نے تمہیں
نہیں سنایا اور (اسی طرح) اللہ نے موسیٰؑ سے کلام کیا جیسا
کہ واقعی طور پر کلام کرنا ہوتا ہے، یہ تمام رسول (خدا پرستی اور
نیک عملی پر) خوشخبری دینے والے اور (انکارِ حق پر) ڈرانے
والے تھے (اور اس لئے بھیجے گئے تھے) کہ ان کے آنے (اور
نیک و بد بتلانے) کے بعد لوگوں کے پاس کوئی حجت باقی
نہ رہے جو وہ خدا کے حضور پیش کر سکیں (یعنی یہ عذر کر سکیں
کہ ہمیں راہِ حق کی طرف کسی نے دعوت نہیں دی تھی)
اور خدا (اپنے کاموں میں) سب پر غالب ہے اور (اپنے
تمام کاموں میں) حکمت والا ہے۔

وَلَمَّا جَآءَ عِيسَىٰ بِالْبَيِّنَٰتِ قَالَ
قَدْ جِئْتُكُم بِالْحِكْمَةِ وَلِأُبَيِّنَ
لَكُم بَعْضَ الَّذِي تَخْتَلِفُونَ
فِيهِ ۖ فَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَطِيعُونِ إِنَّ

اور جب عیسٰیؑ (خدا کی) نشانیاں لے کر آیا، کہا "میں تمہارے
پاس حکمت و دانائی لے کر آیا ہوں اور اس لئے آیا ہوں کہ
بعض ان باتوں کو جن کے متعلق تمہارے درمیان اختلاف
ہے صاف صاف بیان کردوں، پس اللہ کے متقی بندے بن جاؤ

اللّٰہَ رَبِّیْ وَرَبُّکُمْ فَاعْبُدُوْہُ ھٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِیْمٌ (طٰہٰ)	اور میری پیروی کرو (اس بات میں کہ) بیشک اللہ ہی میرا اور تمہارا پروردگار ہے پس اسی کی عبادت کرو کہ یہی سیدھا راستہ ہے۔
یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ قَدْ جَآءَکُمْ بُرْھَانٌ مِّنْ رَّبِّکُمْ وَاَنْزَلْنَآ اِلَیْکُمْ نُوْرًا مُّبِیْنًا۔ فَاَمَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰہِ وَاعْتَصَمُوْا بِہٖ فَسَیُدْخِلُھُمْ فِیْ رَحْمَۃٍ مِّنْہُ وَفَضْلٍ وَّ یَھْدِیْھِمْ اِلَیْہِ صِرَاطًا مُّسْتَقِیْمًا۔ (النساء)	(اے افرادِ نسلِ انسانی!) تمہارے پاس تمہارے پروردگار کی طرف سے برہان (دلیل و حجت) آگئی اور ہم نے تمہاری طرف واضح اور آشکار روشنی بھیج دی پس جو لوگ اس پر ایمان لائے اور انھوں نے اس کا سہارا مضبوط پکڑ لیا تو وہ انھیں عنقریب اپنی رحمت کے سایہ میں داخل کردیگا اور اُن پر اپنا فضل کرے گا اور انھیں اپنے تک پہنچنے کی راہ دکھائے گا ایسی راہ جو بالکل سیدھی راہ ہے۔

قرآن نے ان آیات میں "ہدایتِ وحی" کو "حکمت" "برہان" (حجت و دلیل) اور نورِ مبین (آشکار روشنی) کہا ہے تاکہ یہ بخوبی واضح ہوجائے کہ جس طرح محسوسات و مادیات کے لئے "عقل" کو "روشنی" اور "دلیلِ راہ" کہا جاتا ہے اسی طرح عقل کے دائرۂ حدود سے آگے کے لئے "ہدایت وحی" یہی حیثیت رکھتی اور یہی خدمات انجام دیتی ہے۔

"ہدایتِ وحی" کی ضرورت پر اب تک جو کچھ کہا گیا اگر اس کے علاوہ مزید اضافہ مطلوب ہو تو مبدءِ فیاض کے اس لطیف و حسین فیضان کے متعلق اس روشن پہلو سے بھی نظر کی جاسکتی ہے کہ جب ہم حواس کی قوتوں کا فکرِ عمیق سے مطالعہ کرتے ہیں تو یہ حقیقت صاف نمایاں نظر آتی ہے کہ ناموسِ فطرت نے یہاں ایک قوت کے عملی نظام کو اس طرح سانچہ میں ڈھالا ہے کہ انسان کے اندر ودیعت کی ہوئی قوت حواس اُس وقت تک اپنا صحیح عمل نہیں کرپاتی، جب تک خارج نے اس کی مدد نہ کی جائے۔ مثلاً قوتِ باصرہ دیکھنے کی

قوت کا نام ہے اور تم اس سے اپنی زندگی میں برابر کام لیتے رہتے ہو اور اس بحث سے قطع نظر "کہ جو شے باہر موجود ہے وہ آنکھ کے باریک پردوں پر اپنا عکس ڈال رہی ہے یا آنکھ کے پردوں میں جو روشنی ہے وہ اندر سے بشکلِ شعاع نکل کر موجودِ خارجی کو متاثر کر رہی ہے اور اس کو ہم "دیکھنا کہتے ہیں" تم نے کبھی اس پر ضرور غور کیا ہوگا کہ جب تم کسی قسم کی بھی روشنی میں ہوتے ہو تو اپنی قوتِ باصرہ کی استعداد کے مطابق جس شے کو دیکھنا چاہتے ہو دیکھتے ہو لیکن جوں ہی تاریکی کا شکار ہو جاتے ہو اور شبِ دیجور کے ساتھ ابرِ سیاہ کے پردے روشنی پر چھا جاتے ہیں اُس وقت حلقۂ چشم میں قوتِ باصرہ کی موجودگی کے باوجود تم یہ کہا کرتے ہو کہ "ہاتھ کو ہاتھ نہیں سوجھتا" تو آخر بینا ہوتے ہوئے ایسا کیوں کہتے ہو؟ تمہارا جواب اُس وقت یہ ہوتا ہے کہ قانونِ قدرت نے یہی مقرر کر دیا ہے کہ باطنی قوائے عمل اُس وقت تک اپنا صحیح کام نہیں کرتے جب تک خارج سے اسی سلسلہ کی مدد نہ پہنچے اس لئے قوتِ باصرہ کی باطنی قوت بھی محتاج ہے کہ دیے (چراغ) کی روشنی سے لے کر ماہتاب و آفتاب تک جس حیثیت کی بھی روشنی اپنا عملی مظاہرہ کر سکے گی اور یہی حال دوسرے حواس کا بھی ہے۔

پس اگر یہ صحیح ہے اور بلاشبہ صحیح ہے کہ خدائے واحد کا قانونِ قدرت اور ناموسِ فطرت اپنی وحدت کی جلوہ نمائی کا مظاہرہ کائناتِ مادی اور عالمِ روحانی میں یکساں طور پر کرتا رہتا ہے تو بے تامل یہ کہا جا سکتا ہے کہ اگرچہ اس میں کوئی شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ "عقل" حضرت انسان کے اندر کی وہ روشنی ہے جس کو یدِ قدرت نے انسانیت کے ارتقائی منازل پر گامزن ہو کر انسانیت کی "مثلِ اعلیٰ" اور "مقصدِ عظمیٰ" کو پا لینے کے لئے ودیعت کیا ہے مگر مسطورۂ بالا قانون یہاں بھی اُسی طرح کارفرما ہے جیسا کہ قوائے حواس میں کارفرما نظر آتا ہے یعنی اگر "عقل" عالمِ محسوسات و مادیات کے دائرے میں اپنا عملی مظاہرہ کرنا

چاہتی ہے تو وہ محسوساتِ خارجی کی مدد کی ضرور محتاج رہتی ہے مثلاً اس کا یہ فریضہ ہے کہ جزئیات کے ذریعہ "کلی" کا استخراج کرے لیکن وہ ایسا جب ہی کر سکے گی کہ خارج میں اُس سلسلہ کی جزئیات کا ایک بڑا ذخیرہ اپنے حقائقِ اصلیہ کو اس کے سامنے پیش کرے پس اگر عقل کی روشنی اور ان حقائق کے درمیان وہم، خیال اور ظن کے تاریک پردے حائل ہو جائیں تو عقل کی روشنی ہرگز اپنا صحیح کام نہیں کر سکتی، تو اسی طرح جب وہ ماورا محسوسات (روحانیات) کی جانب اپنی روشنی کو متوجہ کرتی ہے تو یہی اوہام، ظنون خیالات جذباتِ فاسدہ کے تاریک پردے اُس کے اور عالمِ روحانیات کے درمیان عموماً حائل ہو جاتے ہیں اور وہ اکثر و بیشتر اُن سے مغلوب ہو کر گم کردہ راہ ہو جاتی اور معرفتِ حق اور معرفتِ باطل کے درمیان فرق و امتیاز سے عاجز نظر آتی ہے ایسی حالت میں خالقِ کائنات کی رحمتِ کاملہ اور ربوبیتِ تامہ اُس کو خاسر و ناکام نہیں چھوڑتی اور خارج سے اس کی پوری مدد کرتی ہے اور یہی وہ خارج کی روشنی ہے جو نبی اور پیغمبر کے ذریعہ کائناتِ انسانی تک پہنچی اور دین و مذہب کی زبان میں "وحی روشنی" کہی جاتی ہے۔ چنانچہ قرآنِ عزیز نے اسی حقیقت کو نمایاں کرنے کے لئے جگہ جگہ وحی کو "نور" (روشنی) سے تعبیر کیا ہے۔

يَاأَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَكُمْ بُرْهَانٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَأَنْزَلْنَا إِلَيْكُمْ نُوْرًا مُّبِيْنًا (النساء)	(اے افرادِ نسلِ انسانی!) تمہارے پاس تمہارے پروردگار کی جانب سے بُرہان (دلیل و حجت) آگئی اور ہم نے تمہاری جانب واضح اور آشکارا "روشنی" (وحی الٰہی بشکلِ قرآن) بھیج دی۔
قَدْ جَاءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّكِتَابٌ مُّبِيْنٌ۔ (مائدہ)	اللہ کی جانب سے تمہارے پاس (حق کی) "روشنی" آ چکی اور ایسی کتاب آگئی (جو اپنی ہدایتوں میں نہایت) روشن کتاب ہے۔

يُرِيدُونَ اَنْ يُّطْفِئُوا نُورَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ وَيَاْبَى اللّٰهُ اِلَّآ اَنْ يُّتِمَّ نُوْرَهٗ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ ۔ (توبہ)

یہ لوگ (مشرکین، یہود، نصاریٰ) چاہتے ہیں اللہ کی روشنی کو اپنی پھونکوں سے بجھا دیں حالانکہ اللہ یہ روشنی پوری کئے بغیر رہنے والا نہیں اگرچہ کافروں کو پسند نہ آئے۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى بِاٰيٰتِنَآ اَنْ اَخْرِجْ قَوْمَكَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ (ابراہیم)

اور (دیکھو، واقعہ یہ ہے کہ) ہم نے اپنی نشانیوں کے ساتھ موسیٰؑ کو بھیجا تھا کہ اپنی قوم کو تاریکیوں سے نکالے اور "روشنی" میں لائے۔

وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِيْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا وَاِنَّكَ لَتَهْدِيْٓ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۔

اور اسی طرح ہم نے تیری جانب اپنے "امر" میں سے "روح امر" کی وحی بھیجی حالانکہ اس سے قبل تو نہیں جانتا تھا کہ کیا ہے کتاب؟ اور نہیں جانتا تھا کہ کیا ہے ایمان؟ لیکن ہم نے اس کو (قرآن کو) نور (روشنی) بنایا ہے، ہم اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتے ہیں ان کو اس کے ذریعہ راہ دکھاتے ہیں اور اے پیغمبر! بلاشبہ تو (لوگوں کو) سیدھی راہ کی جانب راہنمائی کرتا ہے"

پھر اس مسئلہ کی اہمیت پر ایک دوسرے پہلو سے بھی فکر و نظر کی ضرورت ہے وہ یہ کہ ہم اس عالم ہست و بود میں روز و شب کے مشاہدات و تجربات سے یہ نتیجہ نکالنے میں حق بجانب ہوتے ہیں کہ یہاں ہر شے کی کیفیت و کمیت یا اس کی حقیقت معلوم کرنے کے لئے ایک "ترازو" یا "پیمانہ" ضرور ہے اور یہ کہ ہر ایک "پیمانہ" اور ہر ایک "ترازو" اپنے اندر ایک خاص صلاحیت رکھتا اور اپنی صلاحیت کے مطابق ہی اشیاء کے ماپ تول میں کام دیسکتا ہے۔ مثلاً موتی اور جواہرات کے تولنے کے لئے ایک خاص ترازو (کانٹا) ہے اب اگر ہم یہ چاہیں کہ اس میں شکر، روئی، غلہ جیسی چیزوں کو تولیں تو ظاہر ہے کہ اس کے لئے یہ نہیں کہ

دوسری قسم کا ترازو کام دیگا یا مثلاً کپڑا، زمین وغیرہ جیسی اشیا کی پیمائش کے لئے ہم ایک خاص قسم کا پیمانہ (گز) استعمال کرتے ہیں۔ پس اگر ہم چاہتے ہیں کہ اس سے حرارت و برودت کی بھی پیمائش کرلیں تو اس کے لئے یہ نہیں بلکہ دوسرا پیمانہ تھرمامیٹر[1] کام میں لانا ہوگا اور اسی طرح ہوا کے دباؤ اور سطح کی اونچائی معلوم کرنے کے لئے بیرومیٹر[2] اور زلزلوں اور بھونچاؤں کی حالت دریافت کرنے کے لئے سیسومیٹر[3] اور آواز کی مقدار و قوت کی پیمائش کے لئے فونومیٹر[4] جدا جدا قسم کے پیمانے استعمال کرنے ہوں گے کیونکہ اُن کی اپنی صلاحیت و استعداد کار کا یہی فطری تقاضا ہے کہ اگر اس کے خلاف ان کا استعمال کیا جائے گا تو یا قطعاً بیکار ثابت ہوں گے اور یا صحیح حقیقت نہ بتلا سکیں گے حالانکہ ان سب کا ایک ہی کام ہے یعنی "ماپ تول" اور ایک ہی نام ہے "ترازو اور پیمانہ" مگر ہر شے کی حقیقت اور اس کی کیفیت و کمیت کے پیشِ نظر چونکہ ان سب کی صلاحیتِ کار کی حدود متعین ہیں لہذا اُن میں سے کوئی ایک بھی اپنی حدود سے متجاوز ہو کر کارآمد ثابت نہیں۔

قانونِ قدرت کی کارفرمائی کو رہنما بنا کر اگر ہم اسی نقطۂ نظر سے آگے قدم بڑھائیں اور خالص مادیات سے گذر کر معنویات کی حدود پر جا پہنچیں تو یہاں بھی وہی کرشمۂ قدرت نظر آتا ہے یعنی انسان کی انفرادی و اجتماعی حیات کے لئے رحمتِ کردگار نے جو پیمانے مقرر کئے ہیں اور جن کو وجدان، حواس اور عقل کہا جاتا ہے ان میں بھی جدا جدا صلاحیتوں کے اعتبار سے حدود منقسم ہیں، مثلاً پیمانۂ "وجدان" انسان کی صرف اُسی کیفیت و حالت سے متعلق ہے جو قدرت کے ہاتھوں نے اس کے وجود کے ساتھ ساتھ اس میں ودیعت کردی ہے اور حواس کا پیمانہ اُن ہی اشیا سے تعلق رکھتا ہے جو دیکھنے، سُننے، چکھنے، چھونے اور سونگھنے

---

[1] Thermometer [2] Barometer [3] Seismometer. [4] Phonometer

ٹیں آسکتی ہیں اور پیمانۂ "عقل" ان دونوں سے آگے عالمِ مشاہدات و محسوسات کے حقائق اور اُن کی کیفیات کے جانچنے، اُن کے درمیان امتیاز پیدا کرنے، ان سے نتائج اخذ کرنے، اور اُن پر احکام صادر کرنے کی خدمت انجام دیتا ہے۔

پس اگر ہم چاہیں کہ "وجدان" سے "حواس" اور "حواس" سے "عقل" کا کام لیں تو خود عقل ہی کے نزدیک ایسا کرنا غلط ہوگا کیونکہ یہ قانونِ فطرت کی مقررہ حدود کی خلاف ورزی کے مرادف ہے جس کے اقدام پر ناکامی کے ماسوا اور کچھ ہاتھ نہیں آتا۔

لیکن عقلِ انسانی اس کے آگے نہ جاننے کے باوجود پھر جاننے کی جو جستجو رکھتی اور اپنی ترقی کو اس کے اندر محدود نہیں سمجھتی، نیز تمام خارجی دلائل سے بڑھ کر انسان کے اندر کی قوی تر حجت و برہان "وجدان" ان ہر دو عالم سے بھی بلند تر عالم کے وجود کا جو پتہ دیتی ہے اس کے پیشِ نظر ہم وسعتِ نظر کا قدم اور آگے بڑھاتے اور مسطورۂ بالا عالمِ معنویات سے لطیف تر معنوی عالم کا کھوج لگانا چاہتے، اور اس کائنات سے اپنا رشتہ جوڑنا چاہتے ہیں، جہاں حُسن، صداقت اور محبت[1] (ذاتِ حق کی صفاتِ ربوبیت، عدالت اور رحمت) اپنی جلوہ آرائیوں سے اس کائنات کو بھی منور کر رہی ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ یہاں پہنچ کر پیمانۂ عقل بھی کوتاہ ہو کر رہ جاتا ہے اور اس کی رفعتِ پرواز وہاں تک رسائی نہیں کر پاتی خصوصاً ایسی حالت میں کہ انسانوں کے درمیان "عقل" کا اس درجہ تفاوت موجود ہے کہ ایک شخص کی عقل اُس کو نہ صرف ممکن الوقوع سمجھتی ہے بلکہ اس کو وجود پذیر کر دکھاتی ہے بلکہ تفاوتِ عقلی

---

[1] آج کل علماءِ جدید میں یہ بحث جاری ہے کہ سائنس نے اپنی حدود کو اس طرح محدود رکھا کہ اس کے دائرہ میں حُسن، صداقت اور محبت کی کوئی قدر و قیمت نظر نہیں آتی اور اس لئے وہ خدا کی ہستی کی معرفت ضروری نہیں سمجھتی مگر یہ سائنس کا کمال نہیں بلکہ نقص ہے جو آج نہیں تو کل ضرور پورا ہو کر رہے گا۔

کی بوالعجبیوں کا تو یہ حال ہے کہ ایک ہی شخص کی عقل ایک وقت جس بات پر ناممکن کا فتویٰ صادر کردیتی ہے دوسرے وقت میں اُسی بات کو ممکن سمجھنے لگتی ہے تو جب پیمانۂ عقل کا عالمِ محسوسات میں یہ حال ہے، تو عالمِ غیب تک اس کی رسائی معلوم؟ اور پھر جس پیمانہ کے توازن کو غیرِ متوازن بنانے کے لئے وہم و خیال اور جذبات کا سیلِ رواں موجیں مارتا رہتا ہو کیسے کہا جاسکتا ہے کہ خارج سے مدد و یاری کے بغیر "عقل" معرفتِ الٰہی اور علومِ غیب تک رسائی حاصل کرسکتی ہے؟

پس انسان کی بیچارگی و درماندگی کے اس مقام پر بھی رحمتِ پروردگار اپنے فیضان سے اُس کو محروم نہیں رکھتی اور معنوی و روحانی حقائق کی معرفت کے لئے ایک مقدس ہستی (پیغمبر) کے ذریعہ اُس کو عقل سے بھی رفیع و لطیف پیمانہ "ہدایتِ وحی" عطا کردیتی ہے، تاکہ انسان "سعادت و شقاوت" میں امتیاز کرنے کے بعد حیاتِ سرمدی اور "نجاتِ ابدی" کو پاسکے۔

قرآنِ عزیز نے "وحی الٰہی" کو یہی حیثیت دیتے ہوئے سورۂ شوریٰ میں ارشاد فرمایا ہے۔

اَللّٰهُ الَّذِیْۤ اَنْزَلَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ وَ الْمِیْزَانَ — اللہ وہی جس نے حق کے ساتھ کتاب (قرآن) کو نازل کیا اور اتارا "میزان" (ترازو) کو یعنی دینِ حق کو جو حق و باطل کے لئے ترازو اور پیمانہ ہے۔

چنانچہ شاہ عبدالقادر (نوراللہ مرقدہ) موضح القرآن میں اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں۔

"ترازو فرمایا دین حق کو جس میں بات پوری ہے نہ کم نہ زیادہ"

صاحبِ وحی کی معرفت کی وجدانی دلیل

"ہدایتِ وحی" یا "نبوت و رسالت" کی حقیقت دانیت پر گزشتہ سطور میں کوتاہ قلمی کے باوجود جو کچھ سپردِ قرطاس کیا گیا اُس کی تکمیل کے لئے

اس سوال کو بھی حل کرنا از بس ضروری ہے کہ جب کوئی شخص یہ دعویٰ کرے کہ وہ "حاملِ وحی" ہے اور "خدا کا پیغمبر اور ایلچی" تو اُس کے دعوئے صدق و کذب کی معرفت کا کونسا طریقہ ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اگرچہ "علم الکلام" کے ماہرین (متکلمین) نے اس معرفت کے لئے بہت سے دلائل و براہین پیش کئے ہیں اور اس مسئلہ کی اہمیت کے پیشِ نظر اس پر معرکۃ الآرا بحثیں کی ہیں تاہم وہ اپنے طرزِ استدلال میں اصطلاحی فلسفیانہ اسلوب رکھتی ہیں جس کو ہم "مذہبیات" و "روحانیات" میں خاص اہمیت دینے کو آمادہ نہیں ہیں کیونکہ اس راہ میں وہی اسلوبِ بیان مفید، دلنشین اور جاذبِ قلب ہو سکتا ہے جس کی بنیاد و نہاد وجدانی طرزِ استدلال پر رکھی گئی ہو اور عقلیت کا پورا پورا لحاظ رکھتے ہوئے اصطلاحی فلسفہ و منطق کی قیود میں اس کو پابہ زنجیر نہ کر دیا گیا ہو اور یہ اس لئے کہ معرفتِ الٰہی اور معرفتِ علوم غیبیہ کے لئے دلیلِ "وجدان" سے زیادہ دوسری کوئی دلیل و برہان مؤثر نہیں ہے، اسی حکمتِ بالغہ کے پیشِ نظر قرآنِ عزیز کے تمام عقلی استدلالات — جن پر غور کرنے کے لئے "قرآن" عقل و فکر اور تدبر کو مخاطب بناتا ہے — کی بنیاد بھی "وجدان" پر قائم کی گئی ہے۔ البتہ یہ قرآنِ حکیم کا اعجازِ بلاغت ہے کہ ان وجدانی دلائل کو اگر کوئی فلسفی دقیق فلسفیانہ طریقِ استدلال کے سانچہ میں ڈھال کر زیرِ بحث لانا چاہے تو یہ وجدان پر مبنی استدلالات اسی اہمیت و قوت کے ساتھ اپنی صداقت اور ثمرۂ و نتیجہ کو اس رنگ میں بھی تسلیم کرا لیتے ہیں۔

غرض "وجدان" اس سوال کا جواب یہ دیتا ہے کہ تم مدعیِ نبوت کی زندگی کو "صداقت کی کسوٹی" پر خوب کسو اور اگر آج وہ ہستی تمہارے سامنے نہیں ہے تو تعصب اور نسلی دماغی عصبیت سے پاک اور بے لوث ہو کر بے لاگ تاریخی حقائق سے دریافت کرو پس اگر تم پر یہ حقیقت منکشف ہو جائے کہ اُس کی قبل از دعویٰ نبوت زندگی کا ہر شعبۂ حیات صداقت و حقانیت کا مظہر ہے

اور ہر ایک شعبۂ زندگی بے داغ صداقت کا پیکر اور نہ صرف اسی قدر بلکہ اس کا وجود ہر قسم کی بداخلاقیوں، گناہوں اور آلودگیوں سے پاک اور "معصوم" ہے اور اخلاقی بلندیوں کا مخزن اور ان ہی کیفیات وحالات کے ساتھ اُس نے جانے بوجھے لوگوں میں زندگی کا بڑا حصہ گذرا ہے تو پھر اس کے دعوٰئے صداقت میں شک وشبہ کرنا عقلِ سلیم کے خلاف ہوگا، کیونکہ عقل بآسانی یہ فیصلہ کرتی ہے کہ جس ہستی نے اپنی مدتِ حیات کے طویل عرصہ میں نازک سے نازک موقعوں پر بھی کبھی ایک لمحہ کے لئے انسانی دنیا پر جھوٹ نہ بولا ہو آخر دماغی وقلبی انقلابات کی وہ کونسی تاریخ ہے جس کی بنا پر ایسی باہوش وحواس ہستی کے متعلق یہ کہا جا سکے کہ وہ خالقِ کائنات "خدائے برحق" پر کذب بیانی اور افترا پردازی کے لئے یک بیک آمادہ ہو جائے چنانچہ قرآنِ عزیز نے اسی حقیقت کو سورۂ یونس میں اس طرح بیان فرمایا ہے:-

قُلْ لَّوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا تَلَوْتُهٗ عَلَيْكُمْ	اور تم کہو اگر اللہ چاہتا تو میں قرآن تمہیں سناتا ہی نہیں
وَلَآ اَدْرٰىكُمْ بِهٖ فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ	اور تمہیں اس سے خبردار ہی نہ کرتا (مگر اُس کا چاہنا یہی
عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ	ہوا کہ تم میں اُس کا کلام نازل ہو اور تمہیں اقوام عالم
فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ	کی ہدایت کا ذریعہ بنائے) پھر دیکھو، یہ واقعہ ہے کہ میں
كَذِبًا اَوْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِهٖ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ	اس معاملہ سے پہلے تم لوگوں کے اندر ایک پوری عمر بسر
الْمُجْرِمُوْنَ۔ (یونس)	کر چکا ہوں کیا تم سمجھتے بوجھتے نہیں؟

"صاحبِ وحی" کی صداقت کی یہ ایسی بہترین کسوٹی اور دلیل ہے کہ جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ۶ھ میں بادشاہانِ دنیا کے نام اسلام کی دعوت وپیغام کے سلسلہ میں والا نامے بھیجے تو وقت کی سب سے بڑی طاقت (رومن امپائر) کے بادشاہ ہرکلیوس (ہرقل) کے پاس حضرت دحیہ کلبی نامۂ مبارک لے کر پہنچے تب اس نے بھی جب آپ کی صداقت کو پرکھنا

چاہا تو سب سے پہلے اسی وجدانی دلیل کو معیارِ صداقت ٹھہرایا اور صورتِ حال یہ پیش آئی کہ اس نے سرکاری حکام سے دریافت کیا، یہاں کوئی حجازی قافلہ موجود ہے جس سے اس ہستی کے متعلق معلومات حاصل ہو سکیں؟ اتفاق سے ابوسفیانؓ (جو ابھی مسلمان نہیں ہوئے تھے) کی سرکردگی میں ایک تجارتی قافلہ مقیم تھا، چنانچہ اُن لوگوں کو شاہی دربار میں طلب کیا گیا اور ہرکلیوس نے رئیس التجارۃ (ابوسفیانؓ) سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق چند سوالات کئے جن میں سب سے اہم سوال یہ تھا کہ "وہ تمہارے اندر ہی پلا بڑھا رہا سہا ہے تو کیا تم نے اس کی زندگی کے اس طویل دور میں کبھی جھوٹ کا شائبہ پایا ہے؟" ابوسفیانؓ نے جواب دیا "کبھی نہیں، بلکہ اس کے برعکس وہ اپنی قوم میں "الصادق الامین" کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے" یہ سن کر ہرکلیوس نے یہ کہا۔

وسألتك هل كنتم تتهمونه بالكذب	میں نے تجھ سے یہ بھی دریافت کیا: کیا کبھی اُس کے
قبل ان يقول ما قال فذكرت	اس دعوے سے قبل تم نے اس کو جھوٹا پایا ہے"
ان لا: فقد اعرف انه لم يكن	تو نے کہا "کبھی نہیں" تب میں نے یقین کر لیا کہ جو
ليذر الكذب على الناس ويكذب	ہستی انسانوں پر جھوٹ کہنے کو آمادہ نہ ہو وہ کبھی خدا
على الله۔ (بخاری ج ۱)	پر جھوٹ نہیں بول سکتی۔

جو ہستی انسانوں پر جھوٹ کہنے کو آمادہ نہ ہو وہ کبھی خدا پر جھوٹ نہیں بول سکتی" دیکھئے یہ جملہ اس سلسلہ میں وجدانِ انسانی کا کس درجہ صحیح ترجمان ہے کہ ہرکلیوس نے بھی تمام عقلی و نقلی دلائل سے الگ ہو کر وجدان کے تقاضے سے پہلی دلیل جو پیش کی وہ وہی تھی جس کو وجدان کے خالق (خدائے برتر) نے اپنے پیغمبر سے (صداقتِ دعویٰ کے لئے) پیش کرائی۔ چنانچہ مولانا ابوالکلام آزاد نے ان آیات کی تفسیر اسی حقیقت کی روشنی میں اس طرح کی ہے۔

• پھر آیت (۱۶) میں صداقتِ نبوت کی ایک سب سے زیادہ واضح اور وجدانی دلیل بیان کی ہے ۔۔۔ فرمایا، ساری باتیں چھوڑ دو، صرف اس بات پر غور کرو کہ میں تم میں کوئی نیا آدمی نہیں ہوں جس کے خصائل و حالات کی تمہیں خبر نہ ہو، تم ہی میں سے ہوں اور اعلانِ وحی سے پہلے ایک پوری عمر تم میں بسر کر چکا ہوں، یعنی چالیس برس تک کی عمر کہ عمرِ انسانی کی پختگی کی کامل مدت ہے، اس تمام مدت میں میری زندگی تمہاری آنکھوں کے سامنے رہی، بتلاؤ اس تمام عرصہ میں کوئی ایک بات بھی تم نے سچائی اور امانت کے خلاف مجھ میں دیکھی؟ پھر اگر اس تمام مدت میں مجھ سے یہ نہ ہو سکا کہ کسی انسانی معاملہ میں جھوٹ بولوں تو کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ اب خدا پر بہتان باندھنے کے لئے تیار ہو جاؤں اور جھوٹ موٹ کہنے لگوں، مجھ پر اس کا کلام نازل ہوتا ہے؟ کیا اتنی سی موٹی بات بھی تم نہیں پا سکتے؟

تمام علماءِ اخلاق و نفسیات متفق ہیں کہ انسان کی عمر میں ابتدائی چالیس برس کا زمانہ اس کے اخلاق و خصائل کے ابھرنے اور بننے کا اصل زمانہ ہوتا ہے جو سانچہ اس عرصہ میں بن گیا، پھر بقیہ زندگی میں بدل نہیں سکتا، پس اگر ایک شخص چالیس برس کی عمر تک "صادق" و "امین" رہا ہے، تو کیونکر ممکن ہے کہ اکتالیسویں برس میں قدم رکھتے ہی ایسا کذاب و مفتری بن جائے کہ انسانوں پر ہی نہیں بلکہ فاطر السموات والارض (آسمان و زمین کے پیدا کرنے والے خدا) پر افترا کرنے لگے؟

چنانچہ اس کے بعد فرمایا۔ دو باتوں سے تم انکار نہیں کر سکتے جو شخص اللہ پر افترا کرے اس سے بڑھ کر کوئی شریر نہیں اور جو صادق کو جھٹلائے وہ بھی سب سے زیادہ شریر انسان ہے اور شریر و مفتری انسان کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔ اب صورتِ حال نے یہاں دونوں فریق پیدا کر دیئے، اگر میں مفتری علی اللہ ہوں تو مجھے ناکام و نامراد ہونا پڑے گا، اگر تم سچائی کے

مکذب ہو تو تمہیں اس کا خمیازہ بھگتنا ہے، فیصلہ اللہ کے ہاتھ ہے اور اس کا قانون ہے کہ مجرموں کو فلاح نہیں دیتا۔

چنانچہ اللہ کا یہ فیصلہ صادر ہو گیا جو مکذب تھے ان کا نام و نشان بھی باقی نہیں رہا جو صادق تھا، اس کا کلمۂ صدق آج تک قائم ہے اور قائم رہے گا۔[۱]

بہر حال "صاحبِ وحی" کے دعوئے صداقت کی یہ وجدانی دلیل عقلِ سلیم اور فکرِ مستقیم کی نگاہ میں "علم الیقین" پیدا کرنے کے لئے کافی ووافی ہے، تاہم بقیہ شرائط یعنی صداقتِ تعلیم نزولِ وحی کا ادعا اور مخالفین کے مقابلہ میں تحدی (چیلنج) اور تحدی کا ایفار" مدعی نبوت و رسالت" کے لئے یہ تمام امور بھی ازبس ضروری ہیں اور اپنی جگہ تفصیل طلب اور قابلِ لحاظ ہیں اس لئے کہ ان شرائط کے پیشِ نظر ہی نبی اور مصلح کے درمیان امتیاز، نبی اور ساحر و شعبدہ باز کے مابین فرقِ بیّن اور نبی اور متنبی میں تضاد قائم کیا جا سکتا ہے۔[۲]

بعثت | غرض خاتم الانبیاء محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ کے انفرادی اور اجتماعی دونوں پہلوؤں کا یہ حال تھا کہ ایک جانب خلوتہائے راز میں معرفتِ الٰہی کے لئے استغراق صراطِ مستقیم کی جستجو، نوعِ انسانی کے اصلاحِ حال کی تڑپ اور طلب تھی اور دوسری جانب افرادِ قوم و ملک کے ساتھ راست گفتاری، صداقت شعاری، حُسنِ معاملت اور اصابتِ فکر جیسے اخلاقِ کریمانہ و صفاتِ حمیدہ سے متصف معاشرتی زندگی کا مظاہرہ تھا اور اُن امتیازات کی وجہ سے ہر فرد کی نگاہ میں آپ کی وہ قدر و منزلت تھی کہ باتفاق رائے "الصادق الامین" کے لقب سے یاد کئے جاتے تھے اور کل جو دشمنی اُن کو "محمد" رسول اللہ" سے

---

[۱] ترجمان القرآن ج ۲ ص ۱۵۰۔ [۲] یہ مباحث علم کلام میں قابلِ مراجعت ہیں لیکن قصص القرآن کی تمام جلدوں کے مطالعہ سے یہ کل مبحث تسلی بخش تفصیلات کے ساتھ مل جائیں گے۔

دعوئے نبوت کی بنا پر ہوئی وہ آج محمد بن عبداللہ کے ساتھ قطعاً نہیں تھی اور سب ہی اُن کی تقدیس و تطہیر کے قائل تھے۔

یہی حالات وواقعات تھے جبکہ عمرِ مبارک چالیس منزلیں طے کر چکی تھی، رمضان کا مہینہ تھا اور آپ غارِ حرا میں مشغولِ عبادت تھے کہ اچانک آپ کے سامنے جبرئیل فرشتہ نمودار ہوا اور اس نے بشارت دی کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو ثقلین کی رشد وہدایت کے لئے چن لیا اور رسالت وپیغمبری کے منصب کبریٰ پر فائز کیا۔

یہ واقعہ چونکہ نوعِ انسانی کی تاریخ میں حیرت زا انقلاب کا باعث ثابت ہوا اور اس نے ذاتِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو معراجِ رفعت کی اس حد پہ پہنچا دیا جہاں عالمِ ادیان وملل کے تمام اصلاحات وانقلابات اسی ہستی کا فیضِ رحمت نظر آتے ہیں اس لئے تاریخ وحدیث کے روشن صفحات نے اس واقعہ کی تمام تفصیلات کو بسندِ صحیح اپنے سینہ میں محفوظ رکھا ہے چنانچہ فنِ حدیث وتاریخِ اسلام کے امام "بخاری" (رحمہ اللہ) نے اپنی مشہور و مقبول کتاب الجامع الصحیح میں صدیقۂ عائشہ کی سند سے اس واقعہ کو جن الفاظ میں نقل کیا ہے اس کا ترجمہ درجِ ذیل ہے۔ عائشہ صدیقہ فرماتی ہیں۔

نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) پر شروع میں سچی خوابوں کا سلسلہ جاری رہا، کوئی خواب آپ نہیں دیکھتے تھے مگر وہ اپنی تعبیر میں اس درجہ روشن اور صحیح ثابت ہوتا تھا جیسا کہ طلوعِ صبح کے لئے سپیدۂ صبح کا ظہور ہوتا ہے، پھر آپ کو خلوت محبوب ہوگئی اور حرا میں مشغولِ عبادت رہنے لگے۔ گاہے گاہے آپ اہل وعیال کے پاس بھی تشریف لے آتے تھے، حضرت خدیجہ (رضی اللہ عنہا) آپ کے لئے کچھ توشہ طیار کرتیں اور آپ اس کو لے کر پھر غارِ میں واپس تشریف لیجاتے، اسی طرح حرا میں مشغولِ استغراق وعبادت تھے کہ اچانک ایک روز آپ پر

خدا کا فرشتہ نمودار ہوا اور کہنے لگا "اقرءْ پڑھیے" نبی امی نے کہا "ما انا بقاری" "میں پڑھنا نہیں جانتا" پیغمبر ارشاد فرماتے تھے "کہ جب میں نے فرشتہ سے یہ کہا تو اس نے مجھ کو گرفت میں لے لیا جس کی شدت سے مجھ کو تکلیف محسوس ہونے لگی اور پھر چھوڑ کر مجھ سے دوبارہ کہا "پڑھیے" اور میں نے وہی جواب پھر دیا "میں پڑھنا نہیں جانتا" تب اس نے پھر وہی عمل کیا اور گرفت چھوڑ کر تیسری مرتبہ پھر پہلا جملہ دہرایا اور میں نے بھی وہی سابق جواب دیا غرض تین مرتبہ یہی گفتگو اور یہی عمل ہوتے رہنے کے بعد چوتھی مرتبہ فرشتہ نے (سورۂ اقراء کی) یہ چند آیتیں تلاوت کیں۔ اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِىْ خَلَقَ ۝ خَلَقَ الْإِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۝ اِقْرَأْ وَرَبُّكَ الْأَكْرَمُ الَّذِىْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۝ عَلَّمَ الْإِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ ۝ اپنے اس پروردگار کے نام سے پڑھ جس نے پیدا کیا، اس نے انسان کو خونِ بستہ سے پیدا کیا پڑھ اور تیرا پروردگار بہت کرم کرنے والا ہے جس نے قلم (تحریر) کے ذریعہ (انسان کو) علم سکھایا، انسان کو وہ سب کچھ سکھایا جس سے وہ ناواقف تھا[1] غرض نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان آیات کو دہرایا اور یہ آپ کے ذہن نشین ہو گئیں، اس کے بعد جب حِرا سے فارغ ہوئے تو یہ حالت کہ قلب (شدتِ وحی سے) کانپ رہا تھا آپ نے مکان میں داخل ہوتے ہی فرمایا: مجھ کو کپڑا اُڑھاؤ، مجھ کو کپڑا اُڑھاؤ" (حضرت) خدیجہؓ نے فوراً کپڑا اُڑھا دیا، جب آپ کو سکون ہوا تو خدیجہ (رضی اللہ عنہا) کو تمام واقعہ کہہ سنایا اور پھر فرمایا "خشیت علیٰ نفسی مجھے جان کا خوف ہے[2]" (حضرت) خدیجہ نے سن کر عرض کیا "قسم بخدا، خدا آپ کو

---

[1] حضرت شاہ عبدالقادر (رحمہ اللہ) اس آیت کی تفسیر میں بہت ہی لطیف بات ارشاد فرماتے ہیں، موضح القرآن میں لکھتے ہیں۔ اوّل جبرئیل وحی لائے تو یہی پانچ آیتیں، حضرت (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) نے کبھی لکھا پڑھا نہ تھا (اس لئے اللہ تعالیٰ نے) فرمایا کہ قلم سے بھی علم وہی دیتا ہے یوں بھی (یعنی بغیر وسائل بھی وہبی طور پر) وہی دیگا۔

[2] یعنی مجھے یہ خوف ہے کہ شاید میں وحی کے بار کو برداشت نہ کر سکوں۔

ہرگز رسوا نہیں کرے گا۔ کیونکہ آپ صلہ رحمی کرتے ہیں، مہمانوں کی مہمانداری، بیچاروں کی چارہ گری فرماتے اور مفلس کے لئے ذریعۂ معاش مہیا کرتے ہیں اور حق رسی کی کڑی سے کڑی مصیبت میں مددگار بنتے ہیں۔ اس گفتگو کے بعد حضرت خدیجہ (رضی اللہ عنہا) نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے چچازاد بھائی ورقہ بن نوفل کے پاس لے گئیں، ورقہ زمانۂ جاہلیت کے ان لوگوں میں سے تھے جنھوں نے مسیحی عیسائیت کو قبول کر لیا تھا، عبرانی زبان سے واقف اور انجیل کی کتابت کیا کرتے تھے اور بہت ضعیف العمر اور نابینا تھے (حضرت) خدیجہؓ نے ورقہ سے کہا: برادرِ من آپ اپنے بھتیجے کا واقعہ تو سنئے" ورقہ نے دریافت حال کیا، تب نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے گذرا ہوا واقعہ سنایا، ورقہ نے سنا تو کہا" ہذا الناموس الذی کان ینزل علیٰ موسیٰ۔ یہ وہ فرشتہ (جبرئیل) ہے جو حضرت موسیٰ (علیہ السلام) پر وحیِ الٰہی لے کر آیا کرتا تھا، کاش کہیں اُس وقت تک زندہ رہوں جب تیری قوم تجھ کو تیرے وطن (مکہ) سے نکالے گی" آپ نے دریافت کیا: کیا میری قوم مجھ کو وطن سے بے وطن کرے گی" ورقہ نے کہا" بیشک ایسا ہوگا اور جس پیغام کے لئے خدا نے آپ کو پیغمبر بنایا ہے اس خدمت پر جو بھی مامور ہوا اس کے ساتھ یہی صورت پیش آئی ہے، پس اگر وہ وقت میری زندگی میں آیا تو میں پوری قوت کے ساتھ تیری حمایت کرونگا" مگر ورقہ کو یہ وقت نہیں آیا اس سے قبل ہی اُن کا انتقال ہوگیا۔[1]

حدیث بخاری اور بعض مستشرقین کی کوتاہ اندیشی

صدیقہ عائشہ (رضی اللہ عنہا) کی حدیث میں نزولِ وحی کی وجہ سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر جو فوری تاثر ہوا اس کو خود زبانِ مبارک سے اس طرح ظاہر کیا گیا ہے" انی خشیت علیٰ نفسی" اور پھر اس کے متصل ہی حضرت خدیجہؓ

[1] بخاری باب کیف کان بدء الوحی علیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔

کے تسکین دہ الفاظ منقول ہیں تو یہ واقعہ کا ایسا پہلو ہے جس کی فطری صداقت اور غیر مصنوعی سادگی خود بخود دل میں اُتر جاتی ہے اور واقعہ کا نقشہ اس طرح سامنے آجاتا ہے کہ ایک صادق وامین ہستی اپنی پاک اور بے لوث زندگی کے ساتھ ایک غار میں محوِ استغراق ہے اس کے قلب میں خدائے برتر کے لئے عشق سے سرشار جذبۂ عبودیت موجزن ہے، وہ شرک اور گناہوں کی آلودگیوں سے نفور و بیزار گوشۂ تنہائی کو پسند کرکے پہاڑ کے ایک غار میں سرگرمِ عبادت ہے، یہ سلسلہ اگرچہ عرصہ سے جاری ہے مگر اچانک ایک روز خدا کا فرشتہ (جبرئیل) جو ہمیشہ سے خدا کے پیغمبروں کے پاس وحی لیکر آتا رہا ہے اس پر ظاہر ہوتا ہے اور وحیِ الٰہی کی پیغام رسانی کرتے ہوئے اس کو نبوت و رسالت کی بشارت دیتا ہے۔ یہ ہستی چونکہ اس سے قبل اس منصبِ جلیل کی حقیقت سے ناآشنا تھی اس لئے اس حیرت زا خبر اور وحی الٰہی کی عظیم ترین روحانی قوت کے زبردست اثر نے جو فوری انقلاب ذاتِ اقدس میں پیدا کیا اُس کی وجہ سے تشویش اور گھبراہٹ کا رونما ہونا ایک فطری بات تھی، "خشیتُ علیٰ نفسی" کی مراد یہ نہیں تھی کہ جان کا خوف آپ کو پریشان کئے ہوئے تھا، ایک عربی نژاد، قریشی الاصل، اور شخصی شجاعت کے مالک سے اس قسم کی توقع کیسے ہو سکتی ہے؟ بلکہ مطلب یہ تھا کہ وہ اس بارِ عظیم کو برداشت بھی کر سکے گا یا نہیں؟ چنانچہ اس اعلیٰ تاثر کو اُس مقدس انسان کی رفیقۂ حیات خدیجۃ الکبریٰ نے محسوس کرتے ہوئے اس کے اخلاقِ کریمانہ اور اوصافِ حمیدہ کا ذکر کیا اور کہا کہ ایسی ہستی ناکام زندگی کے لئے نہیں ہوتی اور خدا کبھی آپ کو رسوا نہیں کریگا اور پھر اُس مقدس پیغمبر کو ورقہ کے پاس لے گئیں تاکہ ایک ایسے شخص سے جو عرصہ سے خدا کی وحی اور خدا کی کتاب کا ذکر کرتا رہتا ہے، اس اجمال کی تفصیل معلوم کریں۔

اس صاف اور سادہ بات کو دیکھئے اور پھر بعض مستشرقین یورپ کی اس مضحکہ خیز

نکتہ چینی پر نظر ڈالئے جو تعصب اور کوتاہ نظری کی عینک لگا کر کی گئی ہے۔

اگر پیغمبر اسلام پر حرا میں وحی الٰہی کا نزول اور فرشتہ کا ظہور ہوا ہوتا تو پھر آپ وحیِ الٰہی سے فیضیاب ہو کر اور منصبِ رسالت کی بشارت سن کر یہ کیوں فرماتے "انی خشیت علی نفسی" اور خدیجہ کو تسکین دینے کی ضرورت پیش نہ آتی کیا آپ کو خدا پر بھروسہ نہیں تھا۔

ببیں تفاوتِ رہ از کجاست تا بکجا، حقیقتِ حال کیا تھی اور اس کو رنگ و روغن دیکر کیا بنا دیا؟ یہاں نہ خدا پر عدمِ اعتماد کی کوئی جھلک ہے اور نہ فرشتہ کے ظہور اور وحی کے نزول پر ریب و شک کا معاملہ ہے بلکہ اس حقیقت کے اعتراف ہی کی وجہ سے جو صورتِ حال پیدا ہو گئی تھی اس کا ایک فطری تاثر ہے جو آپ کی صداقت کا مزید ثبوت فراہم کرتا ہے، کیونکہ اگر اس کے برعکس کہیں آپ اس واقعہ کو اس طمطراق کے ساتھ پیش فرماتے کہ گویا ذاتِ اقدس کے لئے یہ کوئی نئی بات نہیں بلکہ جانی بوجھی بات ہے تب البتہ اس کی گنجائش ہو سکتی تھی کہ اس شخص نے (دعوئے نبوت کے لئے) پہلے سے ایک منصوبہ قائم کر رکھا تھا اور حرا کی خلوتیں بھی اسی مقصد کے لئے تھیں چنانچہ اب موقع دیکھکر اس نے یہ اعلان کر دیا کہ میں خدا کا پیغمبر ہوں اور مجھ پر وحی آتی ہے۔

بہر حال اس مسئلہ پر ہم نے مختصر طور پر جو کچھ لکھا ہے علماءِ اسلام نے مختلف اسالیبِ بیان کے ساتھ اسی حقیقت کا اظہار فرمایا ہے مثلاً مشہور محدث و مفسر حافظ عماد الدین بن کثیر (رحمہ اللہ) ارشاد فرماتے ہیں:-

ثم قال "لقد خشیت علی نفسی"	آپ نے پھر فرمایا "لقد خشیت علی نفسی" یہ اس لئے
وذلک لانہ شاھد امراً لم	فرمایا کہ آپ نے ایک ایسی حقیقت کا آج مشاہدہ کیا

یعهده قبل ذلک ولا کان   کہ اس سے قبل اس سے واقف نہیں تھے اور نہ کبھی آپ
فی خلده ۱ے   کے دل میں یہ خیال گذرا تھا کہ ایسا کچھ پیش آئے گا۔

اور حکیم الامۃ شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی لطیف توجیہ کا حاصل یہ ہے۔

"پھر آپ پر غارِ حرا میں حق (وحی) کا نزول ہوا، جب فرشتہ اور آپ کے درمیان سلسلۂ کلام ختم ہوگیا تو آپ پر ایک خاص کیفیت طاری ہوئی جس کو ہم اپنی زبان میں "تشویش و اضطراب" سے تعبیر کرتے ہیں اور حقیقت میں یہ ایک نفسیاتی کیفیت تھی جس کا پیش آنا فطری تھا اس لئے کہ جب نزولِ وحی کی وجہ سے آپ کے بشری قویٰ پر ملکوتی صفات نے اثر کیا تو دو متضاد قوتوں کے درمیان تصادم اور پھر ملکوتی قوت کے غلبہ کی وجہ سے آپ کے اندر تشویش پیدا ہو جانا یقینی تھا، یہی وجہ ہے کہ ابتدائے نزولِ وحی کے بعد کچھ مدت تک وحی کا سلسلہ منقطع رہا کیونکہ انسان بشریت اور ملکیت دو جہات کے درمیان محصور ہے۔ پس جب ہستی کی بشریت پر ملکوتی صفات غالب آکر اس کو ظلمتوں سے نور کی جانب لے جاتی ہیں تو جس قوت کے ساتھ یہ غلبہ اپنا اثر کرتا ہے انسان اپنے اندر اسی شدت کے ساتھ بشریت و ملکیت کے درمیان تصادم اور تزاحم محسوس کرتا ہے اور شدتِ تصادم کا یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کی ملکوتی قوت و استعداد کو اس درجہ کامل و مکمل کر دے جو منصبِ نبوت و رسالت کے لئے ضروری ہے حتیٰ کہ اس کی قوتِ بشری (قوتِ بہیمی و حیوانی) قوتِ ملکوتی کے ہاتھ میں پوری طرح تابع اور منقاد ہو جاتی ہے اور اب وہ ہستی جس کو فیضانِ نبوت سے سرفراز کیا گیا ہے مطمئن اور تصادم کی کشمکش سے بالاتر ہو کر اس منصب جلیل (نبوت و رسالت) کی خدمت کے قابل ہو جاتا ہے۔ ۲ے

ے۱ تاریخ ابن کثیر ج ۳ ص ۷۔ ے۲ حجۃ اللہ البالغہ ج ۲ ص ۱۵۳

بشریت اور نبوت کا باہمی تعلق

"نبوت" اور "بشریت" کے درمیان اس درجہ نازک رشتہ ہے کہ قرآن حکیم کی "تعلیم" سے قبل پیروانِ مذاہب و ادیان نے اس راہ میں بھی اعتدال کو ترک کر کے افراط اور تفریط کو اُسوہ بنا لیا تھا اور اس بارہ میں ان کو سخت ٹھوکر لگی تھی چنانچہ بعض پیروانِ مذہب نے یہ دیکھ کر کہ نبی اور رسول باوجود اس امر کے کہ وہ انسان اور بشر کی شکل وصورت رکھتا ہے لیکن ساتھ ہی افرادِ انسانی سے جدا ایسی خصوصیات کا حامل نظر آتا ہے جو مجاہدات و ریاضات کے ذریعہ سے بھی دوسروں کو حاصل نہیں ہوتیں اس لئے دراصل وہ بشر نہیں بلکہ خدا یا خدا کا بیٹا ہے جس نے انسانوں کی نجات کے لئے جامۂ بشریت اختیار کر لیا ہے[1]۔ اس کے برعکس دوسری جماعت نے یہ کہا کہ نبوت و رسالت کوئی منصب نہیں ہے کہ خدا کی جانب سے "عطیۂ مناصب" کی طرح دیا جاتا ہو بلکہ اخلاقِ کریمانہ اور صفاتِ حمیدہ کا وہ اعلیٰ درجہ ہے جو ہر ایک انسان اپنی روحانی جدوجہد سے حاصل کر لے سکتا ہے اور یہ کہتے ہیں کہ اگرچہ عطاء و بخشش ہر شے کے لئے اُسی جانب (خدا کی جانب) سے ہے لیکن کسی شے کا بطور "منصب" عطا ہونے کی حدود میں محدود رہنا اور روحانی جدوجہد سے ہر شخص کے حاصل کر لینے کے لئے اُس کا دروازہ کھلا رہنا ان دونوں باتوں کے درمیان جو فرق ہے ہمارا خیال یہ ہے کہ "نبوت" بھی اور درجاتِ روحانیت کی ہی طرح ہے اور عطاءِ منصب کی شکل میں خاص امتیاز نہیں رکھتی۔

قرآنِ حکیم نے اس افراط و تفریط کو ختم کرنے کے لئے "نبوت و رسالت کی حقیقت کو" بہت عمدہ طریقوں سے آشکار کیا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ خدائے تعالیٰ نے انسان کی راہنمائی کے لئے جو مختلف درجاتِ ہدایت کا سلسلہ قائم کیا ہے اُس کا اعلیٰ درجہ "ہدایتِ وحی" کا ہے اور یہ انسان کی روحانیت اور مقصدِ حیات کی کامرانی کا کفیل وضامن ہے

[1] اوتار اور ابن اللہ کا عقیدہ دراصل ایک ہی سلسلہ کی دو کڑیاں ہیں۔

اور جبکہ ہدایت کا یہ سلسلہ "انسانی راہنمائی کے لئے" ہے تو عقلِ سلیم کا تقاضا یہ ہے کہ یہ درجہ "انسان" ہی کو بخشا جائے لیکن کیا ہر شخص کو جدا جدا بخش دیا جائے، نہیں ایسا نہیں ہونا چاہئے اس لئے کہ یہاں درجاتِ عقل مختلف ہیں اور درجاتِ استعدادیں بھی تنوع موجود ہے اس لئے ازبس ضروری ہے کہ کسی خاص ہستی کو اس کے لئے چن لیا جائے تو اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس انتخاب کی نوعیت کیا ہونی چاہئے، یہ کہ جو عمدہ صلاحیتوں کے ساتھ زیادہ سے زیادہ مجاہدات اور ریاضات کے ذریعہ نفس پر قابو پائے یا یہ کہ خدائے تعالیٰ جس کو یہ درجہ عطا فرمائے اُس کی صلاحیتوں اور اس کی استعدادات کی تخلیق ہی اس طرح کردے کہ صدق و امانت اس کا مایۂ خمیر بنا ہوا ہو اور خارجی مجاہدہ اور ریاضت کا محتاج نہ ہو، یہ جُدا امر ہے کہ خدائے برتر کے سامنے اظہارِ عبودیت اور تقرب الی اللہ کے لاانتہاہی فیض سے فیضیاب ہونے کے لئے اس سلسلہ کو بھی کلیتہً ترک نہ کرے. تو اس سوال کا جواب یہ ہے کہ عقل و بصیرت اس فیصلہ کو حق بجانب سمجھتے ہیں کہ یہاں دوسری شکل عمل میں آنی چاہئے، اس لئے کہ جس طرح خدائے برتر کے مقررہ قانونِ قدرت نے "ہدایتِ وحی" سے پہلے کے مختلف درجاتِ ہدایت کو انسان کے مجاہدہ و ریاضت پر موقوف نہیں رکھا اور اس بخشش و فیض کو حسبِ حال "عطیۂ الٰہی" کی حیثیت میں رکھا ہے یعنی "وجدان"، "حواس" اور "عقل" ان سب درجاتِ ہدایات کا جب یہی حال ہے کہ وہ جدوجہد سے نہیں بلکہ "عطیۂ الٰہی" سے ملتے ہیں تو "ہدایتِ وحی" بھی جس کو بخشا جائے وہ بطور "منصب و عطیہ" کے ہی عطا ہو، البتہ یہ ازبس ضروری ہے کہ جس کو بھی بخشا جائے اُس کی روحانی صلاحیتیں اور استعدادات ہر طرح اس منصب کی اہل ہوں اور ایسی ہستی کو عطا نہ ہو کہ اس کی صلاحیت و استعداد عطا کرنے والے کی بے سلیقگی پر چشمک زن ہو۔

غرض "نبی" اور "رسول" اُس ہستی کو کہتے ہیں جو لوازمِ بشریت کے ساتھ اپنے تقدس، طہارت اور اخلاقِ حسنہ و اوصافِ حمیدہ کے اس بلند مقام پر فائز ہو اور اُس کے صفات صدق و امانت اس درجہ مسلّم ہوں کہ اس کو "بشرِ معصوم" کہہ سکیں، وہ نہ خدا ہوتا ہے اور نہ ابنِ خدا بلکہ خدا کی جانب سے "ہدایتِ وحی کا حامل" مخلوقِ خدا کے لئے "خدا کا ایلچی" اور اُن کی ہر قسم کی "رشد و ہدایت کا کفیل" ہو، چونکہ وہ بشر ہے اس لئے افرادِ نسلِ انسانی سے تعلق رکھتا ہے اور چونکہ ہر قسم کی آلودگیوں اور گناہوں سے پاک اور "معصوم" ہے، اس لئے اس کو اللہ سبحانہ کے ساتھ ہم کلامی کا شرف حاصل ہے، پس نبوت و رسالت کا بشریت کے ساتھ یہی وہ تعلق ہے جو ہر قسم کی افراط و تفریط سے بری اور حقیقتِ حال کے لئے آئینہ دار ہے۔ اور اسی حقیقت کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود زبانِ وحی ترجمان سے ظاہر فرمایا ہے "انما انا قاسم واللہ یعطی"۔ خدا دینے والا ہے اور میں تقسیم کرنے والا ہوں" یعنی ایک جانب خدا سے "وحی ہدایت" حاصل کرتا ہوں اور دوسری جانب خدا کے بندوں تک اس کو پہنچا دیتا ہوں۔ یہی میرا فریضۂ رسالت و نبوت ہے اور اسی حقیقت کو قرآنِ حکیم نے مختلف اسالیب بیان کے ساتھ اس سلسلہ کے غلط کار لوگوں کی ہدایت کے لئے اس طرح بیان کیا ہے۔

قُلْ سُبْحَانَ رَبِّيْ هَلْ كُنْتُ إِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا	کہہ دیجئے، پاکی ہے میرے پروردگار کے لئے میں نہیں ہوں مگر انسان اور خدا کا ایلچی (رسول)
قُلْ لَّا أَمْلِكُ لِنَفْسِيْ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا إِلَّا مَا شَاءَ اللّٰهُ ۚ وَلَوْ كُنْتُ أَعْلَمُ الْغَيْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ	وہی ہو کر رہتا ہے جو خدا چاہتا ہے، اگر مجھے غیب کا علم ہوتا تو ضرور ایسا کرتا کہ بہت سی منفعت بٹور لیتا اور (زندگی میں) کوئی گزند مجھے نہ پہنچتا، میں اُس کے سوا کیا ہوں

الْخَيْرِ وَمَا مَسَّنِيَ السُّوْءُ إِنْ أَنَا إِلَّا نَذِيْرٌ وَّبَشِيْرٌ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ۝ (الاعراف)

کہ ماننے والوں کے لئے (گناہوں کی پاداشِ عمل سے) خبردار کرنے والا اور (نیک عمل پر) بشارت دینے والا ہوں۔

قَالَ إِنِّيْ عَبْدُ اللّٰهِ اٰتٰنِيَ الْكِتٰبَ وَجَعَلَنِيْ نَبِيًّا ۝ وَّجَعَلَنِيْ مُبٰرَكًا أَيْنَ مَا كُنْتُ ۔ (مریم)

(عیسیٰ نے) کہا: میں اللہ کا بندہ ہوں، اُس نے مجھ کو (ہدایتِ انسانی کیلئے) کتاب دی اور مجھ کو نبی بنایا اور اس نے مجھ کو بابرکت کیا، خواہ میں کسی جگہ ہوں۔

فَأْتِيٰهُ فَقُوْلَا إِنَّا رَسُوْلَا رَبِّكَ فَأَرْسِلْ مَعَنَا بَنِيْ إِسْرَاءِيْلَ ۝ وَلَا تُعَذِّبْهُمْ قَدْ جِئْنٰكَ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكَ ۝ وَالسَّلٰمُ عَلٰى مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰى ۔ (طٰہٰ)

تم (موسیٰ وہارون) اُس (فرعون) کے پاس جاؤ اور کہو ہم تیرے پروردگار کے بھیجے ہوئے آئے ہیں۔ پس بنی اسرائیل کو ہمارے ساتھ رخصت کردے اور ان پر سختی نہ کر۔ ہم تیرے پروردگار کی نشانی لے کر تیرے سامنے آگئے اُن پر سلامتی ہو جو سیدھی راہ اختیار کرے۔

رُسُلًا مُّبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ ۝ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ۝ (النساء)

یہ تمام رسول (خداپرستی و نیک عمل کے نتائج کی) خوشخبری دینے والے اور (انکارِ حق کے نتائج سے) ڈرانے والے تھے (اور) اس لئے بھیجے گئے تھے کہ اُن کے آنے (اور نیک و بد بتلانے) کے بعد لوگوں کے پاس کوئی حجت باقی نہ رہے جو وہ خدا کے حضور پیش کرسکیں اور خدا (اپنے کاموں میں) سب پر غالب ہے اور (تمام کاموں میں) حکمت والا ہے۔

يٰٓأَيُّهَا النَّبِيُّ إِنَّآ أَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا ۝ وَّدَاعِيًا إِلَى

اے نبی! بلاشبہ ہم نے تجھ کو بھیجا ہے (حق پر) گواہی دینے والا اور نیکی کے انجام پر بشارت دینے والا اور (بدی کے

اللّٰہِ بِاِذْنِہٖ وَسِرَاجًا مُّنِیْرًا۔	انجام سے ڈرانے والا اور بلانے والا اللہ کی راہ کی طرف
(احزاب)	اس کے حکم سے اور بھیجا روشن چراغ بنا کر۔
عٰلِمُ الْغَیْبِ فَلَا یُظْھِرُ عَلٰی	وہ (خدا) غیب کی تمام باتوں کا جاننے والا ہے پس وہ اپنے
غَیْبِہٖٓ اَحَدًا۔ اِلَّا مَنِ ارْتَضٰی	غیب (کے معاملات) پر کسی کو خبردار نہیں کرتا مگر جس کو پیغمبر
مِنْ رَّسُوْلٍ فَاِنَّہٗ یَسْلُکُ	بنا کر چن لے، پس بلاشبہ وہ (خدا) اس رسول کے آگے اور
مِنْۢ بَیْنِ یَدَیْہِ وَمِنْ خَلْفِہٖ	پیچھے نگہبان چلاتا ہے (یعنی اُس کو اس بات سے محفوظ رکھتا
رَصَدًا۔ لِّیَعْلَمَ اَنْ قَدْ	ہے کہ خدا کی دی ہوئی خبریں شیطان یا اُس کا نفس کوئی ملاوٹ
اَبْلَغُوْا رِسٰلٰتِ رَبِّھِمْ	کر سکے اور اس کو شبہ پڑ جائے کہ یہ خدا کی وحی ہے یا کچھ اور)
(الآیہ)	تاکہ خدا یہ ظاہر کر دے کہ انھوں نے (رسولوں نے) بلاشبہ اپنے
(الجن)	پروردگار کے پیغام (ٹھیک ٹھیک) پہنچا دیے۔

ان آیات کی تفسیر میں حضرت شاہ عبدالقادر (نور اللہ مرقدہ) یہ تحریر فرماتے ہیں۔
"یعنی رسول کو خبر دیتا ہے غیب کی پھر چوکیدار (فرشتے) رکھتا ہے اُس کے ساتھ کہ اُس میں شیطان دخل نہ کرنے پاوے اور اپنا (رسول کا) نفس غلط نہ سمجھے یہی معنی ہیں اس بات کے کہ پیغمبروں کو عصمت ہے اوروں کو نہیں اور اُن کا معلوم "بے شک" ہے اوروں کے معلوم میں شبہ ہے۔ ۱۲ منہ

"نبی" اور "رسول" سے متعلق مسطورۂ بالا افراط و تفریط کے ساتھ ساتھ مشرکینِ عرب ایک نئی گمراہی میں مبتلا تھے وہ کہتے تھے کہ اول تو "پیغمبر" کا وجود ہی ہمارے لئے اچنبھے کی بات ہے اور اگر یہ اچنبھا ہونا ہی تھا تو اس کے لیے ہماری طرح کا ایک انسان ہی کیوں چُنا گیا؟ کیوں ایک "فرشتہ" نہ بھیجا گیا اور اگر انسان ہی بھیجنا تھا تو یا تو مکہ اور طائف کی

کسی متمول، سرمایہ دار ہستی کو پیغمبر بنایا جاتا ورنہ اس کو ہی غیب سے خزانے اور بے نظیر باغات عطا کیے جاتے تب ہم سمجھتے کہ بیشک یہ خدا کا فرستادہ ہے۔

وَقَالُوْا مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ يَأْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِيْ فِي الْأَسْوَاقِ لَوْلَا أُنْزِلَ إِلَيْهِ مَلَكٌ فَيَكُوْنَ مَعَهٗ نَذِيْرًا ۙ أَوْ يُلْقٰى إِلَيْهِ كَنْزٌ أَوْ تَكُوْنُ لَهٗ جَنَّةٌ يَّأْكُلُ مِنْهَا ......

اور وہ (مشرکین) کہتے ہیں یہ کیسا رسول ہے جو کھانا کھاتا اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے، ایسا کیوں نہ ہوا کہ اس کے ساتھ آسمان سے فرشتہ اُترتا اور وہ خدا کے پیغام سے خبردار کرتا یا ایسا کیوں نہ ہوا (کہ بظاہر آنکھوں دیکھتے) اس پر آسمان سے خزانہ اُتر آتا یا قدرتی باغ ہوتا کہ وہ (ہر وقت مرضی کے مطابق) اُس کے (پھل) کھاتا......

وَمَا أَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ إِلَّا إِنَّهُمْ لَيَأْكُلُوْنَ الطَّعَامَ وَيَمْشُوْنَ فِي الْأَسْوَاقِ ۗ وَجَعَلْنَا بَعْضَكُمْ لِبَعْضٍ فِتْنَةً ۗ أَتَصْبِرُوْنَ ۚ وَكَانَ رَبُّكَ بَصِيْرًا ۝ (فرقان)

اور ہم نے تجھ سے پہلے بھی ایسے ہی پیغمبر بھیجے تھے جو کھانا کھاتے تھے اور بازاروں میں چلتے پھرتے تھے (یعنی پیغمبری کے لئے بشریت منافی نہیں ہے بلکہ انسانوں کے لئے انسان ہی کو پیغمبر ہونا چاہیے) اور ہم نے (انسانوں میں سے انسان ہی کو پیغمبر بنا کر) ایک دوسرے کی آزمائش کا سامان کر دیا کہ آیا تم صبر و استقامت کا ثبوت دیتے ہو یا نہیں اور تیرا پروردگار بلاشبہ (انسانوں کے کردار کا) دیکھنے والا ہے۔

وَقَالُوْا لَوْلَا أُنْزِلَ عَلَيْهِ مَلَكٌ ۖ وَلَوْ أَنْزَلْنَا مَلَكًا لَّقُضِيَ الْأَمْرُ ثُمَّ لَا يُنْظَرُوْنَ ۝ وَلَوْ جَعَلْنٰهُ مَلَكًا لَّجَعَلْنٰهُ رَجُلًا وَّلَلَبَسْنَا عَلَيْهِمْ مَّا يَلْبِسُوْنَ ۔ (انعام)

اور وہ کہتے ہیں اس پر (محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر) کیوں فرشتہ نہیں اتارا گیا اور اگر ہم فرشتہ اتارتے تو البتہ (نتائج اعمال کا) فیصلہ کر دیا جاتا اور پھر وہ مہلت نہ دیئے جاتے اور اگر ہم اس کو فرشتہ کر دیتے تو بھی (انسانوں کی ہدایت کیلئے) اس کو بصورت انسان ہی ظاہر کرتے اور (اس طرح) ہم پھر ان لوگوں کو اس شبہ میں مبتلا کر دیتے جس میں

اس جگہ اُن کی گمراہی کو دو دلائل سے واضح کیا ہے ایک یہ کہ ایمان و اعتقاد کی زندگی سرتاسر "غیب" سے متعلق ہے پس اگر انسان کو اسی عالم میں عالمِ غیب کے معاملات کا مشاہدہ کرا دیا جائے اور پھر بھی وہ انکار پر جارہے تو خدا کا قانون "امہال" (مہلت کا قانون) نافذ نہیں ہوگا بلکہ نتائجِ اعمال کا فوراً ہی ظہور ہو کر رہے گا اور یہ ان کے لئے بھی مضر ہے اور خدا کی حکمت رحمت و ربوبیت کے بھی خلاف ہے۔ دوسری دلیل یہ کہ انسانی دنیا میں اگر فرشتہ کے ذریعہ "ہدایتِ وحی" کو بھیجا جائے تو انسان کس طرح اُس سے مانوس ہو سکتے ہیں پھر اگر اُسے بھی انسان ہی کی شکل میں بھیجیں تو شبہ کرنے والوں کا شبہ اُسی طرح قائم رہے گا اس لئے عقل و نقل دونوں کا فیصلہ یہی ہے کہ ہدایتِ انسان کے لئے "انسان" ہی کو مبعوث ہونا چاہیے۔

وَمَا مَنَعَ النَّاسَ اَنْ يُّؤْمِنُوْٓا اِذْ جَآءَهُمُ الْهُدٰٓى اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا اَبَعَثَ اللّٰهُ بَشَرًا رَّسُوْلًا ۝ قُلْ لَّوْ كَانَ فِى الْاَرْضِ مَلٰٓئِكَةٌ يَّمْشُوْنَ مُطْمَئِنِّيْنَ لَنَزَّلْنَا عَلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَلَكًا رَّسُوْلًا (بنی اسرائیل)

اور لوگوں کے پاس جب ہدایت آ پہنچی تو اُن کو ایمان لانے سے کسی بات نے نہیں روکا مگر اس نے کہ وہ کہتے ہیں "کیا خدا کسی بشر کو پیغمبر بنا کر بھیجیگا اے پیغمبر! کہدیجیے اگر زمین پر انسانوں کی جگہ فرشتوں کی آبادی ہوتی اور وہ اس پر چلتے پھرتے تو ہم ضرور اُن کے لئے آسمان سے فرشتہ کو ہی رسول بنا کر بھیجتے۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِىْٓ اِلَيْهِمْ فَسْئَلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۝ وَمَا جَعَلْنٰهُمْ جَسَدًا لَّا يَاْكُلُوْنَ الطَّعَامَ وَمَا كَانُوْا خٰلِدِيْنَ ۝ (الانبیاء)

اور (اے پیغمبر) ہم نے تجھ سے پہلے بھی جن پر وحی نازل کی ہے وہ انسانوں کے سوا اور کچھ نہیں تھے پس (اے معترضین!) اگر تم نہیں جانتے تو جاننے والوں سے دریافت کر لو اور نہ ہم نے ان کو بیجان (دھڑ) بنایا تھا کہ وہ کھانا نہ کھاتے ہوں اور نہ وہ (خضر کی طرح) ہمیشہ رہنے والے تھے۔

بہرحال ان آیات میں قرآنِ عزیز نے علمی اور تاریخی دونوں قسم کے دلائل سے یہ صاف کردیا کہ کائناتِ انسانی کی ہدایت کے لئے "انسان" کا نبی اور ہادی ہونا فطری بات ہے اور اس لئے اقوامِ ماضیہ میں ایسا ہی ہوتا رہا ہے۔

پھر اس مسئلہ کی جانب بھی توجہ کی ہے کہ نبوت و رسالت کا تعلق سرداری، سرمایہ داری، اور جتھہ بندی سے کچھ نہیں ہے اور اس کے لئے جن فطری اعلیٰ ملکات و استعدادات کی ضرورت ہے ان کے پیشِ نظر اللہ تعالیٰ ہی خوب واقف ہے کہ کون اس "منصب" کا اہل ہے۔

وَقَالُوا لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ ۞ اَهُمْ يَقْسِمُوْنَ رَحْمَتَ رَبِّكَ نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَّعِيْشَتَهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّيَتَّخِذَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا سُخْرِيًّا وَرَحْمَتُ رَبِّكَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ ۔

اور وہ کہتے ہیں یہ قرآن کیوں ان دو بستیوں (مکہ اور طائف) کے کسی سردار پر نازل نہیں ہوا، (تو) کیا تیرے پروردگار کی رحمت کو یہ تقسیم کرنے والے ہیں (نہیں، بلکہ) ہم نے ہی ان کے درمیان ان کی دنیوی معیشت کو تقسیم کیا ہے اور ہم نے ہی بعض انسانوں کو بعض پر بلندی درجات عطا کی ہے تاکہ بعض بعض کے مسخر رہیں (یعنی بعض مقتدی ہوں اور بعض مقتدی، بعض پیغمبر ہوں اور بعض امتی) اور تیرے پروردگار کی رحمت (نبوت) اس (دولت و ثروت) سے کہیں زیادہ) بہتر ہے جو وہ خزانہ کئے ہوئے ہیں۔

وَاِذَا جَآءَتْهُمْ اٰيَةٌ قَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ حَتّٰى نُؤْتٰى مِثْلَ مَآ اُوْتِيَ رُسُلُ اللّٰهِ ؔ اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ

اور جب ان کے پاس خدا کی جانب سے کوئی آیت آتی ہے تو یہ (مشرکین) کہتے ہیں ہم اس وقت تک ایمان نہیں لائیں گے جب تک ہم کو بھی وہی چیز (وحی) نہ دی جائے جو خدا کے رسولوں کو دی گئی (لیکن ایسا نہیں ہوسکتا اس لئے کہ) اللہ ہی خوب جانتا ہے کہ وہ اپنے منصبِ رسالت کو کس کے

اور یہ بات تو بہت واضح اور صاف ہے کہ جس شخص کو کوئی منصب عطا کیا جائے تو انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ وہ ہر طرح اس کے لیے جوہر قابل اور اہل ہونا چاہیے لیکن یہ ضروری نہیں کہ ہر ایک جوہر قابل کو وہ "منصب" ملے، کیونکہ معطی کی مصلحت ہی خوب فیصلہ کر سکتی ہے کہ کس کو ملے اور کس کو نہ ملے چہ جائیکہ جوہر قابل بھی نہ ہو۔ اس لیے ضروری ہوا کہ جو نبی اور رسول ہو وہ ہر حیثیت سے "انسانِ کامل" اور گناہوں سے "معصوم" ہو، لیکن یہ ضروری نہیں کہ جو شخص بھی اخلاقِ حمیدہ اور روحانی مجاہدات کے ذریعہ "تقدیس" کا درجہ حاصل کر سکا ہو وہ منصبِ نبوت پر بھی ضرور فائز ہو۔

بہرحال نبوت "منصب" ہے "ڈگری" نہیں ہے، اور اس لیے جن کو دیا بھی جاتا ہے ان کو متنبہ کر دیا جاتا ہے کہ یہ تم پر فضلِ خداوندی ہے ورنہ اگر وہ تم سے اس کو سلب کر لینا چاہے تو تمہاری طاقت بلکہ کائنات کی طاقت سے باہر ہے کہ پھر یہ تم کو مل سکے۔

وَلَئِنْ شِئْنَا لَنَذْهَبَنَّ بِالَّذِیْ	اور (اے پیغمبر!) اگر ہم چاہیں تو جو تجھ پر ہم نے وحی کی ہے
اَوْحَیْنَا اِلَیْکَ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَکَ	اُس کو چھین لیں اور پھر تجھ کو کوئی بھی ایسا کارساز نہ ملے
بِہٖ عَلَیْنَا وَکِیْلًا۔ اِلَّا رَحْمَۃً	جو ہم پر زور ڈال سکے، لیکن (یہ جو سلسلۂ وحی جاری ہے تم
مِّنْ رَّبِّکَ، اِنَّ فَضْلَہٗ کَانَ	اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ تیرے پروردگار کی رحمت ہے
عَلَیْکَ کَبِیْرًا۔ (بنی اسرائیل)	اور یقین کر کہ تجھ پر تیرے پروردگار کا بڑا ہی فضل ہے۔

نبی اور مصلح | مسطورۂ بالا تفصیلات سے یہ بات بھی واضح ہو گئی کہ چونکہ "نبی" اور "رسول" کو براہِ راست خدائے برتر سے شرفِ مکالمت حاصل ہوتا ہے یا خدا کا معصوم فرشتۂ خدا کی وحی لا کر سناتا ہے اس لیے اس کا ذریعۂ علم "علم یقین" کا وہ درجہ رکھتا ہے جس میں شک و شبہ کی مطلق گنجائش نہیں رہتی اور اس کے علاوہ تمام ذرائع علم یقین کے اس درجہ سے نیچے

ہیں بلکہ اُن کی افادیت "ظن" سے آگے نہیں بڑھتی اس لئے اگر ایک مردِ صالح اپنی قوم یا نوعِ انسانی کی اصلاحِ حال کے لئے کوئی قدم اٹھائے تو مقدس سے مقدس تر ہونے کے باوجود اُس کے اپنے طریقۂ اصلاح میں غلطی کا وقوع اور امکان دونوں موجود رہتے ہیں بلکہ بعض اوقات وہ ایسی فاش غلطی کر گذرتا ہے کہ اس سے فائدہ پہنچنے کی بجائے قوم کو نقصان اٹھانا پڑتا ہے اس لئے ایک "نکوکار مصلح" یہ کبھی دعویٰ نہیں کرتا کہ وہ اصلاحِ حال کے لئے جو کچھ اپنی جانب سے کہتا ہے غلطی سے پاک ہے مگر ایک "نبی" اور "رسول" کے لئے ازبس ضروری ہے کہ وہ یہ بھی اعلان کرے کہ میں خدا کی جانب سے اصلاحِ حال کے لئے خدا کا پیغام رساں ہوں اور یہ بھی دعویٰ کرے کہ وہ جو "تعلیم و اصلاح" پیش کر رہا ہے، خدا کا فرمودہ ہے اور اس لئے ہر قسم کی غلطی اور لغزش سے پاک اور محفوظ ہے، وہ یہ نہیں کہے گا کہ یہ میرے دل کی آواز ہے یا اندر سے جو آواز آتی ہے اُس کا نتیجہ اور ثمرہ ہے بلکہ صاف صاف یہ کہے گا کہ اس میں میرا اپنا کچھ نہیں ہیں تو صرف ایلچی اور پیغامبر ہوں یہ جو کچھ بھی ہے خدا کا فرمان اور اس کی "وحی" ہے۔

چنانچہ قرآن عزیز نے جگہ جگہ ان دونوں باتوں کو واضح کیا ہے وہ کہتا ہے کہ ہر ایک پیغمبر کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ وہ اعلان کر دیں کہ خدا نے ان کو اپنی "ہدایتِ وحی" کے لئے چن لیا ہے اور وہ خدا کے پیغمبر ہیں اور یہ بھی حکم دیا گیا ہے کہ جو کچھ ان پر وحی کیا جاتا ہے اس کو حرف بحرف امت تک پہنچائیں۔

حضرت نوح علیہ السلام اپنی قوم سے خطاب کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

قَالَ یٰقَوْمِ لَیْسَ بِیْ ضَلٰلَةٌ وَّ لٰكِنِّیْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِیْنَ	(نوح نے) کہا: اے میری قوم! مجھ کو گمراہی سے کوئی واسطہ نہیں ہے بلکہ میں تو تمام کائنات کے پروردگار کی جانب سے

عـه صـ ۳۳۲ صـ ۳۳۳ کے بعد ہے۔

صِرَاطًا سَوِيًّا ۝ (مریم)

پیروی کریں میں تجھ کو سیدھی راہ دکھلاؤں گا۔"

اور لوط (علیہ السلام) نے اپنی قوم سے مکالمہ کرتے ہوئے یہ فرمایا۔

إِذْ قَالَ لَهُمْ أَخُوهُمْ لُوطٌ أَلَا تَتَّقُونَ ۝ إِنِّي لَكُمْ رَسُولٌ أَمِينٌ ۝ فَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَطِيعُونِ ۝ (الشعراء)

جب کہا ان سے اُن کے بھائی (لوط) نے کیا تم پرہیزگاری اختیار نہیں کرتے، بلاشبہ میں تمہارے لئے خدا کا بھیجا ہوا ہوں (اور اس پیغامبری میں) صاحب امانت ہوں پس اللہ سے ڈرو اور میری پیروی کرو۔

اور حضرت یعقوب و یوسف (علیہما السلام) کے ایک طویل حیرت زا واقعہ کے ضمن میں یعقوب (علیہ السلام) کا وہ مقولہ بھی منقول ہے جس میں انھوں نے اپنے بیٹے یوسف (علیہ السلام) کو وحی الٰہی کے ذریعہ یہ بشارت دی ہے کہ جس طرح خدا نے تیرے باپ دادا، ابراہیم، اسمٰعیل، اسحٰق اور یعقوب (علیہم السلام) کو پیغمبری عطا فرمائی اُسی طرح تجھ کو بھی اس منصب جلیل سے سرفراز کریگا۔

وَكَذَٰلِكَ يَجْتَبِيكَ رَبُّكَ وَيُعَلِّمُكَ مِن تَأْوِيلِ الْأَحَادِيثِ وَيُتِمُّ نِعْمَتَهُ عَلَيْكَ وَعَلَىٰ آلِ يَعْقُوبَ كَمَا أَتَمَّهَا عَلَىٰ أَبَوَيْكَ مِن قَبْلُ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْحَاقَ ۚ إِنَّ رَبَّكَ عَلِيمٌ حَكِيمٌ ۝ (یوسف)

اور اسی طرح تیرا پروردگار تجھ کو چن لیگا" اور تجھ کو تعبیر رؤیا کا علم بخشے گا اور تجھ پر اپنی نعمت (نبوت) کی تکمیل کریگا اور اولاد یعقوب پر (جو اس کے اہل ہوں گے) جیسا اُس نے اس سے پہلے تیرے باپ دادا ابراہیم، اسحٰق، پر اس (نبوت) کو پورا کیا بیشک تیرا پروردگار جاننے والا ہے حکمت والا ہے۔

اور پھر حضرت یوسف (علیہ السلام) کی تبلیغ و دعوت کا اس طرح قرآن میں ذکر ہے۔

يَا صَاحِبَيِ السِّجْنِ أَأَرْبَابٌ

اے میرے قید کے رفیقو! کیا بہت سے آقا اور خداوند بہتر

أُبَلِّغُكُمْ رِسَالَاتِ رَبِّي وَأَنْصَحُ بھیجا ہوا ہوں، تم تک اپنے پروردگار کی جانب سے پیغام
لَكُمْ وَأَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا پہنچاتا ہوں اور تمہاری خیر خواہی کرتا ہوں اور میں اللہ کی
تَعْلَمُونَ۔ (الاعراف) باتوں میں سے وہ باتیں جانتا ہوں جن سے تم بے خبر ہو۔

اور حضرت ہود اور قوم کے درمیان مکالمہ میں حضرت ہود نے یہ اعلان فرمایا:۔

قَالَ يٰقَوْمِ لَيْسَ بِي سَفَاهَةٌ (ہود نے) کہا: اے میری قوم! میں بے وقوف نہیں ہوں
وَلٰكِنِّي رَسُولٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِينَ لیکن میں جہانوں کے پروردگار کی جانب سے بھیجا ہوا ہوں
أُبَلِّغُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّي وَأَنَا لَكُمْ میں اپنے پروردگار کا پیغام تم تک پہنچاتا ہوں اور میں تمہارا خیر خوا
نَاصِحٌ أَمِينٌ ۝ (الاعراف) ہوں اور (پیغام الٰہی اور خیر خواہی میں) صاحبِ امانت ہوں۔

اور صالح (علیہ السلام) نے یہ فرمایا۔

قَالَ يٰقَوْمِ لَقَدْ أَبْلَغْتُكُمْ رِسَالَةَ (صالح نے) کہا: اے قوم! بلاشبہ میں نے تم کو اپنے پروردگار
رَبِّي وَنَصَحْتُ لَكُمْ وَلٰكِنْ لَّا کا پیغام پہنچا دیا اور تمہاری خیر خواہی کی مگر تم خیر خواہی کرنے
تُحِبُّونَ النّٰصِحِينَ۔ (الاعراف) والوں کو ناپسند کرتے ہو۔

اور حضرت ابراہیم نے اپنے باپ آزر سے یہ ارشاد فرمایا۔

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ إِبْرٰهِيمَ إِنَّهُ اور یاد کرو کتاب (قرآن) میں ابراہیم کا حال، بلاشبہ تھا،
كَانَ صِدِّيقًا نَّبِيًّا ۝ إِذْ قَالَ وہ بہت ہی صادق اور نبی" جب اس نے اپنے باپ سے
لِأَبِيهِ يٰأَبَتِ لِمَ تَعْبُدُ مَا لَا يَسْمَعُ کہا: اے باپ! ایسی چیز کی پوجا کیوں کرتا ہے جو نہ سنتی ہے،
وَلَا يُبْصِرُ وَلَا يُغْنِي عَنْكَ شَيْئًا ۝ نہ دیکھتی ہے اور نہ تجھ کو کسی (نقصان) سے بے پرواہ کرتی ہے
يٰأَبَتِ إِنِّي قَدْ جَاءَنِي مِنَ الْعِلْمِ (یعنی بت پرستی کیوں کرتا ہے؟) اے باپ! بلاشبہ مجھ کو علم
مَا لَمْ يَأْتِكَ فَاتَّبِعْنِي أَهْدِكَ (وحی) سے وہ حصہ ملا ہے جو تجھ کو حاصل نہیں ہے پس میری

مُتَفَرِّقُوْنَ خَيْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ۝ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖٓ اِلَّآ اَسْمَآءً سَمَّيْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ ؕ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ؕ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ ؕ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ (یوسف)

ہیں یا یکتا خدا کی ذات جو ہر شے پر غالب ہے، تم اس کے سوا جس کو پوجتے ہو اُن کی حقیقت اس کے سوا کچھ نہیں کہ چند نام ہیں جو تم نے اور تمہارے باپ دادوں نے گڑھ لئے ہیں، اللہ تعالیٰ نے اس کے لئے کوئی دلیل نہیں اتاری اور حکم تو خدا کے سوا کسی کا نافذ نہیں ہے، اُس نے یہی حکم دیا ہے کہ اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو، دین کی سیدھی راہ یہی ہے۔ لیکن اکثر لوگ (اس حقیقت کو) نہیں جانتے۔

اور حضرت شعیب (علیہ السلام) نے اصحابِ ایکہ کے سامنے یہ اعلان کیا۔

كَذَّبَ اَصْحٰبُ الْاَيْكَةِ الْمُرْسَلِيْنَ ۝ اِذْ قَالَ لَهُمْ شُعَيْبٌ اَلَا تَتَّقُوْنَ ۝ اِنِّيْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِيْنٌ ۝ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ۝ (الشعراء)

اصحاب ایکہ نے پیغمبروں کو جھٹلایا، جب اُن سے شعیب نے کہا: کیا تم خدا سے نہیں ڈرتے، بلاشبہ میں تمہارے لئے (خدا کی جانب سے) صاحبِ امانت پیغامبر ہوں، پس اللہ سے ڈرو اور میری پیروی کرو۔

اور حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے فرعون کے دربار میں بے دھڑک یہ اعلان فرمایا۔

وَقَالَ مُوْسٰى يٰفِرْعَوْنُ اِنِّيْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ حَقِيْقٌ عَلٰٓى اَنْ لَّآ اَقُوْلَ عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ ؕ قَدْ جِئْتُكُمْ بِبَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ فَاَرْسِلْ مَعِيَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۝ (الاعراف)

اور موسیٰ نے کہا، اے فرعون! بلاشبہ میں جہانوں کے پروردگار کا پیغمبر ہوں، میرے لئے یہی لائق ہے کہ میں خدا کے بارے میں حق کے سوا کچھ نہ کہوں، میں تمہارے پروردگار کی طرف سے دلیل لے کر آیا ہوں، پس تو میرے ساتھ بنی اسرائیل کو (آزاد کر کے) بھیج دے۔ (جن کو صدیوں سے غلام

اور حضرت داؤد و سلیمان (علیہما السلام) کے واقعہ میں سلیمان (علیہ السلام) نے ملکہ سبا کو دعوتِ اسلام کے لئے جو نامۂ مبارک تحریر فرمایا تھا اُس کا اسلوب بیان یہ ہے۔

اِنَّهٗ مِنْ سُلَيْمٰنَ وَ اِنَّهٗ	یہ سلیمانؑ کی جانب سے ہے اور یہ شروع ہے اللہ کے نام سے
بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ	جو رحمٰن ہے رحیم ہے بات یہ ہے کہ مجھ پر اپنی بلندی و برتری کا اظہار
اَلَّا تَعْلُوْا عَلَیَّ وَ اْتُوْنِیْ	نہ کرو (کیونکہ میں بادشاہ نہیں بلکہ پیغمبر ہوں) اور میرے پاس
مُسْلِمِيْنَ ۝ (النمل)	خدا کی فرمانبردار بندی بن کر حاضر ہو۔

اور حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) سے قبل ایک علاقہ میں خدا کے چند نبی دعوت و تبلیغ اسلام کے لئے مامور کئے گئے تھے اُنھوں نے اپنی قوم سے فرمایا۔

قَالُوْا رَبُّنَا يَعْلَمُ اِنَّآ اِلَيْكُمْ	انھوں نے کہا ہمارا پروردگار (خوب جانتا ہے کہ بلاشبہ
لَمُرْسَلُوْنَ وَ مَا عَلَيْنَآ	ہم تمہاری جانب اس کے بھیجے ہوئے ہیں، اور ہمارے
اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ۔	اوپر اس سے زیادہ کوئی ذمہ داری نہیں کہ امرِ حق کا صاف
(یٰسٓ)	اور کھلا پیغام پہنچا دیں۔

اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے بار بار بنی اسرائیل کے سامنے یہ اعلان فرمایا کہ میں خدا کا پیغمبر ہوں اور میری بتلائی ہوئی راہ کے سوا کوئی راہِ مستقیم نہیں کیونکہ میں جو کچھ بھی پیش کر رہا ہوں خدا کا فرمودہ ہے۔

قَالَ اِنِّیْ عَبْدُ اللّٰهِ اٰتٰنِیَ الْكِتٰبَ	(عیسیٰ نے) کہا بلاشبہ میں اللہ کا بندہ ہوں اس نے مجھ کو "کتاب"
وَجَعَلَنِیْ نَبِيًّا ۔ (مریم)	عطا کی ہے اور اُس نے مجھ کو "نبی" بنایا ہے۔
اِذْ قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ يٰبَنِیْٓ اِسْرَآءِيْلَ	جب کہا عیسیٰ بن مریم نے اے بنی اسرائیل! بلاشبہ میں تمہاری
اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ (الصف)	جانب خدا کی جانب سے بھیجا ہوا ہوں (رسول ہوں)

اور خاتم الانبیاء محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت و تبلیغ میں تو جگہ جگہ یہ حقیقت بہت نمایاں نظر آتی ہے۔

یَآ اَیُّھَا النَّبِیُّ اِنَّآ اَرْسَلْنٰکَ شَاھِدًا	اے نبی! بلاشبہ ہم نے تجھ کو (حق کے لئے) گواہ اور (نیک
وَّ مُبَشِّرًا وَّنَذِیْرًا وَّ دَاعِیًا	عملی کیلئے) بشارت دینے والا اور (بدعملی کے نتائج سے)
اِلَی اللّٰہِ بِاِذْنِہٖ وَسِرَاجًا	ڈرانے والا اور خدا کے حکم سے اس کی جانب بلانے والا اور
مُّنِیْرًا۔ (الاحزاب)	(ہدایت وصراطِ مستقیم کیلئے روشن چراغ بنایا ہے۔
قُلْ یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ اِنِّیْ رَسُوْلُ	(اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کہہ دیجئے "اے لوگو! بیشک میں تم
اللّٰہِ اِلَیْکُمْ جَمِیْعًا الَّذِیْ لَہٗ	سب کی جانب اللہ کا بھیجا ہوا ہوں، اسی کے لئے ہر بادشاہت
مُلْکُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَآ	آسمانوں کی اور زمین کی، کوئی خدا نہیں ہے مگر صرف وہی
اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ یُحْیٖ وَیُمِیْتُ فَاٰمِنُوْا	یکتا ذات (وہی) زندگی بخشتا ہے اور وہی موت دیتا
بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہِ النَّبِیِّ الْاُمِّیِّ الَّذِیْ	ہے، پس ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول "نبی امی"
یُؤْمِنُ بِاللّٰہِ وَکَلِمٰتِہٖ وَاتَّبِعُوْہُ	پر جو خود اللہ پر اور اس کی باتوں پر ایمان لاتا ہے اور
لَعَلَّکُمْ تَھْتَدُوْنَ۔ (اعراف)	اسی کی پیروی کرو تاکہ تم راہ پاؤ۔
اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ (آل عمران)	بلاشبہ اللہ کے نزدیک (ہمیشہ کا) دین (حق) اسلام ہی ہے۔
فَمَنْ یَّبْتَغِ غَیْرَ الْاِسْلَامِ دِیْنًا	جو شخص اسلام کے ماسوا کو دین بنانا چاہے تو خدا کے
فَلَنْ یُّقْبَلَ مِنْہُ (آل عمران)	یہاں وہ مقبول نہیں ہے۔

غرض پیغمبر اور نبی کے لئے ازبس ضروری ہے کہ وہ اپنی دعوتِ اصلاح اور تعلیم حق پر خود بھی ایمان لائے اور کائنات کے سامنے بھی یہ اعلان کرے کہ یہ "پیغام ہدایت" اور یہ "تعلیم حق" میری جانب سے نہیں بلکہ خدا کی جانب سے ہے اور اسی نے مجھ کو اپنا ایلچی بنا کر اس کی دعوت

کے لئے بھیجا ہے، یہ جو کچھ ہے سب خدا کا اپنا ہے ہیں تو صرف اُس کی جانب پکارنے والا ہوں اور اس میں شک و شبہ کا کوئی سوال ہی نہیں ہے اور یہ ہر قسم کی لغزش و خطا سے پاک "علم الیقین" اور "وحی الٰہی" ہے۔ جس کے متعلق خدا کا یہ فیصلہ ہے "لَا یَاْتِیْهِ الْبَاطِلُ مِنْ بَیْنِ یَدَیْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ تَنْزِیْلٌ مِّنْ حَکِیْمٍ حَمِیْدٍ" اور "وَمَا یَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰی اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰی" لیکن "مصلح غیر نبی" کو یہ مجاز حاصل نہیں ہے کہ وہ اپنی دعوتِ اصلاح کے بارہ میں یہ دعویٰ کرے کیونکہ اس کی یہ دعوتِ اصلاح یا کسی پیغمبر اور نبی کی "ہدایتِ وحی" کی پیروی میں ہوگی تب تو اُس کی حیثیت ایک یاددہانی کرنے والے کی ہے اور یا ہدایتِ وحی کے اتباع کے ساتھ اُس کے اپنے اجتہاد اور ضمیر کی آواز کا بھی دخل ہوگا تو اُس کے اس حصّہ اصلاح کا لغزش خطا بلکہ بعض اوقات غلط روی سے بھی محفوظ رہنا لازمی اور ضروری نہیں ہے۔

کیفیتِ وحی | وحی سے متعلق جو حقائق سپردِ قلم ہو چکے ہیں اُن میں ایک یہ اضافہ بھی قابلِ توجہ ہے۔ عربی میں وحی کے معنی "مخفی اشارہ" کے ہیں، گویا یہ فطرتِ الٰہی کی وہ سرگوشی ہے جو ہر ایک مخلوق پر اس کی راہِ عمل کھولتی ہے، چنانچہ قرآن نے شہد کی مکھی کے نظامِ بیت کے متعلق فطری ہدایت کو لفظ "وحی" سے ہی تعبیر کیا ہے۔

وَاَوْحٰی رَبُّكَ اِلَی النَّحْلِ اَنِ	اور تیرے پروردگار نے شہد کی مکھی کے دل میں یہ بات
اتَّخِذِیْ مِنَ الْجِبَالِ بُیُوْتًا وَّمِنَ	ڈال دی کہ پہاڑوں میں اور درختوں میں اور ان ٹٹیوں میں
الشَّجَرِ وَمِمَّا یَعْرِشُوْنَ (النحل)	جو اسی غرض سے بلند کی جاتی ہیں اپنے لئے چھتے بنائے۔

اور مذہب و دین کی اصطلاح میں اس الہام کو کہتے ہیں جو خدائے برتر کی جانب سے نبی اور پیغمبر پر اس طرح القاء یا فرشتہ کے ذریعہ نازل کیا جاتا ہے کہ اس مقدس ہستی کو اُس کے

منجانب اللہ ہونے کا روز روشن سے بھی زیادہ یقین حاصل ہو جاتا ہے اور کسی قسم کے بھی شک وشبہ اور تردد کی گنجائش باقی نہیں رہتی اور اسی لئے وہ تحدی کے ساتھ یہ دعویٰ کرتا ہے کہ یہ "خدا کی وحی" اور اس کا بخشا ہوا "علم یقین" ہے۔ نزولِ وحی کی یہ صورت کس طرح پیش آتی ہے اور کون سے وہ طریقے ہیں جن کے ذریعہ نبی معصوم کو خدا کی وحی کا علم ہوتا ہے؟

قرآن عزیز اس کے متعلق یہ کہتا ہے۔

وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ	اور کسی انسان کیلئے یہ صورت ممکن نہیں کہ اللہ تعالیٰ اس سے
اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ	(اس دنیا میں بالمواجہ) گفتگو کرے مگر یا وحی (کے القار) کے
اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا فَيُوْحِيَ بِاِذْنِهٖ	ذریعہ یا پس پردہ یا بھیجدے فرشتہ کو پس وہ اس کی (خدا کی)
مَا يَشَآءُ اِنَّهٗ عَلِيٌّ حَكِيْمٌ	اجازت سے اس پر وحی لا اتارے جو اس کی (خدا کی) مرضی ہو
(شوریٰ)	بلاشبہ وہ (خدا) بلند و بالا حکمت والا ہے۔

غرض "وحی" ایک خاص ذریعۂ علم کا نام ہے جو خدا کی جانب سے اس کے نبیوں اور رسولوں کے لئے مخصوص ہے اور اس کا تعلق براہِ راست عالمِ قدس اور عالمِ غیب سے ہے اسی بنا پر اگرچہ انبیاء و رسل کو اس کی معرفت اور اس کے منجانب اللہ ہونے کا یقینِ کامل آفتاب عالمتاب سے زیادہ بدیہی ہوتا ہے لیکن وہ اس کی حقیقی کیفیت کو دوسروں پر تشبیہ و تمثیل ہی کے ذریعہ واضح کر سکتے ہیں۔ چنانچہ جب بعض صحابہ (رضی اللہ عنہم) نے حضرت اقدس (صلی اللہ علیہ وسلم) سے نزولِ وحی کی کیفیت کے متعلق سوالات کئے تو آپ نے یہ جوابات ارشاد فرمائے۔

احیانا یاتینی کصلصلة الجرس۔ کبھی یوں معلوم ہوتا ہے گویا گھنٹہ کی مسلسل گونج ہے "دوی کدوی النحل۔ (کبھی) جس طرح شہد کی مکھیوں کی بھنبھناہٹ سے

گونج پیدا ہوتی ہے اُس طرح کی گونج محسوس کرتا ہوں" "واحیاناً یتمثل لی الملکُ رجلاً فیکلمنی فاَعِیِ مایقول" اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ فرشتہ انسان کی شکل میں ظاہر ہو کر مجھ کو خدا کی وحی سناتا ہے اور میں اس کو محفوظ کر لیتا ہوں"

اِن جوابات میں کیفیتِ وحی کو اگرچہ قریب الفہم بنانے کی کافی کوشش کی گئی ہے، پھر بھی یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ حقیقی کیفیت کو خدا اور خدا کے پیغمبر کے علاوہ دوسرا کوئی نہیں پاسکتا اور پیغمبر اُس حقیقت کا اذعان اور اس کے منجانب اللہ ہونے پر غیر متبدل یقین تو رکھتا ہے لیکن غیر نبی پر حقیقی کیفیت کو واضح کرنے سے معذور ہے اور یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے اس لئے کہ یہ صورتِ حال تو دنیا کی بن دیکھی اشیا کے بارہ میں بھی صبح سے شام تک ہم مشاہدہ کرتے رہتے ہیں۔ مثلاً جس شخص نے سیب کو نہیں دیکھا اور نہیں چکھا اُس کے سامنے دیکھنے اور چکھ لینے والا اگرچہ سیب کی حقیقت کا بہتر سے بہتر نقشہ بھی پیش کر دے اور اس کے رنگ مزہ، خوشبو، لطافت وغیرہ کی تعبیر بحدِ کمال بھی پہنچا دے تب بھی وہ شخص سیب کو آنکھ سے دیکھنے اور زبان سے چکھ لینے والے کے مقابلہ میں کسی طرح اس کی حقیقی کیفیت سے آگاہ نہیں ہو سکتا، وہ بلا شبہ سیب کے متعلق صحیح علم تو حاصل کر سکتا ہے لیکن حقیقی ذوق کو ہرگز نہیں پاسکتا، اسی طرح نبی کی تعلیم و تلقین سے ہم "وحی" کے متعلق ایک اجمالی علم ضرور حاصل کر لیتے ہیں لیکن اسکی حقیقی کیفیت کو نہیں پاسکتے۔

نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے قرآن میں مسطورہ سہ اقسامِ وحی میں سے پہلی قسم "الّا وحیاً" کے متعلق یہ بھی ارشاد فرمایا ہے "وھواشدہ علیّ فیفصم عنّی وقد وعیتُ ما قال۔ اور وحی کی یہ صورت مجھ پر بہت سخت گذرتی ہے، پھر جب یہ کیفیت ختم ہو جاتی ہے تو وحی الٰہی نے جو کچھ کہا ہوتا ہے وہ سب مجھے محفوظ ہوتا ہے" یعنی جب فرشتہ بشکلِ انسان تمثل اختیار کر کے

وحی الٰہی لاتا ہے یا "من وراء حجاب" براہِ راست خدائے برتر سے ہم کلامی کا شرف حاصل ہوتا ہے تو یہ دونوں صورتیں آپ پر آسان ہوتی ہیں مگر "القاءِ وحی" کی پہلی شکل سخت گذرتی ہے۔ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ اس کے متعلق علماءِ حق یہ ارشاد فرماتے ہیں۔

خالقِ کائنات نے انسان کو لوازم بشریت کی قیود و شروط کے ساتھ اس درجہ پابند بنا دیا ہے کہ انبیاء و رسل جیسی مقدس اور معصوم ہستیوں کو بھی اپنی تطہیر و تقدیس کے باوجود ان اثرات سے متاثر ہوئے بغیر کوئی چارۂ کار نہیں ہے اس لئے جب اُن پر خدا کی وحی کا نزول ہوتا اور ایسی حالت میں اُن پر عالمِ قدس کے تمام اثرات چھا جاتے اور انوار و تجلیات کی آغوش میں وہ حضرتِ حق سے ہم کلامی کا شرف حاصل کرتے ہیں تو اس حالت میں ان پر دو قسم کی کیفیتوں میں سے ایک کیفیت ضرور طاری ہوتی ہے، ایک یہ کہ اُس کے بشری خواص کو مغلوب کر کے اُس کی روحانی کیفیات کو عالمِ قدس کی جانب اس درجہ بلند اور رفیع کیا جائے کہ وہ حضرتِ حق کی وحی کے اثرات قبول کرنے اور محفوظ رکھنے کے قابل ہو سکے اور چونکہ جذب و انجذاب کی اس خاص حالت اور عالمِ آب و گل سے عالمِ قدس کی جانب اس مخصوص رفعت میں بشری خصوصیات اور روحانی موثرات کے درمیان سخت قسم کا تصادم پیدا ہو جاتا ہے اس لئے اس تصادم اور تزاحم سے ہستی پر ابتداءً ایک اضطرابی کیفیت طاری ہو جاتی ہے اور آہستہ آہستہ جب یہ تصادم ختم ہو کر عالمِ قدس کے تمام پاک اور لطیف اثرات اُس ہستی پر چھا جاتے ہیں اور وہ اُن میں محو اور مستغرق ہو کر لذتِ وحی کو پا جاتی ہے تو پھر یہ اذیت و تکلیف یکلخت جاتی رہتی ہے اور اس کی مسرت کی کوئی انتہا نہیں رہتی اور یہ سب کچھ چند دقیقوں میں ہو گذرتا ہے۔

یہی وہ صورتِ وحی ہے جس کی کیفیات کو ذاتِ اقدس (صلی اللہ علیہ وسلم) نے

"صلصلۃ الجرس" اور "دوِی النحل" کی تمثیلات میں سمجھانے کی کوشش فرمائی ہے، تمثیلات میں اس پہلو کے اختیار کرنے کی وجہ بھی مسطورۂ بالا حقیقت ہے اس لئے کہ اس صورتِ خاص میں جب بشری حواس وادراکات پر عالمِ قدس کے روحانی اثرات کا غلبہ ہوتا ہے تو اول حواس وادراکات میں اضطراب وبے چینی پیدا ہو جاتی ہے اور حاسۂ سمع کہ جس کا تعلق سماعتِ وحی سے ہے وہ شروع میں ایک خاص قسم کی گونج محسوس کرتا ہے جو اس عالمِ پست سے دور کا بھی تعلق نہیں رکھتی اور اس کے بعد وہ "وحیِ الٰہی" کی اصل کیفیت سے لذت اندوز ہوتا اور اس کو "علمِ یقین" اور "اِذعانِ حق" کے ساتھ پالیتا ہے کیونکہ عالمِ قدس کے قوی موثرات اس پر غالب آکر "وحی الٰہی" کے حصول کا ہر طرح اہل بنا دیتے ہیں مگر دوسروں پر اس حقیقت کے تمام وکمال سمجھانے میں ان علامات واثرات کے اظہار سے آگے نہیں جاتا جن کو ابھی "صلصلۃ الجرس" اور "دوی النحل" کی تعبیرات میں سُن چکے ہو وحیِ الٰہی کی اس نوع کے علاوہ دوسری ہر دو انواع "یعنی ورارِ حجاب کلامِ الٰہی کی سماعت یا فرشتہ کے ذریعہ وحی کے نزول" میں صورتِ حال برعکس ہوتی ہے اور اس وقت نبی کے بشری خواص کو عالمِ قدس کی جانب رفعت دینے اور عالمِ خاک وگل سے عالمِ نور کی جانب جذب وانجذاب سے متاثر کرنے کی تکلیف نہیں دی جاتی بلکہ عالمِ قدس کی تمام کیفیات خود ہبوط ونزول کرتی اور نبی کی روحانیت کو متاثر بناتی ہیں اور یا فرشتہ بحکم حضرتِ حق اپنے ملکوتی جسد کو جامۂ انسانیت کے ساتھ متمثل کر لیتا اور عالمِ قدس کے اثرات اور بشری خواص میں امتزاج پیدا کر کے نبی کے حضور حاضر ہوتا اور وحی الٰہی کی تلاوت کرتا ہے اور اس لئے ان دونوں صورتوں میں نبی اور رسول کو پہلی قسم کے تصادم سے دوچار ہونا نہیں پڑتا۔

کیفیتِ وحی اور بعض مستشرقین کی گمراہی

چونکہ یورپ کے دورِ علمی کی بنیاد خالص مادیات پر قائم ہے اور روحانی علوم اور ماورارِ مادیات کے ناقابلِ انکار حقائق کے لئے وہ کوئی جگہ دینے کو آمادہ نہیں ہے اس لئے بعض مستشرقین نے جب وحیِ الٰہی کی پہلی قسم کے متعلق نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے وہ اقوال سُنے جن کا ذکر ابھی ہو چکا ہے اور وہ حالات پڑھے جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ نزولِ وحی کی اس خاص صورت میں آپ کرب اور اضطراب محسوس فرماتے اور سردی کے ایام میں آپ کی پیشانی پر پسینہ آجاتا اور آپ پر بے خودی کے سے آثار نظر آنے لگتے تو اُنھوں نے یہ کہنے میں کوئی جھجک محسوس نہیں کی کہ یہ نزولِ وحی کی کیفیت نہیں ہوتی تھی بلکہ (العیاذ باللہ) آپ کو ہسٹریا کا دورہ ہو جاتا تھا۔

یہ مستشرقین پرزور الفاظ میں آپ کی صداقت و امانت کو تسلیم کرتے ہیں، آپ کی تعلیماتِ حق کو سراہتے اور کائناتِ انسانی کے لئے آپ کی تعلیمات کو "تعلیمِ کامل" مانتے ہیں لیکن اس کے باوجود آپ کے دعویٰ "الہام و وحیِ الٰہی" کا انکار کرتے اور کیفیتِ وحی کو مرض سے تعبیر کرتے ہیں "سبحانك هذا بهتانٌ عظيم"

درحقیقت یہ حضرات یا تو ازرہِ تعصب ناقابلِ انکار تعلیمِ حق کے تسلیم کے ساتھ ساتھ ایک ایسی بات کہنا چاہتے ہیں جس سے تعلیمِ حق (اسلام) پر کاری ضرب لگ سکے اور تعصب کے الزام سے بھی بچ جائیں اور یا پھر اُس علمی حقیقت سے بے بہرہ ہیں جس کو تفصیل کے ساتھ ہم ابھی ظاہر کر چکے ہیں کہ نزولِ وحی کی یہ کیفیت "مرض" نہیں تھا بلکہ اپنے اثرات اور محرکات کی بنا پر ایک فطری صورتِ حال تھی جس کا پیش آنا ازبس ضروری تھا اور دراصل یہ کیفیت، دماغ، حواس اور اعضائے انسانی کو مفلوج نہیں بناتی تھی جیسا کہ ہسٹریا وغیرہ میں ہوتا ہے بلکہ اس کے برعکس تمام مادی قویٰ میں روحانی کوائف کی ایسی برقی رو دوڑا دیتی ہے

جس سے چند لمحات کے بعد ان کے اندر ایسی زبردست اور مافوق المادہ قوت پیدا ہو جاتی تھی جس کے ذریعہ اُس ہستی (نبی) میں عالمِ قدس سے پوری طرح وابستہ ہو کر خدا کی وحی اور اس کے کلام کو سننے اور قلب و دماغ میں بخوبی محفوظ رکھنے کی صلاحیت رونما ہو جائے چنانچہ اسی لئے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کیفیت کا اظہار کرتے ہوئے یہ بھی ارشاد فرمایا "فیفصم عنی وقد وعیت ما قال" شدت و کرب کی یہ کیفیت جلد ہی مجھ سے زائل ہو جاتی ہے اور میں وحی الٰہی کو تمام و کمال محفوظ کر لیتا ہوں۔"

کیا ہسٹریا کے دوروں کا کوئی مریض ایسا پیش کیا جا سکتا ہے جس پر ایک جانب مرض کا مسلسل حملہ ہو رہا ہو اور دوسری جانب وہ علمی و عملی صلاحیتوں، معاشی و معادی حکمتوں، اور دینی و دنیوی رفعتوں کے لئے ایسا کامل و مکمل دستور و آئین اور اعمال و افکار پیش کر رہا ہو، کائنات جس کا جواب نہ رکھتی ہو اور دوست و دشمن دونوں اُس کی رفعت و بلندی کا اعتراف کرتے ہوں؟ کیا دماغی فتور جو کہ ہسٹریا کا ثمرہ اور نتیجہ ہے اور دماغی رفعت و بلندی جس کے ثمرات حیرت زا اور عملی دنیا میں وسیع سے وسیع تر ہوں دونوں یکجا جمع ہو سکتے ہیں؟ اور اگر نہیں ہو سکتے اور بلاشبہ نہیں ہو سکتے تو حقیقتِ حال کو نظر انداز کرتے ہوئے "وحیِ الٰہی سے متعلق" مستشرقین کا یہ دعوٰی کس درجہ حقیر اور بے وقعت ہو جاتا ہے، صاحبِ عقل و بصیرت اس کا خود اندازہ لگا سکتے ہیں؟

نزولِ وحی کا پہلا دور

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر سب سے پہلے سورۂ علق کی یہ آیات نازل ہوئیں۔

اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ	پڑھو اپنے پروردگار کے نام سے، جس نے پیدا کیا،
خَلَقَ ۚ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ	پیدا کیا انسان کو خونِ بستہ سے، پڑھو! اور تیرا
عَلَقٍ ۚ اِقْرَأْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ	پروردگار جو سب سے زیادہ برگزیدہ ہے وہ ہستی ہے

الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ عَلَّمَ | جس نے سکھایا لکھنا، سکھایا انسان کو وہ سب
الْاِنْسَانَ مَالَمْ یَعْلَمْ | کچھ جو وہ نہیں جانتا تھا۔

ان آیات میں یہ بتلایا گیا ہے کہ حضرتِ انسان جو خدا کی سب سے بہتر اور سلسلۂ کائنات کی سب سے ترقی یافتہ مخلوق ہے اور اسی وجہ سے وہ کائناتِ ہست و بود میں "خلیفۃ اللہ" کے منصب پر سرفراز کیا گیا ہے اُس کی خلقی کمزوریوں کا یہ حال ہے کہ اُس کی نمود کی ابتدار آبِ نجس اور خونِ بستہ سے ہوئی ہے لیکن قدرتِ حق نے جب اس کو مقامِ رفیع بخشنے کا ارادہ کیا اور "اسفلِ سافلین" کے لائق مخلوق کو "درجاتِ علیا" پر فائز کرنا چاہا تو اس کو وہ صفتِ اعلیٰ عطا فرمائی جو صفاتِ الٰہی میں مبدء الصفات ہے یعنی اُس کو "صفتِ علم کا مظہر" بنایا، اس کو "قلم کے ذریعہ" لکھنا سکھایا اور علوم و عرفان کا مہبط و محور ٹھہرایا پھر اس جانب بھی اشارہ کیا کہ بہ سلسلۂ اسباب و مسببات حصولِ علم کے تین ہی طریقے ہیں "ذہنی، لسانی، رسمی" اور علمِ ذہنی الفاظ اور رسوم و نقوش کا محتاج نہیں ہوتا۔ اور علمِ لسانی علمِ ذہنی کا محتاج ہے مگر رسوم و نقوشِ کتابت سے بے نیاز اور علمِ رسمی، رسم الخط اور نقوش کا بھی محتاج ہے پس اگر "علمِ رسمی" کا کسی جگہ مذکور ہو تو لسانی اور ذہنی علوم کا ذکر خود بخود ہو جاتا ہے کیونکہ یہ اپنے سے بلند ہر دو علوم کے لئے بہترین معتبر ہے اور ظاہر ہے کہ علمِ رسمی "قلم" کا محتاج ہے۔ لہٰذا قرآن عزیز نے "علم بالقلم" کہہ کر لطیف پیرایۂ بیان میں اس پوری حقیقت کو واضح کر دیا اور اس کی مزید تشریح "علم الانسان مالم یعلم" سے کر دی۔ اور اس معجزانہ اسلوب کی غرض و غایت یہ ہے کہ ایک جانب "علم" اور "نبوت" کے درمیان کیا علاقہ ہے اس کا اظہار ہو جائے اور دوسری جانب انسان کو اپنے مقصدِ حیات کا صحیح علم ہو جائے۔

نزولِ وحی کا دوسرا دور

غارِ حرا میں منصبِ نبوت سے سرفرازی کے وقت سورۂ علق کی یہ چند آیات نازل ہو کر وحی الٰہی کا سلسلہ منقطع ہو گیا، حکمتِ الٰہی کا تقاضا یہ ہوا کہ حرا میں فرشتہ کے ظہور اور وحی کے نزول سے فوری طور پر نبوت و رسالت کے جو خصائص و اثرات ذاتِ اقدس پر وارد ہوئے ہیں وہ اچھی طرح راسخ ہو جائیں اور صلاحیت و استعدادِ نبوت و رسالت کی تکمیل ہو جائے تاکہ آئندہ سلسلۂ وحی کے قوی مؤثرات و محرکات پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے بشری خواص کے لئے اجنبی نہ رہیں، اس لئے کچھ عرصہ کے لئے نزولِ وحی کا سلسلہ بند رہا، اسی کو مذہب کی اصطلاح میں "فترتِ وحی" کہتے ہیں۔

لیکن ذاتِ اقدس (صلی اللہ علیہ وسلم) کو حرا میں پیش آمدہ کیفیت و صورتِ حال سے جو فطری تشویش پیدا ہوتی تھی جب اُس نے سکون و طمانیت کی شکل اختیار کر لی تو نزولِ وحی کی روحانی کیفیات نے اس درجہ لطف اندوز کیا کہ آپ اس "فترت" کو برداشت نہ کر سکے اور لطیف و عمیق جذبات نے اس حد تک اضطراب و بےچینی کی شکل اختیار کر لی کہ گاہ گاہ ناموسِ اکبر (جبرئیلِ امین) ظاہر ہو کر آپ کو صبر و تسکین کی دعوت دیتے اور یقین دلاتے تھے کہ اپنی تمام لطافتوں اور حسن و کمال کے ساتھ نبوت و رسالت کا یہ سلسلہ آپ کی ذات کے ساتھ وابستہ ہو چکا ہے اور "فترت" کا یہ دور محض عارضی ہے اس لئے آپ اندوہگیں نہ ہوں تب آپ تسکین پاتے اور وقتِ موعود کے منتظر رہتے کہ کچھ عرصہ بعد[1] نزولِ وحی کا دوسرا دور شروع ہوا اور سب سے اول سورۂ مدثر کی یہ آیات نازل ہوئیں۔

---

[1] فترۃ کا زمانہ کس قدر رہا ہے، اس سلسلہ میں چھ ماہ سے ڈھائی سال تک کے متعلق روایات پائی جاتی ہیں اور محدثین کا رجحان چھ ماہ کی جانب زیادہ ہے۔

يَا أَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ ۝ قُمْ فَأَنْذِرْ ۝	اے کملی پوش اٹھ (اور لوگوں کو گمراہی کے انجام سے) ڈرا
وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ۝ وَثِيَابَكَ	اور اپنے پروردگار کی عظمت وجلال کو بیان کر اور لباس
فَطَهِّرْ ۝ وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ ۝	کو پاک کر اور بتوں سے جدا رہ، اور زیادہ حاصل کرنے کی
وَلَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ ۝ وَلِرَبِّكَ	نیت سے حسنِ سلوک نہ کر، اور اپنے پروردگار کے معاملہ میں
فَاصْبِرْ ۝	(اذیت ومصیبت پر) صبر اختیار کر۔

ان آیات نے گویا انسانی مقصدِ حیات کی تکمیل کردی کیونکہ سورۂ علق میں کہا گیا تھا کہ انسانیت کبریٰ کے لئے "صحیح علم" شرط ہے یہ نہیں تو کچھ بھی نہیں۔ اب یہ بتایا جارہا ہے کہ علمِ صحیح کی رفعت وبلندی کے اعتراف کے باوجود انسانیت کی تکمیل اس وقت تک ناممکن ہے کہ علمِ صحیح کے ساتھ "عملِ صحیح" بھی موجود ہو اس لئے کہ اگر علم صحیح ہے اور عملِ صحیح مفقود تو اس علم کی افادیت معطل اور بیکار ہے اور اگر عمل ہے اور علم صحیح ندارد تو وہ عمل موجبِ زیان ونقصان ہے، رشد وہدایت اور صراطِ مستقیم کے لئے دونوں ہی کا وجود ضروری ہے اور تب ہی انسان "انسانیت کبریٰ" حاصل کرسکتا ہے۔

غرض جس طرح سورۂ علق کی آیات نے "علمِ نافع" کی جانب اشارات کئے اسی طرح سورۂ مدثر نے "عملِ نافع" کی اساسی تفاصیل ظاہر کی ہیں۔ خدا کی ہستی اور اُس کی ربوبیتِ کاملہ کا عملی اعتراف، باطنی طہارت وپاکیزگی کا کمال، ظاہری طہارت وپاکی کا لزوم، بے غرض اور بے لوث اخلاقِ حمیدہ کی اساس "احسان" پر استقامت اور قبولِ حق اور نیک عملی کے نتائج پر "صبر" ان آیات کا حاصل ہیں اور یہی وہ بنیادی امور ہیں جن میں علمِ حق اور عملِ صحیح کی تمام کائنات سمودی گئی ہے۔

نیز ذاتِ اقدس (صلی اللہ علیہ وسلم) کے لئے سورۂ علق اور سورۂ مدثر کا یہ خطاب

اور پیغامِ حق اشارہ ہے اس جانب کہ یہ نظامِ عمل منصبِ رسالت کے لئے "تکمیلِ نفس" اور دعوتِ رشد و ہدایت کے لئے "مرتبۂ اولین" کی حیثیت رکھتا ہے اور یہی مستقبلِ قریب میں "بعثتِ عامہ" کا باعث ثابت ہوگا۔

اعلانِ دعوت وارشاد کی پہلی منزل

کلامِ الٰہی کے اس حکم کے بعد جو کہ تبلیغ و دعوتِ حق کا پہلا پیغام تھا، دعوت وارشاد نے ایک قدم اور آگے بڑھایا اور اب ذاتِ حق نے سورۂ شعراء کی آیات نازل فرما کر نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کو یہ فیصلہ سنایا کہ سب سے پہلے اہلِ قرابت اور رشتہ داروں کو دعوتِ حق دیجئے تاکہ دوسروں پر بھی اس کا اثر پڑے اور یوں بھی قریش اور بنی ہاشم کے قبولِ حق کا اثر تمام عرب قبائل پر پڑنا لازمی ہے اس لئے کہ وہ سب قبائل کے سرخیل اور سرگروہ ہیں اور ساکنانِ حرم ہونے کی وجہ سے تمام عرب پر اُن کا دینی اور دنیوی اثر ہے۔ سورۂ شعراء میں ہے۔

وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ	اور (اے پیغمبر!) اپنے قریبی ناتے والوں کو (گمراہی سے)
وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِمَنِ	ڈرا اور جو مسلمان تیرے پیرو ہیں اُن کے لئے اپنے بازوؤں
اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ فَاِنْ	کو پست رکھ (یعنی نرمی اور تواضع سے پیش آ) اگر وہ نافرمانی
عَصَوْكَ فَقُلْ اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّمَّا	کریں تب تو اُن سے کہہ دے میں تمہارے ان اعمالِ
تَعْمَلُوْنَ ۚ وَتَوَكَّلْ عَلَى الْعَزِيْزِ	(بد) سے بری ہوں، اور غالب، رحم کرنے والی ذات
الرَّحِيْمِ الَّذِيْ يَرٰىكَ حِيْنَ	پر بھروسہ کر جو تجھ کو اُس وقت بھی دیکھتی ہے، جب
تَقُوْمُ وَتَقَلُّبَكَ فِي السّٰجِدِيْنَ	تو اُس کی بارگاہ میں کھڑا ہوتا ہے اور اس وقت بھی
اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ؕ	جبکہ تو سجدہ کرنے والوں میں مل کر اُس کے سامنے سجدہ
(شعراء)	ریز ہوتا ہے۔ بلاشبہ وہ سننے، جاننے والا ہے۔

گویا یہ "تکمیلِ علم و عمل" اور "منصبِ رشد و ہدایت کے فیضان" کے بعد دوسرا درجہ تھا جس میں اعلانِ حق اور دعوتِ اسلام کی عملی صورت اختیار کرنے کے لئے تحریک کی گئی چنانچہ صحیح روایات شاہد ہیں کہ آپ نے صفا کی چوٹی پر کھڑے ہو کر اُس زمانہ کے طریقِ اعلان کے مطابق "یا صباحا" "یا صباحا" کہہ کر خانوادۂ قریش کو پکارا اور جب سب جمع ہو گئے تو ایک مثال دے کر سمجھایا کہ بلا شبہ میں خدا کا پیغمبر اور رسول اور صراطِ مستقیم کے لئے ہادیٔ برحق ہوں۔ ارشاد فرمایا۔

لوگو! اگر میں تم سے یہ کہوں کہ اس پہاڑ کی پشت پر ایک لشکر جرار جمع ہے اور تم پر حملہ کیلئے آمادہ، تو کیا تم مجھ کو صادق سمجھو گے "أو مصدقیّ؟" لوگوں نے کہا: ہم نے تجھ کو "الصادق الامین" پایا ہے تو جو کچھ کہے گا حق اور صداقت پر مبنی ہو گا۔ تب آپ نے فرمایا! تو لوگو! میں تم کو خدائے واحد کی جانب بلاتا ہوں اور اصنام پرستی کی نجاست سے بچانا چاہتا ہوں، تم اس دن سے ڈرو جب خدا کے سامنے حاضر ہو کر اپنے اعمال و کردار کا حساب دینا ہے۔[۱]

یہ صدائے حق جب قریش کے کانوں میں پہنچی تو وہ حیران رہ گئے اور باپ دادا کے دین "بت پرستی" کے خلاف آواز سُن کر برافروختہ ہونے لگے گویا سب میں ایک آگ سی دوڑ گئی اور سب سے زیادہ آپ کے حقیقی چچا ابولہب کو طیش آیا اور غضبناک ہو کہنے لگا "تبالك سائر اليوم اما دعوتنا الا لهذا۔ تو ہمیشہ ہلاکت و رسوائی کا منہ دیکھے کیا تو نے اس غرض سے ہم کو بلایا تھا"۔[۲]

عجب منظر ہے کہ چند گھڑیاں پہلے جس محمد بن عبداللہ کی صداقت و امانت اور

---

[۱] تاریخ ابن کثیر ج ۳ ص ۳۸۔ [۲] سورۂ لہب کا نزول ابولہب کی اسی گستاخانہ بات کے انجام بد کا اظہار کرتا ہے۔

خصائلِ حمیدہ سے ساری قوم متاثر رہ کر اس کی عظمت و عزت کرتی اور اس کے ساتھ والہانہ محبت کا اظہار کرتی تھی وہی آج اس اعلان پر کہ میں "محمد رسول اللہ" ہوں یکلخت بیگانہ و نفور اور خون کی پیاسی بن گئی۔

دعوت وارشاد کی دوسری منزل

سیرت کی کتابوں میں پڑھ آئے ہو کہ نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے خاندان اور برادری کے لوگوں کو راہِ حق دکھانے اور اُن کی ایمانی اور اخلاقی حالت درست کرنے کی خاطر کیا کچھ نہیں کیا مگر قریش کے چند اصحاب کے سوائے کسی نے آپ کی دعوت پر لبیک نہ کہا اور عداوت و بغض کو اپنا شعار بنائے رکھا۔ تب دعوت وارشاد نے ترقی کے تیسرے زینہ پر قدم رکھا اور ذاتِ حق کی جانب سے حکم ہوا، اے داعیِ حق! خاندان اور برادری کے انکار و جحود سے متاثر و غمگین نہ ہو اور اپنی مفوضہ خدمت پر استقامت کے ساتھ قائم رہو کیونکہ سعادت و شقاوت تمہارے قبضہ میں نہیں ہے تمہارا کام تو صرف ابلاغ (پہنچانا) ہے۔ البتہ اب خاندان کے دائرہ سے آگے بڑھ کر مکہ اور اطرافِ مکہ کے قبائل و اقوام کو بھی یہ پیغامِ حق سناؤ اور دعوت وارشاد کا یہ نسخہ اُن کے سامنے بھی رکھو تاکہ جو سعید روحیں "پیغامِ حق" کے لئے مضطرب اور بےچین ہیں وہ اس پر لبیک کہہ کر تسکین پائیں اور روحِ تشنہ کو آبحیات سے سیراب کریں۔

وَهٰذَا كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَكٌ	اور (دیکھو) یہ کتاب (قرآن) ہے جسے ہم نے (توراۃ کی طرح)
مُّصَدِّقُ الَّذِیْ بَیْنَ	نازل کیا، برکت والی اور جو کتاب اس سے پہلے نازل
یَدَیْهِ وَلِتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰی	ہو چکی ہے اس کی تصدیق کرنے والی اور اس لئے نازل
وَمَنْ حَوْلَهَا۔	کی تاکہ تم ام القریٰ (یعنی شہر مکہ کے باشندوں کو) اور ان کو جو اس کے
(انعام)	چاروں طرف ہیں (گمراہیوں کے نتائج سے) ڈراؤ۔

وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا لِّتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰى وَ مَنْ حَوْلَهَا۔ (شوریٰ)	اور اسی طرح ہم نے تم پر قرآن نازل کیا زبانِ عربی میں تاکہ (گمراہیوں کے نتائج سے) ڈراؤ شہر مکہ کے باشندوں کو اور اُن کو جو اُس کے آس پاس ہیں۔

چنانچہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تبلیغِ حق کو مکہ کی تحدید سے آزاد کرکے اطرافِ مکہ کے لئے عام کردیا اور طائف، حُنین، اور یثرب (مدینہ) تک اپنی صدائے حق کو پہنچایا، بلکہ مہاجرین کے ذریعہ حبشہ کے عیسائی بادشاہ اصحمہ تک کو کلمۂ حق سُنایا۔

بعثت عامہ اس کے بعد دعوت وارشاد کی وہ تیسری منزل پیش آئی جو "بعثتِ محمدی" کا نصب العین اور مقصدِ وحید، اور تمام انبیاء ورسل علیہم الصلوٰۃ والسلام کے مقابلہ میں ذاتِ اقدس محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے لئے طغرائے امتیاز تھی یعنی خدائے برتر نے آپ کی بعثت کو "بعثتِ عام" قرار دیا اور حکم ہوا کہ آپ نہ صرف قریش کے لئے نہ صرف اُم القریٰ (مکہ) اور اطرافِ مکہ کے لئے نہ صرف عرب کے لئے نبی ورسول بناکر بھیجے گئے ہیں بلکہ آپ کی بعثت تمام کائناتِ انسانی کے لئے ہوئی ہے اور آپ عرب وعجم اور اسود واحمر سب کے لئے پیغامبر اور خدا کے ایلچی ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے۔

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ (السبا)	اور ہم نے تم کو تمام کائناتِ انسانی کیلئے پیغام دیکر بھیجا ہی (اعمال نیک پر) خوشخبری سُنانے اور (اعمالِ بد پر) لوگوں کو ڈرانے کے لئے اور اکثر (جاہل) لوگ اس حقیقت کو نہیں سمجھتے
تَبٰرَكَ الَّذِيْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰى عَبْدِهٖ لِيَكُوْنَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرًا (فرقان)	"پاک اور برتر ہے وہ ذات جس نے حق وباطل کے درمیان تمیز دینے والی کتاب نازل فرمائی اپنے بندے (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) پر تاکہ وہ تمام جہان والوں کو (انجامِ بد سے) ڈرائے۔

دعوتِ اسلام کا مجمل خاکہ
اور حضرت جعفرؓ کی تقریر

نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) سرزمینِ عرب میں مبعوث ہوئے اس لئے فطری طریقِ کار کے پیشِ نظر سب سے اول قومِ عرب ہی اُن کی دعوت و ارشاد کا مخاطب قرار پائی تاکہ جو قوم کل چوپایوں کی گلہ بان تھی نورِ نبوت سے مستنیر ہوکر کائناتِ انسانی کی گلہ بان بن جائے اور خدائے برتر کے سب سے بزرگتر پیغمبر و رسول کے سایۂ رحمت میں تربیت پاکر کائناتِ ہدایت کے لئے "خیرِ امۃ" کا لقب پائے۔ تو اب دیکھنا یہ ہے کہ عرب جیسی سرکش، جاہل تمدن و حضارۃ سے یکسر محروم اور اخلاقی و ملّی جذبات واحساسات سے قطعاً منحرف قوم پر "اسلام کی دعوت" نے فوری طور پر کیا اثر کیا تاکہ ہم بآسانی یہ اندازہ کرسکیں کہ جس مذہب کے بنیادی اصول وعقائد اور افکار و اعمال نے ایسی قوم کے تمام شعبہ ہائے حیات میں حیرت زا اور عظیم الشان انقلاب پیدا کرکے اس کو روحانی دنیا کا انسان بنادیا اُس مذہب کی صداقت کے لئے تنہا یہ ایک کارنامہ ہی روشن دلیل بن سکتا ہے۔

مشرکین مکہ کی پیہم مخالفت، ایذا رسانی، اور ہولناک طریقہائے عذاب نے جب مسلمانوں کی ایک مختصر جماعت کو افریقہ کے مشہور ملک حبشہ کی جانب ہجرت پر مجبور کردیا اور وہ عیسائی حکمراں اصحمہ کی حکومت میں پناہ گزیں ہوگئے تو سردارانِ قریش اس کو بھی برداشت نہ کرسکے اور اصحمہ کے دربار میں مشاہیر کا ایک وفد بھیج کر یہ مطالبہ کیا کہ وہ مسلمانوں کو اس لئے ان کے حوالہ کردے کہ یہ بددین ہوکر اور باپ دادا کے دین کو چھوڑکر قوم میں تفرقہ پیدا کرنے کا باعث بنے اور یہاں رہ کر بھی حکمران کے دین کے مخالف ہیں۔

اصحمہ نے وفد کا مطالبہ سُن کر مسلمانوں کو جواب دہی کے لئے دربار میں طلب اور اسلام کے متعلق دریافتِ حال، کیا۔ تب حضرت جعفر (رضی اللہ عنہ) نے اسلام سے متعلق تقریر فرمائی اور اس کی مقدس تعلیم کا مختصر اور جامع نقشہ کھینچ کر اصحمہ کو حقیقتِ حال سے آگاہ کیا۔

یہی وہ تقریر ہے جو دراصل عرب کے دورِ جاہلیت اور قبولِ اسلام کے دور کی انقلابی کیفیت کا مجمل مگر بہترین خاکہ ہے۔ حضرت جعفر بن ابی طالب (رضی اللہ عنہ) نے بادشاہ اور درباریوں کو مخاطب کرکے ارشاد فرمایا۔

بادشاہ! ہم پر ایک طویل تاریک زمانہ گذرا ہے۔ اُس وقت ہماری جہالت کا یہ عالم تھا کہ ایک خدا کو چھوڑ کر بتوں کی پرستش کرتے تھے اور خود ساختہ پتھروں کی پوجا ہمارا شعار تھا، مردار خواری، زناکاری، لوٹ مار، قطع رحمی صبح و شام کا ہمارا مشغلہ، ہمسایوں کے حقوق سے ہم بیگانہ، رحم و انصاف سے ہم نا آشنا، اور حق و باطل کے امتیاز سے ہم ناواقف، غرض ہماری زندگی سراسر درندوں کی طرح تھی کہ قوی ضعیف کو کچلنے اور توانا، ناتوان کو ہضم کرلینے کو اپنے لئے فخر اور طغرائے امتیاز سمجھتا تھا۔

رحمتِ خدا کا کرشمہ دیکھئے کہ اس نے ہمارے اندر ایک بزرگ پیغمبر مبعوث کیا، جس کے نسب سے ہم واقف، جس کی صداقت، امانت و عصمت پر دوست و دشمن دونوں گواہ، جس کی قوم نے اُس کو "محمد الامین" کا لقب دیا، وہ آیا اور اس نے ہم کو خدا کی توحید کا سبق دیا، خدائے واحد کی جانب بلایا، اُس نے بتلایا کہ خدا کا کوئی سہیم و شریک نہیں، وہ شرک سے پاک ہے، بت پرستی جہالت کا شیوہ ہے اس لئے قابلِ ترک ہے اور صرف خدائے واحد ہی کی عبادت حقِ عبدیت ہے، اُس نے ہم کو حق گوئی اور صداقت شعاری کی تلقین کی اور صلہ رحمی کا حکم فرمایا۔ ہمسایوں اور کمزوروں کے ساتھ حسنِ سلوک سکھایا، قتل و غارت کی رسمِ بد کو مٹایا، زناکاری کو حرام اور فحش کہہ کر اس ننگِ انسانیت عمل سے ہم کو نجات دلائی، نکاح میں محارم اور غیر محارم کا فرق بتایا، جھوٹ بولنے، ناحق مالِ یتیم کھانے کو حرام فرمایا، نماز اور

خیرات و صدقات کی تعلیم دی اور ہر حیثیت سے ہم کو حیوانیت کے قعرِ ذلت سے نکال کر انسانیتِ کبریٰ کے مرتبہ پر پہنچایا۔

بادشاہ! ہم نے اس مقدس تعلیم کو قبول کیا اور اس پر صدقِ دل سے ایمان لائے یہ ہے ہمارا وہ قصور جس کی بدولت یہ مشرکین کا وفد تجھ سے مطالبہ کرتا ہے کہ تو ہم کو ان کے حوالے کر دے۔[1]

حضرت جعفر (رضی اللہ عنہ) نے اسلام کے صاف اور سادہ مگر روشن اصول کو جب اصحمہ کے سامنے جرأتِ حق کے ساتھ پیش کیا تو حبشہ کے حکمراں نے مسلمانوں کو اپنی پناہ سے نکال کر وفد کے حوالہ کرنے سے انکار کر دیا اور پھر حضرت جعفرؓ نے خوش الحانی کے ساتھ سورۂ مریم کی چند آیات تلاوت کیں تو نجاشیِ حبشہ بے حد متاثر ہوا اور آبدیدہ ہو کر اسلام کی صداقت پر ایمان لے آیا اور حضرت جعفرؓ کے دستِ حق پرست پر مشرف باسلام ہو گیا۔

یہ ہے دعوتِ اسلام کا مختصر خاکہ جس نے دنیا کو شب دیجور کے تاریک ترین خطۂ انسانی کو ایک بہت ہی قلیل عرصہ میں مثلِ آفتاب تابناک اور روشن ترین بنا دیا۔ اس خاکہ میں اعتقادات اخلاق اور اعمالِ حسنہ کا وہ تمام عطر موجود ہے جس کو قرآن عزیز نے مختلف صورتوں میں حسب حال اور مناسبِ مقام بہ کثرت بیان کیا ہے بلکہ پورا قرآن ان ہی روشن حقائق کا ہادی و مرشد ہے۔

قرآن اور تجدیدِ دعوت | نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت جبکہ بعثتِ عام ہے تو از بس ضروری ہوا کہ کائناتِ انسانی کی رشد و ہدایت کے لئے خدا کا جو پیغام آپ کے ذریعہ آئے وہ آخری پیغام اور کامل و مکمل پیغام ہو اور فطرت کے ایسے سانچے میں ڈھلا ہوا ہو کہ عقلِ سلیم اور فطرتِ مستقیم تمام کائناتِ انسانی کے لئے اس کو ابدی اور سرمدی پیغام یقین کرے۔ اسی پیغامِ الٰہی کا نام

[1] سیرت ابنِ ہشام جلد اول و تاریخ ابن کثیر ج ۳۔

"القرآن" یا "الکتاب" ہے۔

قرآن کی تعلیم اور اُس کی دعوت واصلاح کی حقیقت معلوم کرنے سے قبل چند لمحات کے لئے مذاہبِ عالم کی تاریخ پر نظر ڈالنا ضروری ہے۔

قرآن کے نزول سے قبل کائناتِ انسانی پر چار مذہبی تصور حاوی اور فکر و نظرِ ذہنی پر اثر انداز تھے۔ ہندو مت، مجوسی، یہودی اور مسیحی۔

ہندو مت تصورِ الٰہی کے متعلق خواص اور عوام کے لئے دو جُدا جُدا تخیلات رکھتا تھا، خواص کے لئے وحدۃ الوجود[1] اور عوام کے لئے اصنام پرستی، وحدۃ الوجود کا تصور اس درجہ فلسفیانہ تھا کہ خدا کا صحیح تصور کسی طرح اس راہ سے ممکن نہ تھا اس لئے کہ اگر ایک جانب وہ ہر وجود کو خدا یا خدا کا جزء مانتا ہے تو دوسری جانب خدا کے لئے کوئی محدود و متعین تخیل بنانے سے عاجز تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ہندو مت کے تمام اسکولوں (مذاہب) میں اصنام پرستی ہی کو مذہبی امتیاز رہا اور وہ توحیدِ خالص کو مقبولِ خواص و عوام نہ بنا سکا۔ چنانچہ ویدک دھرم، بدھ مت، جین مت وغیرہ بلکہ جدید اصلاحی اسکول (مذہب) آریہ سماج سب کے سب توحیدِ خالص کے تصور سے خالی ہیں۔

مجوسی مذہب کا اعتقادی تصور تو صاف صاف "ثنویت" کی بنیادوں پر قائم ہے یعنی وہ خدا کے تصور و تخیل کو خیر و شر کی جُدا جُدا دو متقابل قوتوں میں تقسیم کر دیتا ہے، وہ کہتا ہے کہ نور اور خیر کا خدا "یزداں" اور ظلمت و شر کا "اہرمن" ہے اور اس طرح خدائے خیر اور خدائے شر دو خدا، کائناتِ ہست و بود پر متصرف اور باہم متقابل ہیں۔

یہودی مذہب اگرچہ خدا کے تصور میں مدعیِ توحید رہا ہے لیکن موجودہ تورات کے اوراق

---

[1] یہاں وہ وحدت الوجود مراد ہے جو بڑیگیانہ تصور کا نچوڑ ہے۔

شاہد ہیں کہ اُس کی نگاہ میں خدا کی ہستی تجسیم سے پاک نہیں ہے اسی لئے تورات کا تخیلِ خدا
کہیں حضرت یعقوب سے کشتی لڑتا نظر آتا ہے اور یعقوب اُس کو پچھاڑ دیتا ہے اور کہیں اُس کی
اسرائیلیوں سے دور ہٹنے لگتا ہے اور وہ اُن کی وجہ سے چھپتا نظر آتا ہے کبھی وہ بنی اسرائیل کو اپنی چہیتی
بیوی بنا لیتا ہے تو کبھی مصر سے خروج کے وقت بادل اور آگ کا ستون بن کر بنی اسرائیل کی رہنمائی
کرتا نظر آتا ہے اور کبھی اس کی آنکھیں دکھنے آجاتی ہیں وغیرہ وغیرہ اور اس تصور کا آخری مظاہرہ
حضرت عزیر (عزرا) علیہ السلام کو خدا کا بیٹا تسلیم کر لینے پر ختم ہو جاتا ہے۔

اسی طرح مسیحی تصور بھی تجسیم و تشبیہ کے چکر میں آکر حضرت مسیح کو خدا کا بیٹا مان لیتا اور اس
طرح مشرکانہ عقیدہ "اوتار" کا تخیل اپنا لیتا ہے اور اقانیم ثلثہ (تثلیث) اور مریم و بیٹے میں حقیقی
خدا کی ہستی کو گم کر بیٹھتا ہے۔ خدا کی ہستی سے متعلق یہ وہ تصورات تھے جن میں دنیا کے بڑے
بنیادی مذاہب نزولِ قرآن کے وقت مبتلا نظر آتے ہیں۔

اِن سب مذاہب میں توحیدِ حقیقی سے غفلت نے رسالت یعنی دعوتِ حق کے داعی
کی شخصیت کے متعلق بھی غلط تصورات پیدا کر دیئے تھے چنانچہ ہندو مذہب کے ذہنی تصور میں تو
رسالت و نبوت اپنے صحیح معنی میں نظر ہی نہیں آتی اور وہ نبی و رسول کے مفہوم سے ہی یکسر نا آشنا
نظر آتا ہے اور مجوسی، یہودی اور مسیحی مذہب کے معتقدات میں اگر یہ تصور پایا بھی جاتا ہے
تو افراط و تفریط کی شکل میں کبھی "ابن اللہ" ہو کر اور کبھی "بد اخلاق و بد اعمال انسان" کا پیکر
بن کر جیسا کہ تورات میں حضرت لوط علیہ السلام اور اُن کی بیٹیوں کا اُن کے ساتھ اختلاط کا
واقعہ مذکور ہے (العیاذ باللہ من ہذہ الخرافات والافتراءات)

گویا اُن کے نزدیک یا تو "رسول" اور داعیِ حق کی شخصیت کوئی اہمیت ہی نہیں رکھتی
اور یا پھر خدا، خدا کا اوتار اور خدا کا بیٹا بن کر سامنے آتی ہے اور اس لئے جس طرح وہ حقیقی

توحید سے بیگانہ نظر آتے ہیں اسی طرح رسالت و نبوت کے صحیح تصور سے بھی محروم ہو چکے ہیں۔

اسی طرح عالمِ آخرت کے متعلق بھی اِن مذاہب کے تصور کی دنیا افراط و تفریط سے خالی نہیں تھی، بعض مذاہب میں تو کائناتِ انسانی مختلف جونوں کے چکر میں گرفتار نظر آتا اور آواگون (تناسخ) کے ناقص فلسفیانہ نقطۂ نگاہ کا رہینِ منت بنا ہوا ہے اور ایک حد پر پہنچ کر "برہم" یعنی خدا میں جذب ہو جانا نجات کا آخری نقطہ متعین کیا جاتا ہے۔ نیز خیر و شر کی جزاء و سزا کے بارہ میں ایک قادرِ مطلق خدا نہیں بلکہ ایک جبری قانون میں جکڑی ہوئی مجبور ہستی کا تصور پیش کرتا ہے اور بعض اگرچہ تناسخ کے غلط عقیدہ سے جدا یومِ معاد اور یومِ جزاء کے تصور سے آشنا بھی ہیں لیکن اُن کے نزدیک بھی عالمِ آخرت کا معاملہ اعمالِ صالحہ و سیئہ یا افعال و کردار کے حق و باطل کی جزاء و سزا سے وابستہ نہیں ہے بلکہ نسلی امتیازات اور جماعتی فرقہ بندی اور یا پھر کفارہ کے ساتھ مربوط ہے۔

ان چار بنیادی مذاہبِ عالم کے علاوہ مشرکین اور فلاسفہ کی بعض ایسی جماعتیں بھی تھیں جو نہ خدا کی ہستی کی قائل ہیں اور نہ عالمِ آخرت کی اور خدا کی ہستی پر اگر ایمان بھی رکھتی تھیں تو سیکڑوں، ہزاروں بلکہ بے تعداد بتوں کی باطل پرستی کے ساتھ ملوث و مجروح۔

غرض یہ تھے مذاہبِ عالم کے وہ ذہنی تصورات اور فکری معتقدات جن پر کائناتِ انسانی کی روحانی اور سرمدی سعادت کا مدار سمجھا جاتا تھا اور جو بلاشبہ اپنے نتائج و ثمرات کے لحاظ سے کائناتِ انسانی کو مشعلِ ہدایت دکھا کر "انسانیتِ کبریٰ" کے درجہ تک پہنچانے اور انسانوں کا خدا کے ساتھ حقیقی معبود و عبد ہونے کا رشتہ قائم کر کے دین و دنیا کی خیر و فلاح تک پہنچانے میں قطعی تہی دامن تھے۔

ان ہی حالات میں "اسلام" کی دعوت و تبلیغ یا "تعلیم حق" نے رونمائی کی اور کائنات

انسانی کے ہر شعبۂ حیات میں گوناگوں انقلاب پیدا کر کے نیا عالم پیدا کر دیا اور آفتابِ ہدایت کی روشنی سے منور بنا کر اُس کو معراجِ کمال تک پہنچا دیا۔

توحید — نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے خدا کے کلام (قرآن) کے ذریعہ سب سے پہلے اسی عقیدۂ توحید پر روشنی ڈالی اور توحیدِ خالص کی حقیقت واضح کر کے تمام کائناتِ انسانی کو اس کی جانب دعوت دی۔

قرآنِ عزیز کی دعوتِ توحید کا حاصل یہ ہے کہ اللہ ایک ایسی ہستی کا نام ہے جو اپنی ذات و صفات میں ہر قسم کے شرک سے پاک اور وراء الوراء ہے، نہ اُس کا کوئی سہیم و شریک ہے اور نہ اُس کا ہمتا و ہمسر، اس لئے "ابنیت" کا عقیدہ ہو یا "اوتار" کا، صنم پرستی ہو یا ثنیت و تثلیت یہ سب باطل ہیں وہ یکتا و بے ہمتا ہے، باپ، بیٹا اور اس قسم کی نسبتوں سے پاک ہے، پرستش کے قابل وہ خود ہے نہ کہ اُس کے مظاہر اور اُس کی مخلوقات وہ جس طرح تجسم و تشبہ سے بالاتر ہے اُسی طرح اس کا نہ کوئی مقابل ہے اور نہ کوئی حریفانہ سہیم۔

اَللّٰہُ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ	"اللہ" اُس ہستی کا نام ہے کہ اُس کے سوا کوئی معبود اور خدا نہیں ہے
اَللّٰہُ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ۔	"اللہ" وہ ہے کہ اُس کے سوا کوئی نہ خدا ہے نہ معبود وہ ہمیشہ زندہ رہنے والا ہے اور زندگی کا بخشنے والا۔
وَاعْبُدُوا اللّٰہَ وَلَا تُشْرِکُوْا بِہٖ شَیْئًا۔	پس تم اللہ ہی کی عبادت کرو اور کسی کو اُس کا شریک نہ بناؤ۔
لَا تُشْرِکْ بِاللّٰہِ اِنَّ الشِّرْکَ لَظُلْمٌ عَظِیْمٌ۔	اللہ کا کسی کو شریک نہ بنا اس میں کوئی شبہ نہیں کہ شرک بہت بڑا ظلم ہے۔
وَاِلٰھُکُمْ اِلٰہٌ وَّاحِدٌ	اور خدا تمہارا ایک ہی خدا ہے۔

یہ اور اسی مضمون کی بے شمار آیات ہیں جو قرآن عزیز میں توحید خالص کی داعی اور منادی ہیں لیکن سورۂ اخلاص یا سورۂ توحید میں جس معجزانہ اختصار کے ساتھ توحید سے متعلق موجودہ مذاہب کے ناقص اور غلط تصورات کو باطل کرتے ہوئے توحید خالص کی تعلیم دی گئی ہے وہ خود اپنی نظیر ہے۔

قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۚ اَللّٰهُ	(اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کہہ دیجئے اللہ یکتا ذات ہے
الصَّمَدُ ۚ لَمْ يَلِدْ ۙ وَلَمْ يُوْلَدْ	اللہ بے نیاز ہے نہ وہ کسی کا باپ ہے اور نہ کسی کا بیٹا اور
وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ	نہ اس کا کوئی ہمسر اور سہیم و شریک ہے۔

ایک مرتبہ توحید سے متعلق مذاہب عالم کی تعلیم پر اور نظر کیجئے اور پھر ان چند مختصر آیات کو غور و فکر کے ساتھ ملاحظہ فرمائیے تو آپ اندازہ کر سکیں گے کہ پہلی دو آیات میں توحید خالص کا صحیح اور حق تصور پیش کر دیا گیا ہے، قرآن کہتا ہے کہ اللہ ایسی ہستی کا نام ہے جو یکتا و بے ہمتا ہے، ساری کائنات اُس کی محتاج ہے اور وہ ہر قسم کی احتیاج سے پاک اور بے نیاز یعنی وہ صمد ہے یعنی مجموعۂ کمالات صرف صمدیت کا حصہ ہے اور بس۔

اس کے بعد وہ نصاریٰ اور یہود سے مخاطب ہو کر شمع ہدایت دکھاتا ہے کہ اللہ اس ہستی کو کہتے ہیں جو باپ اور بیٹے جیسی ذاتی نسبتوں سے بالاتر ہے وہ نہ کسی کا باپ ہے اور نہ کسی کا بیٹا تعالیٰ اللہ علواً کبیراً، اور اسی طرح ہندو دھرم سے کہتا ہے کہ ایسی لازوال ہستی کی مقدس شان اس سے بلند و بالا ہے کہ وہ کسی انسان یا حیوان کے جسم میں محدود ہو کر "اوتار" کہلائے یا اس معبودِ مطلق کے ساتھ چھوٹے چھوٹے معبودوں کا سلسلہ قائم کر کے کسی مخلوق کو اس کا سہیم و شریک ٹھہرایا جائے۔ سُبْحٰنَكَ هٰذَا بُهْتَانٌ عَظِيْمٌ اور وہ مجوس اور ویدک دھرم کے اُن پجاریوں کو مخاطب کرتا ہے جو اُس کو یزداں کہہ کر اہرمن کو اُس کا مقابل حریف تسلیم کرتے

ہیں یا روح (جیو) اور مادہ (پرکرتی) کو خدا کے ساتھ ازلی و ابدی (قدیم وغیر مخلوق) کہہ کر ان چیزوں کو خدا کا کفو اور ہمسر بتلاتے ہیں، اور کہتا ہے "ولم یکن لہ کفواً احد" خدا اُس ہستی کا نام ہے جس کا نہ کوئی ہمسر اور حریف ہے اور نہ اُس کی طرح اَنادی (قدیم) اور غیر مخلوق ہے۔

غرض قرآنِ عزیز نے خدا کی ذاتِ واحد سے متعلق ان تمام نسبتوں کا قطعی انکار کر کے جو توحیدِ خالص کے کسی طرح بھی معارض ہوتی تھیں اُس کو یکتا اور بے ہمتا ظاہر کیا ہے اور اس طرح شرک فی الذات اور شرک فی الصفات کا قلع قمع کر دیا ہے اور شرک فی الالوہیۃ اور شرک فی الربوبیۃ کے خلاف توحید اور صرف توحید کو ہی اسلام کا بنیادی تصور قرار دیا ہے۔

یہاں یہ بات بھی قابلِ توجہ ہے کہ جس طرح قرآن نے توحید کے تمام اطراف و جوانب کو نقص و خام کاری سے پاک کر کے حقیقی توحید کے تصور کی جانب راہنمائی کی اور اُس کو ہر قسم کے تجسم سے وراء الوراء بتلا کر توحیدِ کامل کی جانب دعوت دی اُسی طرح اُس نے توحید کے اس فلسفیانہ عقیدہ کو بھی باطل ثابت کیا جو اس باب میں تفریط کی حد تک بڑھ کر صفاتِ الٰہی کا بھی منکر ہو گیا اور کہنے لگا کہ وہ قادر ہے بغیر قدرت کے خالق ہے بغیر خلق کے، بصیر ہے بغیر رؤیت کے، سمیع ہے بغیر سمع کے وغیرہ وغیرہ۔ اس عقیدہ کا حاصل یہ ہے کہ خدا الٰہی ہستی کا نام ہے جس کے لئے "تعطل" لازم ہے جیسا کہ پہلی تعلیمات کا حاصل یہ تھا کہ کسی نہ کسی رنگ میں خدا کے لئے تجسم ضروری ہے۔

قرآن نے کہا کہ پہلی کیفیت اگر افراط پر مبنی تھی تو یہ تفریط پر قائم ہے اس لئے کہ ایک ذات کے لئے متعدد صفاتِ کمال کا ہونا ذات کی وحدت پر اثر انداز نہیں ہے اس لئے بلاشبہ وہ سمیع و بصیر ہے: سنتا ہے اور دیکھتا ہے، لاریب وہ قدرتِ کاملہ کے ساتھ قادر ہے اور صفتِ رحم و کرم کے ساتھ رحیم و کریم ہے البتہ اُس کی صفتِ سمع و بصر، صفتِ رحم و کرم وغیرہ

صفات کا انسانی صفات سمع و بصر سے دور کا بھی تعلق نہیں ہے اور جس طرح وہ اپنی ذات میں بے ہمتا اور یکتا ہے اسی طرح صفات میں بھی ہے۔

لَیْسَ کَمِثْلِهٖ شَیْءٌ وَهُوَ السَّمِیْعُ الْبَصِیْرُ ؕ اُس (خدا) کی کوئی مثال نہیں اور یہ حقیقت ہے کہ وہ سنتا ہے دیکھتا ہے۔

غور فرمائیے کہ کس معجزانہ تعبیر کے ساتھ ایک ہی آیت اور ایک ہی جملہ میں اُس کی صفاتِ کمالیہ کا اعتراف بھی مذکور ہے اور یہ بھی وضاحت موجود کہ خدا کی ان صفات کو انسانی صفات طرح نہ سمجھو بلکہ اُس کی ذات کی طرح اُس کی صفات بھی "لیس کمثلہ شیٔ" کے عنوان سے معنون اور انسانی صفات کی حقائق کے مقابلہ میں بے مثال و بے نظیر ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ خدائے برتر کی توحید جب ہی حقیقی توحید کہلا سکتی ہے کہ اس میں نہ تجسیم کا عقیدہ شامل حال ہو اور نہ تعطل کا کہ یہ دونوں افراط و تفریط کی راہیں ہیں بلکہ عقیدہ یہ ہو کہ اللہ اپنی ذات میں بھی بے ہمتا و یکتا ہے اور اپنی صفات میں بھی اور وہ ہر طرح کے شرک و کفو سے پاک اور برتر ہے۔

رسالت توحید حقیقی کے ثبوت کے بعد قرآن نے "رسالت" کے بنیادی عقیدہ کی اصلاح بھی ضروری سمجھی اور اُس نے بتلایا کہ کسی تعلیم کے حسن و قبح میں معلم کی شخصیت کو بہت بڑا دخل ہوتا ہے کیونکہ یہ ممکن ہی نہیں کہ اچھی تعلیم کا معلم بدعمل انسان ہو یا بُری تعلیم کا معلم نیکوکار اور جبکہ یہ ایک حقیقت ثابتہ ہے کہ خدا ہر ایک انسان کے ساتھ براہِ راست ہمکلام نہیں ہوتا تو ازبس ضروری تھا کہ کائناتِ انسانی کی ہدایت کے لئے ایک انسان ہی کو معلم بنایا جائے اور وہی خدا کی جانب سے رسالت اور پیغامبری کا فرض انجام دے۔

پس بشری اوصاف سے متصف یہ انسان نہ خدا ہوگا اور نہ خدا کا بیٹا یا خدا کا اوتار

بلکہ بشر اور انسان ہی رہے گا نیز خدا کے پیغامبر ہونے کی وجہ سے پاکی اور تقدس کا جو رشتہ اس کو خدا کی درگاہ سے وابستہ کئے ہوئے ہے اُس کے پیشِ نظر اُس کی ہستی کا نہ انکار کیا جا سکتا ہے اور نہ اُس کو دوسرے انسانوں کے مساوی کہا جا سکتا ہے اس لئے قرآن نے جگہ جگہ مسیح ابنِ مریم اور عزیر (علیہم السلام) کے متعلق اس حقیقت کو واضح کیا کہ وہ خدا کے مقدس رسول ہیں، خدا یا خدا کے بیٹے نہیں ہیں۔ نیز یہ بھی بتلایا کہ اگر ایک انسان تمہاری طرح کھاتا پیتا ہے اور مینا بھی اور بازاروں میں چلتا پھرتا، خرید و فروخت کرتا اور گھر میں اہل و عیال کے ساتھ معاشرتی زندگی بسر کرتا ہے تو اُس سے یہ کیسے لازم آگیا کہ وہ خدا کا فرستادہ "رسول" نہیں ہے اور کس طرح یہ جائز ہے کہ ایک صادق و امین ہستی کے اس دعویٰ کو تم محض قیاس کی بنا پر جھٹلا دو کہ وہ خدا کا رسول نہیں ہے۔

قرآن نے ان حقایق کو جن صاف اور واضح تعبیرات کے ساتھ بیان کیا ہے گذشتہ صفحات میں آپ اُن کا مطالعہ فرما چکے ہیں۔

پس جس کتاب میں نبوت و رسالت سے متعلق صحیح تصور موجود نہ ہو وہ کبھی اپنی مذہبی تعلیمات کی صداقت کی مکمل تصویر نہیں پیش کر سکتی، یہی وہ عقیدہ ہے جس کی حقیقت میں "ایمان بالرسل" "ایمان بالکتب" "ایمان بالملائکہ" سب بنیادی عقائد سمٹ کر جذب ہو جاتے ہیں۔

قرآن کہتا ہے کہ جبکہ ہدایتِ انسانی کے لئے خدائے تعالیٰ اپنی پیغامبری کے لئے ایک انسان اور بشر کو ہی چن لیتا ہے تو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ انسان نے جب سے اس کائنات میں قدم رکھا ہے اُسی وقت سے رشد و ہدایت کا یہ سلسلہ قائم ہے۔

وَاِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِیْهَا نَذِیْرٌ۔ (فاطر)	کوئی گروہ یا جماعت ایسی نہیں ہے کہ جس میں ہماری جانب سے نذیر (پیغامبر) نہ گذرا ہو۔

وَلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ (رعد) — اور ہر قوم کے لئے ہادی آئے ہیں۔

مِنْهُمْ مَنْ قَصَصْنَا عَلَيْكَ وَمِنْهُمْ — ان میں سے بعض کے واقعات کا ہم نے قرآن میں تذکرہ

مَنْ لَمْ نَقْصُصْ عَلَيْكَ (المومن) — کردیا ہے اور بعض ایسے ہیں جن کا تذکرہ قرآن میں نہیں کیا۔

اور یہ یقین لانا بھی ضروری ہے کہ جبکہ خدا ایک ہے اور اس کی تعلیم ایک تو بلاشبہ تمام پیغمبرانِ خدا کی بنیادی تعلیم بھی ایک ہی رہی ہے اور اس لئے اگر خدا کے کسی ایک برحق نبی و رسول کا بھی انکار کیا گیا تو گویا اس نے پوری دعوتِ قرآنی کا انکار کر دیا، پس یہ ایمان ضروری ہوا۔

لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ — ہم خدا کے پیغمبروں میں پیغمبر ہونے کے لحاظ سے کسی کے درمیان کوئی

مِنْ رُسُلِهِ۔ — فرق نہیں کرتے (کہ ایک کو مان لیں اور دوسرے کا انکار کر دیں)

لہٰذا جب تمام انبیاء علیہم السلام پر ایمان لانا از بس ضروری ہوا تو اُن پر نازل شدہ تمام کتبِ سماویہ پر بھی ایمان لانا جزوِ ایمان ہوگا ورنہ تو ایک جانب سے ایمان لاکر دوسری جانب سے اُس پیغمبر کی صداقت کا انکار لازم آئے گا اور جب رسالت اور رسالت کے ساتھ کتبِ سماویہ پر ایمان حقیقتِ ثابتہ بن جائے تو ملائکۃ اللہ پر اس لئے ایمان لانا ضروری ہوگا کہ خدا کے اِن پیغمبروں نے یہ صاف صاف اعلان کیا ہے کہ خدا کی جانب سے اُن پر یہ وحی خدا کا فرشتہ لے کر آتا ہے تو اب یا ہم اس پیغمبر کی صداقت کا انکار کر دیں اور یا پھر بن دیکھے فرشتہ پر اس لئے ایمان لے آئیں کہ بتلانے والی ہستی اپنے کردار و اعمال میں ہر طرح صادق و امین اور امراضِ دماغی و قلبی "جنون و سحر" ——— سے ہر طرح پاک ہے۔ اور ضروری نہیں ہے کہ جس شی کو آنکھوں نے نہ دیکھا ہو اور کانوں نے نہ سُنا ہو وہ حقیقت میں بھی غیر موجود ہو کیونکہ یہ ایک مسلّمہ اصول ہے کہ کسی شے کے عدمِ علم سے اس شے کا عدم لازم نہیں آتا یعنی یہ ضروری نہیں کہ جس بات کو ہم نہیں جانتے وہ واقع میں بھی موجود نہ ہو۔

یومِ آخرت | نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے خدا کے آخری اور مکمل پیغام قرآن کے ذریعہ تعمیری بنیادی اصلاح یومِ آخرت کے متعلق فرمائی۔

مذاہبِ عالم اس سلسلہ میں بھی راہِ مستقیم سے روگردانی اور افراط و تفریط کے بحرِ ظلمات میں پھنسے ہوئے تھے وہ یا تو آواگون (تناسخ) کے چکر میں یومِ آخرت کے اس تصور سے

لہ اس موقعہ پر اس مسئلہ کے تمام پہلوؤں سے متعلق اگرچہ بحث کرنے کی گنجائش نہیں ہے تاہم اس قدر سمجھ لینا ضروری ہے کہ تناسخ (آواگون) کا عقیدہ اس اساس پر قائم ہے کہ ہر ایک انسان کی موجودہ زندگی سابق میں کئے ہوئے اعمال کا ثمرہ اور نتیجہ ہے ورنہ کائنات میں یہ تنوع ہرگز نہ ہوتا کہ کوئی انسان ہے تو کوئی حیوان اور کوئی نباتات و جمادات، نیز انسانوں میں کوئی عالم ہے تو کوئی جاہل اور کوئی صحتیاب ہے تو کوئی مریض اور کوئی امیر کبیر ہے تو کوئی مفلس و محتاج و حقیر وغیرہ وغیرہ۔

اس عقیدہ کا مقصد یہ ہوا کہ بغیر عمل و کردار کے اگر عالم میں یہ تغیرات موجود ہیں تو یہ خدا کی صفتِ عدل کے منافی ہیں لیکن اس عقیدہ کی خام کاری اور بطلان کی مختلف وجوہ میں سے ایک وجہ یہ ہے کہ اگر روح اپنے اعمال کی وجہ سے مختلف جون بدل کر ان تغیراتِ عالم کا باعث ہے جو مجموعۂ کائنات کے حسن کا باعث ہیں اور جس کی بدولت یہ پورا کارخانہ مکمل نظام کے ساتھ وابستہ نظر آتا ہے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ انسان کے لئے فطری اور نیچرل طور پر گنہگار، بدکار اور بداعمال ہونا ازبس ضروری ہے، تاکہ مجموعۂ کائنات کا یہ حسن نہ صرف یہ کہ پیدا ہو بلکہ قائم رہے جس کا تغیرات اور تنوعات پر مبنی ہونا ازبس ضروری ہے۔

دوسرے الفاظ میں یوں کہہ دیجئے کہ جون بدل کر آواگون کی زندگی اگر اعمال کی جزا و سزا سے متعلق ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ حضرتِ انسان کے لئے نکوکار بننے کی جگہ زیادہ سے زیادہ بدکار ہونا چاہیئے تاکہ آئندہ نظامِ عمل میں یہ تنوع باقی رہے جس کا باقی رہنا عقل و فطرت کے مطابق ہے ورنہ تو حیوانات، نباتات، جمادات کے نقصان سے انسانی دنیا کا یہ سارا کارخانہ درہم برہم ہو کر رہ جائیگا۔

تناسخ کے ناقص فلسفیانہ عقیدہ پر یقین رکھنے والوں نے اس حقیقت کو یکسر فراموش کر دیا ہے کہ ایک چیز اپنی انفرادیت کے لحاظ سے خواہ کتنی ہی قبیح اور بری معلوم ہو لیکن مجموعۂ کائنات کے پیشِ نظر اس کا وجود بھی اپنے اندر ضرور حسن رکھتا ہے۔ مثلاً تِل (خال) اپنے رنگ و روپ میں کیسا ہی سیاہ فام کیوں نہ ہو لیکن محبوب کے رخسار پر نہ خود حسین بن جاتا ہے بلکہ حسنِ محبوب کو دوبالا کر دیتا ہے اور حافظ شیرازی جیسے صوفی کو بھی کہنا پڑا

قطعاً بیگانہ ہو چکے تھے اور قیامت (پہلے) کا تعلق انسانی اعمال کی جزاء و سزا اور یوم الحساب سے غیر متعلق سمجھ چکے تھے اور یا پھر اس دام نجات کا مدار اور جزاء و سزا کا معیار اعمال و کردار کی جگہ نسل و خاندان اور سوسائٹی کی معاشرتی گروہ بندی پر سمجھ بیٹھے تھے اور "کفارہ" کو عقیدہ بنا کر حساب و محاسبۂ اعمال سے مطمئن ہو چکے تھے۔ اور مشرکین اور بعض فلاسفہ نے تو یوم آخرت کے وجود ہی کا انکار کر دیا تھا، اور ان کی سمجھ میں ہی نہیں آتا تھا کہ آج کا مردہ انسان کل کس طرح زندگی اختیار کر لیگا اور سیکڑوں اور ہزاروں برس کی بوسیدہ ہڈیاں یوم حساب میں کس طرح جسم بن کر اپنی روح کے لئے لباس بن سکیں گی۔

قرآن نے نازل ہو کر دنیاء انسانی کو بتایا کہ اس صاف اور واضح بات کے سمجھنے میں آخر تم پر کیوں وحشت طاری ہوتی ہے اور کیوں تمہاری عقل اس کو نہیں تسلیم کرتی کہ جس خالقِ کائنات اور بدیع السموات والارض نے نمونہ اور نقشہ کے بغیر یہ عجیب و غریب عالم آفرینش کر دیا وہ بلاشبہ اس پر قادر ہے کہ ماضی میں مخلوق اور حال میں مردہ و بوسیدہ ہستی کو مستقبل میں دوبارہ وجود عطا فرما دے اور اس کے منتشر اجزاء کو جمع کر کے دوبارہ وہی ہیئت جسمانی عطا اور سابق روح کو اس میں واپس کر دے۔

یا تو صاف کہو کہ اس کائنات کو کسی بلند و بالا ہستی نے پیدا نہیں کیا جس کو خدا (اللہ) کہتے ہیں اور اگر یہ مانتے ہو تو یہ قطعاً عقل کے خلاف ہے کہ جو ابتدائی آفرینش

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۶۳) "خال محبوب" پر "سمرقند و بخارا" بخش دینے پر آمادہ کر دیتا ہے۔
اسی طرح عالم و کائنات میں انفرادی طور پر کسی کا مریض ہونا، اپاہج و معذور ہونا، ناقص الخلقت ہونا، وغیرہ گو قبیح اور قابلِ افسوس نظر آتے ہوں مگر مجموعۂ کائنات کے حسن کے لئے فطری (نیچرل) ہیں اور اس تنوع پر ہی دنیا کے نظام کا بقاء ہے اور خالقِ کائنات کے کمالاتِ آفرینش کا آئینہ دار۔

گلہائے رنگ رنگ سے ہے رونقِ چمن ۔۔۔ اے ذوق اس جہاں کو ہے زیب اختلاف سے

کر سکے وہ اس آفرینش کو دُہرا نہ سکے۔

وَيَقُولُ الْإِنْسَانُ ءَإِذَا مَا مِتُّ لَسَوْفَ أُخْرَجُ حَيًّا ○ أَوَلَا يَذْكُرُ الْإِنْسَانُ أَنَّا خَلَقْنَاهُ مِنْ قَبْلُ وَلَمْ يَكُ شَيْئًا۔ (۱۹/۶۶)	اور انسان کہتا ہے کہ بھلا جب میں مرگیا تو کیا میں (قبر سے) زندہ نکالا جاؤں گا۔ کیا انسان یہ یاد نہیں کرتا کہ ہم نے پہلے اُسے پیدا کیا حالانکہ وہ کوئی چیز نہیں تھا۔
وَضَرَبَ لَنَا مَثَلًا وَّنَسِيَ خَلْقَهٗ قَالَ مَنْ يُّحْيِ الْعِظَامَ وَهِيَ رَمِيْمٌ ○ قُلْ يُحْيِيْهَا الَّذِيْٓ اَنْشَاَهَآ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَهُوَ بِكُلِّ خَلْقٍ عَلِيْمٌ ○ (۳۶/۷۸)	اور ہماری نسبت باتیں بنانے لگا اور اپنی پیدائش کی خیقت کو بھول گیا، کہتا ہے کہ ہڈیاں جب گل کر خاک ہوگئی ہوں تو کون ہے جو اُن کو زندہ کرکے کھڑا کردے (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کہہ دیجئے کہ جس نے ان ہڈیوں کو اول بار پیدا کیا تھا وہی ان کو زندہ کرے گا اور وہ سب کا پیدا کرنا جانتا ہے۔

یہ مشرکینِ مکہ تھے جو خدا اور خالقیتِ خدا کے تو قائل تھے مگر دوسری زندگی کے منکر وہ کافر اور جاحد تھے۔ پھر اس نے اُن کو بھی مخاطب کیا جو کہتے تھے کہ آخرت کا تصور اس لئے فضول ہے کہ یہ کائنات کسی کی مخلوق ہی نہیں، مادہ اور اس کی حرکت یونہی ازل سے ابد تک کائنات کا روپ و رنگ اختیار کئے ہوئے ہے اور حرکت و کشش دو قوتیں اس نظامِ عالم کے ہر قسم کے تنوعات کے کفیل ہیں۔ قرآن نے کہا یہ گمراہ کن تصور ایک بنیادی غلط فہمی پر مبنی ہے وہ یہ کہ عقل اور سائنس کے خلاف یہ سمجھ لیا گیا کہ ذراتِ مادہ (اجزاءِ اثیریہ) میں شعور و ارادہ نہ ہونے کے باوجود حرکت، قوتِ استعداد اور کشش کے ذریعہ خود بخود ایسی اشیاء وجود پذیر ہوسکتی ہیں جن کا مواد (میٹریل) ان ذرات میں موجود نہیں یعنی مادہ میں بالقوہ بھی نہ شعور ہے اور نہ ارادہ، نہ جذبات

ہیں نہ احساسات، نہ ادراکات ہیں اور نہ عقل و تمیز وغیرہ تو جسم کیا ان صفات کا حامل کہا جاتا، لیکن یہ مسلمات میں سے ہے کہ جسم کو نہ شعوری کہہ سکتے ہیں، نہ جذباتی، نہ ذی ادراک کہا جا سکتا ہے اور نہ ذی عقل و صاحب تمیز لیکن دلیلِ وجدان جو فطری دلائل میں سب سے مضبوط اور بہتر دلیل ہے وہ اس حقیقت کو تسلیم کراتی ہے کہ جبکہ تمام موجوداتِ عالم میں انسان موجوداتِ عالم کی ارتقائی ہستی اور اشرف الموجودات ہے، اور اس میں جذبات، حسیات، ادراکات، شعور اور عقل جیسے لطیف اوصاف موجود نظر آتے ہیں حالانکہ بلاشبہ مادہ کی ذات اصل میں یہ معدوم تھے، تو اس میں قطعاً شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ انسان سے بلند ضرور ایک ایسی ہستی موجود ہے جو قدرت و ارادہ کی علی الاطلاق مالک اور تمام موجودات کی خالق ہے اور اس میں بھی کوئی ریب و شک نہیں کہ انسان ایسی ذی عقل، ذی شعور اور صاحبِ ارادہ ہستی کی تخلیق محض بے فائدہ نہیں ہے اور اس کی زندگی کے اعمال و کردار بے وجہ اور مہمل نہیں ہیں اور جبکہ ہم اس دنیا میں انسانوں کے اعمال و کردار کی جزاء و سزا کا مظاہرہ نہیں دیکھتے تو وجدان ہی ہم سے یہ منواتا ہے کہ ایک ایسا دن ضرور مقرر ہے جب کائناتِ انسانی اپنے اعمال و کردار کی جزاء و سزا کا نتیجہ و ثمرہ پائیگی اور اسی کو یوم القیامہ، یوم الآخرہ اور یوم الحساب کہتے ہیں، چونکہ یہ دن اپنی پائیداری اور قیام کی وجہ سے خاص اہمیت رکھتا ہے اس لئے یوم القیامہ کہلاتا ہے اور چونکہ دنیائے موجودہ کے بعد ہے اس لئے یوم الآخرہ ہے اور چونکہ جزاء و سزاء اعمال کے محاسبہ پر منحصر ہوگا اس لئے یوم الحساب ہے۔

وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لَا تَأْتِينَا — اور منکرین کہتے ہیں کہ قیامت ہم کو تو کبھی نہیں آئیگی اے محمد

السَّاعَةُ قُلْ بَلَىٰ وَرَبِّي — (صلی اللہ علیہ وسلم) کہہ دیجئے ہاں ہاں مجھ کو اپنے پروردگار

لَتَأْتِيَنَّكُمْ عَالِمِ الْغَيْبِ (سبا) — کی قسم جو عالم الغیب ہے قیامت تم کو ضرور پیش آکر رہیگی۔

اَیَحۡسَبُ الۡاِنۡسَانُ اَنۡ یُّتۡرَکَ سُدًی ۔ ۔ ۔ اَلَیۡسَ ذٰلِکَ بِقٰدِرٍ عَلٰۤی اَنۡ یُّحۡیِۦَ الۡمَوۡتٰی ۔

کیا انسان یہ گمان کرتا ہے کہ وہ مہمل اور بیکار چھوڑ دیا جائیگا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کیا خدا اس پر قادر نہیں کہ مردوں کو زندہ کر دے ؟

وَالتِّیۡنِ وَالزَّیۡتُوۡنِ ۙ وَطُوۡرِ سِیۡنِیۡنَ ۙ وَهٰذَا الۡبَلَدِ الۡاَمِیۡنِ ۙ لَقَدۡ خَلَقۡنَا الۡاِنۡسَانَ فِیۡۤ اَحۡسَنِ تَقۡوِیۡمٍ ۫ ثُمَّ رَدَدۡنٰهُ اَسۡفَلَ سٰفِلِیۡنَ ۙ اِلَّا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَهُمۡ اَجۡرٌ غَیۡرُ مَمۡنُوۡنٍ ؕ فَمَا یُکَذِّبُکَ بَعۡدُ بِالدِّیۡنِ ؕ اَلَیۡسَ اللّٰهُ بِاَحۡکَمِ الۡحٰکِمِیۡنَ ۔

(التین)

گواہ ہے انجیر و زیتون (کے باغات سے سرسبز و شاداب وہ مقام بیت اللحم جہاں حضرت عیسیٰ کی ولادت ہوئی اور گواہ ہے طورِ سینا (جہاں موسیٰ علیہ السلام کو نبوت سے سرفرازی نصیب ہوئی) اور گواہ ہے یہ بلد امین کہ جہاں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت ہوئی کہ بلاشبہ ہم نے انسان کو بہترین بہتر قوام سے بنایا پھر اس کو نیچوں سے سب سے نیچے مقام پر دھکیل دیا مگر وہ انسان جو ایمان لائے اور نیک عمل کئے ان کیلئے بے منت و احسان اجر و ثواب ہے تو اب وہ کیا بات ہے جو تجھ کو دین (قیامت) کے جھٹلانے پر آمادہ کرتی ہے کیا اللہ حاکموں میں سب سے بہتر حاکم نہیں ہے ۔

اور سچ تو یہ ہے کہ قرآن عزیز کہتا ہے کہ آخرت کے انکار پر منطقی دلائل قائم کرنے اور سفسطہ اور غلط روش کو اختیار کر کے اِدھر اُدھر بھٹکنے کی آخر ضرورت کیا ہے جبکہ انسان کی سب سے قریب اور سب سے زیادہ مضبوط دلیل "وجدان" خود بخود اس جانب راہنمائی کرتی ہے کہ یہ نظامِ عالم جس طرح حیرت زا اور محیر العقول نظامِ فطرت سے منظم اور قوانینِ فطرت کے ہاتھوں میں مسخر ہے ہو نہیں سکتا کہ یہ خود بخود نظام ہوا ہو اور جبکہ اس کا کوئی خالق

ضرور ہے تو اُس نے خیر و شر کے ثمرات و نتائج کے لئے بھی ضرور کوئی وقت مقرر کیا ہے ورنہ یہ کامل و مکمل نظام ثمرہ اور نتیجہ کے پیشِ نظر ایک مہمل شے ماننی پڑے گی پس نتیجہ اور ثمرہ کا وہ دن ہی "یوم آخرت" کے نام سے موسوم ہے جو نہ تناسخ کے چکر سے وابستہ ہے اور نہ ازلیت و ابدیتِ عالم کا حامل، بلکہ جس طرح عالم کی ہر شے کا ایک آغاز ہے اور ایک انجام اسی طرح خود اس پورے عالم کا بھی ایک آغاز اور انجام از بس ضروری ہے۔

پس مومن اور مسلم وہی ہے جو توحیدِ خالص، رسالت کے صحیح تصور اور یوم آخرت پر یقینِ کامل، کے سر رشتہ کے ساتھ پیوستہ ہو، یہی وہ تین بنیادی عقائد ہیں جو دین کے حقیقی تصور یعنی ایمان باللہ، ایمان بالرسل، ایمان بالکتب، ایمان بالملائکہ، ایمان بالقدر اور ایمان بالآخرہ سب ہی پر حاوی ہیں اور یہی وہ دینِ کامل ہے جس کی تشریح قرآن عزیز نے سورۂ بقرہ کے آخری رکوع میں اس طرح کی ہے۔

اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ؕ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ ۟ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ ۟ وَقَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ۫ غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ	رسول (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) ایمان رکھتے ہیں اُس شے پر جو اُن پر اُن کے رب کی جانب سے اُتاری گئی ہے (یعنی قرآن) اور ہر ایک (ایماندار) ایمان رکھتا ہے خدا پر، فرشتوں پر، سماوی کتابوں پر اور اس کے رسولوں پر (وہ کہتے ہیں خدایا!) ہم تیرے پیغمبروں کے درمیان کسی ایک کو بھی پیغمبر تسلیم کرنے کے سلسلہ میں فرق نہیں کرتے اور کہتے ہیں ہم نے تیرا حکم سنا اور اُس کی پیروی کی، اے پروردگار ہم تجھ سے مغفرت کے خواہاں ہیں اور ہم کو آخر کار تیری ہی جانب لوٹنا ہے۔

مابعد الطبیعاتی عقائد وافکار سے متعلق قرآن حکیم کی یہی وہ اصلاحی اور انقلابی تعلیمات تھیں جن کو نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اوّل عرب کے سامنے روشناس کیا اور پھر تمام کائنات انسانی تک پہنچا کر مذاہب کی دنیا ہی بدل ڈالی اور اسلام کی اس دعوتِ توحید نے مذاہب عالم میں ہلچل پیدا کر دی اور کسی نہ کسی رنگ میں ان کو توحیدِ حقیقی کے اس ارتقائی نقطہ کی جانب جھکنا پڑا۔ اور اُس نے صرف یہی نہیں کیا کہ خدا اور اُس کے بندوں کے درمیان رشتۂ معبودیت وعبودیت ہی کو صحیح نقطۂ نظر پر استوار اور عقائد اور مابعد الطبیعاتی افکار کے رخِ روشن کو آشکارا کر دیا، بلکہ اُس نے "ایمان اور عملِ صالح" کو دین کی بنیاد بنا کر اخلاق، معاشرت، معاش، غرض مذہب اور اجتماعی سیاست سب ہی کو اصلاح وانقلاب کے سانچے میں ڈھال کر دنیا کی صحیح راہنمائی کا حق ادا کر دیا۔

یہ بحث چونکہ طویل الذیل ہے اور آیت وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ کی تفسیر کے ضمن میں شرح وبسط کی محتاج اس لئے یہ مقام اس کی وسعت کو برداشت نہیں کر سکتا۔

اسراء (معراج)

"اسراء" کے معنی شب میں لیجانے کے ہیں، نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کا وہ بے نظیر شرف وعجد اور حیرت زا واقعہ "جس میں خدائے برتر نے اپنے رسول کو مسجد حرام (مکہ) سے مسجدِ اقصیٰ (بیت المقدس) اور وہاں سے ملاءِ اعلیٰ تک بجسد عنصری اپنی نشانیاں دکھانے کے لئے سیر کرائی" چونکہ شب کے ایک حصہ میں پیش آیا تھا اس لئے "اسراء" کہلاتا ہے۔

"معراج" عروج سے مشتق ہے جس کے معنی چڑھنے اور بلند ہونے کے ہیں اور اسی لئے معراج زینہ کو بھی کہتے ہیں، نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے چونکہ اس شب میں ملاءِ اعلیٰ کے منازلِ ارتقا طے فرماتے ہوئے سبع سماوات، سدرۃ المنتہیٰ، اور اُس سے بھی بلند ہو کر آیات اللہ کا مشاہدہ فرمایا اور ان واقعات کے ذکر میں زبانِ وحی ترجمان نے "عُرِجَ بِی" کا جملہ استعمال فرمایا اس لئے اس باجبروت اور پُر عظمت واقعہ کو "معراج" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

بعض علماء نے اصطلاحی فرق و امتیاز کے لئے یہ بھی فرمایا ہے کہ اس واقعہ کا وہ حصہ جس کا ذکر بصراحت سورۂ بنی اسرائیل میں ہے قرآنی تعبیر کے اتباع میں "اسراء" ہے اور وہ حصہ جس کا تذکرہ سورۃ النجم اور صحیح احادیث میں ہے ذاتِ اقدس (صلی اللہ علیہ وسلم) کی تعبیر "ثم عرج بی" کی مناسبت سے "معراج" کے عنوان سے معنون ہے۔

واقعہ کی وحدت اس لئے دو مختلف تعبیروں اور واقعات کی تفصیلات میں جزوی اختلاف کے پیشِ نظر تطبیقِ روایات کی خاطر اس واقعہ کے تعدد کا دعویٰ نہ تاریخی اور تحقیقی نقطۂ نظر سے ہرگز صحیح نہیں ہے اور مشہور محقق، جلیل القدر محدث، مفسر اور مورخ حافظ عماد الدین بن کثیر کا یہ ارشاد

بلاشبہ درست اور حقیقتِ حال کے لئے کاشف ہے فرماتے ہیں۔

ان تمام روایتوں کو جمع کرنے سے یہ بات بخوبی واضح ہوگئی کہ واقعہ معراج صرف ایک ہی مرتبہ پیش آیا ہے اور راویوں کی عبارات کے بعض حصص کا ایک دوسرے سے کچھ مختلف اور تفصیلات میں کم وبیش ہونا وحدتِ واقعہ پر اثر انداز نہیں ہے کیونکہ انبیاء علیہم السلام کے علاوہ دوسرے انسان خطاکاری سے محفوظ نہیں ہیں۔

سوان روایات کے جزوی اختلافات کو دیکھ کر جن علماء نے تعددِ واقعہ کا مسلک اختیار کیا اور ہر ایک مختلف روایت کو جدا جدا واقعہ بنادیا اور اس طرح یہ دعویٰ کردیا کہ معراج کا واقعہ متعدد بار پیش آیا ہے۔ انھوں نے بعید از قیاس بات کہہ ڈالی اور قطعاً غلط راہ روی اختیار کرلی اور حقیقتِ حال سے دور پڑ گئے . . . . یہ مسلک اس لئے بھی صحیح نہیں ہے کہ نہ سلف صالحین سے تعددِ واقعہ منقول ہے اور نہ تاریخی دلائل اس کے مؤید ہیں اور اگر ایسا ہوتا تو خود نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) ضرور بصراحت اس سے مطلع فرماتے اور راویانِ روایت بلاشبہ اس کو روایت کرتے۔[1]

تحقیق تاریخ وسنہ یہ عدیم النظیر واقعہ کب پیش آیا؟ اس کے تعین میں اگرچہ متعدد اقوال مذکور ہیں لیکن ان دو باتوں پر سب کا اتفاق نظر آتا ہے ایک یہ کہ واقعہ معراج قبل از ہجرت پیش آیا، اور دوسری بات یہ کہ حضرت خدیجۃ الکبریٰ (رضی اللہ عنہا) کی وفات کے بعد وقوع میں آیا ہے جبکہ واقعہ ہجرت بالاتفاق سنہ ۱۳ نبوت کو پیش آیا اور بخاری میں مذکور حضرت عائشہ (رضی اللہ عنہا) کی روایت کے مطابق حضرت خدیجہؓ کا انتقال ہجرت سے تین سال قبل اور ایک دوسری روایت کے پیش نظر نمازِ پنجگانہ کی فرضیت سے قبل ہوچکا تھا[2]۔ تو اب واقعہ معراج کو ہجرت سے

---

[1] ترجمہ عبارت تفسیر ابن کثیر ج ۳ ص ۲۲ مطبوعہ مصر (جدید) [2] فتح الباری جلد ۷ ص ۱۷۹

قبل کے ان تین برسوں کے اندر ہی ہونا چاہئے۔

نیز کتب تاریخ وسیرت دونوں شاہد ہیں کہ معراج اور ہجرت کے درمیان کوئی اہم واقعہ موجود نہیں ہے اور بہ تحقیقِ نظر ان ہر دو کے درمیان نہایت گہرا رشتہ اور ربط وعلاقہ پایا جاتا ہے تو بلاشبہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ واقعہ معراج ہجرت سے بہت قریب زمانہ میں پیش آیا ہے اور درحقیقت یہ واقعہ ہجرت ہی کی پُر جلال و پُر عظمت "تمہید" تھی۔

غالباً ابنِ سعد نے طبقات میں اور امام بخاری نے اپنی الصحیح الجامع میں اسی لئے واقعۂ معراج اور ہجرت کو کسی تیسرے واقعہ کی مداخلت کے بغیر آگے پیچھے بیان کیا ہے اور جو حضرات بخاری کے ابواب وتراجم کی باہمی ترتیب کی دقیقہ سنجی سے واقف اور ان کے تفقہ کی بالغ نظری سے آگاہ ہیں وہ جانتے ہیں کہ اُن کا رجحان یہ ہے کہ ان ہر دو واقعات کے درمیان زمانہ اور تعلق دونوں اعتبار سے انتہائی قربت ہے۔

تو اب یہ کہنا آسان ہے کہ جو ارباب سیر وتاریخ یہ فرماتے ہیں کہ معراج کا واقعہ ہجرت سے ایک سال یا ڈیڑھ سال قبل پیش آیا اُن کا ارشاد پایۂ تحقیق رکھتا ہے۔

پھر مہینہ اور تاریخ کے تعین میں بھی متعدد اقوال موجود ہیں مگر راجح قول یہ ہے کہ مہینہ رجب کا تھا اور تاریخ ۲۷ تھی۔ چنانچہ ابن عبد البرؒ امام نووی اور عبد الغنی مقدسی (رحمہم اللہ) جیسے مشہور اور جلیل القدر محدثین کا رجحان اسی جانب ہے کہ رجب تھا اور آخر الذکر فرماتے ہیں کہ ۲۷ تھی اور دعویٰ کرتے ہیں کہ امتِ مرحومہ میں ہمیشہ سے عملاً اسی پر اتفاق بھی رہا ہے۔

قرآنِ عزیز اور واقعہ معراج

قرآنِ عزیز میں اسرا یا معراج کا واقعہ دو سورتوں بنی اسرائیل اور النجم میں مذکور ہے، سورۂ بنی اسرائیل میں مکہ (مسجد حرام) سے بیت المقدس (مسجد اقصیٰ) تک سیر کا تذکرہ ہے اور سورۂ النجم میں ملاءِ اعلیٰ کی سیر وعروج کا بھی ذکر موجود ہے اور اگرچہ عام طور پر

یہ سمجھا جاتا ہے کہ بنی اسرائیل کی صرف ابتدائی آیات ہی میں یہ واقعہ مذکور ہے مگر حقیقت حال یہ ہے کہ پوری سورۃ اسی عظیم الشان واقعہ سے متعلق ہے اور سورۃ کی تمام آیات اسی کا تکملہ ہیں اور اس دعوے کے لئے ایک صاف اور واضح دلیل خود اسی سورۃ میں یہ موجود ہے کہ وسط سورہ میں آیت "وَمَا جَعَلْنَا الرُّؤْيَا الَّتِي أَرَيْنَاكَ إِلَّا فِتْنَةً لِّلنَّاسِ" میں اسی واقعہ معراج کا تذکرہ ہو رہا ہے۔ اس سے قبل حضرت موسیٰ اور حضرت نوح علیہما السلام کے واقعاتِ دعوت و تبلیغ اسی سلسلہ میں بطور شواہد و نظائر پیش کئے گئے ہیں کہ منکرین نے ہمیشہ اسی طرح خدا کی صداقتوں کو جھٹلایا ہے جس طرح آج واقعۂ معراج کو جھٹلا رہے ہیں۔

احادیث اور واقعہ معراج کا ثبوت

مشہور محدث زرقانی رح کہتے ہیں کہ معراج کا واقعہ پینتالیس صحابہ (رضی اللہ عنہم) سے منقول ہے اور پھر اُن کے نام بھی شمار کرائے ہیں[1]۔ ان صحابہ میں مہاجرین بھی ہیں اور انصار بھی اور یہ ہرگز نہیں سمجھنا چاہئے کہ چونکہ انصارِ صحابہ مکّہ میں موجود نہیں تھے اس لئے ان کی روایات صرف شنیدہ ہیں اس لئے کہ ایسے اہم واقعہ کو جس کا اسلام کی ترقی کے ساتھ بہت گہرا تعلق اور ہجرت کے واقعہ کے ساتھ خصوصی ربط ہے صحابہ نے براہِ راست نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ہی دریافت حال کیا ہوگا اور اگر مہاجرین سے بھی سُنا ہوگا تو پھر ذاتِ اقدس سے تصدیق ضرور کی ہوگی، چنانچہ شداد بن اوس رض کی روایت میں یہ الفاظ موجود ہیں۔

قلنا یا رسول اللہ کیف اسری بک[2] — ہم نے (صحابہ نے) عرض کیا اے خدا کے رسول! آپ کو معراج کس طرح ہوئی۔

لفظ "قلنا" یہ ثابت کر رہا ہے کہ بلا شبہ معراج سے متعلق صحابہ (رضی اللہ عنہم) کے عام مجمع میں

---

[1] جلد ۶ ص ۱۶ ۔ [2] ترمذی

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے استفسار کیا جاتا تھا جن میں مہاجرین وانصار سب ہی شریک ہوتے تھے اور مالک بن صعصعہؓ جو انصاری صحابی ہیں اُن کی روایتِ معراج میں ہے۔

ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم حدثھم ۔ [۱]	نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کو (صحابہ کو) یہ واقعہ بیان فرمایا۔

واقعہ کی نوعیت چونکہ یہ واقعہ اپنی اہمیت کے ساتھ ساتھ طویل بھی تھا اس لیے بربنائے بشریت واقعہ کے اصل تفصیلی حالات میں اتحاد و اتفاق اور بحدِ تواتر روایات منقول ہونے کے باوجود متعدد روایات کی فروعی تفصیلات میں جو اختلاف نظر آتا ہے وہ معمولی توجہ سے رفع کیا جا سکتا ہے اور بلاشبہ ان جزوی اختلافات سے اصل واقعہ کی حقیقت پر مطلق کوئی اثر نہیں پڑتا خصوصاً جبکہ قرآنِ عزیز نے اُن عجیب اور حیرت زا واقعات کو نصِ قطعی سے واضح کر دیا ہے جن کے متعلق ملحدین اپنے الحاد و زندقہ کے ذریعہ باطل تاویلات پیش کر کے اس واقعہ کی معجزانہ حیثیت کا انکار کرتے ہیں۔

واقعۂ معراج و اسراء اور قرآن عزیز سورۂ بنی اسرائیل میں واقعۂ اسراء بیت المقدس تک کی سیر سے وابستہ ہے۔

سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَی الْمَسْجِدِ الْاَقْصَی الَّذِیْ بٰرَکْنَا حَوْلَہٗ لِنُرِیَہٗ مِنْ اٰیٰتِنَا اِنَّہٗ ھُوَ السَّمِیْعُ الْبَصِیْرُ۔ (بنی اسرائیل)	پاکی ہو اُس ذات کے لیے جس نے اپنے بندے کو، (یعنی پیغمبرِ اسلام کو) راتوں رات مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک کہ اُس کے اطراف کو ہم نے بڑی ہی برکت دی ہے، سیر کرائی اور اس لیے سیر کرائی کہ اپنی نشانیاں اسے دکھائیں، بلاشبہ وہی ذات ہے جو سننے والی دیکھنے والی ہے۔

[۱] بخاری کتاب المعراج۔

وَمَا جَعَلْنَا الرُّؤْيَا الَّتِیْ اَرَیْنٰكَ اِلَّا فِتْنَةً لِّلنَّاسِ (۔۔)

اور وہ دکھلاوا جو تجھ کو ہم نے دکھایا سو لوگوں کی آزمائش کے لئے (دکھلایا)

اور سورۃ النجم میں ملاءِ اعلیٰ تک عروج کا ذکر بھی موجود ہے۔

وَالنَّجْمِ اِذَا هَوٰی ۝ مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوٰی ۝ وَمَا یَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰی ۝ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰی ۝ عَلَّمَهٗ شَدِیْدُ الْقُوٰی ۝ ذُوْ مِرَّةٍ فَاسْتَوٰی ۝ وَهُوَ بِالْاُفُقِ الْاَعْلٰی ۝ ثُمَّ دَنَا فَتَدَلّٰی ۝ فَكَانَ قَابَ قَوْسَیْنِ اَوْ اَدْنٰی ۝ فَاَوْحٰی اِلٰی عَبْدِهٖ مَا اَوْحٰی ۝ مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰی ۝ اَفَتُمٰرُوْنَهٗ عَلٰی مَا یَرٰی ۝ وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰی ۝ عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰی ۝ عِنْدَهَا جَنَّةُ الْمَاْوٰی ۝ اِذْ یَغْشَی السِّدْرَةَ مَا یَغْشٰی ۝ مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰی ۝ لَقَدْ رَاٰی مِنْ اٰیٰتِ رَبِّهِ الْكُبْرٰی ۝ (النجم)

شاہد ہے ستارہ جبکہ غروب ہو تمہارا رفیق نہ گمراہ ہوا اور نہ بھٹکا اور وہ نہیں بولتا اپنے نفس کی خواہش سے یہ نہیں ہے مگر حکم جو اُس کو بھیجا گیا ہے، اُس کو بتلایا ہے سخت قوتوں والے زورآور (فرشتہ) نے (کہ یہ خدا کی وحی ہے) جو سیدھا بیٹھا اور تھا وہ آسمان کے اونچے کنارہ پر پھر وہ قریب ہوا پس جھک آیا پھر رہ گیا (دونوں کے درمیان) دو کمان بلکہ اُس سے بھی نزدیک کا فرق پس خدا نے اپنے بندہ (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) پر وحی نازل فرمائی جو بھی وحی بھیجی اُس (بندہ) نے جو دیکھا (اس کے) دل نے جھوٹ نہیں کہا (یعنی آنکھ کی دیکھی بات کو دل نے جھٹلایا نہیں بلکہ تصدیق کی) تو کیا تم اُس سے اُس پر جھگڑتے ہو جو اُس نے خود دیکھا ہے (یعنی واقعہ پر جھگڑتے ہو) اور اُس (بندہ) نے خدا کو دیکھا ایک (خاص) نزول کے ساتھ جبکہ وہ بندہ سدرۃ المنتہیٰ کے نزدیک موجود تھا جس کے پاس آرام سے رہنے کی بہشت (جنت الماوی) ہے اس وقت سدرہ (بیری کا درخت) پر چھا رہا تھا جو کچھ چھا رہا تھا اُس

سورۂ بنی اسرائیل اور واقعہ معراج

یہاں سورۂ بنی اسرائیل اور سورۃ النجم کی تفسیر کا موقع نہیں صرف اشارات ہی پر اکتفا مناسب معلوم ہوتا ہے کیونکہ اگر ایک جانب یہ آیات اپنی مکمل تفسیری حق کا مطالبہ کرتی ہیں تو دوسری جانب کتاب اپنے سیاق و سباق کے پیش نظر اختصار کی طالب ہے، بہر حال حسب ضرورت دونوں کا لحاظ رکھتے ہوئے اس قدر گذارش ہے کہ بنی اسرائیل کی ابتدائی آیت میں واقعہ اسراء کے متعلق جو کچھ کہا گیا اس کی اگر تحلیل کی جائے تو بآسانی یہ فیصلہ کیا جا سکتا ہے کہ جہاں تک قرآن کا تعلق ہے اس کا فیصلہ یہی ہے کہ واقعۂ اسراء بحالتِ بیداری بجسدِ عنصری پیش آیا ہے اور اس مطلب سے ہٹ کر جب اس کو روحانی یا منامی رؤیا کہا جاتا ہے تو تاویلاتِ باردہ کے بغیر دعویٰ پر دلیل قائم نہیں ہو سکتی۔

بنی اسرائیل میں اس واقعہ کی ابتداء خدائے برتر کی قدوسیت اور سبحانیت کے بعد لفظ "اسریٰ" سے ہوئی ہے۔ یہ لفظ "س، ر، ی۔ سریٰ یسریٰ" سے ماخوذ ہے۔ لغت میں جس کے معنی "رات میں چلنے" کے آتے ہیں۔

سری، یسری، سریً وسریۃً الخ سریٰ، یسریٰ، سریۃً میں سریٰ کے معنی ہیں

سار لیلاً (منجد) وہ رات میں چلا۔

اور "اسریٰ" کے معنی بھی "شب میں لے چلا" آتے ہیں چنانچہ کتب لغت میں ہے۔

اسریٰ، اسراءً۔ سار لیلاً (منجد) اسریٰ کے معنی ہیں "رات میں چلا"

یہی معنی اقرب الموارد، قاموس، لسان العرب اور تمام کتب لغت میں بصراحت مذکور ہیں اور اسی لفظ اسریٰ کو جب متعدی بنانا چاہتے ہیں یعنی "راتوں رات لیجانا" ظاہر کرنا چاہتے ہیں تو "ب تعدیہ" بڑھا دیتے ہیں۔ اس موقعہ کے علاوہ قرآن عزیز میں جہاں جہاں "اسراء" اور اس کے مشتقات آئے ہیں ان تمام مقامات میں بھی اسی معنی میں استعمال ہوا ہے چنانچہ

سورۂ ہود میں لوط علیہ السلام کے واقعہ میں ہے۔

قَالُوْا يٰلُوْطُ اِنَّا رُسُلُ رَبِّكَ	فرشتوں نے کہا، لوط! ہم تو تیرے پروردگار کے بھیجے
لَنْ يَّصِلُوْٓا اِلَيْكَ فَاَسْرِ	ہوئے (فرشتے) ہیں۔ یہ تجھ تک ہرگز نہیں پہنچ پائیں گے
بِاَهْلِكَ بِقِطْعٍ مِّنَ الَّيْلِ۔	پس تو اپنے لوگوں کو کچھ رات گئے (یہاں سے) لے نکل۔

یہ آیت "فَاَسْرِ بِاَهْلِكَ بِقِطْعٍ مِّنَ الَّيْلِ" سورۂ دخان میں بھی موجود ہے، اور سورۂ طٰہٰ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واقعہ میں ہے۔

وَلَقَدْ اَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰٓى اَنْ	اور بلاشبہ ہم نے موسیٰ پر وحی کی کہ تیرے بندوں کو
اَسْرِ بِعِبَادِيْ (طٰہٰ)	راتوں رات لے جا۔

اور سورۂ شعراء میں ہے۔

وَاَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰٓى اَنْ اَسْرِ	اور ہم نے موسیٰ پر وحی بھیجی کہ میرے بندوں کو راتوں
بِعِبَادِيْٓ اِنَّكُمْ مُّتَّبَعُوْنَ (شعراء)	رات لے کر نکل جا، تمہارا تعاقب ضرور کیا جائیگا۔

اور یہی آیت سورۂ دخان میں بھی مذکور ہے۔

ان تمام آیات میں لفظ "اسراء" کا جس طرح اطلاق کیا گیا ہے اُس سے دو حقیقتوں پر روشنی پڑتی ہے۔ ایک یہ کہ "اسراء" اُس سیر اور اُس چلنے کو کہتے ہیں جو رات میں پیش آئے اس لئے دن یا شام کے چلنے پر "اسراء" کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔

دوسری بات یہ کہ "سری یا اسراء" ان تمام آیات میں روح مع جسد پر اطلاق ہوا ہے یعنی لوط اور موسیٰ علیہما السلام اور اُن کے متبعین جن کے لئے یہ حکم ہو رہا ہے کہ وہ دشمنوں سے بچ کر راتوں رات ان بستیوں (مصر اور سدوم) سے نکل جائیں، ان کا رات کے حصہ میں نکل جانا نہ خواب کی شکل میں تھا اور نہ روحانی طور پر، اور نہ رویاء کشفی کے طریقہ پر بلکہ

عالم بیداری میں روح مع جسد کے تھا۔

پس جبکہ قرآن کے ان تمام اطلاقات میں اسراء کے یہ معنی بغیر کسی "تاویل کے قابلِ تسلیم ہیں تو بنی اسرائیل کی آیت " سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی " میں "اسراء" کو روح مع جسد تسلیم کرنے میں کیوں پس و پیش ہو اور کس لئے اس واقعہ کو فقط روحانی، منامی، یا بین النوم و الیقظہ کشفی طریقہ کے ساتھ مخصوص کیا جائے؟ جبکہ اس آیت " اسری بعبدہ لیلاً " میں ایک لفظ بھی ایسا موجود نہیں ہے جو اس اسراء کو قرآن کے عام اطلاقات سے جدا معنی پر دلالت یا اشارہ کرتا ہو۔

رہا یہ مسئلہ کہ بنی اسرائیل کی آیت " وَمَا جَعَلْنَا الرُّءْیَا الَّتِیْٓ اَرَیْنٰکَ اِلَّا فِتْنَةً لِّلنَّاسِ " کے لفظ " رویا " سے فائدہ اٹھا کر یہ کہنا کہ چونکہ " رویا " عالمِ خواب پر بولا جاتا ہے اس لئے اسراء کا واقعہ منامی یا روحانی تھا، بدیں وجہ صحیح نہیں ہے کہ عربی بول چال میں جس طرح " رویا " کا اطلاق خواب کی حالت پر ہوتا ہے اُسی طرح وہ اس رویت پر بھی بولا جاتا ہے جس کا مشاہدہ آنکھ بحالتِ بیداری کرتی ہے۔ چنانچہ عربی کے نہایت مستند اور مشہور لغت لسان العرب میں یہ تصریح موجود ہے۔

وقد جاء رویا فی الیقظۃ اور بلاشبہ " رویا " بیداری میں عینی مشاہدہ کے لئے بھی آتا ہے

اور صاحبِ لسان نے جاہلی شاعر راعی کے اس شعر کو اس معنی کے لئے سند ٹھہرایا ہے۔

فکبّر للرؤیا وھش فؤادہ وبشّر نفساً کان نفساً یلومھا

اس نے تکبیر کہی اور اس کا دل مسرت سے لبریز ہو گیا اور اس نے اپنے نفس کو پہلے ملامت کر رکھا تھا خوشخبری دی اس منظر کو دیکھ کر جس کا اس نے عینی مشاہدہ کیا۔

اسی طرح متنبی کے اس مصرعہ کو بھی سند قرار دیا ہے۔

ورؤياك احلى فى العيون من الغمض

اور تیرا دیدار (میری) آنکھوں میں نیند سے بھی زیادہ لذیذ ہے

ان مستند اقوالِ عرب کے بعد "رویا" کو صرف خواب کی حالت کے ساتھ مخصوص کر دینا کس طرح صحیح ہو سکتا ہے؟ اب جبکہ "اسری بعبدہ" میں "اسراء" کے متبادر معنی "سیر بدن مع جسد" کے ہیں اور "رویا" کا اطلاق دونوں قسم کی رویت پر ہوتا رہا ہے تو اس مقام پر "اسراء" کا قرینہ اس کا متقاضی ہے کہ یہاں "بحالتِ بیداری عینی مشاہدہ" کے معنی ہی متعین ہونے چاہئیں اور دوسرے معنی قیاسی اور تاویلی حیثیت سے زیادہ وقیع نہیں ہیں۔

بعض معاصر علماء نے "اسراء" کو روحانی قرار دیتے ہوئے لسان العرب کے پیش کردہ سندات کو اول تو مستند ہی تسلیم نہیں کیا اور بفرضِ تسلیم کے بعد یہ دعویٰ کیا ہے کہ ان ہر دو شاعروں راعی اور متنبی کے شعر و مصرعہ سے رویا کے معنی "خواب میں رویت" ہی کے نکلتے ہیں نہ کہ رویا بصری کے مگر تعجب یہ ہے کہ دونوں باتیں محض دعویٰ پر ہی ختم ہو گئی ہیں اور دعوے کیلئے زحمتِ دلیل کی ضرورت نہیں محسوس کی گئی۔ تسلیم کر لیجئے کہ لغتِ عرب کے لئے متنبی مستند نہیں ہے مگر مشہور جاہلی شاعر راعی کس لئے غیر مستند قرار پایا جبکہ کلامِ عرب کی سند کے لئے جاہلی شعراء سے زیادہ کوئی سند مقبول نہیں سمجھی گئی، نیز راعی نے جبکہ جملہ "فکبر" کو "للرؤیا" کے ساتھ وابستہ کیا ہے تو اس کے صاف معنی یہ ہوئے کہ "رویا" کی وجہ سے اس نے نعرۂ تکبیر بلند کیا اور ظاہر ہے کہ نعرۂ تکبیر خواب میں بلند نہیں ہوا تھا بلکہ عالمِ بیداری کا واقعہ تھا، اسی طرح متنبی کے مصرعہ کا مطلب یہ ہے کہ شبِ وصل میں تیرے دیدار کے مقابلہ میں نیند ہیچ ہے، اگرچہ یہ صحیح ہے کہ نیند خود بہت شیریں ہے مگر دیدارِ محبوب کے مقابلہ میں اس کی شیرینی بھی بے حقیقت ہے۔

اس لغوی حقیقت کے آشکارا ہو جانے کے بعد حضرت عبداللہ بن عباس (رضی اللہ عنہ)

کا یہ ارشاد جو صحیح بخاری میں مذکور ہے "رویا عین اریہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم" سونے پر سہاگا ہے کیونکہ وہ لغتِ عرب کے امام بھی ہیں اور ترجمان القرآن بھی اور ان کے مقابلہ میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا اور حضرت معاویہ (رضی اللہ عنہ) کا یہ ارشاد پیش کرنا قطعاً مرجوح ہے کہ وہ اسراء کو رویا بمعنی خواب مراد لیتے ہیں۔

مرجوح اس لئے ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہ اور حضرت امیر معاویہ (رضی اللہ عنہما) سے جو روایات اس سلسلہ میں منقول ہیں وہ بلحاظ صحتِ روایت وہ درجہ نہیں رکھتیں جو حضرت عبداللہ بن عباس (رضی اللہ عنہما) کی روایت کو حاصل ہے بلکہ محدثین کے نزدیک بچند وجوہ اُن کی صحت غیر مستند ہے۔ مثلاً حضرت عائشہ صدیقہ (رضی اللہ عنہا) کی روایت کتبِ حدیث کی بجائے فقط سیرت کی روایت ہے اور پھر محمد بن اسحٰق اس کے متعلق یہ کہتے ہیں "حدثنی بعض آل ابی بکر" مجھ سے یہ روایت ابوبکر کے خاندان کے ایک فرد نے بیان کی ہے" اس کا حاصل یہ ہوا کہ یہ روایت منقطع ہے کیونکہ درمیان کا ایک راوی مجہول ہے جس کے متعلق کوئی علم نہیں کہ وہ کس درجہ کا راوی ہے نیز اس روایت کے طریق میں بھی باہم اختلاف ہے اس لئے کہ بعض روایت میں ہے "ما فقدت جسد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم" میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جسدِ اطہر گم نہیں پایا" حالانکہ یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہؓ حریم نبوی میں ہجرت کے بعد داخل ہوئی ہیں اور واقعۂ معراج ہجرت سے قبل کا واقعہ ہے تو حضرت عائشہؓ کا "ما فقدت" میں نے گم نہیں پایا" فرمانا کیسے صحیح ہو سکتا ہے؟ اس لئے بلا شبہ اس روایت میں جرح و نقص ہے۔

اسی طرح حضرت معاویہ (رضی اللہ عنہ) کی روایت بھی سیرت میں منقول روایت ہے جس کو محمد بن اسحٰق نے یعقوب بن عتبہ بن مغیرہ بن الاخنس سے روایت کیا ہے اور محدثین

اس پر متفق ہیں کہ یعقوب نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا زمانہ نہیں پایا، اس لئے یعقوب اور حضرت معاویہؓ کے درمیان ضرور کوئی راوی متروک ہے، جس کا روایت میں کوئی ذکر نہیں ہے۔ پس یہ روایت بھی مجروح و منقطع ہے اور بروایت ابن اسحٰق حضرت معاویہ (رضی اللہ عنہ) کا یہ قول "قال کانت رؤیا من اللہ صادقۃ۔ حضرت معاویہ نے کہا: معراج اللہ تعالیٰ کی جانب سے سچا خواب تھا" کسی طرح بھی صحت کو نہیں پہنچتا۔

اب ایک مرتبہ پھر احادیثِ معراج پر نظر ڈالئے اور دیکھئے کہ ایک جانب بخاری و مسلم اور صحاح کی وہ روایات ہیں جو متن و سند کے لحاظ سے مسلّم اور صحت کے اعلیٰ معیار پر قائم سمجھی جاتی ہیں۔ ان کی تفصیلات واقعۂ معراج کو بجسدِ عنصری ظاہر کرتی ہیں اور اسی لئے جمہورِ صحابہ اسی مسلک کو اختیار کئے ہوئے ہیں اور دوسری جانب محمد بن اسحٰق کی سیرت میں منقول اور حضرت عائشہؓ اور حضرت معاویہ (رضی اللہ عنہما) کی جانب منسوب وہ روایات ہیں جن کی صحت تک مجروح ہے۔ اس لئے بات صرف یہی نہیں ہے کہ جو شخص سورۂ بنی اسرائیل کی آیت میں "رویا" بمعنی "خواب" لیتا ہے اُس کا قول درست نہیں ہے بلکہ بلحاظ سند یہ انتساب بھی صحیح نہیں ہے کہ حضرت عائشہؓ اور حضرت معاویہ (رضی اللہ عنہما) رویائے منامی کے قائل ہیں۔ کیونکہ جن جلیل القدر محدثین و مفسرین نے اس قول کو ان بزرگوں کی جانب منسوب کیا ہے اُس کا مدار محمد بن اسحٰق کی ہی یہ ہر دو روایات ہیں اور ان دونوں کی صحت کا حال ابھی روشن ہو چکا۔

ممکن ہے کہ یہ کہا جائے بعض روایات میں واقعہ کی ابتدا اس طرح مذکور ہے۔ "بینا انا نائم" یا "بین النائم والیقظان" یعنی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بحالتِ خواب تھے یا بیداری اور خواب کی درمیانی حالت میں تھے کہ خدا کا قاصد "جبرئیل" آیا، نیز بخاری کی

شریک والی روایت کے ختم پر ہے "استیقظ وهو فی المسجد الحرام" اور آپ جاگ اٹھے جبکہ آپ مسجد حرام میں تھے اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ جو کچھ گذرا خواب میں گذرا۔

مگر یہ اس لئے صحیح نہیں کہ پہلے دو جملوں کا صاف اور سادہ مطلب یہ ہے کہ جب معراج یا اسراء کا واقعہ پیش آنے والا تھا تو اس وقت آپ سو رہے تھے لیکن واقعہ بحالتِ بیداری پیش آیا جیسا کہ باقی تمام روایات سے ظاہر ہوتا ہے اور بقول قرطبی (رحمۃ اللہ) دوسرے جملہ کا مطلب یہ ہے کہ راوی اس بیداری کا ذکر کر رہا ہے جو علی الصباح نمازِ فجر کے لئے ہوئی یعنی اگرچہ آپ ابتداءِ شب میں ام ہانی کے مکان میں سوئے تھے مگر کچھ حصہ شب میں جب معراج کا واقعہ پیش آیا اور آپ اس سے فارغ ہو کر کرۂ ارضی پر واپس تشریف لائے تو باقی رات مسجدِ حرام میں سو کر گذاری اور جب آپ صبح کو بیدار ہوئے ہیں تو لوگوں نے مسجدِ حرام میں آپ کو پایا۔

علاوہ ازیں شریک کی روایت میں تعبیرِ ادا کی فاش غلطیاں ہو گئی ہیں جن پر محدثین نے تنبیہ فرمائی ہے مثلاً اُن کی روایت کہتی ہے کہ معراج کا واقعہ بعثت سے بھی قبل پیش آیا "انه جاءه ثلاثه نفر قبل ان یوحی الیه وهو نائم فی المسجد الحرام" آپ کے پاس تین فرشتے بعثت اور نزولِ وحی سے قبل اس حالت میں آئے کہ آپ مسجد حرام میں سو رہے تھے" چنانچہ امام نووی، خطابی، ابنِ حزم، عبدالحق، قاضی عیاض (رحمہم اللہ) نے شریک کی روایت پر سخت تعاقب کیا ہے۔ امام نوویؒ فرماتے ہیں:۔

> شریک نے اس روایت میں بہت سی غلطیاں کی ہیں جن کا علماء نے انکار کیا ہے اور مسلم نے بھی یہ الفاظ کہہ کر شریک کے اوہام پر تنبیہ کی ہے "شریک نے روایت میں مقدم و مؤخر کر دیا ہے اور کم و بیش کر دیا ہے۔ اوہام میں سے ایک یہ ہے کہ شریک کی روایت

میں ہے "معراج کا واقعہ نزولِ وحی سے قبل پیش آیا ہے" حالانکہ یہ قطعاً غلط ہے اور اس قول کا کوئی راوی بھی موافق نہیں ہے۔ حافظ عبدالحق رحمہ اللہ نے اپنی کتاب الجمع بین الصحیحین میں اس شریک والی روایت کو نقل کرکے کہا ہے کہ شریک نے اس میں بہت سی غیر معروف (ناقابلِ قبول) باتیں بڑھادی ہیں اور غیر معروف الفاظ کا بھی اضافہ کردیا کیونکہ اسراء کی حدیث کو حفاظِ حدیث کی ایسی جماعت نے نقل کیا ہے جو بلند پایہ اور ہر قسم کی جرح سے محفوظ اور مشہور ائمہ حدیث ہیں۔ مثلاً ابنِ شہاب زہری، ثابت بنانی، قتادہ عن انس اور ان میں سے کوئی ایک حافظِ حدیث بھی ان اجزاء کو بیان نہیں کرتا جن کو شریک نے بیان کیا ہے اور شریک محدثین کے نزدیک حافظ حدیث نہیں ہے۔

بہر حال فتح الباری میں معراج اور اسریٰ کے متعلق اتحاد و تغائر کی بحث کرتے ہوئے حافظ ابنِ حجرؒ یہی فیصلہ فرماتے ہیں کہ معراج بحالتِ بیداری اور روح مع الجسد ہوئی ہے۔

فمنهم من ذهب الى ان الاسراء والمعراج وقعا فى ليلة واحدة فى اليقظة بجسد النبى صلى الله عليه وسلم وروحه بعد المبعث والى هذا ذهب الجمهور من علماء المحدثين والفقهاء المتكلمين وتواردت عليه ظواهر الاخبار الصحيحة ولا ينبغى العدول عن ذلك اذ ليس فى العقل ما يحيله حتى يحتاج الى تاويله[1]	پس ان علماء میں سے وہ ہیں جو کہتے ہیں کہ بلاشبہ واقعاتِ اسراء و معراج دونوں ایک ہی رات میں بحالتِ بیداری جسم اور روح کے ساتھ بعثت کے بعد پیش آئے، تمام محدثین، فقہاء اور متکلمین کا یہی مذہب ہے اور صحیح احادیث سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے، اور اس سے تجاوز کرنا یعنی اس کا انکار کرنا نامناسب ہے، اس لئے کہ ایسا ہونا عقل کے نزدیک محال نہیں ہے کہ تاویل کرنے کی احتیاج ہو۔

[1] فتح الباری جلد ۷ ص ۱۵۶ مطبوعہ البہیۃ المصریہ۔

اور قاضی عیاض شفاء میں یہی تحریر فرماتے ہیں:۔

وذهب معظم السلف والمسلمین الی ان الاسراء بالجسد فی الیقظة وهو الحق وهذا قول ابن عباس وجابر وانس وحذیفة وعمر وابی هریرة ومالك بن صعصعة وابی حبة البدری وابن مسعود وضحاك و سعید بن جبیر وقتادہ وابن المسیب ابن شهاب وابن زید والحسن وابراهیم ومسروق ومجاهد وعکرمة وابن جریج وهو دلیل قول عائشة و هو قول الطبری وابن حنبل وجماعة عظیمة من المسلمین وهو قول اکثر المتاخرین من الفقهاء والمحدثین والمتکلمین والمفسرین۔

جلیل القدر سلف صالحین اور بزرگ ترین مسلمان اس جانب ہیں کہ اسراء بجسد عنصری بیداری میں پیش آیا اور یہی مذہب حق ہے اور یہی ابن عباس جابر، حذیفہ، عمر، ابوہریرہ، مالک بن صعصعۃ ابوحبہ بدری، ابن مسعود (رضی اللہ عنہم) اور ضحاک، سعید بن جبیر، قتادہ، ابن مسیب، ابن شہاب، ابن زید، حسن، ابراہیم نخعی، مسروق، مجاہد، عکرمہ، ابن جریج (رحمہم اللہ) کا قول ہے اور یہی دلیل ہے حضرت عائشہ رضہ کے قول کی اور یہی طبری کا قول ہے، اور ابن حنبل کا اور مسلمانوں کی جماعت عظیم کا۔ اور یہی قول ہے متاخرین میں سے اکثر فقہاء، محدثین، متکلمین اور مفسرین کا۔

اور خفاجی نسیم الریاض میں قاضی عیاض کی اس عبارت "وهو دلیل قول عائشہ" کے متعلق فرماتے ہیں کہ اگرچہ یہ بات بظاہر خلاف معلوم ہوتی ہے اس لئے کہ عائشہ صدیقہ رضہ کی جانب جو قول منسوب ہے وہ اس کے قطعاً خلاف ہے لیکن قاضی عیاض (رحمہ اللہ) کا یہ دعویٰ ہے کہ جلیل القدر صحابہ رضہ کی یہ نقول اس امر کی دلیل ہیں کہ عائشہ (رضی اللہ عنہا) کی جانب

منسوب قول صحیح نہیں ہے اور وہ بھی جمہور ہی کے ساتھ ہیں۔

الحاصل قرآنِ عزیز اور احادیثِ صحیحہ بغیر کسی تاویل کے بصراحت یہ ظاہر کرتے ہیں کہ اسراء اور معراج کا واقعہ بجسدِ عنصری اور بحالتِ بیداری پیش آیا ہے اور ان دلائل کو بطور فہرست اس طرح شمار کرایا جا سکتا ہے۔

(۱) سورۂ بنی اسرائیل کی آیت "اسریٰ بعبدہٖ" میں اسراء کے متبادر معنی وہی ہیں جو حضرت موسیٰ اور حضرت لوط علیہما السلام سے متعلق آیات میں ہیں یعنی بحالتِ بیداری اور بجسدِ عنصری رات میں لے چلنا۔

(۲) آیت "وما جعلنا الرؤیا التی اریناک" میں "رؤیا" بمعنی عینی مشاہدہ ہے نہ کہ خواب یا روحانی رویت اور لغتِ عرب میں "رؤیا" کے یہ معنی مجاز نہیں بلکہ حقیقت ہیں۔

(۳) آیت "الا فتنۃ للناس" میں قرآن نے اس واقعہ کو اقرار و انکار کی شکل میں ایمان و کفر کے لئے معیار قرار دیا ہے اور اگرچہ انبیاء علیہم السلام کے روحانی مشاہدہ یا خواب پر بھی مشرکین و منکرین کا انکار وجود ممکن اور ثابت ہے۔ لیکن اس جگہ تبادر یہی ظاہر کرتا ہے کہ واقعہ کی عظمت و فخامت کے پیشِ نظر منکرین کا انکار اس لئے شدید سے شدید تر ہوا کہ نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اس واقعہ کو عینی مشاہدہ کی طرح بیان فرمایا ہے۔

(۴) سورۂ النجم کی آیت "مازاغ البصر وما طغیٰ" میں رویتِ جبرئیل نہیں بلکہ واقعہ اسراء کا مشاہدۂ عینی مراد ہے اور سورۃ کی آیت "مازاغ البصر وما طغیٰ" میں یہ بتلانا مقصود ہے کہ آنکھ نے جو کچھ دیکھا قلب نے ہو بہو اس کی تصدیق کی اور واقعہ سے متعلق نہ رویتِ عینی نے کبھی اختیار کی اور نہ رویتِ قلبی نے اس حقیقت کا انکار کیا بلکہ دونوں کی مطابقت نے اس کی صداقت پر مہرِ تصدیق ثبت کر دی۔

(۵) صحیح حدیث میں ہے کہ جب مشرکین نے اس واقعہ کے انکار پر یہ حجت قائم کی کہ اگر یہ صحیح ہے تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بیت المقدس کی موجودہ جزئی تفصیلات بتائیں کیونکہ ہم کو یقین ہے کہ نہ انھوں نے بیت المقدس کو کبھی دیکھا ہے اور نہ بغیر دیکھے جزئی تفصیلات بتائی جا سکتی ہیں تب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے سے بیت المقدس کے درمیانی حجابات منجانب اللہ اٹھا دیئے گئے اور آپ نے ایک ایک چیز کا مشاہدہ کرتے ہوئے مشرکین کے سوالات کے صحیح جوابات مرحمت فرمائے جن میں مسجد کی بعض تعمیری تفصیلات تک زیر بحث آئیں، یہ دلیل ہے اس امر کی کہ مشرکین یہ سمجھ رہے تھے کہ آپ اسراء کو بحالتِ بیداری اور بجسدِ عنصری ہونا بیان فرما رہے ہیں اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے خیال کی تردید نہیں فرمائی بلکہ اس کی تائید کے لئے معجزانہ تصدیق کا مظاہرہ فرما کر ان کو لاجواب بنا دیا۔

(۶) ترجمان القرآن حضرت عبداللہ بن عباس (رضی اللہ عنہما) سے بسندِ صحیح منقول ہے کہ قرآن میں مذکور "رویا" سے مراد "رویا عین" ہے نہ کہ خواب یا روحانی مشاہدہ۔

(۷) آیۃ "وما جعلنا الرؤیا التی اریناک الا فتنۃ للناس والشجرۃ الملعونۃ فی القراٰن" میں یہ مذکور ہے کہ واقعہ اسراء اور جہنم کے اندر سینڈھ کے درخت کا موجود ہونا اور آگ میں نہ جلنا یہ دونوں واقعے اقرار و انکار کی صورت میں ایمان و کفر کے لئے آزمائش ہیں پس جبکہ جہنیوں کی غذا کے لئے ایک مادی خاردار درخت کا موجود ہونا سرسبز و شاداب رہنا اور آگ سے نہ جلنا مشرکین کے انکار کا باعث ہو، بلاشبہ اسراء کے واقعہ میں بھی آزمائش کا پہلو یہی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کس طرح زمان و مکان کی قیود کو توڑ کر بجسدِ عنصری و بحالتِ بیداری وہ سیر کر لی جس کا ذکر سورۂ بنی اسرائیل اور "والنجم" میں اور صحیح احادیث میں ہے اور یقیناً مشرکین نے اسی کا انکار کیا جس کے رد میں قرآن نے اس کو "الا فتنۃ للناس" کہہ کر اس قدر

اہمیت دی ورنہ تو انبیاء علیہم السلام کے روحانی مشاہدات اور خواب کے واقعات کا انکار تو اُن کے لئے ایک عام بات تھی۔

(۸) اسراء کا واقعہ جب پیش آیا تو صبح کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جن صحابہ کی محفل میں اس واقعہ کا تذکرہ کیا وہ سب باتفاق یہ فرماتے ہیں کہ یہ واقعہ بجسدِ عنصری بحالتِ بیداری پیش آیا مثلاً حضرت عمرؓ، حضرت انسؓ، حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ وغیرہ اور اس کے برعکس ذیل کے قائلین میں حضرت امیر معاویہؓ اور حضرت عائشہؓ کے اسماء گرامی ہیں جن کا اسلام یا حرم نبوی سے تعلق اس واقعہ سے برسوں بعد مدینہ کی زندگی پاک سے وابستہ ہے اس لئے واقعہ کے ایام میں موجود اصحاب کا قول راجح ہے۔

(۹) حضرت عائشہ اور حضرت امیر معاویہ (رضی اللہ عنہما) کا جو مسلک جمہور کے خلاف منقول ہے وہ بلحاظ درجۂ روایت و صحتِ سند نہ صرف مرجوح بلکہ مجروح ہے اس لئے اول تو ان بزرگوں کی جانب اس قول کا انتساب ہی درست نہیں اور بالفرض صحیح بھی ہو تو جمہور کے مسلک کے مقابلہ میں ہر حیثیت سے مرجوح ہے۔ وذٰلک تسع آیات بینات۔

والنجم در واقعۂ معراج واقعۂ معراج کی تفصیلات اگرچہ مستند، مشہور اور مقبول روایات و احادیث سے ثابت و منصوص ہیں لیکن خود قرآنِ عزیز (والنجم) میں بھی بنصِ صریح بعض تفصیلات مذکور ہیں جن کو بنی اسرائیل کے اجمال کی تفسیر کہنا چاہیئے اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اُن چند آیات کی تفسیر بھی بیان کر دی جائے۔

"والنجم اذا ھوٰی ما ضل صاحبکم وما غوٰی" نجم، ستارہ کو کہتے ہیں اور "النجم" کہہ کر کبھی خاص ستارہ ثریا پر بھی اطلاق کرتے ہیں اور "ہوٰی" کے معنی سقوط و غروب کے ہیں اور "والنجم" میں "واو" قسم کے لئے ہے جس سے استعمالاتِ قرآنی میں اکثر مضمون مابعد کی اہمیت کے

پیشِ نظر استشہاد مقصود ہوتا ہے" ضل ضلالت سے ہے گمراہ ہونے اور بہک جانے کو کہتے ہیں اور "غوٰی" غوایت سے جس کے معنی بے راہ روی اور بچل جانے کے ہیں۔

پس ہر دو آیات کا مطلب یہ ہوا کہ شب دیجور کے یہ ستارے یا ثریا اس امر کی شہادت ہیں کہ جس طرح نظامِ شمسی میں ثریا بلکہ تمام ستارے طلوع سے غروب تک ایسے محکم اور مضبوط نظامِ فطرت میں منسلک ہیں کہ مقررہ وقت و معین رفتار کے ساتھ بغیر بھٹکے بچلے ہوئے جاری و ساری ہیں۔ ٹھیک اسی طرح روحانی نظامِ شمسی کے تمام ستارے (انبیاء علیہم السلام) بھی نبوت و رسالت کے مقررہ اصول و معین راہ پر جاری و ساری رہے ہیں اور کبھی خدا کے معین کردہ نظامِ نبوت سے نہ بھٹکے اور نہ بے راہ ہوئے تو پھر یقین کرو کہ اس نظامِ روحانیت (نبوت) کا آفتاب عالمتاب یعنی تمہارا رفیق (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) بھی نہ بھٹکا اور نہ بے راہ ہوا، اور ہو بھی کیسے سکتا تھا کہ ایسا ہونے پر سارا نظامِ نبوت ہی درہم برہم ہو کر رہ جاتا اور انبیاء علیہم السلام کی بعثت کا مقصد ہی فوت ہو جاتا۔ یا یوں کہہ لیجئے کہ تمہارے سامنے جس شب کا ذکر ہو رہا ہے اُس شب دیجور میں ثریا جیسے روشن ستارہ کا طلوع ہو کر غروب ہو جانا اس پورے نظامِ شمسی کے تغیر و فنا کی بولتی تصویر ہے پس اگر تمہارا رفیق (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کسی ایسے واقعہ کا اظہار کرتا ہے جو عام قانونِ قدرت کے پیشِ نظر عجیب و غریب معلوم ہوتا، اور اس نظامِ شمسی کے ایک خاص دورِ انقلاب اور حیرت زا تغیر کا پتہ دیتا ہے تو تم کو یقین کرنا چاہئے کہ یہ واقعہ بلاشبہ عالمِ وجود میں آیا اور تمہارا رفیق اس معاملہ میں نہ بھٹکا اور نہ بے راہ ہوا بلکہ جو کچھ دیکھا اور جو کچھ نقل کیا وہ سب حرف بحرف حق اور مبنی بر حقیقت ہے۔

"وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى" "نطق" گویائی اور "ہوٰی" خواہشِ نفس۔ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْیٌ يُّوْحٰى "وحی" وہ یقینی الہام جو خدا کی جانب سے نبی پر نازل ہوتا ہے اور جس کے خدا کی

جانب سے ہونے میں کسی قسم کا شک وتردد نہیں ہوتا یعنی "رسالت" اور یہ بھی واضح رہے کہ تمہارے رفیق کی صدق مقالی کا یہ عالم ہے کہ وہ خدا کی باتیں کبھی بھی اپنی خواہشِ نفس سے نہیں کہتا بلکہ جو کچھ بھی کہتا ہے وہ خدا کی ہی وحی سے ہوتا ہے۔

"عَلَّمَهٗ شَدِيْدُ الْقُوٰى، ذُوْ مِرَّةٍ فَاسْتَوٰى، وَهُوَ بِالْاُفُقِ الْاَعْلٰى، ثُمَّ دَنَا فَتَدَلّٰى، فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰى" "علّمہ" تعلیم، سکھلانا۔ "شدید القویٰ" زبردست روحانی طاقتوں والا "مرہ" زور آور۔ "فاستویٰ" استوار، سیدھا ہو بیٹھا۔ "افق الاعلیٰ" (آسمان کا) اونچا کنارا۔ "دنا" دنو، قریب ہونا۔ "فتدلّٰی" تدلّی، جھک آنا۔ "قاب قوسین" دو کمان کی مقدار "ادنیٰ" قریب یا کم۔

"صاحبِ وحی (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) اور وحی نازل کرنے والے (خدا) کے باہم رشتۂ وحی کا اظہار کرنے کے بعد ضرورت تھی کہ ان دونوں کے درمیان جو وحی کے لئے رابطہ ہے یعنی جبرئیل کچھ اُس کے متعلق بھی کہا جائے، کیونکہ مشرکینِ مکّہ اُس کی شخصیت اور اس کے فرض کی تفصیلات سے قطعاً ناآشنا تھے اور یوں بھی وحی کی عظمت، صاحبِ وحی کی جلالت اور وحی نازل کرنے والی ہستی کے جلال وجبروت کا تقاضا تھا کہ رابطۂ وحی کی شخصیت کے بعض نمایاں اوصاف کو بھی بیان کیا جائے۔ اس لئے ارشاد ہوا۔ اُس پر (محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر) جو وحی لاتا ہے وہ زبردست روحانی وجسمانی طاقتوں کا پیکر ہے وہ پیغمبرِ خدا (صلی اللہ علیہ وسلم) کو اپنی حقیقی ہیئت وصورت میں صاف نمایاں نظر آیا اور آپ نے اُس کو آسمان کے بلند کنارے پر دیکھا، پھر وہ قریب ہوگیا پس (پیغمبرِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب) جُھک آیا، پھر ہوگیا اتنا قریب جیسا کہ دو کمان کی مسافت یا اس سے بھی قریب تر۔

"فَاَوْحٰى اِلٰى عَبْدِهٖ مَاۤ اَوْحٰى، مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰى، اَفَتُمٰرُوْنَهٗ عَلٰى مَا يَرٰى" "فواد

قلبؔ، رائیؔ، رویت بصرؔ، تماروؔنہ، مماراۃ مبنی مقابلہ کرنا، جھگڑا کرنا۔

جب صاحب وحی (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) اور وحی کے لانے والے (جبرئیل علیہ السلام) کے درمیان صورتِ حال یہ پیش آئی تو اُس کے بعد موحی (وحی کرنے والے خدا) نے اپنے بندے پر جو کچھ چاہا وہ براہِ راست وحی فرمائی یعنی جب اس مقامِ رفیع پر بلا کر جہاں کسی مخلوق کا گذر نہ ہوا اور نہ ہو، مخاطب کو کیا بتلایا جائے کہ خدا اور اُس کے پیغمبر کے درمیان کیا کچھ وحی کی سرگوشیاں ہوئیں، کیونکہ کسی کو وہ رفعت جب نصیب ہی نہیں تو وہ اُن حقایق کو سمجھ ہی کیا سکتا ہے لہٰذا اسی قدر کافی ہے کہ یہ یقین کر لو کہ خدا نے جو چاہا اپنے بندہ (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) سے بات چیت کی اور یہ کہ اُس کی آنکھ نے اس شب میں جن اسرارِ الٰہی کو دیکھا۔ قلب نے اس کو جھوٹا نہیں کہا، بلکہ وہ ایک ایسی حقیقت تھی جس کے بارے میں چشم و قلب دونوں کے درمیان مطابقت و تصدیق کا ہی سلسلہ قائم رہا تو پھر اے مخاطبین جو کچھ اس (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) نے دیکھا ہے کیا تم اس کے متعلق جھگڑتے ہو؟

"وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰى، عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰى، عِنْدَهَا جَنَّةُ الْمَاْوٰى، اِذْ يَغْشَى السِّدْرَةَ مَا يَغْشٰى"۔ "نزلۃ اخریٰ" ایک قسم کا نزول یا دوسری مرتبہ "سدرہ" بیری کا درخت۔ "سدرۃ المنتہیٰ" ملاءِ اعلیٰ کا ایک مقامِ رفیع "جنۃ الماویٰ" نیکوں کے قیام کی جنت "یغشیٰ" غشیان، ڈھانپ لینا۔

حالانکہ جھگڑنے کی کوئی بات نہیں اس لئے کہ اس نے وحی کرنے والے (خدا) کو ایک خاص کیفیتِ نزول کے ساتھ دیکھا ہے اور اس وقت دیکھا جب وہ (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) سدرۃ المنتہیٰ کے پاس تھا جس کے قریب جنت الماویٰ ہے اور اس وقت اس سدرہ کو ڈھانپنے والے شے (یعنی فرشتوں) نے ڈھانپ رکھا تھا۔ یا یہ کہئے کہ اس نے جبرئیل علیہ السلام کو دوسری مرتبہ

ـــــــــــ
۱؎ مشکلات القرآن ص ۳۴۰ تا ۳۲۰۔

(اصلی ہیئت میں) دیکھا، سدرۃ المنتہیٰ کے قریب الخ پس نہ مشاہدۂ جلوۂ حق کوئی جھگڑنے کی بات ہے اور نہ رویتِ جبرئیل کہ جس کو اس سے قبل بھی اس نے دیکھا ہے اور چشمِ حق بین اور قلبِ حق آگاہ کے لئے ان میں سے ایک بات بھی قابلِ نزاع نہیں۔

مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰی، لَقَدْ رَاٰی مِنْ اٰیٰتِ رَبِّہِ الْکُبْرٰی ۔ "زاغ" زیغ، کجی - "طغیٰ" طغیان، سرکشی، خلافِ حق رجحان۔

بہر حال اس کے مشاہدۂ حق پر کوئی جھگڑے، اور انکار کرے یا تسلیم کرے اور حق جانے حقیقت تو یہ ہے کہ اس نے لیلۃ الاسراء میں جو کچھ بھی مشاہدات کئے اور آنکھوں سے جو کچھ بھی دیکھا اس چشمِ حق بین نے حقیقتِ حال کے خلاف نہ کسی قسم کی کجی اختیار کی اور نہ وہ راہ سے بے راہ ہوئی اور بلا شائبۂ شک وشبہ اس نے اپنے پروردگار کے بڑے بڑے نشان دیکھے۔

واقعہ کی تفصیلات

وہ نشان کیا تھے جن کو اس جگہ "لَقَدْ رَاٰی مِنْ اٰیٰتِ رَبِّہِ الْکُبْرٰی" کہا اور بنی اسرائیل میں "لِنُرِیَہٗ مِنْ اٰیٰتِنَا" فرمایا اور اسی سورہ میں دوسرے مقام پر "وَمَا جَعَلْنَا الرُّؤْیَا الَّتِیْ اَرَیْنٰکَ اِلَّا فِتْنَۃً لِّلنَّاسِ" کہہ کر ان کی اہمیت کو روشناس کرایا۔ بخاری و مسلم میں منقول صحیح، مشہور اور مستند روایات کا مجموعی بیان یہ ہے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک صبح کو ارشاد فرمایا۔ گذشتہ شب میرے خدا نے مجھ کو اپنے خاص مجد و شرف سے نوازا جس کی تفصیل یہ ہے کہ شبِ گذشتہ جبکہ میں سو رہا تھا رات کے ایک حصہ میں جبرئیل آئے اور مجھ کو بیدار کیا ابھی پوری طرح جاگ بھی نہ پایا تھا کہ حرم کعبہ میں اٹھا لائے اور تھوڑی دیر لیٹا تھا کہ پوری طرح بیدار کر کے اول میرا سینہ چاک کیا اور (ملاءِ اعلیٰ کے ساتھ مناسبتِ تامہ پیدا کرنے کے لئے عالم دنیا کی کدورتوں کو) دھویا اور ایمان و حکمت سے

بھر دیا۔ اس کے بعد حرم کے دروازہ پر لایا گیا اور وہاں جبرئیل نے میری سواری کے لئے خچر سے کچھ چھوٹا جانور براق پیش کیا جو سپید رنگ تھا۔ جب میں اس پر سوار ہو کر روانہ ہوا تو اُس کی سبک رفتاری کا یہ عالم تھا کہ حدِ نگاہ اور حدِ رفتار یکساں نظر آتی تھی کہ اچانک ... بیت المقدس جا پہنچے۔ یہاں جبرئیلؑ کے اشارہ پر براق کو مسجد کے دروازہ کے اس حصہ سے باندھ دیا جس سے انبیاء بنی اسرائیل مسجدِ اقصیٰ کی حاضری پر اپنی سواریاں باندھا کرتے تھے (اور جو اُس وقت تک بطور یادگار قائم تھا) پھر میں مسجدِ اقصیٰ میں داخل ہوا اور دو رکعات پڑھیں اب یہاں سے ملاءِ اعلیٰ کی طیاری شروع ہوئی تو اول جبرئیلؑ نے میرے سامنے دو پیالے پیش کئے اُن میں سے ایک شراب (خمر) سے لبریز تھا اور دوسرا دودھ (لبن) سے میں نے دودھ کا پیالہ قبول کیا اور شراب کا پیالہ مسترد کر دیا، جبرئیلؑ نے یہ دیکھ کر کہا: آپ نے دودھ کا پیالہ قبول کر کے دینِ فطرت کو اختیار کیا (یعنی خدا کی جانب سے جو میں نے آپ کو یہ دو پیالے پیش کئے تو در اصل یہ تمثیل تھی دینِ فطرت اور دینِ زیغ کی مگر آپ نے اس حقیقت کو پہچان لیا اور دودھ کے پیالہ کو قبول فرما کر جو دینِ فطرت کی تمثیل تھا دینِ فطرت کو قبول فرما لیا۔ اس کے بعد ملاءِ اعلیٰ کا سفر شروع ہوا اور جبرئیل کی ہمرکابی میں براق نے آسمان کی جانب پرواز کی، جب ہم پہلے آسمان (سماءِ دنیا) تک پہنچ گئے تو جبرئیلؑ نے نگہبان فرشتوں سے دروازہ کھولنے کو کہا نگہبان فرشتہ نے دریافت کیا، کون ہے؟ جبرئیلؑ نے کہا: میں جبرئیل ہوں، فرشتہ نے دریافت کیا، تمہارے ساتھ کون ہے؟ جبرئیلؑ نے جواب دیا: محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) فرشتہ نے کہا: کیا خدا کے مدعو ہو کر آئے ہیں؟ جبرئیل نے کہا: بیشک فرشتہ نے دروازہ کھولتے ہوئے کہا: ایسی ہستی کا آنا مبارک ہو جب ہم اندر داخل ہوئے تو حضرت آدم (علیہ السلام) سے ملاقات ہوئی۔ جبرئیل نے میری جانب مخاطب ہو کر کہا۔

یہ آپ کے والد (اور نسلِ انسانی کے مورثِ اعلیٰ) آدم (علیہ السلام) ہیں، آپ ان کو سلام کیجئے میں نے اُن کو سلام کیا اور اُنھوں نے جوابِ سلام دیتے ہوئے فرمایا "مرحبا بالابن الصالح والنبی الصالح - خوش آمدید برگزیدہ بیٹے اور برگزیدہ نبی" اس کے بعد دوسرے آسمان تک پہنچے اور پہلے آسمان کی طرح سوال وجواب ہو کر دروازہ میں داخل ہوئے۔ تو وہاں یحییٰ وعیسیٰ (علیہما السلام) سے ملاقات ہوئی، جبرئیل نے اُن کا تعارف کرایا اور کہا کہ آپ سلام پر پیشقدمی فرمائیے، میں نے سلام کیا اور اُن دونوں نے جواب دیتے ہوئے فرمایا "مرحبا بالاخ الصالح والنبی الصالح - خوش آمدید اے برگزیدہ بھائی اور برگزیدہ نبی" پھر تیسرے آسمان تک پہنچ کر یہی مرحلہ پیش آیا اور جب میں آسمانِ ثالث میں داخل ہوا تو حضرت یوسف (علیہ السلام) سے ملاقات ہوئی، جبرئیل نے تقدیم سلام کے لئے کہا اور میرے سلام کرنے پر یوسف (علیہ السلام) نے بھی جوابِ سلام کے بعد یہی کلمہ کہا "خوش آمدید اے برگزیدہ بھائی اور برگزیدہ نبی"۔ بعد ازاں چوتھے آسمان پر اس سوال وجواب کے ساتھ حضرت ادریس (علیہ السلام) سے ملاقات ہوئی اور پانچویں آسمان پر حضرت ہارون (علیہ السلام) سے اور چھٹے آسمان پر موسیٰ (علیہ السلام) سے اسی طرح ملاقات ہوئی لیکن جب میں وہاں سے روانہ ہونے لگا تو حضرت موسیٰؑ پر رقت طاری ہوگئی، میں نے سبب دریافت کیا تو فرمایا: مجھے یہ رشک ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی حکمتِ بالغہ نے ایسی ہستی کو جو میرے بعد مبعوث ہوئی یہ شرف بخش دیا کہ اُس کی امت میری امت کے مقابلہ میں چند در چند زیادہ جنت سے فیضیاب ہوگی۔ اس کے بعد سابق سوالات وجوابات کا مرحلہ طے ہو کر جب میں ساتویں آسمان پر پہنچا تو حضرت ابراہیم (علیہ السلام) سے ملاقات ہوئی جو بیت المعمور سے پشت لگائے بیٹھے تھے اور جس میں ہر روز ستر ہزار نئے فرشتے (عبادت کے لئے) داخل

ہوتے ہیں، انھوں نے میرے سلام کا جواب دیتے ہوئے فرمایا "مبارک اے میرے برگزیدہ
بیٹے اور برگزیدہ نبی" یہاں سے پھر مجھ کو سدرۃ المنتہیٰ تک پہنچایا گیا (تمہاری بول چال میں یہ
ایک انتہا کی بیری کا درخت ہے) جس کا پھل (بیر) ہجر کی ٹھلیا کی برابر ہے اور جس کے
پتّے کان کی طرح چوڑے ہیں۔ اس پر ملائکۃ اللہ جگنو کی طرح بے تعداد چمک رہے
تھے اور خدا کی خاص تجلی نے اس کو حیرت ناک پر رونق اور پرکیف بنا رکھا تھا۔

اسی سفر میں میں نے چار نہروں کا بھی معائنہ کیا ان میں سے دو ظاہر نظر آتی تھیں
اور دو باطن میں بہہ رہی تھیں، یعنی دو نہریں جن کا نام نیل اور فرات ہے[۲] آسمانِ دنیا پر
نظر پڑیں اور دو نہریں جنت کے اندر موجود پائیں اور ان مشاہدات کے بعد محمد کو شراب
(خمر) دودھ اور شہد کے پیالے پیش کئے گئے اور میں نے دودھ کو قبول کر لیا اس پر جبرئیل ع نے

---

[۱] سدرۃ المنتہیٰ کے متعلق مختلف روایات کا حاصل یہ ہے کہ اس کی جڑ چھٹے آسمان پر ہے اور اس کی شاخیں ساتویں آسمان سے بھی نکل گئی ہیں اور یہ وہ مقام ہے جہاں سے چیزیں زمین پر اترتی اور زمین سے اوپر چڑھ کر وہاں تک پہنچتی ہیں گویا نزول وعروج کا مقام اتصال ہے اس مقام سے آگے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ نہ جبرئیل علیہ السلام اور دوسرے ملائکۃ اللہ کا گذر ہوا اور نہ کسی نبی مرسل کا۔

محدثین کہتے ہیں کہ یہ مقام اس درخت کی شکل میں دراصل "ایمان وحکمۃ" کی حقیقت کو متشکل و مصور ظاہر کرتا ہے، اس لئے کہ ایمان نیت صالح، قول صالح اور عمل صالح کا جامع ہے، پس یہ درخت اپنے پھل کے ذائقہ اپنی خوشبو اور اپنے سایہ پر صفات کے لحاظ حقیقت ایمان کا مظہر ہے یعنی اس درخت کے پھل کا لذیذ ذائقہ نیت صالح کا مظہر ہے اور عمدہ خوشبو قول صالح اور راحت بخش سایہ عمل صالح کا مظہر ہے اور اسی لئے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایمان کی تشبیہ شجر کے ساتھ دی ہے۔ ارشاد مبارک ہے الایمان بضع وسبعون شعبۃ الحدیث۔

[۲] یا تو یہ مراد ہے کہ جس وقت آپ نے جنت میں دو نہریں دیکھیں تو آپ نے اسی وقت جب دنیا کی جانب نگاہ کی تو وہاں سامنے نیل اور فرات بہتی ہوئی نظر آئیں اور یا یہ ملاءِ اعلیٰ کی نہروں کے اسی طرح نام ہیں جس طرح دنیا کے دو دریا نیل اور فرات ہیں۔

مجھے بشارت سنائی کہ آپ نے "دینِ فطرت" کو قبول کر لیا (یعنی جو ہر قسم کی کدورتوں سے پاک اور شفاف ہے عمل میں شیریں اور خوشگوار اور نتیجہ میں حد درجہ مفید اور احسن ہے)۔

پھر خدائے تعالیٰ کا خطاب ہوا کہ تم پر شبانہ روز پچاس نمازیں فرض قرار دی گئیں جب میں ان اسرارِ الٰہی کے مشاہدات سے فارغ ہو کر نیچے اترنے لگا تو درمیان میں موسیٰ علیہ السلام سے ملاقات ہوئی، انھوں نے دریافت کیا: معراج کا کیا تحفہ لائے؟ میں نے کہا: پچاس نمازیں۔ انھوں نے فرمایا: تمہاری امت اس بارِ گراں کو برداشت نہ کر سکے گی اس لئے واپس جایئے اور تخفیف کی التجا کیجئے کیونکہ میں تم سے قبل اپنی امت کو آزما چکا ہوں، چنانچہ میں درگاہ الٰہی میں رجوع ہوا اور اللہ تعالیٰ کی جانب سے پانچ کی تخفیف ہو گئی، موسیٰ علیہ السلام تک لوٹ کر آیا تو انھوں نے پھر اصرار کیا کہ اب بھی زیادہ ہیں اور کم کراؤ اور میں اسی طرح چند مرتبہ آتا جاتا رہا حتیٰ کہ صرف پانچ نمازیں رہ گئیں مگر موسیٰ (علیہ السلام) مطمئن نہیں ہوئے اور فرمایا: میں بنی اسرائیل کا کافی تجربہ اور ان کی اصلاح کر چکا ہوں اس لئے مجھے اندازہ ہے کہ آپ کی امت یہ بھی برداشت نہ کر سکے گی، اس لئے تخفیف کے لئے مزید عرض کیجئے تب میں نے کہا کہ اب عرض کرتے شرم آتی ہے میں اب راضی برضا اور اس کے فیصلے کے سامنے سرِ نیاز جھکاتا ہوں۔ جب میں یہ کہہ کر چلنے لگا تو ندا آئی "ہم نے اپنا فرض نافذ کر دیا اور اپنے بندوں کے لئے تخفیف کر دی یعنی مشیتِ الٰہی قبل ہی یہ فیصلہ کر چکی ہے کہ امتِ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پر بصورتِ ادا اگرچہ پانچ نمازیں فرض رہیں گی مگر ان کا اجر و ثواب پچاس ہی کی برابر ہوگا اور یہ تخفیف ہمارا فضل و کرم ہے۔

اُن ہی روایات میں ہے کہ میں نے جنت و جہنم کا بھی مشاہدہ کیا اور پھر مشاہدہ کی تفصیلات بھی منقول ہیں۔

معراج میں رویتِ باری

کیا معراج میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ذاتِ احدیت کے جمالِ جہاں آرا کا بے حجاب مشاہدہ کیا؟ صحیح روایات میں اس مسئلہ کے متعلق جو تعبیرات مذکور ہیں اُن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مشاہدہ ضرور کیا تاہم نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اُس مشاہدہ کی کیفیت کے حقیقی اظہار سے اس لئے قاصر ہیں کہ دنیوی تعبیرات میں کوئی تعبیر ایسی موجود نہیں کہ بلند سے بلند ترین مخلوق اُس کے ذریعہ جمالِ جہاں آرا کی کیفیت و حقیقت کو بیان کر سکے اس لئے آپ نفسِ واقعہ کا اقرار فرماتے ہیں جیسا کہ حضرت عبد اللہ بن عباس (رضی اللہ عنہما) کی روایت میں منقول ہے "رأیتہ نورًا۔ میں نے اُس کو 'نور' دیکھا" اور مشاہدہ کے باوجود جمالِ جہاں آرا کی ناقابلِ بیان کیفیت کا پھر اِن الفاظ میں اظہار بھی فرماتے جاتے ہیں "نورٌ انّٰی اراہ۔ اُس نورِ بحت کا حقیقی مشاہدہ کہاں ہو سکتا تھا۔

پس حضرت عبد اللہ بن عباسؓ کے مقابلہ میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی جانب سے رویتِ باری کی نفی میں آیتِ قرآنی کا یہ استدلال لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ اُس کو آنکھیں نہیں دیکھ سکتیں اور وہ آنکھوں کا یعنی دیکھنے والوں کی پوری حقیقت کا ادراک کئے ہوئے ہے"۔ اس لئے مرجوح ہے کہ آیت میں موجودہ دنیا کی مادی اور محدود بصارت کے مشاہدہ کا انکار ہے جو بلا ریب حق ہے لیکن ملاءِ اعلیٰ کا وہ مقامِ معراج جہاں زمان و مکان اور حدود و قیود سے آزاد اسرارِ الٰہی کے مشاہدات کے لئے کسی کو نوازا گیا ہو تو اُس کے مشاہدۂ حقیقت کا یہ آیت کسی طرح انکار نہیں کرتی۔

یہی وجہ ہے کہ صحابہ (رضی اللہ عنہم) کے زمانہ سے آج تک محققین علماء کی ایک کثیر جماعت سلفاً عن خلفٍ سورۂ والنجم کی آیت "اَفَتُمٰرُوْنَهٗ عَلٰى مَا يَرٰى" "مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰى" کی تفسیر میں صحیح احادیث کی استمداد سے یہ ثابت کرتی رہی ہے کہ ان مقامات میں رویت

سے "رویتِ باری" مراد ہے۔ چنانچہ محققِ عصر علامہ سید محمد انور شاہ کشمیری نور اللہ مرقدہٗ نے سورۂ والنجم کی دقیق و لطیف اور بے بہا تفسیر میں اس حقیقت کو باحسنِ وجوہ بیان فرمایا ہے۔[۱]

ہجرت

ہجرت لفظ "ہجر" سے ماخوذ ہے جس کے معنی چھوڑ دینے کے ہیں اور اسلام کی اصطلاح میں "اللہ کے لئے ترکِ وطن کر دینا" ہجرت کہلاتا ہے۔

ہجرتِ حبش اللہ کے دین پر استقامت اور کلمۂ حق کی حفاظت کی خاطر فداکارانِ اسلام کو ترکِ وطن کی پہلی آزمائش اس وقت پیش آئی جبکہ کفارِ مکہ اور مشرکینِ قریش نے ہر قسم کے ظلم و ستم کا نشانہ بنا کر مسلمانوں کے لئے ان کے محبوب وطن (مکہ) میں دینِ حق پر قائم رہتے ہوئے لمحاتِ زندگی کو ناممکن بنا دیا اور اب ترکِ وطن کے علاوہ کوئی چارۂ کار باقی نہ چھوڑا پس مٹھی بھر مسلمانوں پر مشرکین کے ناقابلِ برداشت مظالم اور مسلمانوں کے حیرت زا صبر و استقلال نے دنیا کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ کر دیا جو "ہجرتِ حبش" کے عنوان سے معنون ہے۔

حبش کا موجودہ فرمانروا اصحمہ[۲] عیسائی تھا اور دینِ مسیحی کا عالم بھی، اس لئے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو اجازت مرحمت فرمائی کہ وہ سرِ دست حبشہ کو ہجرت کر جائیں توقع ہے کہ اصحمہ کی حکومت ان کا خیر مقدم کرے گی اور وہ کسی مزاحمت کے بغیر دینِ حق پر قائم و مستقیم رہ سکیں گے۔

---

[۱] تفسیر کا یہ حصہ فتح الملہم شرح مسلم جلد اول لعلامہ شبیر احمد عثمانی اور مشکلات القرآن لحضرۃ الشاہ الکشمیری نور اللہ مرقدہ دونوں میں منقول ہے اور اپنی جگہ قابلِ مراجعت ہے۔

[۲] حبشہ کے بادشاہ کا لقب "نجاشی" تھا جو "نجوس" کا معرب ہے نجوس حبشی زبان میں حکمراں کو کہتے ہیں۔

ہجرت کے اس دور کی نمایاں شخصیت حضرت عثمان (رضی اللہ عنہ) اور ان کی رفیقۂ حیات، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی لختِ جگر حضرت رقیہ (رضی اللہ عنہا) ہیں، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مقدس جوڑے کو رخصت فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ لوط اور ابراہیم (علیہما السلام) کے بعد یہ پہلا جوڑا ہے جو خدا کی راہ میں ہجرت کر رہا ہے[1]۔ پھر آہستہ آہستہ یہ تعداد اسی تک پہنچ گئی، ان مہاجرین میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عم زاد بھائی حضرت جعفرؓ بھی تھے، یہی وہ مردِ حق کوش ہیں جنہوں نے قریش کے وفد کی مہاجرین سے متعلق زہر چکانی اور مطالبۂ مراجعت کے سلسلہ میں نجاشی حبش کے دربار میں اسلام پر بے نظیر تقریر فرمائی اور جس کا ذکر صفحات گذشتہ میں ہو چکا ہے۔

ہجرتِ مدینہ کے اسباب

سنہ ۱۱ نبوت موسم حج کے موقعہ پر الحراء اور منیٰ کے درمیان مقام عقبہ میں یثرب (مدینہ) کے چند لوگوں نے شب کی تنہائی میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغام حق سنا اور اسلام قبول کر لیا، یہ چھ یا آٹھ اشخاص تھے۔ دوسرے سال چند سابق اشخاص اور بعض دوسرے حضرات نے جو تعداد میں بارہ تھے حاضر خدمت ہو کر اسلام پر تبادلۂ خیالات کیا اور مشرف باسلام ہو گئے ان کے اسمائے گرامی بر ایت محمد بن اسحٰق یہ ہیں:۔ ابوامامہ، عوف بن الحارث، رافع بن مالک، قطبہ بن عامر، عقبہ بن عامر، معاذ بن حریث، ذکوان بن عبد قیس خالد بن مخلد، عبادہ بن صامت، عباس بن عبادہ، ابوالہیثم، تمیم بن ساعدہ[2]۔

حضرت عبادہ بن صامت فرماتے ہیں کہ ہم نے عقبۂ اولیٰ میں حسب ذیل شرائط کے ساتھ اسلام پر بیعت کی تھی۔

(۱) خدائے واحد کے ماسوا کسی کی پرستش نہیں کریں گے۔

---

[1] مستدرک، حاکم۔ جلد ۴ صفحہ ۴۸

[2] البدایہ والنہایہ جلد ۳ صفحہ ۱۴۹۔

(۲) چوری نہیں کریں گے۔

(۳) زنا نہیں کریں گے۔

(۴) اپنی اولاد کو قتل نہیں کریں گے۔

(۵) کسی پر جھوٹی تہمتیں نہیں لگائیں گے اور نہ کسی کی غیبت کریں گے۔

(۶) اور کسی بھی اچھی بات میں آپ کی (نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی) نافرمانی نہیں کریں گے

بیعت کے بعد نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا اگر تم نے ان شرائط کو پورا کیا تو تمہارے لئے جنت کی بشارت ہے اور اگر تم ان باتوں میں سے کسی کے مرتکب ہوئے تو پھر تمہارا معاملہ خدا کے ہاتھ ہے چاہے بخش دے اور چاہے جرم پر سزا دے

اس واقعہ سے مدینہ کے ہر گھر میں اسلام کا چرچا کر دیا اور آہستہ آہستہ ہر ایک خاندان میں آفتاب اسلام کی ضیا باری ہونے لگی اور نتیجہ یہ نکلا کہ اوس و خزرج کی تمام شاخوں میں سے ۱۳ نبوت کو تہتر مرد اور دو عورتیں اسی مقام عقبہ پر موسم حج میں شب کی تاریکی کے اندر آفتاب نبوت کی درخشانی سے فیضیاب ہونے جا پہنچے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بھی اپنے چچا عباس (رضی اللہ عنہ) کو ہمراہ لے کر وہاں پہنچ گئے اور ان کے سامنے اسلام پر ایک موثر وعظ فرمایا جس سے ان کے قلوب نورِ ایمان سے جگمگا اٹھے اس کے بعد انصار اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان اس امر پر گفتگو ہوئی کہ اگر ذات اقدس صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ میں نزولِ اجلال فرمائیں تو اشاعتِ اسلام کو بھی بہت زیادہ فائدہ پہنچے اور ہم کو بھی فیضیاب ہونے کا بخوبی موقع میسر آئے اور اس سلسلہ میں جانبین سے محبت و مودت کے قول و قرار بھی ہوئے جن کی تفاصیل کتب سیر و تاریخ میں مذکور ہیں۔ ان ہی حضرات میں سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بارہ شخصوں کو منتخب فرما کر دعوت و تعلیم اسلام کے لئے اپنا نقیب مقرر فرمایا۔

یثرب (مدینہ) میں اسلام کی اشاعت نے جب اس طرح روز افزوں ترقی اختیار کرلی تو اب وحیِ الٰہی نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانی جاں نثارانِ اسلام کو اجازت دی کہ وہ مشرکینِ مکہ کی ہولناک ایذا رسانی سے محفوظ ہو جانے کے لئے مدینہ ہجرت کر جائیں اور خدا کے لئے ترکِ وطن اختیار کریں، چنانچہ آہستہ آہستہ مسلمانوں نے مدینہ کو ہجرت شروع کردی مشرکینِ مکہ نے یہ دیکھ کر مسلمانوں کو ہجرت سے روکنے کے لئے مظالم میں اور اضافہ کردیا اور انسدادِ ہجرت کے لئے ممکن ذرائع کو اختیار کیا مگر فداکارانِ اسلام کا جذبۂ ہجرت فرو نہ ہوا بلکہ وہ کثرت کے ساتھ مال، جان، آبرو اور اولاد کی زندگی کو خطرہ میں ڈال کر اللہ کی راہ میں وطنِ عزیز کو خیرباد کہتے رہے اور اکثر ایسا ہوا کہ جب اہلِ مکہ نے اُن کے اموال اور اہل و عیال کو ساتھ لے جانے سے روک دیا تو ان مردانِ خدا نے صبر آزما زندگی کے ساتھ ہجرتِ حق کی خاطر اُن کو بھی وہیں چھوڑا اور تنہا خدا کے بھروسہ پر مدینہ روانہ ہو گئے۔

ہجرت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم

اب مکہ میں مشاہیر مسلمانوں میں سے صرف ابوبکر اور علی (رضی اللہ عنہما) ہی باقی رہ گئے تھے[۱] اور ایک قلیل تعداد باقی مسلمانوں کی تھی تب قریش نے سوچا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کر کے اسلام کو مٹا دینے کا اس سے بہتر دوسرا کوئی موقع نہیں آئیگا۔

دار الندوہ

چنانچہ تمام سردارانِ قریش قصیّ بن کلاب کے قائم کردہ گورنمنٹ ہاؤس "دار الندوہ" میں جمع ہوئے اور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل سے متعلق سازشی مجلسِ مشاورت قائم کی۔ اس مجلس میں عتبہ، شیبہ، ابوسفیان، طعیمہ بن عدی، جبیر بن مطعم، حارث بن عامر نضر بن حارث، ابوالبختری، زمعہ بن اسود، حکیم بن خزام، ابوجہل، نبیہ بن الحجاج، منبہ بن الحجاج، امیہ بن خلف جیسے صنادیدِ قریش شریکِ مشورہ تھے۔ مشورہ شروع ہونے والا ہی تھا

---

[۱] تاریخ ابن کثیر ج ۲ ص ۱۷۵۔

کہ ایک شیطان "شیخ نجدی" دار الندوہ کے دروازہ پر آموجود ہوا اور شرکتِ مجلس کا خواستگار بنا
قریشِ مکہ نے ہم مشرب پاکر بخوشی اجازت دی اور اب مشورہ شروع ہوا۔ مختلف اہل الرائے
نے مختلف رائیں دیں لیکن شیخ نجدی نے ہر ایک رائے کو غلط قرار دیا آخر ایک شخص نے
کہا، تمام قبائل میں سے ایک ایک جوان لیجئے اور ان سے کہیے کہ وہ بیک وقت محمد
(صلی اللہ علیہ وسلم) پر حملہ کر کے قتل کر دیں اس سے کام بھی بن جائیگا اور بنو عبد مناف کسی سے
قصاص لینے کی جراءت بھی نہ کر سکیں گے اور صرف خونبہا پر معاملہ طے ہو جائیگا۔ شیخ نجدی
نے اس رائے کو بہت سراہا اور یہی رائے طے پا گئی۔ اِدھر جبرئیل نے وحیِ الٰہی کے ذریعہ
ذاتِ اقدس کے سامنے اس پوری داستان کو کہہ سنایا اور عرض کیا کہ خدا کی مرضی یہ ہے
کہ آپ آج کی شب اپنے بستر پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کو سلا کر خود مدینہ کو ہجرت کر جائیے
چنانچہ وحیِ الٰہی کے مطابق آپ قریش کے نوجوانوں کی حراست کے باوجود سورۂ یٰسین کی چند
آیات "فَأَغْشَيْنَاهُمْ فَهُمْ لَا يُبْصِرُونَ" پڑھتے ہوئے اور "شاھت الوجوہ" فرما کر مٹھی بھر
خاک ان کے سروں پر ڈالتے ہوئے صاف بچ کر نکل گئے اور حضرت ابوبکرؓ کے مکان پر جاکر
اور وحیِ الٰہی کا مژدۂ رفاقت سنا کر ان کو ہمراہ لئے مدینہ کو روانہ ہو گئے۔

ہجرت کا یہ واقعہ ربیع الاول ۱۳ نبوت دو شنبہ کے روز پیش آیا، یہ واقعہ اپنے خصوصی
حالات اور معجزانہ اثرات کے ساتھ بہت مشہور اور صحیح احادیث و روایات میں مذکور ہے اور
صدیق اکبر (رضی اللہ عنہ) کی سفرِ ہجرت میں رفاقت کی عظمت و جلالت کے لئے رہتی دنیا تک
قرآنِ عزیز اس طرح ناطق ہے۔

ثَانِيَ اثْنَيْنِ إِذْ هُمَا فِي الْغَارِ إِذْ يَقُولُ ۔ دو میں سے دوسرا جبکہ وہ دونوں غار میں تھے جب کہ یہ اپنے رفیق
لِصَاحِبِهِ لَا تَحْزَنْ إِنَّ اللَّهَ مَعَنَا ۔ (ابوبکر) سے کہہ رہا تھا۔ ابوبکر غم نہ کھا بلا شبہ خدا ہمارے ساتھ ہے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس موقعہ پر ابو بکر رضی اللہ عنہ کو مخاطب کرتے ہوئے "لاتحزن" فرمایا "لاتخف" نہیں فرمایا، یہ اس لئے کہ "خوف" اور "حزن" کے لغوی فروق میں سے ایک دقیق فرق یہ بھی ہے کہ عموماً "خوف" اپنی مضرت کے سلسلہ میں ہوا کرتا ہے بخلاف حزن کے کہ وہ اس رنج کو کہتے ہیں جو اکثر دوسرے کی مصیبت کی وجہ سے خود کو پیش آتا ہے۔ گویا قرآن عزیز بنص صریح ناطق ہے۔ اس حقیقت کے لئے کہ ابو بکرؓ کو اپنی جان اور اپنی ذات کا خوف نہیں تھا، بلکہ ذاتِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی گرفتاری اور مشرکین کے ہاتھوں ظلم رسانی کا حزن و ملال جانکاہی پر آمادہ کئے ہوئے تھا، پس حضور قدسی صفات نے ابو بکرؓ کی اس حالت کا اندازہ لگایا تو لاتخف کی جگہ لاتحزن ارشاد فرمایا اور ساتھ ہی "ان اللہ معنا" فرما کر ابو بکرؓ کی رفاقت کی مقبولیت پر بھی مہر تصدیق ثبت فرما دی، دنیا اپنے بغض و عناد اور زندقہ و الحاد سے جو چاہے کہے لیکن رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور ابو بکرؓ کی "معیتِ حقہ" کے لئے قرآن کے جملہ "اللہ معنا" کی ناطقیت کے بقاء و دوام کو ساری کائنات بھی مل کر مٹانا چاہے تو نہیں مٹا سکتی

ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ

قرآن عزیز اور ہجرتِ مدینہ

واقعہ معراج میں گذر چکا ہے کہ درحقیقت اسراء تمہید تھی ہجرت کے عظیم الشان واقعہ کی یعنی واقعہ اسراء کے عجائبات اس امر کی تمہید تھے کہ اب آپ کی تبلیغی زندگی کا دور ایک دوسرا رخ اختیار کرنے والا ہے جو کامرانیوں اور کامیابیوں سے بھرپور ہے اس لئے ازبس ضروری ہے کہ پہلے آپ کو قبلتین اور ملاء اعلیٰ کے اسرار و غوامض سے آگاہ کر دیا جائے تاکہ مکی زندگی جب مدنی حیات میں منقلب ہو تو اس سے قبل نبوت و رسالت کے کمالات غایتِ قصویٰ تک پہنچ چکے ہوں اور آپ کا منصبِ ہدایت اس مقامِ رفیع تک جا پہنچا ہو جہاں خدا کی بلندی سے بلند ترین مخلوق کا بھی گذر نہ ہوا ہو تاکہ آپ [illegible]

اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا کے شرف کو حاصل کر سکیں۔

پس سورۂ بنی اسرائیل از ابتدا تا انتہا ہجرتِ مدینہ کے ہی اسرار و لطائف سے معمور ہے چنانچہ ابتدائی آیات میں اسراء کا بیان ہے اور پھر ذکر آگیا ہے رشد و ہدایت کے اصول کا اور درمیان میں امم سابقہ اور اُن کے ہادی انبیاء و رسل کے واقعاتِ تبلیغی کا تذکرہ شواہد و نظائر بن کر سامنے آجاتا ہے اور اس ضمن میں معراج کے حکم و اسرار کا بھی ذکر ہو جاتا ہے اور اس کے بعد "رَبِّ اَدْخِلْنِيْ مُدْخَلَ صِدْقٍ الآیۃ" سے مکہ سے خروج اور مدینہ کی ہجرت کا ذکر شروع ہو جاتا ہے اور یہ ذکر آخر سورت تک جاری رہتا ہے چنانچہ حضرت عبداللہ بن عباس (رضی اللہ عنہا) اور حضرت قتادہ (رحمۃ اللہ) نے مسطورۂ ذیل ہر دو آیات کے سلسلۂ مضامین کو ہجرت مدینہ سے ہی وابستہ قرار دیا ہے۔

وَاِنْ كَادُوْا لَيَسْتَفِزُّوْنَكَ مِنَ	اور قریب تھا کہ وہ (مشرکین) البتہ تجھ کو عاجز کر دیتے سرزمین
الْاَرْضِ لِيُخْرِجُوْكَ مِنْهَا وَاِذًا لَّا	(مکہ) سے تاکہ تجھ کو اس سے نکال دیں اور ایسی حالت میں
يَلْبَثُوْنَ خِلَافَكَ اِلَّا قَلِيْلًا (اسریٰ)	ان کی ہلاکت بہت قلیل عرصہ میں سامنے آجاتی

یہ مشرکین کے حق میں سخت قسم کی تہدید و تخویف ہے کہ جب بھی تمہارے مظالم کی بدولت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہجرتِ مدینہ پیش آئے گی تمہاری اجتماعی زندگی کی ہلاکت قریب سے قریب تر ہو جائے گی، گویا ہجرتِ مدینہ، اسلام کی روز افزوں ترقی اور معاندین اسلام کی موت و ہلاکت کے لئے تقدیر مبرم ہے۔

وَقُلْ رَّبِّ اَدْخِلْنِيْ مُدْخَلَ	اور کہئے! اے میرے پروردگار مجھکو داخل کر (مدینہ)
صِدْقٍ وَّاَخْرِجْنِيْ مُخْرَجَ	میں اچھا داخلہ اور نکال مجھ کو (مکہ) سے عزت کے

صِدْقٍ وَّاجْعَل لِّي مِن لَّدُنكَ سُلْطَانًا نَّصِيرًا۔

ساتھ اور میرے لئے اپنی جانب سے زبردست نصرت و مدد عطا کر۔

اسی طرح سورۂ انفال میں بعض واقعات کے ضمن میں ہجرتِ مدینہ کا تذکرہ موجود ہے۔

وَإِذْ يَمْكُرُ بِكَ الَّذِينَ كَفَرُوا لِيُثْبِتُوكَ أَوْ يَقْتُلُوكَ أَوْ يُخْرِجُوكَ وَيَمْكُرُونَ وَيَمْكُرُ اللَّهُ وَاللَّهُ خَيْرُ الْمَاكِرِينَ ۝

اور (وہ وقت قابل ذکر ہے) جب منکرین تیرے خلاف سازش کر رہے تھے تاکہ تجھ کو قید کرلیں یا مار ڈالیں یا (مکہ سے) نکال دیں اور وہ اپنی سازشوں میں لگے ہوئے تھے اور خدا (اس کے خلاف) تدبیر کر چکا تھا اور اللہ تدبیر کرنے والوں میں سب سے بہتر مدبر ہے۔

اور اسی طرح سورۂ توبہ میں صدیق اکبر (رضی اللہ عنہ) کی عظمت و جلالتِ قدر کے تذکرے کے ساتھ ساتھ ہجرتِ مدینہ کا ذکر اس طرح موجود ہے۔

إِلَّا تَنصُرُوهُ فَقَدْ نَصَرَهُ اللَّهُ إِذْ أَخْرَجَهُ الَّذِينَ كَفَرُوا ثَانِيَ اثْنَيْنِ إِذْ هُمَا فِي الْغَارِ إِذْ يَقُولُ لِصَاحِبِهِ لَا تَحْزَنْ إِنَّ اللَّهَ مَعَنَا فَأَنزَلَ اللَّهُ سَكِينَتَهُ عَلَيْهِ وَأَيَّدَهُ بِجُنُودٍ لَّمْ تَرَوْهَا وَجَعَلَ كَلِمَةَ الَّذِينَ كَفَرُوا السُّفْلَىٰ وَكَلِمَةُ اللَّهِ هِيَ الْعُلْيَا وَاللَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ۔

اگر تم اللہ کے رسول کی مدد نہیں کرو گے تو (نہ کرو) اس کی اللہ تعالیٰ نے اس وقت مدد فرمائی جب اس کو منکرین نے (مکہ سے) نکالا جبکہ وہ دونوں (محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ابوبکرؓ) غار میں (چھپے ہوئے) تھے، جب وہ رسول اپنے رفیق (ابوبکرؓ) سے کہہ رہا تھا، تو غم نہ کھا بلاشبہ اللہ ہمارے ساتھ ہے پس اللہ نے اس پر اپنا سکینہ (طمانیت) اتارا اور اس کو ایسے لشکر کے ذریعہ قوت پہنچائی کہ تم اس کو نہیں دیکھ رہے تھے اور (اس طرح) خدا نے کافروں کا کلمہ پست کر دیا اور اللہ کا کلمہ ہی سب سے بلند ہے اور بلاشبہ اللہ غالب ہے حکمت والا ہے۔

ہجرت؟ اسلام میں "ہجرت" ایک اہم فریضہ ہے، کون نہیں جانتا کہ انسان کے لئے وطن مال اور اہل وعیال کس درجہ عزیز ہوتے ہیں اور وہ ان ہی متاعِ گرانبہا اپنی دنیوی عیش وراحت اور بقاءِ حیات کا مدار سمجھتا ہے لیکن اس کی انانیت اور انسانیت کا ارتقاء ان تمام مقاصدِ حیات سے بھی ایک بلند اور رفیع مقصدِ زندگی کا طالب ہے اور وہ خالقِ کائنات اور رب العالمین کی معرفت ہے جس کی ربوبیت نے اس کو یہ جامۂ ہستی عطا کیا، اسی معرفت کا نام "دین" اور "ملت" ہے۔ انسان جب اس مقصدِ حقیقی کو پالیتا ہے تو پھر اس کی نگاہ میں اس درجہ وسعت اور رفعت پیدا ہو جاتی ہے کہ دنیا کی ان تمام رنگینیوں اور نیرنگیوں کا دامنِ وسیع بھی اُس کو تنگ نظر آتا اور وہ اس تنگ دامنی سے عاجز ہو کر آخر کار "حیاتِ روحانی" کی آغوش میں ہی تسکین پاتا ہے اور جب اس مرحلہ پر پہنچ جاتا ہے تو پھر اس حیاتِ باقی "دینِ حق" کی خاطر وہ دنیا کی تمام متاعِ گرانمایہ تن، من، دھن، حتیٰ کہ اہل وعیال کو بھی تج دیتا ہے اور اُس دُرِ بے بہا کو آنچ تک نہیں آنے دیتا جس کا نام "ایمان" ہے۔ اسی حقیقتِ حال کو اسلام کی مقدس اصطلاح میں "ہجرت" کہا جاتا ہے۔

اسی بنا پر "ہجرت" ایک صادق الایمان اور مخلص مسلمان کے اور منافق اور کافر ہستی کے درمیان امتیاز پیدا کرنے کے لئے بہترین "کسوٹی" اور "معیار" ہے نیز فضاءِ روحانی کا مہر بچر معلوم کرنے کے لئے "جہاد" اور "ہجرت" ہی ایسے دو مقیاس الحرارت ہیں جن سے مومنوں کے ایمان کی حرارت کا صحیح اندازہ ہو جاتا ہے۔

قرآنِ عزیز نے "ہجرت" کی اہمیت پر جگہ جگہ توجہ دلائی ہے اور اس کو ایمان و اسلام کی کسوٹی قرار دیا ہے جس کے لئے یہ مقامات خصوصیت کے ساتھ قابلِ مطالعہ ہیں۔

($\frac{۲۱۸}{۲}$، $\frac{۱۹۴}{۳}$، $\frac{۷۲}{۸}$، $\frac{۳۰}{۹}$، $\frac{۱۱۱}{۱۶}$، $\frac{۵۸}{۲۲}$، $\frac{۱۰۰}{۴}$، $\frac{۴۱}{۱۶}$، $\frac{۹۷}{۴}$)

ابتداءِ اسلام میں مکہ دار الکفر اور دار الحرب تھا، اس لئے وہاں سے مدینہ کو ہجرت کر جانا اسلام کے اہم ترین فرائض میں سے تھا تاکہ مسلمان مدینہ میں امن و عافیت کے ساتھ احکامِ اسلام کی پیروی کر سکیں اور نہ صرف اسی قدر بلکہ اسلام کے مقصدِ عظمیٰ "امر بالمعروف اور نہی عن المنکر" کی یا دوسرے الفاظ میں "اعلاءِ کلمۃ اللہ" کی صحیح خدمت انجام دے سکیں مگر جب ۸ھ ہجری میں "فتح مبین" نے مکہ کی اس حالت کو بدل کر "دار الاسلام" بنا دیا تو اب ہجرت کا یہ خاص فرض ختم ہو گیا اور زبانِ وحی ترجمان نے "لا ھجرۃ بعد الفتح" فرما کر اس حقیقت کا اعلان کر دیا، البتہ اب بھی مرکزِ توحید کے ساتھ والہانہ عشق و محبت کے جذبہ میں مکہ اور مدینہ ہجرت کر کے جانا اجر و ثواب کا ضرور استحقاق پیدا کرتا ہے۔

اور اگر کسی مقام اور کسی ملک میں بھی مسلمانوں کے لئے حیاتِ ایمانی کے پیشِ نظر وہی صورتِ حال پیدا ہو جائے جو اسلام کے ابتدائی دور (مکی دور) میں تھی تو اس وقت مسلمانوں کے لئے وہی احکام عائد ہو جائیں گے جو "مکی دور" کے متعلق قرآن و حدیث اور اُن سے مستنبط "فقہ اسلامی" میں پائے جاتے ہیں اور اصولی طور پر اس وقت صرف دو ہی اسلامی مطالبے سامنے آجائیں گے یا "جہاد فی سبیل اللہ" کے ذریعہ اس حالت کا "انقلاب" اور یا پھر "ہجرت" اور کسی طرح بھی یہ جائز نہیں ہوگا کہ حالتِ راہنہ (موجودہ حالت) پر قناعت کر کے مطمئن زندگی بسر کی جائے۔

مکہ جب دار الکفر اور دار الحرب تھا تو اُس وقت ہجرتِ مدینہ کو اسلام نے کس درجہ اہمیت دی اور اس مقصدِ رفیع کے لئے مسلمانوں سے کس درجہ قربانی اور ایثارِ نفس کا مطالبہ کیا۔ آیاتِ ذیل سے اس حقیقت کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے۔

---

[۱] فتح مکہ کے بعد مدینہ کی ہجرت فرض نہیں رہی۔ [۲] البتہ جہاد فی سبیل اللہ کے طرق و اسباب پر وقت کے تقاضے کے پیشِ نظر ہی عمل واجب ہوگا۔

فَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا وَاُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَاُوْذُوْا فِيْ سَبِيْلِيْ وَقٰتَلُوْا وَقُتِلُوْا لَاُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَلَاُدْخِلَنَّهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ثَوَابًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الثَّوَابِ (آل عمران)

جن لوگوں نے ہجرت کی اور جو اپنے گھروں سے نکالے گئے اور میری راہ میں ستائے گئے اور میری راہ میں لڑے اور مارے گئے میں ضرور اُن کے گناہ اُن سے دور کر دوں گا اور ان کو ایسی جنتوں میں داخل کروں گا جن کے (درختوں کے) نیچے نہریں جاری ہیں، یہ بدلہ ہے اللہ کی طرف سے اور اللہ کے پاس اچھا بدلہ ہے۔

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ اَعْظَمُ دَرَجَةً عِنْدَ اللّٰهِ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ (انفال)

جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں اپنے مالوں اور اپنی جانوں سے جہاد کیا اللہ کے نزدیک بہت بلند رتبہ والے ہیں اور وہی کامیاب ہیں۔

اِنَّ الَّذِيْنَ تَوَفّٰهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ظَالِمِيْٓ اَنْفُسِهِمْ قَالُوْا فِيْمَ كُنْتُمْ قَالُوْا كُنَّا مُسْتَضْعَفِيْنَ فِي الْاَرْضِ قَالُوْٓا اَلَمْ تَكُنْ اَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوْا فِيْهَا فَاُولٰٓئِكَ مَاْوٰهُمْ جَهَنَّمُ وَسَآءَتْ مَصِيْرًا اِلَّا الْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ

بیشک جن کو فرشتوں نے ایسی حالت میں موت سے دوچار کیا کہ وہ اپنی جانوں پر ظلم کر رہے تھے اُن سے (فرشتوں نے) پوچھا کہ تم کس حالت میں تھے انھوں نے جواب دیا کہ ہم زمین میں کمزور تھے۔ فرشتوں نے کہا کیا اللہ کی زمین وسیع نہیں تھی کہ تم اس میں ہجرت کر جاتے سو یہی ہیں جن کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ بہت بری جگہ ہے مگر وہ کمزور مرد اور عورتیں اور بچے جو ہجرت کے لئے کوئی حیلہ نہیں

حِيْلَةً وَّلَا يَهْتَدُوْنَ سَبِيْلًا ۝ کر سکتے اور نہ (ہجرت کے لئے) راہ پاسکتے ہیں تو یہ

فَاُولٰٓئِكَ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّعْفُوَ وہ ہیں کہ امید ہے اللہ تعالیٰ اُن کو معاف کردے

عَنْهُمْ وَكَانَ اللّٰهُ عَفُوًّا غَفُوْرًا ۝ اور اللہ ہے شیوہ معاف کرنے والا بخشنے والا ہے۔

ختم نبوت | نبوت و رسالت کا یہ سلسلہ جو حضرت آدم (علیہ السلام) سے شروع ہو کر حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) تک پہنچا تھا رشد و ہدایت کے اسلوب و نہج کے لحاظ سے اس معنی میں یکسانیت رکھتا ہے کہ اس تمام سلسلہ میں نبوت و رسالت جغرافیائی حدود میں محدود رہی ہے اور اسی لئے مختلف زبانوں میں ایک ہی وقت میں متعدد انبیاء علیہم السلام کی بعثت فرائضِ رسالت ادا کرتی رہی ہے حتیٰ کہ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کے پیغام حق نے اگرچہ گونہ وسعت اختیار کی اور بنی اسرائیل کی گم کردہ راہ بھیڑوں کے علاوہ بھی بعض حلقۂ انسانی اس دعوت کی مخاطب بنی، تاہم انھوں نے عالمگیر دعوت و پیغام کا دعویٰ نہیں کیا اور انجیل شاہد ہے کہ خود ذات قدسی نے بصراحت کہدیا کہ ان کی بعثت کا تخاطب محدود ہے۔

لیکن یہ سلسلہ آخر کب تک اسی طرح محدود رہ سکتا تھا اور جو حلقۂ دعوت و ارشاد آہستہ آہستہ ترقی پذیر اور وسعت گیر ہوتا جا رہا تھا وہ قانونِ قدرت کے عام اصول کے خلاف کس طرح ہمیشہ کے لئے محصور رہ سکتا تھا۔

البتہ انتظار تھا تو اس کا کہ وہ وقت قریب آجائے جبکہ دنیا کی وسیع پہنائیوں اور عالمگیر وسعتوں کے درمیان ایسی ہم آہنگی پیدا ہو جائے کہ نہ ایک کے مفاد و مضار دوسرے حصوں سے اوجھل ہو سکیں اور نہ بیگانہ و بے تعلق رہ سکیں بلکہ خدا کی یہ وسیع کائنات مادی اسباب کی ہمہ گیری کی بدولت ایک "کنبہ" بن جائے اور انسانِ کبیر (عالم) کے تمام جوارح (ممالک و امصار) ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح وابستہ ہو جائیں کہ ایک کا

نفع وضرر دوسروں کے نفع وضرر پر اثر انداز ہونے لگے۔ بلکہ قانونِ فطرت اپنا مظاہرہ کرے اور مادی دنیا کی ہمہ گیر ہم آہنگی کے رونما ہونے سے قبل روحانی پیغام سعادت کو عالم گیر وسعت اور ہمہ گیر عظمت عطا فرمائے۔ چنانچہ عالم اسباب میں فطرت کے عام قانون کی طرح رشد و ہدایت کا جو آغاز پہلے انسان کے ذریعہ ہوا تھا اُس کا انجام اُس مقدس ہستی تک پہنچ کر کامل و مکمل ہو گیا جس کا نام محمد اور احمد ہے (صلی اللہ علیہ وسلم) اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا"

مسئلہ کے اس پہلو کی تعبیر یوں بھی کی جا سکتی ہے کہ اس عالم رنگ و بو میں دو زندگیاں توام اور ہم رشتہ نظر آتی ہیں، ایک مادی اور دوسری روحانی اور خدائے برتر کی ربوبیت کاملہ نے عالم کی اِن ہر دو حیات کی رہ گذر کے لئے روشنی کا بھی انتظام کیا ہے تاکہ ان پر عمل پیرا ہو کر زندگی کی ٹھوکروں، لغزشوں اور تاریک راہوں سے محفوظ رہا جا سکے، چنانچہ اسی مقصد کے لئے اس نے مادی دنیا کے لئے آگ کا درخت لگایا" اَفَرَاَيْتُمُ النَّارَ الَّتِيْ تُوْرُوْنَ ءَاَنْتُمْ اَنْشَاْتُمْ شَجَرَتَهَا اَمْ نَحْنُ الْمُنْشِئُوْنَ ۔ چقماق میں آگ پیدا کی اور تیل کو ذریعہ بنا کر دیئے کو روشنی بخشی۔ يَكَادُ زَيْتُهَا يُضِيْٓءُ وَلَوْ لَمْ تَمْسَسْهُ نَارٌ" اس روشنی کو آغاز بھی بخشا اور انجام بھی اور فطری اور مصنوعی دونوں طریقوں سے اس کی ابتدا کو انتہا تک پہنچا کر کامل و مکمل کر دیا کہ اس کے بعد نہ روشنی کی طلب باقی رہے نہ انتظار۔

غرض جو روشنی صنعت کے ہاتھوں دیئے کی شکل میں نمودپذیر ہوئی اور شمع کافوری لالٹین، روشن گیس اور بجلی کے قمقموں کی شکل میں ترقی کرتی رہی اور جو روشنی براہِ راست فطرت کے ہاتھوں چھوٹے سے ستارہ کی صورت میں چمکی اور بڑے بڑے روشن ستاروں اور بدر و قمر کی شکل میں روبہ ترقی نظر آتی رہی، وہ آخرکار ایک ایسی روشنی پر جا کر رک گئی جس کے بعد

کسی روشنی کی ضرورت ہی باقی نہ رہی اور طلب و انتظار کی تمام فرصتیں اس روشنی پر جا کر ختم ہو گئیں، دنیا نے جس کو آفتاب کہہ کر پکارا۔

اسی طرح اس کی رحمتِ عام اور ربوبیتِ کامل نے روحانی روشنی کا آغاز پہلے انسان حضرت آدم (علیہ السلام) کے ذریعہ کیا اور مادی دنیا کی وسعتوں کے ساتھ ساتھ اس کو نوح، ہود، صالح، ابراہیم، اسمٰعیل، اسحٰق، موسیٰ، عیسیٰ (علیہم السلام) جیسے نبیوں اور رسولوں کے ذریعہ روحانی ستارے اور قمر و بدر بنا کر وسعت عطا فرمائی اور آہستہ آہستہ ترقی دے کر اُس درجہ پر پہنچا دیا کہ مناسب وقت آنے پر وہ روشنی محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پیغامِ رشد و ہدایت کی شکل میں آفتابِ روحانیت بن کر سارے عالم پر چھا گئی۔

یہی وجہ ہے کہ اگر قرآن عزیز نے سورۂ فرقان میں مادی آفتاب کے لئے "سراج" کی تشبیہ دے کر اس کی عالمگیر درخشانی کا ذکر فرمایا تو سورۂ احزاب میں روحانی آفتاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو "سراجاً منیراً" کہہ کر دونوں آفتاب ہائے درخشاں کی ہم آہنگی کا اعلان فرمایا اور مادی و روحانی ہر دو آفتاب عالمتاب کو سراج (چراغ) سے تشبیہ دے کر ساتھ ہی اس حقیقت کو بھی واضح کر دیا کہ گو یہ روشنیاں اپنی ہمہ گیر وسعت کے لحاظ سے آفتاب کہلانے کی مستحق ہیں تاہم یہ بات کسی طرح فراموش نہیں ہونی چاہئے کہ یہ انجام اصل کے اعتبار سے اسی آغاز کا کامل و مکمل نمونہ ہے جس کی ابتدائی نمود روحانی اور مادی دیئے (سراج) سے ہوئی اور روحانی وسعت و عظمت کے لحاظ سے بعض کو بعض پر اور ایک کو سب پر فضیلت و برتری حاصل ہوئی مگر اصل اور بنیاد کے پیشِ نظر سب کی بنا ایک ہی روشنی "وحی الٰہی" سے وابستہ و پیوستہ ہے۔

الانبیاء اخوۃ من علات امہاتہم شتی ودینہم واحد۔

ان ہر دو حقائق کے پیشِ نظر لانے کے بعد یہ حقیقت بھی لائقِ توجہ ہے کہ فطرت ہم کو روز و شب یہ تماشا دکھلا رہی ہے کہ اس کارزارِ حیات میں جو کچھ بھی ہو رہا ہے وہ زیر و بم، نشیب و فراز، عروج و زوال اور زوال و کمال کے دائرہ میں محدود و محصور ہے یعنی جب کسی امر کے متعلق کہا جائے کہ یہ عروج و کمال کو پہنچ رہا ہے تو اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اب سے قبل اس میں جو کمی تھی وہ پوری ہو رہی ہے اور اسی طرح جب یہ سُنا جاتا ہے کہ فلاں شے ابھی ابتدائی درجہ میں ہے تو اس سے یہ مراد ہوتی ہے کہ اس کو ابھی بہ حدِ کمال پہنچنا ہے۔

غرض آغاز اور انجام، ابتدا اور انتہا ان ہی دو نقطوں سے کارزارِ ہستی کا دائرہ بنتا ہے اور یہی دونوں، زوال و عروج۔ نقص و کمال اور نشیب و فراز کی پرکار بناتے ہیں۔ پس آدم علیہ السلام نبوت کا آغاز تھے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس کا آخری انجام۔

پس جو شخص بھی دلیل یا وجدان کی ہدایت سے یہ تسلیم کرتا ہے کہ کائناتِ ہست و بود سب کچھ اسی کی مخلوق ہے تو گویا وہ یہ تسلیم کر لیتا ہے کہ یہ سب نہ ازلی ہیں نہ ابدی بلکہ اُن کیلئے آغاز بھی ہے اور انجام بھی اور اس نئے انسانی تخلیق نے کوئی بھی روپ اختیار کیا ہو بہرحال پہلا انسان اپنے ساتھ ہی مادی و روحانی ہدایت لے کر آیا ہے اور یہی وہ آغاز تھا جس کو ادیانِ سماوی نے نبوتِ آدم کے نام سے یاد کیا ہے اور جس کا سلسلہ برابر اس دنیا میں قائم رہا تا آنکہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا ظہور ہوا اور ذاتِ قدسی صفات نے بعثتِ عام کا اعلان فرمایا تو اب اس روحانی رشد و ہدایت یا پیغامِ الٰہی کے نشو و ارتقاء کیلئے اگر ذاتِ اقدس محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ختمِ نبوت کو وابستہ نہ سمجھا جائے تب تین صورتوں میں سے کوئی ایک صورت ہی وقوع پذیر تسلیم کی جا سکتی ہے۔ ایک یہ کہ سلسلۂ نبوت و رسالت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم نہیں ہوا بلکہ اس سے آگے ترقی و تکمیل کی راہ پر

گامزن ہے تا آنکہ اس حدِ کمال تک پہنچ جائے جس کے بعد کسی تکمیل کی حاجت باقی نہ رہے دوسری صورت یہ کہ اس سلسلہ کے آغاز نے جو ترقی کی راہ اختیار کی ہے وہ تنزل کی جانب مائل ہو جائے اور یہ پیغام کسی طرح بھی شرمندۂ تکمیل نہ ہو سکے۔ تیسری شکل یہ ہے کہ جو سلسلہ ایک خاص حیثیت میں رو بہ ترقی ہے وہ جب حدِ تکمیل کو پہنچ جائے تو پھر کمال صورتِ زوال اختیار کر لے یا یوں کہہ دیجئے کہ حدِ کمال آغاز کی جانب لوٹ جائے اور تحصیلِ حاصل کا نمونہ پیش کر دے۔

لیکن آخری دو شکلیں غیر معقول بلکہ فطری تقاضا کے خلاف ہیں، پہلی صورت تو اس لئے کہ اس سے خدائے تعالیٰ کی ربوبیت کاملہ اور صفتِ رحمت و قدرت کا نقص لازم آتا ہے کہ جس مقصد سے اُس نے ایک آغاز کیا تھا اسی مرضی و مشیت کے باوجود اس کو درجۂ تکمیل نہ دے سکا۔ تعالی اللہ علواً کبیراً۔

اور اگر اس کو تسلیم کر لیا جائے تو گویا یہ مان لینا ہوگا کہ کائناتِ ہست و بود میں نقص، نشیب، زوال، اور ابتذال کے علاوہ کمال، فراز، عروج اور انتہا کا وجود ہی نہیں ہے گویا دوکانِ فطرت میں عیب کے سوا ہنر کا کوئی سودا موجود ہی نہیں، اسی طرح دوسری شکل اسلئے کہ جب کہ تکمیل ایسی حقیقت کا نام ہے جس کے بعد اس سلسلہ کی ضرورت باقی رہے نہ طلب تو پھر رشد و ہدایت اور پیغامِ حق جیسی روشن شے کے پایۂ تکمیل تک پہنچ جانے کے بعد اس کو ابتداء سے پھر دہرانا بے معنی بات ہے۔ اور تحصیلِ حاصل نہ عقل کا کام ہے نہ حکمت و دانائی کا۔ چہ جائے کہ ایسے فعل کی نسبت اس ذات کی جانب ہو جس کے لئے کہا گیا ہے اِنَّ رَبَّكَ عَلِيمٌ حَكِيمٌ

پس اگر موخرالذکر دونوں صورتیں غیر معقول اور ناقابلِ توجہ ہیں تو اب پہلی شکل ہی

لاینحل ضرور رہ جاتی ہے مگر جب اس کی تحلیل کی جائے تو یہ سوال خود بخود سامنے آجاتا ہے کہ جب کہ تاریخِ ادیان وملل نے بلکہ واقعات وحقائق نے یہ ثابت کر دیا اور روشن دلائل وبراہین سے ثابت کر دیا کہ قرآنِ عزیز ایک ایسا روحانی قانون، دستور، آئین اور پیغام رشد وہدایت ہے جس کی نظیر پیش کرنے سے تمام سابق ادیان اور موجودہ مدعیانِ وحی والہام عاجز ودرماندہ رہے ہیں اور رہیں تو پھر علم وعقل اور حکمت ودانش کا وہ کون سا تقاضا ہے جس کے پیش نظر اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ کا انکار کیا جا سکے اور جو تکمیل کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ ہو چکی اُس کو جھٹلا کر اور تاریخِ ادیان کی صاف اور صادق شہادت کا منکر بن کر اس سلسلہ کی آخری کڑی "نبی منتظر" کے لئے چشم براہ ہوا جا سکے۔

یہی وہ حقیقت ہے جس کو قرآنِ عزیز نے "وَلٰکِنْ رَّسُوْلَ اللّٰہِ وَخَاتَمَ النَّبِیّٖنَ" کہہ کر روشن کیا ہے اور جس کی شہادت خود ذاتِ قدسی صفات نے یہ کہہ کر دی ہے۔

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم	میری اور دوسرے انبیاء علیہم السلام کی مثال اس شخص
مثلی ومثل النبیین کمثل رجل بنی دارًا	کی طرح ہے جس نے مکان بنایا اور اس کو مکمل کر لیا مگر
فاتمھا الا لبنۃ واحدۃ فجئت انا	ایک اینٹ کی جگہ چھوڑ دی پس میں قصرِ نبوت کی
فاتممت تلک اللبنۃ۔ (مسلم)	وہی اینٹ ہوں جس نے آکر اس قصر کی تکمیل کر دی۔

آپ کہہ سکتے ہیں کہ اس بات کو مان لینے میں کیا حرج ہے کہ قصرِ نبوت کی تکمیل آپ ہی کی ذات سے ہوئی لیکن پھر آپ کے کمالِ نبوت کے مختلف اطوار واحوال میں سے یہ امتیازی شان بھی منصۂ شہود پر آئی کہ جو شخص بھی جدید نبی یا رسول بنے اس کا انتساب آپ ہی کے فیضِ نبوت کے ساتھ وابستہ ہو یعنی آئندہ بھی نبی اور رسول آتے رہیں مگر وہ مستقل نہ ہوں بلکہ آپ کے ماتحت اور قرآن ہی کے زیرِ نگیں ہوں لیکن یہ کہنا اس لئے صحیح نہیں ہے کہ جو بات

کہی گئی اس کو خواہ کسی خوبصورت سے خوبصورت عنوان سے کہئے سب کا حاصل یہی نکلتا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت و رسالت کے بعد نبی اور رسول کی احتیاج باقی ہے اور اس کے بغیر وحیِ الٰہی اور پیغامِ ربانی تشنۂ تکمیل ہے ورنہ تو تکمیلِ نبوت کے بعد نبی اور رسول کی جگہ خاتم النبیین کے صرف نائب اور جانشین ہونے چاہئیں تاکہ اُن کے ذریعہ پیغام کامل اور ہدایت تام کی یاددہانی ہوتی رہے اور یہی وہ نیابت و وراثت ہے جس کا حق خدمت علماء امت "علماء امتی کانبیاء بنی اسرائیل" اور "العلماء ورثۃ الانبیاء" کے مصداق بن کر ادا کرتے چلے آئے ہیں اور تاقیامِ حشر کرتے رہیں گے۔

اس اہم مسئلہ کی وضاحت یوں بھی کی جاسکتی ہے کہ کتابِ کائنات کے وہ صفحات جن پر مذاہب و ملل کی تاریخ ثبت ہے شاہد ہیں کہ اقطاعِ عالم کے درمیان رسل و رسائل اور دیگر وسائل کے مفقود ہونے کی وجہ سے جبکہ فطرت نے رشد و ہدایت کے پیغام کو عرصۂ مدید تک جغرافیائی حدود میں محدود رکھا اور اس لئے ایک ہی دور میں متعدد مقامات پر متعدد انبیاء و رسل کا ظہور ہوتا رہا اور پھر جب کائنات پر وہ زمانہ پرتو ڈالنے لگا جس کے قریبی عرصہ میں ساری کائنات کے باہم روابط نے ہم آہنگی اور تعارف کی بنیاد ڈالدی اور فطری تقاضا کی بنا پر روحانی پیغام نے بھی بعثتِ خاص کی بجائے بعثتِ عام کی شکل اختیار کرلی اور ایک ایسا پیغام آگیا جو تمام عالم کے لئے یکساں طور پر بیک وقت رشد و ہدایت کا آفتاب بن کر درخشاں ہے تو اس کے بعد یا تو یہ ہونا چاہیئے کہ وہی پیغام رہتی دنیا تک کے لئے رشد و ہدایت کا پیغام بنے اور جس پیغمبر کی معرفت وہ پیغام آیا ہے اس کی ذاتِ اقدس کو اس پیغام کا مکمل و متمم مان کر خاتم الانبیاء والرسل تسلیم کیا جائے، ورنہ غور کیا جائے کہ محدود پیغام و دعوتِ حق کے بعد جب بعثتِ عامہ نے ساری کائنات کی راہنمائی کا فرض انجام دیدیا

تو اس کے بعد ضرورت وطلب کا کونسا عنوان باقی رہا جس کی تکمیل کے لئے اس سلسلہ کو پھر بھی جاری رکھا جائے اور یا بعثت خاص کو دہرایا جائے جس کا حاصل عروج سے انحطاط کی شکل میں ظاہر ہو اور یا بعثت عام کی تحصیل حاصل کی غیر معقولیت عقلیت کی شکل اختیار کرے اور آیت "وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ" کی بشارت کو بے حقیقت بنا دیا جائے۔

ذاتِ اقدس محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثتِ عام کے بعد نبی حیثیت سے اس سلسلہ کا اجرا تحصیل حاصل اور غیر معقول اس لئے ہے کہ فطرت کے مادی اور روحانی تقاضا کے خلاف اگر قدرتِ حق کو یہ منظور تھا کہ پیغام و دعوت اور نظامِ رشد و ہدایت تدریجی طور پر ترقی پذیر نہ ہو اور مادی دنیا کے محدود حالات سے بے نیاز ہو کر انجام پائے تو بلاشبہ آغاز ہی میں وحی الٰہی "بعثتِ عام" کی شکل اختیار کرتی اور پھر منتہی دنیا تک وہی بروئے کار ہوتی اور یا اس کا سلسلہ کسی تکمیل کا محتاج نہ ہو کر منتہی دنیا تک تجدید کی شکل میں جاری رہتا۔

مگر واقعات اور مشاہدات اس کے خلاف ہیں اور اول محدود پیغامات کا سلسلہ اور ان کے درمیان ترقی پذیر وسعت کا دائرہ اور پھر دعوتِ عام کی شکل میں اس ترقی کی انتہا یہ پوری تدریجی کیفیت صاف بتا رہی ہے کہ فطرتِ الٰہی نے فیصلہ کر لیا ہے کہ دوسرے امور کی طرح رشد و ہدایتِ الٰہی یہ پیغام بھی آغاز کی نمود کے ساتھ آہستہ آہستہ ترقی پذیر اور وسعت گیر ہوتا رہے تا آنکہ وہ وقت آجائے کہ یہ وسعت عالمگیر دعوت بن کر پایۂ تکمیل کو پہنچ جائے اور یہ سلسلہ اس حد پر پہنچ کر ختم ہو جائے اور آئندہ نبی و رسول کی جگہ نائبین رسول "علماء" تا قیامِ ساعت اس مکمل قانونِ دعوت کی روشنی میں تبلیغ حق کا فرض انجام دیتے رہیں تاکہ ایک جانب "وحدتِ امت" کا وہ نظام جو بعثتِ عام اور دعوتِ عام سے وابستہ ہو چکا ہے پارہ پارہ نہ ہو سکے اور دوسری جانب حیاتِ عالم کے ساتھ ساتھ اس پیغامِ حق کا

فرض بھی مسلسل ادا ہوتا رہے اور اس طرح خدائے برتر کا یہ اعلان "تَبَارَكَ الَّذِي نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلَىٰ عَبْدِهِ لِيَكُونَ لِلْعَالَمِينَ نَذِيرًا" جدید نبی منتظر اور رسولِ مطلوب کے نظریہ کی شکل میں بے روح ہو کر نہ رہ جائے۔

سطورِ بالا میں انبیاء علیہم السلام کے پیغامِ حق کی وحدت کا تذکرہ آچکا ہے مسئلہ ختم نبوت کے ساتھ اس کا بہت گہرا تعلق ہے اور اس سلسلہ کی دلیل روشن کیلئے تمہید و توطیہ بننے کی حیثیت رکھتا ہے۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ جب ہم اس خاکدانِ ہستی پر نظر ڈالتے ہیں تو یہ حقیقت ہر جگہ نمایاں نظر آتی ہے کہ ہر کثرت کے لئے کوئی نقطۂ وحدت ضرور ہے چنانچہ افراد کے لئے نوع، انواع کے لئے جنس، اجناس کے لئے جوہر، جواہر کے لئے وجود اور وجودات کے لئے وجودِ بحت (خالص) محور و مرکز ہے۔ اسی طرح اجسام کے لئے سطح، سطحات کے لئے خط اور خطوط کیلئے نقطہ مرکز و مدار ہے، نیز اعداد خواہ اپنی کثرت میں کسی حد تک کیوں نہ پہنچ جائیں اُن کا محور و مرکز ہر حالت میں "اکائی" ہے۔

غرض جب بھی کسی کثرت کا تصور کیجئے اُس کے ساتھ وحدت کا تصور لازم و ضروری ہے اور اگر وحدت کو پیشِ نظر لیجئے تو وہ کسی نہ کسی کثرت کے لئے محور و مرکز ہونے کا ضرور پتہ دیتی ہے پس وحدت و کثرت کا یہی رابطہ ہے جس نے حدودِ عدم سے گذر کر ہست کے ساتھ تعلق پیدا کیا اور اس کو عالمِ ہست و بود کا نام دیا۔

تو اس حقیقت کو پیشِ نظر لا کر جب ہم سلسلۂ نبوت و رسالت پر نظر ڈالتے ہیں اور سبع سماوات کی طرح سطحِ عالم پر مختلف ادوار میں ہزاروں سیارگانِ رشد و ہدایت کو ضوفشاں پاتے ہیں تب سطورِ بالا حقیقت کی بنیاد پر فطرت تقاضا کرتی ہے کہ اس کثرت کا بھی کوئی

نقطۂ وحدت ضرور ہونا چاہیے جو کثرت کے لیے محور و مرکز بن سکے اور جس طرح "اکائی" کے بعد کثرت کے لیے کوئی اور مبدء و منتہا نہیں ہو اسی طرح انبیاء و رسل کے سلسلہ کثرت کے لیے بھی ایک ہی مبدء و منتہا ہونا از بس ضروری ہے۔

یہی وہ حقیقت ہے جو "ختم نبوت" کے نام سے موسوم ہے اور اسی کو قرآن حکیم نے اس جوہر حکمت کے ساتھ ادا کیا ہے "مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَاۤ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ۔ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) مردوں میں سے کسی کے صلبی باپ نہیں ہیں تاہم وہ خدا کے پیغمبر اور آخر الانبیاء ہیں"

نبوت "نبأ" سے ماخوذ ہے جس کے معنی "خبر دینا" ہے اور رسالت کے معنی "پیغام" ہیں اور اسلام کی اصطلاح میں نبوت و رسالت خدا کی جانب سے ایک منصب ہے جو مخلوق کی رشد و ہدایت کے لیے کسی مخصوص انسان کو عطا ہوتا ہے اور اس کے لائے ہوئے پیغام کو "وحی" کہتے ہیں۔ کیونکہ یہ پیغام درحقیقت پیغامبر کا اپنا کلام نہیں ہوتا۔ بلکہ خدائے برتر کا فرمان ہوتا ہے جس میں خطاء و قصور یا سہو و نسیان کی مطلق گنجائش نہیں ہوتی

لَا يَاْتِيْهِ الْبَاطِلُ مِنْۢ بَيْنِ	اس (وحی الٰہی) کے سامنے سے اور نہ اس
يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ	کے پیچھے سے باطل کا گذر بھی نہیں ہوتا۔
تَنْزِيْلٌ مِّنْ حَكِيْمٍ حَمِيْدٍ	یہ تو اتارنا ہے حکمت والے ہر طرح قابل ستائش
(حم سجدہ)	والے کی جانب سے (یعنی خدا کی جانب سے)

گویا اس کا مطلب یہ ہوا کہ جب خدائے برحق کسی شخصیت کو نبوت و رسالت یعنی پیغام حق سے سرفراز کر دیتا ہے تو تمام انسانوں کا فرض ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے خالق و مالک خدا کے فرمان "وحی الٰہی" کے سامنے بے چون و چرا سر تسلیم خم کر دیں، وہ شخصیت کی صداقت اور خدا کی جانب سے

اس کے دعویٰ وحی کی حقانیت کا تو ہر حیثیت سے حق رکھتے ہیں لیکن اگر اس کے دونوں دعوؤں کی تصدیق و تائید عقل کی راہ سے دلائل و براہین کے ساتھ ہو جائے اور کسوٹی پر اُس کی صداقت بے لوث اور صاف روشن ہو جائے تب اس کے دیے ہوئے پیغامِ خدا کو ماننے نہ ماننے میں وہ آزاد نہیں رہ سکتے اور بلا شبہ اس کے پیغام کو پیغامِ حق سمجھ کر قبول کر لینا اور اس کے سامنے سرِ نیاز جھکا دینا فرض اولین ہے۔ ہاں چونکہ وہ پیغام کسی بڑے سے بڑے عاقل و فرزانہ انسان کا "پیغام نہیں بلکہ "پیغام الٰہی" ہے اس لیے وہ خود یہ ضروری سمجھتا ہے کہ جو کچھ کہے عقل کی کنج وکاؤ سے خواہ کتنا ہی بالاتر ہو لیکن عقل کی نگاہ میں اور دلائل و براہین کی ترازو میں ناممکن اور محال نہ ہو کیونکہ فطرت اور عقل کے درمیان بیر نہیں ہے بلکہ عقل، فطرت کے قوانین کے سمجھنے اور سمجھ کر قبول کرنے کے لیے بہترین ذریعہ اور آلہ ہے اور وحی الٰہی درحقیقت فطرت کے روحانی قوانین کی ترجمان ہے۔

بہرحال کسی نبی یا رسول کے مبعوث ہونے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ خدا کی مخلوق "جن و بشر" اپنی روحانی سعادت اور اخلاق و کردار کی بلندی کے لیے اپنے عقل و دماغ کے اختراع کی بجائے پیغامِ حق کو راہنما بنائے تاکہ ذی عقل کائناتِ الٰہی اس راہ میں رقیبانہ تضاد و تصادم سے بے نیاز ہو کر انسانوں کے نہیں بلکہ انسانوں کے پیدا کرنے والے خدا کے قوانین پر عمل پیرا ہو کر اجتماعی وحدت، عالمگیر اخوت و مساوات کی قدروں کو حاصل کر سکیں اور ایک دوسرے کا حاکم و محکوم اور آقا و غلام بننے کے بجائے سب ہی یکساں طور پر صرف اپنے پیدا کرنے والے ہی کے محکوم و غلام بن جائیں۔

دوسری جانب اس خاکدانِ عالم کا یہ حال ہے کہ اُس کی ہر ایک شے نشو و ارتقاء کے قانونِ قدرت میں جکڑی ہوئی نظر آتی ہے جس کا تقاضا یہ ہے کہ اگر مادی اور روحانی قوانین

ونواہیس کی خالق ایک ہی ذات ہے تو بلاشبہ دونوں کے نوامیس وقوانین میں ہم آہنگی اور وحدت کارفرما نظر آنی چاہیے ورنہ العیاذ باللہ وحدت واکائی کی جگہ دوئی کو محور و مرکز ماننا پڑیگا جو نقلاً ناممکن اور عقلاً محال ہے۔

تب ازبس ضروری ہے کہ رشد و ہدایت کے اس منصب "نبوت و رسالت" کا سلسلہ بھی قانونِ ارتقا سے اسی طرح جکڑا ہوا ہونا چاہیے جس طرح مادیات کا اور اس لیے تسلیم کرنا ہوگا کہ رشد و ہدایت کا یہ سلسلہ ارتقائی بنیادوں پر اس طرح ترقی پذیر ہو کہ کائناتِ انسانی اپنے بقار وجود تک کسی وقت بھی اس راہ میں نشو وارتقار سے محروم نہ رہے۔

اس حقیقت کے واضح ہو جانے کے بعد اب رشد و ہدایت کے اس نظام کو جو منصبِ نبوت و رسالت کے نام سے معنون ہے یوں سمجھنا چاہیے کہ قانونِ قدرت نے ایک جانب انسان کی مادی نشو وارتقار کا یہ سامان مہیا کیا کہ اس کی عقل و دانش اور اس کے شعورِ دماغی کو آہستہ آہستہ ترقی پذیر کرنا شروع کیا اور دوسری جانب اسی معیار پر انسان کو روحانی و اخلاقی تربیت کا ساز و سامان بھی انبیار و رسل کے ذریعہ آہستہ آہستہ ترقی پذیر شکل میں عطا فرمایا اور آخر ایک وقت وہ بھی آیا کہ انسان عقل و شعور کی ابتدائی اور متوسط منازل سے گذر کر بلوغ و کمال کی اس حد پر پہنچ گئے جس کو اُن کے لیے حدِ کمال کہا جا سکتا ہے اور جب معراجِ کمال پر پہنچ کر انسان "انسانِ کامل" کہلانے کا بجا طور پر مستحق ہو جاتا ہے۔ تاہم حدِ بلوغ کی اس معراجِ ارتقار پر پہنچ جانے پر بھی اس کی جلار اور صیقل کے لیے رہتی دنیا تک نت نئے سامان ہوتے رہینگے اور خالقِ کائنات کی ربوبیتِ کاملہ ان کے کمال کو نقص سے محفوظ رکھنے کے لیے اپنی تربیتِ حق کا ہاتھ اُن سے نہ اٹھائیگی۔

ٹھیک اسی طرح نبوت و رسالت کی شمع رشد و ہدایت کا یہی حال رہا ہے کہ وہ ہزاروں

ہزار سال تک اپنے ابتدائی اور متوسط منازلِ ارتقاء سے گذرتی رہی اور آخر کار وہ وقت بھی آ پہنچا کہ اس کی ترقی اور نشو و ارتقاء نے "کمال و تمام" کی شکل اختیار کر لی اور اس حدِ کمال پر پہنچ گئی جہاں اس کے ذریعہ کائناتِ ہست و بود کے سامنے ایسا قانونِ کمل اور دستورِ کامل آگیا جو ہر طرح عقل و شعورِ انسانی کے حدِ بلوغ کے مناسب حال ہے اور جس کی راہنمائی اور روشنی "عروجِ کمال" کی ضامن و کفیل ہے۔ ساتھ ہی اس میں یہ لچک بھی موجود ہے کہ گویہ قانونِ رشد و ہدایت اپنے بنیادی اصول کے لحاظ سے اٹل اور غیر متبدل ہے مگر عقل و شعور کے کمال و بلوغ کے تحفظ کے لیے جس طرح اللہ تعالیٰ کی ربوبیتِ کاملہ نے راہیں مسدود نہیں کیں بلکہ رہتی دنیا تک اس کی تربیت کے سامان مہیا کیے ہیں اسی طرح اس منصبِ نبوت و رسالت کی تکمیل اور نقطۂ ارتقاء کے حدِ کمال پر پہنچ جانے کے بعد اس کی عطا کردہ رشد و ہدایت کے تحفظ کی راہیں بھی بند نہیں کیں اور تا قیامِ قیامت اس کے جلا و صیقل کے لیے "علماءِ امتی کانبیاءِ بنی اسرائیل" کا سلسلہ قائم و دائم رکھا۔

یہی وہ حقیقت ہے جس کو حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم نے خاتم النبیین کی تفسیر کو ایک روشن مثال کے ذریعہ سمجھایا اور "ختمِ نبوت" کی حقیقی روح کو مادی شکل میں پیش کر کے حرفِ آخر قرار دیا۔

عن ابی ھریرۃ رضی اللہ عنہ	حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ آنحضرت صلی
ان رسول اللہ صلی اللہ	اللہ علیہ وسلم سے روایت فرماتے ہیں۔
علیہ وسلم قال ان مثلی و	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ میری اور
مثل الانبیاء من قبلی	مجھ سے پہلے نبیوں اور رسولوں کی مثال ایسی
کمثل رجل بنی بیتا فاحسنہ	ہے جیسے کسی شخص نے گھر بنایا اور اس کو بہت عمدہ

واجملہ الا موضع لبنۃ من	آراستہ پیراستہ کیا مگر اس کے ایک گوشہ میں
زاویۃ فجعل الناس یطوفون	ایک اینٹ کی جگہ تعمیر میں چھوڑ دی تو اب
بہ ویعجبون لہٗ ویقولون	لوگ اس کو دیکھنے جوق جوق آتے ہیں اور خوش
ھلا وضعت ھٰذہ اللبنۃ	ہوتے ہیں مگر ساتھ ہی کہتے جاتے ہیں کہ یہ ایک
وانا خاتم النبیین (رواہ البخاری	اینٹ بھی کیوں نہ بھر دی گئی (تاکہ تعمیر کی تکمیل
فی کتاب الانبیاء ومسلم) وفی بعض	ہو جاتی) چنانچہ میں نے اسی جگہ کو پُر کیا ہے
الفاظہ فکنت انا سددت	اور میں وہی نبوت کی آخری اینٹ ہوں جس
موضع اللبنۃ وختم بی النبیون	سے قصر مکمل ہو گیا اور میں ہی آخر الانبیاء
وختم بی الرسل (کنز العمال عن	ہوں ۔
ابن عساکر	

حاصل کلام یہ ہے کہ رب العالمین کی ربوبیتِ کاملہ نے کائناتِ ہست بود میں قانونِ ارتقار کو جس طرح نافذ فرمایا ہے اُس کا تقاضا یہ ہے کہ عقل وشعور انسانی کے حدِ بلوغ پر پہنچ جانے کے باوجود اس کی ترقی کا سلسلہ تا ابد جاری رہے اور اس میں ایسی پابندی یا روک نہ ہونی چاہیے جس سے اس کی صلاحیتوں کے نشو وارتقار کا سدِ باب ہو جائے اور دوسری جانب پیغامِ حق کا جو سلسلہ نبوت ورسالت (بذریعہ وحی الٰہی) عالم کی رشد وہدایت کے لیے عطا ہوا ہے وہ بھی حدِ کمال وتمام پر پہنچ جانے کے باوجود فطرت کے قانون ارتقار کے مطابق نہ کمال سے نقص کی جانب رجوع کرے کہ حقیقت ظل اور بروز کے پردہ میں مستور ہو کر رہ جائے اور نہ ربوبیتِ حق کے اس عطار و نوال اور بخشش کا ہی سدِ باب ہو جائے جو "رشد وہدایت" کے عنوان سے معنون اور عالم

انسانی کی حقیقی راہنما ہے اس لیے طریقہ یہ رکھا گیا کہ جب انسان اپنے عقل و شعور میں حدِ بلوغ تک پہنچ گیا یا اُس کے سامان پوری طرح مہیا ہو گئے تب نبوت و رسالت کو بھی یہ حد کمال و تمام پہنچا کر ختم کر دیا گیا اور اعلان کر دیا گیا۔

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ آج میں نے تمہارے لیے تمہارا دین کامل کر دیا

وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ الآیۃ اور تم پر اپنی نعمت (نبوت و رسالت) کو پورا کر دیا۔

مگر رشد و ہدایت کو رہتی دنیا تک اس طرح باقی رکھا کہ آخری پیغمبر کے ذریعہ جو آخری پیغام کامل و مکمل بن کر آیا وہ اساس و بنیاد قرار پائے اور نت نئی مادی ترقیات کے ساتھ ساتھ اس کا فیضانِ علم بھی درخشاں و تاباں رہے اور یہ خدمت علماء حق کے سپرد ہو یہی وہ حقیقت ہے جس کو کلام معجز نظام نے اس انداز میں بیان کیا ہے۔

فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ اگر تم کسی معاملہ میں اختلاف کرو تو اس اختلاف

فَرُدُّوْہُ اِلَی اللّٰہِ وَالرَّسُوْلِ الآیۃ کو اللہ اور اس کے پیغمبر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی

جانب رجوع کرو۔

ظاہر ہے کہ اگر نبوت و رسالت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر پہنچ کر کامل نہ ہوتی اور اس کا سلسلۂ کمال نبوت ہی کی شکل میں آگے بڑھتا رہتا تو یہ نہ کہا جاتا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب یعنی اُن کے ارشاداتِ حق کی جانب رجوع کرو بلکہ خطاب یہ ہوتا کہ تم اللہ کی جانب اور جو نبی تم میں موجود ہو اس کی جانب رجوع کرو اس لیے نبوت و رسالت کو ظلی و بروزی کی اصطلاحوں کی آڑ میں باقی رکھنے کی کوشش کرنا قانونِ فطرت اور دینِ حق کے صریح خلاف اور باطل ہے۔ چنانچہ اس حقیقت کو نمایاں کرنے کے لیے قرآن حکیم نے کئی جگہ مختلف معجزانہ خطابت کو اختیار کیا ہے ایک جگہ ارشاد ہے۔

وَاُوْحِیَ اِلَیَّ هٰذَا الْقُرْاٰنُ	اور میری جانب اس قرآن کی وحی کی گئی تاکہ
لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ وَمَنْۢ بَلَغَ	اس کے ذریعہ میں تم کو (بری باتوں سے) ڈراؤں
(انعام)	اور اُن تمام لوگوں کو بھی جن کو (رہتی دنیا تک) یہ
	قران پہنچے۔

اور دوسری جگہ ہے۔

وَمَاۤ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً	اور نہیں بھیجا ہم نے تم کو مگر تمام جہاں والوں
لِّلْعٰلَمِیْنَ (انبیاء)	کے لیے رحمت بنا کر۔

اور ایک جگہ ہے۔

هُوَ الَّذِیْۤ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ	اللہ وہ ہے جس نے بھیجا اپنے رسول (محمد
بِالْهُدٰى وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ	صلی اللہ علیہ وسلم) کو ہدایت اور دین حق
عَلَى الدِّیْنِ كُلِّهٖ وَكَفٰى بِاللّٰهِ	دے کر تاکہ اس کو تمام ادیان پر غالب
شَهِیْدًا (فتح)	کرے اور اللہ اس کے لیے بطور گواہ کافی ہے

اور ایک جگہ ارشاد ہے۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اَطِیْعُوا	اے ایمان والو اللہ کی اطاعت کرو اور رسول
اللّٰهَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی	(محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کی اور ان کی اطاعت کرو
الْاَمْرِ مِنْكُمْ (نساء)	جو تم میں سے اولی الامر ہیں۔

اس آیت میں صاف طور پر یہ کہہ دیا گیا ہے کہ اب انسانی رشد و ہدایت کے لیے صرف ایک ہی طریقہ ہے کہ اللہ کی اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کی جائے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ اب کسی نبی و رسول کی اطاعت کا سوال نہیں ہے بلکہ اللہ اور

اس کے رسول کی اطاعت کا آخری طریقہ یہ ہے کہ تم میں سے جو صاحبِ امر ہوں (علماء، مجتہدین، خلفاءِ حق) اُن کی پیروی کرو۔

اِن آیاتِ بینات کے علاوہ قرآن حکیم نے جن آیات میں خدا کی کتابوں یا رسولوں پر ایمان لانے کی ہدایت کی ہو وہاں یہ کہہ کر "مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ" "اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِيْ نَزَّلَ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ" کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ان سے پہلے نبیوں اور رسولوں اور قرآن اور اس سے قبل کی کتابوں پر ایمان لاؤ اس حقیقت کو نمایاں کیا اور اُبھارا ہے کہ جہاں تک پیغمبر اور کتاب اللہ پر ایمان لانے کا تعلق ذاتِ اقدس، قرآن حکیم اور اس سے قبل کے نبیوں، رسولوں اور کتابوں کا ہے اور یہ صرف اس لیے کہ یہ سلسلہ آگے بشکل نبوت و رسالت اور وحی الٰہی نہیں چلیگا بلکہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت ہی بہ حدِ کمال پہنچ کر قیامت تک بلا فصل باقی اور جاری رہیگی اور قرآن حکیم کامل و مکمل دستورِ ہدایت بن کر ہمیشہ اس کے لیے زندہ شہادت دیگا۔

حق تعالیٰ کی جانب سے "خاتم النبیین" کا جو منصبِ جلیل ذاتِ اقدس (صلی اللہ علیہ وسلم) کو عطا ہوا ہے عقل و نقل دونوں اعتبار سے ایک اور صرف ایک ہی معنی رکھتا ہے اور وہ یہ کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم آخرِ انبیاء و رسل ہیں اور نبوت و رسالت کا سلسلہ آپ پر پہنچ کر ختم ہو گیا۔

تاج العروس میں ہے (و) الخاتم (من کل شئ عاقبتہ و اٰخرتہ کخاتمتہ والخاتم اٰخر القوم کالخاتم) و منہ قولہ تعالیٰ و خاتم النبیین ای اٰخرھم الخ (فصل الخاء من باب المیم)

تاج العروس کے علاوہ تمام معتبر اور مشہور عربی لغات ناطق ہیں کہ "خاتم" بفتح تاء ہو یا بکسرہ تاء، "آخر شئ" اس کے حقیقی معنی ہیں اور جب کسی شخصیت کے لیے بولا جائے تو "آخر القوم"

مُراد ہوتے ہیں۔ اس لیے آخر الانبیاء والرسل ہونا ذاتِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ خصوصیت ہے جس میں دوسرا کوئی شریک وسہیم نہیں۔

یہ درست ہے کہ خاتم بمعنی "مہر" بھی حقیقی معنی ہیں اور یہی نہیں ان دونوں کے ماسوا اس لفظ کے چند اور معانی بھی حقیقی ہیں لیکن اطلاقات ہی اس کو ظاہر کر سکتے ہیں کہ ان ہر دو حقیقی معنی میں سے کون سے معنی برمحل ہیں مثلاً جب آپ ہاتھ میں انگشتری پہنے ہوئے ہوں اور اس پر آپ کا نام کندہ ہو، اُس وقت اگر کہا جائے کہ "خاتمک فی انملک" تو اس وقت خاتم بمعنی "مہر" حقیقی معنی ہونگے لیکن اس لفظ خاتم کو اگر کسی انسان پر اطلاق کریں تو اس وقت خاتم بمعنی "آخر" حقیقی معنی ہونگے اور خاتم القوم یا خاتم الانبیاء تب ہی صحیح ہوگا کہ آنے والا شخص قوم کا آخری فرد یا نبیوں کا آخری نبی ہو اور اس حقیقی اطلاق کی موجودگی میں مجازی معنی تب ہی قابل اعتنا ہونگے کہ یا حقیقی معنی اس مقام پر ناممکن الاستعمال ہوں اور یا مجازی معنی حقیقی معنی سے مغائر و متضاد نہ ہوں بلکہ اس کے ساتھ پوری مطابقت رکھتے ہوں۔

تب یہ بات واضح اور صاف ہے کہ اگر کوئی شخص بلاغتِ قرآن اور اعجازِ نظمِ قرآنی کے خلاف بلکہ عربیت کے عام اصول کے خلاف آیت کریمہ "خاتم النبیین" میں خاتم کے حقیقی معنی ترک کر کے بلحاظ اطلاق مجازی معنی "مہر" کے لیتا ہے تب بھی مجازی معنی اور مفہوم وہی صحیح اور لائق توجہ ہو سکتے ہیں جو حقیقی معنی "آخر" سے متبائن اور متخالف نہ ہوں اور "نبیوں کی مہر" کا یہ مطلب ہوگا کہ جس طرح کسی تحریر یا کسی شے کے ختم پر "مہر" اس لیے لگائی جاتی ہے کہ اُس پر تحریر یا شے کا اختتام ہوگیا اور اب کسی بھی اضافے کی گنجائش باقی نہیں رہی۔ اسی طرح ذاتِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم انبیاء و مرسلین کے سلسلہ کے لیے

"مہر" ہیں کہ آپ کے بعد اب فہرست انبیاء و رسل میں کسی اضافہ کی گنجائش نہیں رہی اور اس سلسلہ پر مہر لگ گئی اور جس طرح کاغذ یا لفافہ پر مہر ثبوت ہے اس امر کا کہ اب اس کے بعد کسی مضمون یا لفظ و جملہ کی توقع عبث ہے اسی طرح نبیوں کی مہر اس کے لیے کھلی دلیل ہے کہ اب کسی اضافہ کی توقع محال ہے۔

پس "مہر" بہ اطلاق مجاز کے اس مفہوم کو چھوڑ کر اگر کسی خاص مزعومہ کی بنا پر یہ معنی مراد ہوں "کہ ذاتِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نبیوں کے لیے مہر ہیں کہ جس طرح کوئی کاغذ یا تحریر جب ہی مستند ہوتی ہے کہ اس پر ذمہ دار شخصیت کی مہر ثبت ہو اس طرح کوئی نبی "نبی یا رسول" نہیں بن سکتا جب تک آپ اس کے لیے مہر تصدیق نہ بن جائیں" تو یہ مراد دو وجہ سے باطل ہے اول اس لیے کہ یہ مفہوم حقیقی معنی "آخر" کے متضاد و متبائن ہیں۔ دوئم اس لیے کہ ہزاروں یا لاکھوں انبیاء علیہم السلام جو ذات اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانۂ بعثت سے قبل اس کائنات ارضی پر مبعوث ہو چکے اپنی اپنی امت کے زمانہ میں ان کی نبوت غیر مستند اور ناقابل قبول رہی اس لیے کہ ان کی نبوت تصدیق کنندہ "مہر" اُن کی بعثت سے ہزاروں یا سیکڑوں برس کے بعد آئی جبکہ وہ اپنے اپنے فرضِ منصبی سے سبکدوش ہو چکے تو اب بے سود و بے فائدہ۔ اور اگر یہ مراد ہے کہ آپ کے بعد جو نبی آئیں گے اُن کے لیے آپ "مہر" ہیں تو یہ ترجیح بلا مرجح کیوں؟ کہ ہزاروں لاکھوں انبیاء و رسل کے لیے تو مہر نہ بنے اور بعد میں آنے والوں کے لیے "مہر" قرار پائے۔ اور اگر یہ مطلب ہے کہ اگلوں اور پچھلوں سب ہی انبیاء و رسل کے لیے مہر تصدیق ہیں تب بھی اگلوں کے لیے مہر ہونا بے کار رہا کہ اُن کے وقت نبوت گزر جانے کے بعد مہر تصدیق پہنچی علاوہ ازیں یہ احتمالات خود ساختہ اور ظنی ہیں اور کسی ایک احتمال کے یقینی ہونے

کی بھی قرآن میں صراحت موجود نہیں ہے تو پھر حقیقی اطلاق کو ترک دو حقیقی سو مطابق مجازی مفہوم سے روگردانی کے بعد ایسے احتمالات جو حقیقی مفہوم کا حق نہ ادا کرتے ہوں باطل نہیں تو اور کیا ہیں ؟

پھر یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ قرآن کا حکیمانہ طریقِ استدلال یہ ہے کہ وہ ایک مقام پر جو بات کہنا چاہتا ہے اس کو متعدد جگہ مختلف اسالیبِ بیان کے ساتھ اس طرح ادا کر دیتا ہے کہ ایک آیت دوسری آیت کی خود ہی تفسیر بن جاتی اور حقیقت حال روشن ہو کر سامنے آجاتی ہے۔ اس حقیقت کو مفسرین نے اس طرح ادا کیا ہے کہ "القرآن یفسّر بعضہ بعضاً" یعنی قرآن کا بعض حصہ دوسرے بعض حصہ کی خود تفسیر کر دیتا ہے۔ چنانچہ یہی صورت حال یہاں بھی موجود ہے وہ یہ کہ قرآن حکیم اسلام کی خوبی بیان کرتے ہوئے اعلان کرتا ہے۔

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَ	آج میں نے تمہارے لیے تمہارا دین کامل کر دیا
اَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ	اور تم پر اپنی نعمت تمام کر دی اور تمہارے لیے
لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا ۔	اسلام کو دین کی حیثیت میں پسند کر لیا۔

آیت کریمہ کو ایک مرتبہ خوب غور سے پھر پڑھیے اور دیکھیے کہ اس جگہ نہ "خاتَم" ہے اور نہ "خاتِم" کہ اس کو معرضِ بحث میں لا کر خود ساختہ احتمالات پیدا کر لیے جائیں۔ بلکہ یہاں صاف صاف کہا گیا ہے کہ جو دین اسلام وجودِ انسانی کے ساتھ ساتھ رشد و ہدایت کا مرکز بنا ہوا ہے اُس کو آج "کامل" اور اس نعمتِ دین کو تمام کر دیا گیا، اور ظاہر ہے کہ "کامل" کا مقابل "ناقص" اور "تمام" کا متوازی "ناتمام۔ ادھورا" ہوتا ہے۔ یعنی ایک چیز آہستہ آہستہ ترقی پذیر رہی اور رفتہ رفتہ اس حد پہ پہنچ گئی جس کے بعد اب ترقی کا خاتمہ ہی

اس لیے کہ وہ کامل و مکمل ہو کر سامنے آگئی جس کے بعد ناقص یا ناتمام کے دہرانے کا سوال ہی باقی نہیں رہتا۔

سو اگر یہ صحیح ہے کہ اسلام، دورِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم پر پہنچ کر ہی کامل اور تمام ہوا ہے تو بلاشبہ آیت کریمہ "ولکن رسول اللہ وخاتم النبیین" کے یہی معنی صحیح ہو سکتے ہیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اسی دین کے پیغامبر ہیں جو کائناتِ انسان کی ابتدا سے ہی رشد و ہدایت انسانی کا فرض انجام دے رہا ہے اور خدا کا پسندیدہ ہے "ولکن رسول اللہ" اور انسانیت کی مادی ترقی کے ساتھ ساتھ وہ بھی روحانی مدارج ارتقاطے کرتے ہوئے آج "کامل" اور "تمام" ہو گیا، اور اب کسی جدید پیغام کی حاجت نہیں رہی اور جب جدید پیغام کی ضرورت نہیں ہے تو اب نئے پیغامبر کی بھی ضرورت خود بخود باقی نہیں رہی اور رہتی دنیا تک یہی کامل پیغام اور پیغامبر انسانی دنیا کے لیے کافی اور بس ہے" وخاتم النبیین"

لہذا حقیقی اطلاق لیجیے یا مجازی" خاتم" کے معنی اور مفہوم میں "آخر" ہونے کا تصور غیر منفک اور لازم ہے اور اس کے خلاف جو کچھ بھی ہے وہ باطل ہے۔

آیت کریمہ کا شان نزول اگرچہ ایک خاص واقعہ سے تعلق رکھتا ہے لیکن اپنے مفہوم و معنی کے لحاظ سے ہمہ گیر اور غیر موقت ہے اور عربیت اور نقل و روایات دونوں لحاظ سے ایک ٹھوس حقیقت کا اظہار کرتی ہے۔

اس آیت کے تین حصے ہیں ایک میں کہا گیا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم تم مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں اس لیے کہ آپ کی اولادِ ذکور حیاتِ مستعار کو پورا کر چکی اور آپ صلبی بیٹا نہیں رکھتے اور اسلام میں لے پالک۔ "تبنی" بے معنی رسم ہے اور اس سے دوسرے کا بیٹا گود لینے والے کا بیٹا نہیں بن جاتا اور اس کے احکام حاصل نہیں کر لیتا تو ایسی شکل میں

زید (رضی اللہ عنہ) کو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا بیٹا کہنا ہر طرح غلط ہے۔ "مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ" مگر اس سے یہ احساس پیدا نہیں ہونا چاہیے کہ جب آپ مردوں میں سے کسی کے صلبی باپ نہیں ہیں تو اُمت کے ساتھ کس طرح آپ کو شفقتِ پدری ہو سکتی ہے حالانکہ امم سابقہ و سالفہ میں انبیاء و رسل اپنی اپنی امتوں کے بیشتر صلبی باپ بھی رہے ہیں اور روحانی باپ بھی۔ یہ احساس اس لیے نہیں ہونا چاہیے کہ اگرچہ آپ امتِ مرحومہ کے صلبی باپ نہیں ہیں تو نہ ہوں مگر روحانی باپ تو ہیں جیسا کہ ہمیشہ انبیاء و رسل اپنی اپنی اُمتوں کے روحانی باپ ہوتے ہیں بلکہ روحانی باپ کا رشتہ و رابطہ تو صلبی باپ سے بھی ہزار ہا درجہ بڑھ چڑھ کر ہے کیونکہ وہ مادی و روحانی دونوں تربیتوں کا کفیل اور مربی ہے اس لیے دوسرے نبیوں اور رسولوں کی طرح آپ بھی خدا کے رسول ہیں" ولکن رسول اللہ" یہ آیت کا دوسرا حصّہ ہے۔

پھر بات اسی حد پر پہنچ کر ختم نہیں ہو جاتی بلکہ اُمت مرحومہ کے لیے اس سے بھی بلند و بالا یہ بشارت ہے کہ آپ سے قبل جس قدر بھی روحانی باپ (انبیاء و رسل) گزرے ہیں علیٰ قدر مراتب اُن میں اُمت کے لیے شفقت و رحمت کا جذبہ محدود رہا ہے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ ان کے گزر جانے کے بعد دوسرا روحانی باپ (نبی یا رسول) مبعوث ہو کر اُمت پر میری ہی طرح یا مجھ سے زیادہ شفقت و تربیت کا حق ادا کرنے والا ہے لیکن ذاتِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ شانِ رفیع ہے کہ آپ صرف اللہ کے رسول ہی نہیں ہیں بلکہ آخر الانبیاء و الرسل ہیں جن کے بعد کسی نبی اور رسول کی بعثت کی ضرورت نہیں رہی اس لیے کہ دین کامل ہو گیا اور خدا کی نعمت پوری ہو گئی ایسی صورت میں تم اندازہ کر سکتے ہو کہ اس کی شفقت و رحمت کا کیا ٹھکانا ہو گا جو مربی یہ سمجھتا ہو کہ اب اگلوں کی طرح اس کے بعد

دوسرا کوئی مربّی آنے والا نہیں ہے کہ اُمت پر اپنی رحمت نچھاور کرے، اب تو رہتی دنیا تک اُسی کی آغوشِ تربیت وا رہیگی اور اسی کی نبوت و رسالت کا غیر منقطع سلسلہ جاری رہیگا۔

"وخاتم النبیین"

خلاصہ یہ کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی شانِ مبارک اس خصوصی امتیاز کی حامل ہے کہ اس کی بعثت کے بعد کسی نبی یا رسول کی بعثت کی حاجت باقی نہیں رہی اور اس طرح یہ حقیقت بھی روشن ہوگئی کہ ذاتِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اس امر کے باعث نہیں ہیں کہ اُنہوں نے نبوت و رسالت کا سلسلہ ختم کر دیا بلکہ جب خدا تعالیٰ کو منظور ہوا کہ اب یہ سلسلۂ نبوت و رسالت اس ارتقائی منزل پر پہنچ گیا ہے کہ آخری پیغام بن کر کامل و تمام ہو جائے تو ذاتِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو اُس نے اس کے لیے چُن لیا اور بلا شرکت غیرے اُن کو یہ منصبِ عظمیٰ عطا فرمایا "ذٰلک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء واللہ ذو الفضل العظیم" پھر کسی نادان کا یہ کہنا کہ اگر آپ آخر الانبیاء والرسل ہیں تو یہ آپ کی منقبت نہیں بلکہ نقص ہے کہ آپ اس رحمت کے لیے سدِ باب ثابت ہوئے جو نبوت و رسالت کے عنوان سے جاری تھی۔

اس نادان کا یہ خیال اسی طرح فاسد ہے جس طرح اس شخص کا خیال جس نے ایک محفل میں شرکت کی اور دیکھا کہ جو معزز مہمان بھی آتا ہے اُس کا پرجوش استقبال ہوتا ہے اور اس سے محفل کی رونق میں اضافہ ہوتا جاتا ہے مگر جب اُس نے یہ دیکھا کہ ایک شخص ایسا بھی آپہنچا جس کو سب نے حاصلِ محفل سمجھ کر نہ صرف پرجوش استقبال ہی کیا بلکہ تمام محفل کا سرتاج کہا اور اس کے بعد محفل اپنا کام کر کے ختم ہوگئی تو یہ نادان بہت کُڑھا اور پچھتانے لگا کہ کاش یہ حاصلِ محفل نہ بنتا اور محفل اسی طرح سجی سجائی رہتی اور مہمانوں کی آمد کا یہ سلسلہ

یونہی جاری رہتا۔

ٹھیک اسی طرح محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے آخرالانبیاء والرسل ہونے پر یہ نادان اپنے فسادِ خیال کا اظہار کر رہا اور باطل تاویلات کے درپے ہو رہا ہے "یضل بہ من یشاء و یھدی بہ من یشاء"

قرآنِ عزیز نے اکثر مقامات پر "نبی" اور "رسول" کے ایک ہی معنی لیے ہیں جس کو اُردو میں پیغمبر سے تعبیر کیا جاتا ہے لیکن خاص خاص مقامات پر وہ نبی اور رسول میں فرق بھی کرتا ہے۔ اس فرق کو علماء اسلام نے یوں ظاہر کیا ہے کہ نبی عام ہے اور رسول خاص۔ یعنی خدائے تعالیٰ جس شخصیت کو ہم کلامی کا شرف عطا فرماتے ہیں وہ "نبی" کہلاتا ہے کیونکہ لغت میں "نبی" خبر دینے والے کو کہتے ہیں۔ گویا جو شخص خدا سے براہِ راست لے کر بندگانِ خدا کو اس کے احکام کی خبر دے وہ نبی ہے قطع نظر اس امر کے کہ اُس کو جدید کتاب یا جدید شریعت عطا کی گئی ہو یا نہ کی گئی ہو لیکن جب خدا نے ہم کلامی کے منصب کے ساتھ ساتھ اس شخصیت کو "کتابِ جدید" یا "شریعتِ جدیدہ" بھی عطا کی ہو تو اس کو "رسول" کہتے ہیں۔ چنانچہ اس مقام پر قرآن حکیم نے اسی فرق و امتیاز کو معجزانہ اسلوب کے ساتھ ظاہر کیا ہے وہ کہتا ہے کہ جہاں تک گزشتہ انبیاء و رسل کی فہرست کا تعلق ہے اس فہرست میں آپ کا منصب صرف "نبی" ہی نہیں بلکہ "رسول" ہے اور خود قرآن اس کے لیے شہادتِ جاوید ہے اور جبکہ وہ پیغامِ الٰہی کے سلسلہ میں آخری پیغامبر ہیں تو اس جگہ یہ یقین کر لینا چاہیے کہ وہ صرف مصطلحہ رسولوں کے ہی آخر نہیں ہیں بلکہ سرتاسر سلسلۂ نبوت کے لیے "آخر" ہیں۔ تاکہ ظاہر ہو جائے کہ جب وہ خاتم الانبیاء ہیں تو خاتم الرسل بدرجہ اولیٰ و اتم ہیں کیونکہ جب عام ہی کا وجود مفقود ہے تو خاص کا وجود کس طرح کتمِ عدم سے ظاہر ہو سکتا ہے "وخاتم النبیین" اور اسی نمایاں حقیقت کو خود

ذات اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک طویل صحیح حدیث میں برہان قاطع کے طور پر ظاہر کیا ہے "لا نبی بعدی: میرے بعد اب کسی نبی کی بعثت نہیں ہے" "ان الرسالۃ والنبوۃ قد انقطعت فلا رسول بعدی ولا نبی۔ بلاشبہ رسالت اور نبوت دونوں ختم ہوگئے پس میرے بعد نہ رسول ہے اور نہ نبی" "ختم بی الانبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام۔ مجھ پر انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے سلسلہ کا خاتمہ ہوگیا"۔ "انا العاقب الذی لیس بعدہٗ نبیٌ۔ میرا نام عاقب[1] ہے جس کے بعد نبی کی بعثت نہیں ہے"۔ "وختم بی النبیون۔ اور مجھ پر نبیوں کا سلسلہ ختم ہوگیا[2]"۔

---

[1] عاقب: انجام کو پہنچانے والا۔ [2] مسند احمد، ترمذی، مسلم، بخاری وغیرہا۔

غزوات

غزوۂ بدر

غزوہ ۔ ارباب سیر و حدیث نے یہ اصطلاح مقرر کر لی ہے کہ جہاد فی سبیل اللہ کے سلسلہ میں جس لشکر کیساتھ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نہ ہوں اس کو سریہ اور جس میں بنفس نفیس خود شرکت فرمائیں اُس کو "غزوہ" کہتے ہیں۔

بدر ۔ قرآن عزیز نے جن اہم غزوات کا تذکرہ کیا ہے اُن میں سب سے زیادہ نمایاں حیثیت "غزوۂ بدر" کو حاصل ہے۔ بدر دراصل ایک کنویں کا نام ہے جس کی نسبت سے یہ وادی بھی بدر ہی کہلاتی ہے، یہ وادی مکہ اور مدینہ کے درمیان مدینہ سے قریب سلطانی راستہ[1] پر واقع ہے، اسی جگہ وہ اہم غزوہ پیش آیا جس نے دنیا کی تاریخِ ادیان و ملل ہی کا نہیں بلکہ ہر شعبۂ حیات کا رُخ پلٹ کر ظلم سے عدل کی جانب پھیر دیا۔

واقعہ ۔ یہ واقعہ چونکہ ادیان و ملل کی تاریخِ انقلاب میں نمایاں حیثیت رکھتا ہے اس لئے راویانِ حدیث و سیرت نے اس کے ہر ایک جزء کی تفصیل کو واضح طور پر بیان کیا ہے، تاکہ اس تاریخی واقعہ کا کوئی گوشہ بھی تشنۂ تکمیل نہ رہے، لیکن ہم اس مقام پر مختصر مگر جامع الفاظ میں اس کا ذکر مناسب سمجھتے ہیں۔

---

[1] حکومت عثمانی کے دور شباب میں مکہ سے مدینہ جانے کیلئے جو راہ مقرر ہوئی وہ "سلطانی راہ" کہلاتی ہے

ہجرتِ مدینہ مشرکین کے لئے کچھ اس درجہ بڑھی اور اشتعال کا باعث ہوئی اور وہ پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) اور مسلمانوں کو اپنی ناقابل برداشت ایذا رسانی سے محفوظ دیکھ کر کچھ اس درجہ برافروختہ ہوئے کہ اب انھوں نے طے کر لیا کہ جس قیمت پر بھی ہو سکے مسلمانوں کو نیست و نابود کر دینا چاہیئے، چنانچہ اس کے لئے اُنھوں نے ہجرت سے متصل ہی معرکہائے جنگ کی ابتدا کر دی اور غزوۂ بواط اور غزوۂ عشیرۃ جیسے چھوٹے چھوٹے غزوات اسی سلسلہ میں پیش آئے مگر مشرکین مکہ کی آتشِ حسد کے لئے یہ کافی نہ تھا اور وہ چاہتے تھے کہ کسی طرح مسلمانوں کے ساتھ ایک فیصلہ کن جنگ ہو جائے۔

اس ارادہ کی تکمیل کے لئے انھوں نے ضروری سمجھا کہ سامانِ حرب و ضرب بافراط میسر آئے اور اس کے لئے بہترین طریقہ یہ سوچا کہ ابوسفیان کی سرکردگی میں ایک قافلۂ تجارت شام کی منڈیوں میں جائے اور نفع کثیر حاصل کرکے اس سے سامانِ جنگ مہیا کیا جائے۔ اور اس جذبہ نے جوش و خروش کی یہ کیفیت پیدا کر دی کہ جب قافلۂ تجارت کی طیاری شروع ہوئی تو مکہ کے ہر متنفس نے اپنے سرمایہ کا کچھ حصہ اس تجارت کیلیے پیش کیا، حتیٰ کہ ایک بڑھیا (عجوز) نے بھی اپنی محنت کی معمولی پونجی اس خدمت کے لئے پیش کر دی اور تقریباً ستر قریشیوں پر مشتمل یہ قافلہ ابوسفیان کی قیادت میں شام کو روانہ ہوگیا۔

مشہور محدث و مفسر ابن جریر طبری اپنی کتاب "تاریخ الامم والملوک" میں قریش کی اس کیفیت کا اس طرح تذکرہ فرماتے ہیں۔

وقد کانت الحرب بینھم قبل ذٰلک　　　اور قافلہ کی روانگی سے قبل مسلمانوں اور قریش مکہ

فقتلت قتلى وقتل ابن الحضرمي
في ناس بنخلة واسرت أسارى
من قريش وكانت تلك
الواقعة هاجت الحساب بين
رسول الله صلى الله عليه وسلم
وبين قريش وذلك قبل
مخرج ابي سفيان واصحابه الى
الشام ؎

کے درمیان جنگ چھڑ گئی تھی اور ان لڑائیوں میں
لوگ مارے جا چکے تھے اور (مشہور مشرک) ابن
حضرمی مارا جا چکا تھا اور قریش کے لوگ قیدی بھی
بنائے جا چکے تھے اور یہ واقعہ قریش کو اور مسلمانوں
کے درمیان جنگ کے مشتعل ہو جانیکا باعث بن
گیا اور یہ سب کچھ ابو سفیان اور اسکے رفقاء کے
شام کی جانب قافلہ تجارت کی شکل میں نکلنے سے
قبل پیش آ چکا تھا۔

اور جلیل القدر محدث و مفسر ابن کثیر (رحمہ اللہ) اپنی تاریخ البدایۃ والنہایۃ میں تحریر فرماتے ہیں۔

باب سرية عبد الله بن جحش
التي كان سببا لغزوة بدر العظمى
وذلك يوم الفرقان يوم التقى
الجمعان والله على كل شئ
قدير ؎

اب سریہ عبداللہ بن جحش (سریہ نخلہ) جو سبب
بنا بدر کبری کے غزوہ کا اور جسکے متعلق قرآن نے
یہ کہا اور یہ دن ہی حق و باطل کو نکھر جانیکا وہ
دن جبکہ حق و باطل کی جنگ کیلئے دو جماعتیں
آپس میں ملیں، اور اللہ ہر شئ پر قادر ہے

قریش کا تجارتی قافلہ جب نفع کثیر حاصل کر کے شام سے واپس ہو کر مکہ جا رہا تھا، بدر سے قریب ہو کر گذرا تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو علم ہوا، آپ نے فوراً اصحابہ کو جمع کر کے مشورہ فرمایا، تب بعض حضرات نے تو بخوشی اُس کی مقابلے

؎ جلد ۳ ص ۲۶۷ ؎ ابن حضرمی اسی غزوہ میں مارا گیا ؎ جلد ۳ ص ۲۴۸

کیلئے آمادگی ظاہر کی اور بعض نے یہ سمجھ کر کہ کسی اہم جنگ کا معاملہ نہیں ہے اس کے تعاقب پر آمادگی کا ثبوت نہیں دیا، چنانچہ ابن کثیر نے بروایت محمد بن اسحٰق اس واقعہ کا اس طرح ذکر کیا ہے۔

وقال "هذه عير قريش فيها	نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ قریش کا قافلہ
اموالهم فاخرجوا اليها لعل	جا رہا ہے جس میں ان کا مال تجارت ہے اس کا تعاقب
الله ينفلكموها فانتدب الناس	کرو، کیا عجب کہ اللہ تعالیٰ اسکو تمہاری لئے مال
فخف بعضهم وثقل بعض و	غنیمت بنا دے پس لوگوں کو اس کیلئے پکارا گیا تو
ذالك انهم لم يظنوا ان رسول	بعض نے اسکو پسند کیا اور بعض نے نکلنے میں گرانی
الله يلقى حربًا	محسوس کی اور یہ عدم چستی کو بیشن نظر نہیں بلکہ

اس لئے تھی کہ وہ سمجھ رہے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کسی جنگ کے ارادہ سے نہیں جا رہے ہیں۔

مسلمانوں کا یہ لشکر جو قافلہ کے تعاقب میں نکلا، سامان حرب سے بے پرواہ ہو کر مدینہ سے نکلا، مشہور روایت کے مطابق ان کی تعداد صرف تین سو تیرہ تھی جبکہ بحمد اللہ مدینہ کے اندر ہی مسلمانوں کی آبادی ہزارہا بانغ نفوس پر مشتمل تھی اور چند تلواریں، دو تین گھوڑے ساٹھ زرہ اور صرف ساٹھ اونٹ اُن کا متاع جنگ تھا، درآنحالیکہ مسلمانوں کے پاس بلکہ خود نکلنے والے مجاہدین کے پاس مدینہ میں بیش از بیش سامان جنگ اور اونٹ گھوڑے موجود تھے، غرض یہ لشکر جنگی لشکر نہیں تھا، بلکہ فدا کاران توحید کا ایک مختصر سا قافلہ تھا، جو قریش کے حرب و ضرب کے سرمایہ پر قابض ہو کر دشمن کو بے مایہ بنانے نکلا تھا۔

ابو سفیان کو مسلمانوں کے تعاقب کا حال معلوم ہوا تو گھبرایا اور فوراً ضمضم نامی

---

[1] جلد ۳ ص ۲۵۶

ایک شخص کو اجیر بنا کر مکہ روانہ کیا کہ وہ قریش کو اس معاملہ کی خبر دے اور مدد طلب کرے، قریش نے جب حقیقت حال کو سنا تو ان میں بہت زیادہ جوش پیدا ہو گیا اور تمام سرداران قریش[1] آمادہ جنگ ہو کر اپنے اپنے لشکر کو لے کر نکل کھڑے ہوئے اور اس کر و فر سے نکلے کہ تعداد میں ایکہزار تھے، نیزے اور تلواریں بے شمار تھیں، سات سو زرہ، ستر گھوڑے اور بے تعداد اونٹ تھے وہ اوپچی بنے، نیزے اور تلواریں سجے، ڈھالیں اور بکتر لگائے نشۂ غرور میں جھومتے ہوئے بدر کی جانب بڑھے۔

ادھر مسلمان آگے بڑھتے ہوئے جب وادیٔ صفراء کے قریب پہنچے تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بسبس[2] بن عمرو اور عدی بن الزغباء کو جاسوس بنا کر بھیجا کہ وہ قافلہ کا حال معلوم کر کے آئیں۔ ابن اسحٰق کہتے ہیں کہ یہ دونوں بدر پہنچے تو وہاں کنوئیں کے قریب قبیلہ جہینہ کا ایک شخص مجدی بن عمرو موجود تھا، اور نزدیک ہی دو لڑکیاں آپس میں بات چیت کر رہی تھیں۔

ایک نے دوسری سے کہا کہ کل یا پرسوں یہاں قریشی قافلہ آنیوالا ہے میں اس میں کام کرونگی اور تیرا قرض اتار دونگی اور پھر مجدی نے اس لڑکی کی تصدیق کی۔ بسبس نے یہ سنا تو وہ اور عدی اونٹوں کو پانی پلا، فوراً روانہ ہو گئے[3] دوسری جانب ابوسفیان ڈرتا اور چھپتا چھپاتا قافلہ سے آگے بڑھ کر تجسس حال کے لئے بدر پہنچا، مجدی وہاں موجود تھا، ابوسفیان نے دریافت کیا، تو نے کسی

[1] ابولہب کے علاوہ سب ہی تھے، ابولہب بیمار تھا اس لئے اُس نے اپنا قائم مقام دیدیا تھا۔
[2] مسلم و ابوداؤد [3] تاریخ ابن کثیر جلد ۲ ص ۲۶۵ و سیرت ابن ہشام، روض الانف جلد ۲

اجنبی کو تو یہاں نہیں دیکھا؟

مجدی نے کہا اور تو کوئی نئی بات نظر نہیں آئی البتہ تھوڑی دیر ہوئی کہ غیر متعارف دو آدمی ضرور یہاں آئے تھے اور اونٹوں کو پانی پلا کر واپس ہو گئے ابو سفیان کنویں کے پاس گیا تو اونٹوں کی لیدڑی دیکھی، اُس نے لید کو کریدا تو کھجور کی گٹھلیاں نکلیں، ابوسفیان نے یہ دیکھ کر کہا بلاشبہ یہ اونٹ یثرب کے تھے اور تیزی کے ساتھ قافلہ تک پہنچا اور حالات سے باخبر کر کے قافلہ کا رُخ ساحل کی جانب پھیر دیا اور بدر کو بائیں ہاتھ چھوڑتا ہوا، مکہ کو چل دیا۔[۱]

اس مدت میں مسلمان وادی عفراء سے گذر کر وادی ذفران تک پہنچ چکے تھے یہاں اُترے تو ایک جانب بسبس اور عدی سے یہ معلوم ہوا کہ عنقریب ابوسفیان کا قافلہ بدر پہنچنے والا ہے، دوسری جانب یہ پتہ لگا کہ مکہ سے قریش کا جمعیتہ لیکر کرّو فر کے ساتھ مسلمانوں سے لڑنے کی غرض سے بدر کی جانب بڑھ رہے ہیں۔

ابوسفیان نے جب ساحلی جانب اختیار کر لی اور اُس کو یہ یقین ہو گیا کہ اگر مسلمان میرے تعاقب کے لئے بدر کی جانب آئیں گے تو میں اُن کی زد سے محفوظ رہوں گا، اس لئے اُس نے مکہ کی جانب دوسرا قاصد روانہ کیا کہ اب جنگ کی ضرورت نہیں ہے، میں مسلمانوں کی زد سے بچکر جلدی مکہ پہنچ جانیوالا ہوں، قریش بدر کے قریب آ چکے تھے کہ قاصد نے ابوسفیان کا پیغام سنایا مگر ابوجہل نے واپسی کے لئے سختی کے ساتھ انکار کر دیا اور کہا کہ اب ہم ضرور پہنچنا ہے

---

[۱] تاریخ ابن کثیر جلد ۳ ص ۲۶۵ و سیرت ابن ہشام اور الانف جلد ۲۔

اور مسلمانوں کا قلع قمع کر کے اس کانٹے کو ہمیشہ کے لئے نکال دینا ہے۔[1]

بہرحال مسلمانوں کو جب وادی ذفران میں یہ دونوں خبریں ملیں تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ (رضی اللہ عنہم) سے دوبارہ مشورہ ضروری سمجھا کیونکہ اب معاملہ کٹھن تھا، مسلمان بے سروسامان اور پھر تھوڑی تعداد میں تھے اور دشمن ہر طرح وقت کے ہتھیاروں سے مسلح، کثیر سامانِ جنگ کے مالک تھے اور تعداد میں تین گنے سے بھی زیادہ اور بقول ارباب سیرت انصار، اگرچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت سفر کو صد ہزار باعثِ نازش و مباہات سمجھتے اور ہم رکاب رہتے تھے لیکن عقبہ ثانیہ کے وقت وہ نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھ یہ معاہدہ کر چکے تھے کہ جبتک قریش یا غیر قریش اپنی جانب سے مدینہ پر حملہ آور نہ ہوں، انصار مدینہ سے باہر نکل کر جنگ کے لئے مجبور نہیں ہوں گے۔[2]

مشورہ کے لئے یہ اہم وجوہ تھیں جن کے پیشِ نظر نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے صحابہؓ سے مشورہ فرمایا۔ آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ دشمن سر پر ہے اور قافلہ قریب! اب بتاؤ کیا چاہتے ہو، جنگ کر کے حق و باطل کا فیصلہ، یا بغیر کانٹا لگے قافلہ پر قبضہ؟

مسلمانوں نے جب یہ سُنا تو بعض نے طبعی طور پر جنگ کی مخالفت کی اور اس بارے میں گرانی محسوس کی، انھوں نے کہا:۔ یا رسول اللہ ہم جنگ کے ارادے سے نہیں نکلے تھے، اس لئے بے سروسامان ہیں، ہم تو اب بھی یہی چاہتے ہیں کہ قافلہ پر قبضہ کر کے واپس چلے جائیں، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس

---

[1] تاریخ ابن کثیر جلد ۲ ص ۲۶۶ [2] سیرت و تاریخ کی کتابوں میں عموماً یہ قول مذکور ہے۔

کمزور رائے کو ناپسند فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا، قافلہ کو چھوڑو، اب اُس قوم کے متعلق رائے دو، جو تمہارے مقابلہ کے لئے مکہ سے نکل آئی۔ بعض لوگوں نے جب دوبارہ عذر کیا، تو آپؐ نے پھر پہلی بات لوٹا دی، تب جلیل القدر صحابہ ابوبکرؓ، عمرؓ، علیؓ (رضی اللہ عنہم) سمجھ گئے کہ مرضی مبارک حق و باطل کی جنگ سے وابستہ ہے، اس لئے انہوں نے جذبۂ وفاداری کا اظہار کرتے ہوئے عرض کیا کہ، ہم ہر طرح جنگ کے لئے تیار ہیں اور اسلام کی خاطر آپؐ کے پسینہ کی جگہ اپنا خون بہانے کو حاضر ہیں اور حضرت مقداد نے تو اس شد و مد کے ساتھ فداکارانہ جذبات کا اظہار کیا کہ صحابہؓ کو اُن کی تقریر پر رشک ہونے لگا۔ مگر آپ اب بھی نگاہِ مبارک سے کسی بات کے طالب نظر آرہے تھے یہ دیکھ کر انصار میں سے حضرت سعد بن معاذ (رضی اللہ عنہ) کھڑے ہوئے اور عرض کیا: یا رسول اللہ! کیا ہم انصار کی جانب اشارہ ہے کہ ہم کچھ عرض کریں، اور پھر انصار کی جانب سے پوری وفاداری اور فداکاری کا یقین دلاتے ہوئے نہایت موثر تقریر فرمائی۔

مہاجرین و انصار کی یہ تقاریر سُن کر سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ مبارک مسرت سے تمتما اٹھا اور آپ نے ارشاد فرمایا:۔

اب اللہ کے نام پر آگے بڑھو اور بشارت حاصل کرو، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے مجھ سے وعدہ فرمایا ہے کہ دو گروہ (قافلہ اور مشرکین مکہ کا لشکر) میں سے ایک کو تمہارے قبضہ میں دیدونگا اور قافلہ نہیں بلکہ مشرکین کا لشکر تمہارے قبضہ میں دے دیا جائیگا اور خدا کا وعدہ بلاشبہ سچا ہے اور قسم بخدا میں جنگ سے قبل ابھی سے قوم

---

۱ بخاری و مسلم، نسائی و عامہ کتب سیر و تاریخ۔

کے سرداروں کی قتل گاہ کو دیکھ رہا ہوں [1] اور صحیح مسلم میں ہے کہ آپؐ نے بدر پہنچ کر زمین پر ہاتھ رکھ کر بتایا کہ اس جگہ فلاں قریشی مارا جائیگا اور یہاں فلاں قتل ہوگا۔"

سلف سے خلف تک تمام مفسرین، محدثین اور اصحاب سیر و تاریخ اس پر متفق ہیں کہ یہی وہ مشورہ ہے جس کے متعلق سورۂ انفال کی یہ آیات نازل ہوئی ہیں۔

كَمَا أَخْرَجَكَ رَبُّكَ مِنْ بَيْتِكَ بِالْحَقِّ وَإِنَّ فَرِيقًا مِنَ الْمُؤْمِنِينَ لَكَارِهُونَ يُجَادِلُونَكَ فِي الْحَقِّ بَعْدَمَا تَبَيَّنَ كَأَنَّمَا يُسَاقُونَ إِلَى الْمَوْتِ وَهُمْ يَنْظُرُونَ وَإِذْ يَعِدُكُمُ اللَّهُ إِحْدَى الطَّائِفَتَيْنِ أَنَّهَا لَكُمْ وَتَوَدُّونَ أَنَّ غَيْرَ ذَاتِ الشَّوْكَةِ تَكُونُ لَكُمْ وَيُرِيدُ اللَّهُ أَنْ يُحِقَّ الْحَقَّ بِكَلِمَاتِهِ وَيَقْطَعَ دَابِرَ الْكَافِرِينَ لِيُحِقَّ الْحَقَّ وَيُبْطِلَ الْبَاطِلَ وَ

(انفال "اللہ اور رسول کیلئے ہیں") اسلیئے کہ تیرے پروردگار نے تجھکو حق کیلئے تیرے گھر سے نکالا اور حالت یہ ہوگئی کہ مسلمانوں کا ایک فریق اس نکلنے پر گرانی کا ظہار کر رہا تھا اور وہ تجھسے حق کے بارہ میں حق کے ظاہر ہوجانیکے بعد جھگڑا کر رہے تھے گویا وہ آنکھوں دیکھے موت کے منہ میں ہنکائے جا رہے ہیں اور یہ واقعہ اسوقت پیش آیا جبکہ اللہ تمکو وعدہ دے رہا تھا کہ دونوں فریق (قافلہ و مشرکین مکہ کا لشکر) میں سے ایک فریق کو تمہارے قبضہ میں دیدیگا اور تم یہ شبہہ کرتے تھے کہ تمکو وہ گروہ ملے جسکے مقابلہ میں کانٹا بھی نہ لگے اور اللہ کا ارادہ یہ تھا کہ وہ اپنے وعدہ کے کلمات سے حق کو ثابت کردکھائے اور کافروں کی جڑ

---

[1] زرقانی جلد اص ۴۸۰۔

وَلَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُوْنَ ۝ کاٹ دے اور اس طرح حق کو حق کردے اور باطل

کو باطل، اگرچہ مجرموں کو یہ بات پسند نہ آئے۔

اب مسلمان آگے بڑھے اور بدر کے قریب پہنچ کر مدینہ کی جانب والے رُخ "عُدوۃ الدنیا" پر خیمہ زن ہو گئے اور مشرکین آگے بڑھے تو بدر پہنچ کر مدینہ سے دور مکہ کی جانب والے رُخ "عدوۃ القصویٰ" پر اترے اور محاذِ جنگ کا نقشہ اس طرح بنا کہ مسلمان اور مشرکین بالمقابل تھے اور ابوسفیان کا قافلہ اُس وقت ساحل کی جانب نیچے نیچے مشرکین کے لشکر کی پشت پر سے گذر رہا تھا کہ جب وہ چاہیں تو مشرکین مکہ کی نصرت و مدد کے لئے بے روک ٹوک آسکتے اور کمک کا کام دے سکتے ہیں اور پھر یہ عجیب صورت حال تھی کہ مسلمانوں کا محاذِ جنگ اس درجہ ریتیلا تھا کہ انسانوں اور چوپاؤں دونوں کے قدم ریت میں دھنسے جا رہے تھے اور چلنا دشوار ہو رہا تھا۔ مگر مشرکین کا محاذ جنگ ہموار اور پختہ فرش کی طرح تھا۔ غرض دشمن تعداد میں تین گنے سے زیادہ سامانِ جنگ میں پوری طرح مکمل، ذرائع رسل و رسائل میں ہر طرح مطمئن، جائے وقوع نہایت عمدہ، اور اِن تمام باتوں کے ساتھ قافلہ کی کمک متوقع تھی، اور خود اپنی حالت یہ کہ تعداد میں بہت کم، اسلحہ جنگ برائے نام، سامانِ حرب نہ ہونے کے برابر، سواریوں کا شمار برائے بیت، جائے وقوع حد درجہ خراب اور اِن تمام ناسازگار حالات کے ساتھ کمک قطعاً غیر متوقع، اور حد یہ کہ دشمن پانی پر قابض اور مسلمان اس سے محروم۔

ظاہر ہے کہ ایسی حالت میں اگر مسلمانوں کو اُن کی ذاتی رائے پر چھوڑ دیا جاتا تو اِن کی عقل و خرد بہ اسباب ظاہر اس کے سوا اور کیا فیصلہ کر سکتی تھی کہ وہ اس

وقت کو ٹال دیں اور دشمن سے کسی ایسے دوسرے وقت کے لئے جنگ کا قول و قرار کریں کہ وہ دشمن کی طرح ہر حیثیت سے جنگ کے لئے تیار ہوں، چنانچہ اسی بنا پر مسلمانوں نے وادی ذفران میں شوریٰ کے وقت ابتداً یہی کہا بھی مگر وحی الٰہی کے ذریعہ چونکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ معلوم ہو چکا تھا کہ خدا کا یہ وعدہ کہ تم کو "عیر اور نفیر" دونوں میں سے ایک پر مسلط کر دیا جائیگا، صرف اس شکل میں پورا ہونیوالا ہے کہ مسلمان مشرکین کے لشکر (نفیر) کا مقابلہ کریں اور حق و باطل کے اس معرکہ میں مسلمان کامیاب ہوں اور مشرکین ناکام و خاسر، اس لئے مسلمانوں نے پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) کی مرضی پاکر ہمہ قسم کی بے سروسامانی کے باوجود خود کو حق و باطل کی معرکہ آرائی کے لئے والہانہ و فداکارانہ جذبۂ پاک کے ساتھ پیش کر دیا۔

ایسی صورتِ حال کو قرآنِ عزیز نے اس معجزانہ اسلوبِ بیان کے ساتھ ظاہر کیا ہے۔

إِنْ كُنْتُمْ آمَنْتُمْ بِاللّٰهِ وَمَآ أَنْزَلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا يَوْمَ الْفُرْقَانِ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعَانِ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ إِذْ أَنْتُمْ بِالْعُدْوَةِ الدُّنْيَا وَهُمْ بِالْعُدْوَةِ الْقُصْوٰى وَالرَّكْبُ أَسْفَلَ مِنْكُمْ وَلَوْ تَوَاعَدْتُّمْ لَاخْتَلَفْتُمْ فِي الْمِيْعَادِ وَلٰكِنْ لِّيَقْضِيَ اللّٰهُ أَمْرًا كَانَ

اگر تم اللہ پر اور اس (غیبی مدد) پر یقین رکھتے ہو جو ہم نے فیصلہ کر دینے والے دن اپنے بندے پر نازل کی تھی جبکہ دو لشکر ایک دوسرے کے مقابل ہوئے تھے تو چاہیئے کہ اس تقسیم پر (یعنی مال غنیمت کی مقررہ تقسیم پر) کاربند ہو اور اللہ ہر شئے پر قدرت رکھتا ہے۔ یہ وہ (بدر کا) دن تھا کہ تم ادھر قریب کے ناکہ پر تھے، اُدھر دشمن دور کے ناکہ پر اور قافلہ تم سے نچلے حصہ میں تھا (یعنی سمندر کے کنارے کنارے گذر رہا تھا) اور اگر تم آپس میں لڑائی کی بات ٹھہراتے

مَفْعُوْلًا ۙ لِّيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ	تو ضرور جنگ کے وقت کے بارہ میں تم اختلاف کرتے کیونکہ
عَنْۢ بَيِّنَةٍ وَّيَحْيٰى مَنْ حَيَّ	تم چاہتے ہو کہ کسی حالت میں جنگ نہو اور دشمن چاہتا ہے کہ ضرور
عَنْۢ بَيِّنَةٍ ۭ وَاِنَّ اللّٰهَ لَسَمِيْعٌ	جنگ ہو یعنی تمھیں دشمنوں کی کثرت اور اپنی بے سروسامانی
عَلِيْمٌ ۔ (انفال)	کا اندیشہ تھا اور قافلہ پر تسلط آسان نظر آ رہا تھا اور دشمن اپنی

کثرت اور ساز و سامان کے بل پر گھمنڈ کئے ہوئے تھا لیکن اللہ نے دونوں لشکروں کو بھڑا دیا تاکہ جو بات ہونیوالی تھی اُسے کر دکھائے، نیز اسلئے کہ جسے ہلاک ہونا ہے اتمام حجت کے بعد ہلاک ہو اور جو زندہ رہنے والا ہو اتمام حجت کے بعد زندہ رہے اور بلاشبہ اللہ سب کی سنتا اور سب کچھ جانتا ہے۔

وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ بِبَدْرٍ وَّاَنْتُمْ	اور اللہ تمھاری مدد کر چکا ہے بدر کی لڑائی میں اور تم
اَذِلَّةٌ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ	کمزور حالت میں تھے، پس اللہ سے ڈرتے رہو تاکہ تم
اِذْ تَقُوْلُ لِلْمُؤْمِنِيْنَ اَلَنْ يَّكْفِيَكُمْ	شکرگذار ہو (یہ جب ہوا) کہ تو مسلمانوں سے کہہ رہا تھا
اَنْ يُّمِدَّكُمْ رَبُّكُمْ بِثَلٰثَةِ اٰلٰفٍ	کیا تمکو کافی نہیں ہے کہ تمھارا پروردگار تمھاری مدد کو
مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُنْزَلِيْنَ ۔ بَلٰٓى	آسمان سے اُترنے والے تین ہزار فرشتے بھیجے، ہاں بلا
اِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا وَيَاْتُوْكُمْ	شبہ اگر تم صبر کرو اور تقویٰ کی راہ اختیار کرو اور پھر
مِّنْ فَوْرِهِمْ هٰذَا يُمْدِدْكُمْ	ایسا ہو کہ دشمن اسی دم تم پر چڑھ آئیں تو تمھارا پروردگار
رَبُّكُمْ بِخَمْسَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ	(بھی) پانچ ہزار نشان رکھنے والوں سے تمھاری مدد
الْمَلٰٓئِكَةِ مُسَوِّمِيْنَ ۔ وَمَا جَعَلَهُ	کریگا، اللہ نے صرف یہ اسلئے کیا کہ تمھارے لئے
اللّٰهُ اِلَّا بُشْرٰى لَكُمْ وَلِتَطْمَئِنَّ	خوشخبری ہو اور اسکی وجہ سے تمھارے دل مطمئن
قُلُوْبُكُمْ بِهٖ ۭ وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ	ہو جائیں اور مدد و نصرت جو کچھ بھی ہے اللہ کی ہی

عِنْدِ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ لِيَقْطَعَ	طرف سے ہے اُسکی طاقت سب پر غالب ہے، اور
طَرَفًا مِّنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَوْ يَكْبِتَهُمْ	وہ اپنے تمام کاموں میں حکمت رکھنے والا ہے اور نیز
فَيَنْقَلِبُوْا خَآئِبِيْنَ ؀	اسلئے تاکہ منکرین حق کی جمعیت وطاقت کا ایک
(آل عمران)	حصہ بیکار کردے انھیں اسدرجہ ذلیل وخوار کردے
	کہ وہ نامراد ہوکر اُلٹے پاؤں پھر جائیں۔

دعائے نصرت | غرض اس حالت میں دونوں فریق جنگ کے لئے صف آرا ہوئے تو اوّل آپ نے مسلمانوں کی صفوف کو درست فرمایا اور پھر اُس عریش (خس پوش جھونپڑی) کے نیچے جاکر جو آپ کے لئے میدان جنگ میں بنادی گئی تھی، درگاہ الٰہی میں الحاح وتضرع کے ساتھ دعا شروع کی اور عرض کیا:۔

اَللّٰهُمَّ اَنْجِزْ لِيْ مَا وَعَدْتَنِيْ اَللّٰهُمَّ	خدایا! تونے مجھ سے جو وعدہ (نصرت) فرمایا اُسکو
اِنْ تُهْلِكْ هٰذِهِ الْعِصَابَةَ مِنْ	پورا کر۔ خدایا! اگر یہ مٹھی بھر مسلمان ہلاک ہو گئے تو
اَهْلِ الْاِسْلَامِ لَا تُعْبَدْ فِي	پھر خطۂ زمین پر کوئی تیرا عبادت گذار باقی نہیں
الْاَرْضِ [1]	رہے گا۔

صدیق اکبر (رضی اللہ عنہ) نے دیکھا تو قریب آئے اور عرض کیا: "خدا کے رسول! بس کیجئے اللہ تعالیٰ اپنا وعدہ ضرور پورا کریگا۔"

غیبی نصرت وامداد | اور آخر یہی ہوا بھی کہ ہر قسم کے ناساز گار حالات اور اس درجہ کمزوری کے باوجود کہ کسی مسلمان کا اس معرکہ سے صحیح وسالم بچکر نکل جانا خود ایک معجزہ ہوتا مسلمانوں کو غیبی نصرت وامداد نے بامراد اور کامیاب کیا، فتح اور نصرت نے قدم چومے، اور تاریخ عالم کا ایک بے نظیر اور حیرت زا انقلاب پیش

---

[1] صحیح مسلم۔

کر دیا اور مشرکین قریش کے تمام سردار اور مشہور نبرد آزما ہی قتل نہیں ہوئے
بلکہ شرک و کفر کی اجتماعی طاقت ہی کا خاتمہ ہو گیا۔

یہ غیبی نصرت کیا تھی؟ قرآن حکیم اس کا جواب متعدد آیات میں یہ دیتا ہے۔

(۱) مسلمانوں کی نگاہ میں دشمنوں کی تعداد اصل تعداد سے کم نظر آئی تاکہ
مسلمان مرعوب نہ ہوں اور مشرکین کی نگاہوں میں مسلمان مٹھی بھر معلوم ہوئے تاکہ
وہ جنگ سے جی نہ چرائیں اور معرکۂ حق و باطل ٹل نہ جائے۔ "اِذْ یُرِیْکَهُمُ اللّٰهُ
فِیْ مَنَامِكَ قَلِیْلًا ۔ (الی) وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ" (انفال) اور ایک وقت میں
دو گنے معلوم ہوئے تاکہ مسلمانوں سے مرعوب ہو کر رہ جائیں۔ قد کان لکم آیۃ
فی فئتین التقتا فئۃ تقاتل فی سبیل اللہ واُخریٰ کافرۃ یرونھم مثلیھم رای
العین واللہ یؤید بنصرہ من یشاء ان فی ذلک لعبرۃ لاولی الابصار (آل عمران)

(۲) مسلمانوں کی دعا پر اول اُن کی مدد ایک ہزار فرشتوں سے کی گئی، "اِذْ
تَسْتَغِیْثُوْنَ رَبَّكُمْ فَاسْتَجَابَ لَكُمْ اَنِّیْ مُمِدُّكُمْ بِاَلْفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُرْدِفِیْنَ" اور
پھر یہ تعداد بڑھا کر تین ہزار کر دی گئی" اَلَنْ یَّكْفِیَكُمْ اَنْ یُّمِدَّكُمْ رَبُّكُمْ بِثَلٰثَةِ اٰلٰفٍ
مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُنْزَلِیْنَ" اور اگر دشمن تم پر یک لخت حملہ کر دے تو ہم تین ہزار کی
بجائے پانچ ہزار سے مدد کریں گے "یُمْدِدْكُمْ رَبُّكُمْ بِخَمْسَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ
مُسَوِّمِیْنَ"

(۳) مسلمانوں پر عین معرکہ کے وقت اونگھ طاری کر دی جس سے چند منٹ
بعد اُن کی بیداری نے اُن میں ایک نئی تازگی اور نئی روح پیدا کر دی "اذ یغشیکم
النعاس امنۃ منہ"

(۴) آسمان سے پانی برسا کر مسلمانوں کے لئے رتیلی زمین کو پختہ فرش کی طرح بنا دیا اور نشیب کی وجہ سے حوض نما گڑھے میں پانی مہیا کر دیا اور دشمنوں کی زمین کو کیچڑ کی طرح دلدل بنا ڈالا "وَيُنَزِّلُ عَلَيْكُم مِّنَ السَّمَاءِ مَاءً لِّيُطَهِّرَكُم بِهِ وَيُذْهِبَ عَنكُمْ رِجْزَ الشَّيْطَانِ وَلِيَرْبِطَ عَلَىٰ قُلُوبِكُمْ وَيُثَبِّتَ بِهِ الْأَقْدَامَ"

نتیجۂ جنگ بہر حال معرکۂ جنگ بپا ہوا اور دونوں جانب سے نبرد آزما ایک دوسرے کے مقابل ہو کر "هَلْ مِنْ مُبَارِزٍ" پکارنے اور دادِ شجاعت دینے لگے اور پھر یکایک ہجومی جنگ شروع ہو گئی، مسلمان اول تو جنگ مغلوبہ لڑے مگر فراغتِ دعار کے بعد جب میدان جنگ میں آکر نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے "شَاهَتِ الْوُجُوهُ" : چہرے روسیاہ ہوں" پڑھتے ہوئے مٹھی بھر خاک اور کنکریاں دشمنوں کی جانب پھینکیں تو خدائے برحق کی معجزانہ قدرت نے ہوا کے ذریعہ اُس کے ذرات تمام مشرکین کی آنکھوں تک پہنچا دیے اور وہ اس ناگہانی پریشانی سے مضطرب ہو کر آنکھیں ملنے لگے اور جنگ مغلوبہ "جنگ غالبہ" کی شکل میں بدل گئی۔

وَمَا رَمَيْتَ إِذْ رَمَيْتَ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ رَمَىٰ۔ (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم! اور تو نے جب کنکریاں پھینکیں تو در حقیقت تو نے نہیں پھینکیں بلکہ اللہ نے پھینکیں (کیونکہ انسانی ہاتھ ایک مٹھی میں اتنے بڑے لشکر کو ہر آدمی پر رمی نہیں کر سکتا تھا یہ جو کچھ ہوا نبی کے ہاتھ پر خدا کا معجزہ ہوا)

اور دیر نہیں لگی کہ مشرکین کے بڑے بڑے آدمی مارے گئے اور دشمنوں کے پیر اُکھڑ گئے وہ بھاگتے تھے مگر بھاگنے کا موقع نہ پاتے تھے، چنانچہ اُن کے ستر آدمی قتل ہوئے اور ستر گرفتار اور باقی نے راہِ فرار اختیار کی۔

مسلمان اگرچہ خدا کی نصرت اور اُس کے فضل سے کامیاب ہوئے اور فتح و کامرانی کے مالک بنے، تاہم بائیس مجاہدین نے بھی جامِ شہادت نوش کیا

جنگ بدر نے تاریخ عالم کا رُخ بدل دیا

بدر کا معرکہ مورخین اور اصحابِ سیر سے بھی اگرچہ اپنی تاریخی اہمیت کا اعتراف کراتا ہے اور وہ یہ کہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ معرکۂ بدر ایک ہنگامی معرکہ نہیں تھا بلکہ اُس نے قریش مکہ کی قوت کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ کر دیا اور مسلمانوں کو اعلاءِ کلمۃ اللہ کے لئے راہیں کھول دیں، لیکن وہ بھی اس حقیقت حال سے شاید بے خبر ہیں کہ معرکہ بدر صرف مشرکین مکہ اور مسلمانوں کی آویزشِ حق و باطل کا معرکہ نہیں تھا بلکہ جس زمانہ میں یہ واقعہ پیش آیا اُس وقت دنیا ایک موڑ پر کھڑی تھی اور تاریخ عالم کا شہبازِ تیز گام اُس موڑ پر حیران و سرگرداں کھڑا تھا کہ کس جانب رُخ کرے، اس لئے بدر کا انقلاب عالمگیر انقلاب تھا۔

صفحۂ عالم پر اگر بدر کا معرکہ پیش نہ آتا اور مشرکین مکہ کی طاقت شکست و ریخت نہ ہوتی تو بلاشبہ نہ صرف حجاز، نہ صرف عرب و عجم بلکہ کائناتِ ہستی کا ہر ایک سا جبر و ظلم، سرکشی، اور باطل سے دوچار رہتا، آزادیِ ضمیر فنا ہو جاتی، جذباتِ حق مٹ کر رہ جاتے اور یہ سب قوتِ جبریل پر اپنے لئے آپ جگہ پیدا کر لیتے، اب جبکہ بدر کا معرکہ پیش آگیا اور مشرکین مکہ کی قوت ٹوٹ گئی تو دنیا نے موڑ سے آگے بڑھ کر وہ راہ اختیار کر لی جو آزادیٔ ضمیر، عدل و نصفت، حق پرستی اور نکوکاری کی راہ تھی، جہاں ضعیفوں کی نصرت فرض اور بیچاروں کے لئے چارۂ کار رہیا تھا، اسلئے خدا کا یہ عظیم الشان احسان کہ بدر میں حق کو فتح و کامرانی نصیب ہوئی صرف مسلمانوں

ہی کے لئے نہیں تھا بلکہ تمام کائنات انسانی پر احسان عظیم تھا۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے کیا خوب فرمایا:۔

بعض اوقات قدرتی حوادث کا ایک معمولی سا واقعہ بھی فتح و شکست کا فیصلہ کر دیتا ہو جنگ واٹرلو کے تمام مورخین متفق ہیں کہ اگر ۱۷ اور ۱۸ ار جون ۱۸۱۵ء کی درمیانی رات میں بارش نہ ہوئی ہوتی تو یورپ کا نقشہ بدل گیا ہوتا کیونکہ اس صورت میں نپولین کو زمین خشک ہونے کا بارہ بجے تک انتظار نہ کرنا پڑتا سویرے ہی لڑائی شروع کر دیتا نتیجہ یہ نکلتا کہ بلوشر کے پہنچنے سے پہلے ویلنگٹن کو شکست ہو جاتی، واٹرلو میں اگر بارش نہ ہوئی ہوتی تو یورپ کا سیاسی نقشہ بدل جاتا، لیکن اگر بدر میں ہوئی ہوتی تو کیا ہوتا؟ تمام کرۂ ارضی کی ہدایت و سعادت کا نقشہ الٹ جاتا۔ اسی طرف پیغمبر اسلام نے اپنی دعا میں اشارہ کیا تھا: اللّٰھم ان تھلك ھٰذہ العصابۃ فلا تعبد فی الارض = خدایا! اگر خدام حق کی یہ چھوٹی سی جماعت آج ہلاک ہو گئی تو کرۂ ارضی میں تیرا سچا عبادت گذار کوئی نہیں ہوگا[1]

قرآن عزیز کی روشنی میں غزوۂ بدر پر دوبارہ نظر

غزوۂ بدر سے متعلق بیان کردہ تفصیلات جمہور علماء اسلام کے نزدیک مسلم ہیں، خصوصاً اس مسئلہ میں تو سلف و خلف میں سے کسی کی بھی دو رائے نہیں ہیں کہ مسلمان جب مدینہ سے نکلے تو صرف قافلہ پر حملہ مقصود تھا لیکن وادیٔ ذفران میں پہنچ کر قدرتی حادثہ نے ایک دوسرے مقابلہ سے دوچار کر دیا اور یہ مشرکین مکہ کی وہ یورش تھی جو مسلمانوں کا قلع قمع کرنے کے لئے ظہور میں آئی اور اب مسلمانوں کو عیر و نفیر[2] دو کی ساتھ واسطہ پڑ گیا، اس لئے یہی وہ مقام ہے جہاں مسلمانوں کو بذریعہ وحی یہ بشارت

[1] ترجمان القرآن جلد ۲ ص ۵۰۶-۵۰۷ [2] عیر = قافلہ، اور نفیر دشمنوں کا لشکر۔

سنائی گئی کہ ان دونوں میں سے کسی ایک کو مسلمانوں کے سپرد کر دیا جائیگا اور بعض مسلمانوں نے اگرچہ انسانی کمزوری کی بنا پر "نفیر" کے مقابلہ میں "عیر" کو ترجیح دینے کا خیال ظاہر کیا، مگر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو وحی نے اطلاع کر دی تھی کہ اللہ تعالیٰ "نفیر" کے مقابلہ کو مقدر کر چکا ہے اور اس کا وعدہ اسی شکل میں پورا ہوگا، اس لئے ذاتِ اقدس کا رجحان اسی جانب ہوا، اور مشورہ کے بعد آخر وہی فیصلہ ہوا جو خدا اور خدا کے رسول کی مرضی تھی، چنانچہ قرآن عزیز کی آیات "كما اخرجك ربك من بيتك بالحق الاية" اور "اذا انتم بالعدوة الدنيا وهم بالعدوة القصوىٰ والركب اسفل منكم الاية" اسی حقیقت کا اعلان کر رہی ہیں۔

مگر جمہور کے ان مسلمات کے خلاف مولانا شبلی (مرحوم و مغفور) نے سیرۃ النبی جلد اول میں یہ دعویٰ کیا ہے کہ مسلمان شروع ہی میں مدینہ سے صرف "نفیر" کیلئے نکلے تھے اور خدا کے وعدہ "عیر و نفیر" کا حال مسلمانوں کو مدینہ ہی میں معلوم ہو چکا تھا اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے "عیر و نفیر" کے متعلق جو کچھ مشورہ کیا اور صحابہ رضی اللہ عنہم نے جو کتب سیر میں مذکور زبردست تقاریر فرمائیں وہ سب وادیٔ ذفران میں نہیں بلکہ مدینہ ہی میں ہو چکا تھا۔

مولانا ئے مرحوم نے اپنے اس دعوے کو ثابت کرنے کیلئے طویل بحث فرمائی ہے اور احادیث و سیر میں مذکور واقعات کی ترتیب کا اسلئے انکار کر دیا ہے کہ وہ اس ترتیب کو قرآن کی تصریحات کے خلاف سمجھتے ہیں اور یہ کہ بعض صحیح احادیث و روایات بھی اُن کے خیال کی ہی تائید کرتی ہیں۔

چونکہ یہ مسئلہ علمی نظر و فکر سے تعلق رکھتا ہے اس لئے ازبس ضروری ہے کہ قرآن

عزیز ہی کی روشنی میں مناظرانہ اسلوب سے بچ کر خالص تحقیقی رنگ میں اس پر "محاکمہ" کیا جائے تاکہ اصل حقیقت واضح ہو سکے۔

قرآن عزیز نے اس واقعہ کی تفصیلات دیتے ہوئے دو جگہ بصراحت اس حقیقت کا اعلان کیا کہ "نفیر" کا معاملہ مدینہ سے "عیر" کی خاطر نکلنے کے بعد اچانک سامنے آیا اور اس لئے بعض مسلمانوں نے نفیر کے مقابلہ کو ابتداءً خطرہ کی نگاہ سے دیکھا اور گراں محسوس کیا۔

(۱) پہلا مقام سورۂ انفال کی وہ چند آیات ہیں جو کما اخرجك ربك من بيتك بالحق" سے شروع ہو کر" واضربوا منهم كل بنان" تک مسلسل چلی گئی ہیں جو تقریباً سات یا آٹھ آیات ہیں۔

قرآن عزیز نے ان آیات میں اُس پورے واقعہ کو اختصار کے ساتھ بیان کر دیا ہے جو معرکہ بدر میں از اول تا آخر پیش آیا، یعنی مدینہ سے نکلنے پر مسلمانوں کے سامنے کیا کیا صورتیں پیش آئیں وہ سب ہی ایک دوسرے کے ساتھ مربوط کر کے بیان کی گئی ہیں۔ پس جس طرح "کما اخرجك ربك من بيتك" کے ساتھ "وان فريقا من المؤمنين لكارهون" کا تعلق ہے اسی طرح "واذ يعدكم الله احدى الطائفتين" اور "اذ تستغيثون ربكم" اور "اذ يغشيكم النعاس" "وينزل عليكم من السماء ماء" وغیرہ واقعات کا بھی تعلق ہے اور یہ ظاہر ہے کہ مولانا شبلی مرحوم بھی جمہور کے ساتھ اس پر متفق ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا درگاہ الٰہی میں استغاثہ پیش کرنا، ملائکہ کی مدد کا آنا، مسلمانوں پر اونگھ طاری کر کے تازہ دم کر دینا، آسمان سے پانی کا برس کر مسلمانوں کے حق

میں رحمت ثابت ہونا، یہ کُل معاملات اُس آن ہی نہیں پیش آ گئے تھے، جس آن میں مسلمان مدینہ سے نکلے تھے بلکہ یہ ایک طویل سلسلہ تھا جو ایک مدت کے اندر وقوع پذیر ہوتا رہا ہے۔

پس اگر بقول مولانائے مرحوم آیت "کما اخرجك ربك" میں اُس آن کے ماسوا جو مدینہ سے خروج کے ساتھ مربوط ہے اور کچھ مُراد نہیں ہے تو پھر یہ تسلیم کرنا پڑیگا کہ باقی وہ تمام واقعات جو اس آیت کے ساتھ مربوط کرکے بیان ہوئے ہیں گو کلام مستانف ہی کی حیثیت میں کیوں نہ ہوں" وہ سب بھی اسی ایک آن سے متعلق ہیں اور ظاہر ہے کہ یہ قطعًا باطل اور خلاف واقعہ ہے۔ اس لئے اس آیت کا صاف اور صریح مطلب یہ ہے کہ قرآن عزیز عام بول چال اور محاورہ کے مطابق یہ کہہ رہا ہے کہ مسلمانوں کو ذرا اُس واقعہ کی جانب بھی نظر کرنی چاہیئے،

جب پروردگار نے تم کو ایک مرتبہ مدینہ سے باہر حق کی خاطر نکالا تھا اور تمھارے سامنے ایسی صورتِ حال پیش آ گئی تھی کہ تم پر یہ گراں گذرنے لگا تھا کہ کیوں ہم مدینہ سے باہر نکلے کہ آخر کار ہمارے سامنے یہ صورت گراں بار آ گئی اور یہ وہ وقت تھا جبکہ خدا نے تم سے "عیر و نفیر" میں سے ایک کا وعدہ کیا، وغیرہ وغیرہ۔

یہی وجہ ہے کہ تمام مفسرین آیت "وان فریقا من المومنین لکارھون" کے متعلق عربیت کے قاعدہ سے یہ فرما رہے ہیں۔

والجملة فی موضع　　　　اور یہ جملہ حال واقع ہو رہا ہے اور یہ حالِ مقدرہ ہے اسلئے کہ جس کراہت

الحال وھی حال	کا آیت میں ذکر ہو رہا ہو وہ مدینہ سے نکلنے کے بعد پیش آئی تھی جیسا کہ
مقدرۃ لان الکراھۃ	انشاء اللہ ابھی تجھ کو معلوم ہو جائیگا، یا یوں کہیئے کہ یہ اس پوری
وقعت بعد الخروج	حالت کا نقشہ بیان ہو رہا ہو جو مدینہ سے نکلنے کے وقت سے معرکہ بدر
کما تراہ ان شاء اللہ	کے ختم تک پیش آئی (یعنی "اَخْرَجَكَ" میں اخراج سے زمانہ ممتد
تعالی ویعتبر ذلک ممتدا[1]	مراد ہے آنی مراد نہیں ہے)

تو اب صورت حال یہ بنی کہ جو شخص "لکارھون" میں مذکورہ واقعۂ کراہت کو آنی قرار دیتا ہے اور اس پورے واقعہ کو مدینہ کے اندر ہونا ثابت کرتا ہے اس کے پاس تو صرف ایک ایسا تخمینی احتمال ہے جس کا ثبوت اُن قرائن سے قطعاً نہیں ملتا جو مابعد آیات میں موجود ہیں اور جو شخص یہ کہتا ہے کہ آیت "اخرجك" میں اخراج آنی نہیں ہے بلکہ وہ ممتد مدت مراد ہے، جس میں یہ معرکہ پیش آیا تو بعد کی تمام آیات بلاشبہ اُس کے دعوے کے لئے واضح قرینہ بنتی اور دعوے کی تصویب کرتی نظر آتی ہیں

(۲) دوسرا مقام سورۂ انفال ہی کی وہ آیات ہیں جو (وما انزلنا علی عبدنا یوم الفرقان یوم التقی الجمعان" سے شروع ہو کر "والی اللہ ترجع الامور" پر ختم ہوتی ہیں، ان آیات میں قرآن حکیم نے اول مسلمانوں اور مشرکوں کے محاذ جنگ کا کا نقشہ اس طرح کھینچا ہے کہ مسلمانوں کا محاذ جنگ مدینہ سے قریب وادی میں تھا اور مشرکین مکہ ان کے بالمقابل جانب بعید کی وادی میں خیمہ زن تھے اور اس وقت ابوسفیان کا قافلہ مسلمانوں کی وادی سے نیچے نیچے سمندر کے کنارے اس طرح گذر رہا تھا کہ وہ مکی فوج کی پشت پر تھا کہ اگر وہ چاہے تو مسلمانوں کی زد

---

[1] روح المعانی جلد ۹ ص ۱۵۲ و ابن کثیر و روح البیان و البحر المحیط وغیرہ

سے محفوظ ہو کر بے خوف اپنی فوج کی مدد کر سکتا ہے "واذ انتم بالعدوۃ الدنیا وھم بالعدوۃ القصوی والرکب اسفل منکم" اور اس کے بعد کہتا ہے کہ یہ صورت حال مسلمانوں کے لیے اس درجہ ناسازگار تھی کہ اگر تقدیر الٰہی یہ فیصلہ نہ کر لیتی کہ بدر کا معرکہ ضرور پیش آئیگا، اور اس کا انجام مسلمانوں کی حق میں ہوگا اور جنگ کے معاملہ کو مسلمانوں اور مشرکوں کے باہمی عہد و پیمان پر چھوڑ دیا جاتا تو مسلمان آپس میں بھی مختلف المیعاد ہو جاتے، بعض کہتے کہ اس میدان میں حق و باطل کا فیصلہ ہو جائے تو اچھا ہے اور بعض کہتے کہ ہم ان ناسازگار حالات میں ہرگز جنگ کی طاقت نہیں رکھتے اس لئے دوسرے وقت کے لیے اس جنگ کو ٹال دینا چاہیئے اور "نفیر" کی جگہ "عیر" کو قبضہ میں کر لینا چاہیئے جیسا کہ پیش آیا، اور بعض کو جنگ کا معاملہ سخت گراں گذرا اور ہو سکتا تھا کہ سب ہی مسلمان یہ چاہتے کہ اس وقت معرکۂ جنگ بپا نہ ہو، اور مشرکین اپنے ساز و سامان کے زعم پر یہ اصرار کرتے کہ اسی وقت اور اسی جگہ معرکہ ہو جانا از بس ضروری ہے اور یہ نقشہ سامنے آجاتا " لو تواعدتم لاختلفتم فی المیعاد" مگر ہوا یہ "ولکن لیقضی اللہ امراً کان مفعولا"

ان آیات میں قابل غور بات یہ ہے کہ اگر مشرکین مکہ کی فوج کشی کا حال مسلمانوں کو مدینہ ہی میں معلوم ہو گیا تھا اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں سے مدینہ ہی میں وہ مشورہ فرمایا تھا جس کا ذکر تمام کتب حدیث و سیرت میں موجود ہے اور اُسی مقام پر خدا نے احد الطائفتین کا وعدہ فرما کر اپنے نبی کو وحی کی ذریعہ یہ بھی بتا دیا تھا کہ خدا کی مرضی معرکۂ حق و باطل کی ہے، قافلہ پر تسلط کی نہیں ہے تو پھر

عقل حیران ہے کہ ان تمام امور کے معلوم ہو جانے کے بعد مسلمان خود کو کس لئے بے سروسامان سمجھ رہے تھے اور کس وجہ سے بعض مجاہدینِ اسلام جنگ سے جی چرا رہے تھے، جبکہ مدینہ میں مسلمانوں کے پاس ہزاروں اونٹ موجود تھے گھوڑے بھی کم نہیں تھے ستو، پچاس گھوڑوں کا مہیا ہونا معمولی بات تھی تلواروں اور نیزوں کی بھی کچھ کمی نہیں تھی اور ان سب باتوں پر مستزاد یہ کہ جب ان کو دشمنوں کی عددی طاقت کا بھی صحیح اندازہ تھا تو آخر وہ کیا سبب تھا کہ مسلمان جن میں انصار بھی ہیں اور مہاجرین بھی صرف تین سو تیرہ ہی کی تعداد میں کیوں نکلے؟ اور نکلے بھی اس بے سروسامانی کے ساتھ کہ نیزے اور تلواریں تک بھی ہر ایک کے پاس موجود نہیں، چہ جائیکہ باقی سامانِ حرب و ضرب مکمل ہوتا اور کیا بدر کے اس واقعہ کے علاوہ کسی بھی ایسے غزوہ یا سریہ کا حوالہ دیا جا سکتا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے لئے مدینہ میں بیٹھ کر تیاری فرمائی ہو اور مسلمانوں میں دشمن کے مقابلہ کے لئے وہ ہراسانی اور گرانی پیدا ہوئی ہو جس کا ذکر قرآن ان جملوں میں کرتا نظر آتا ہے "وانّ فریقًا من المؤمنین لکارھون" یجادلونک فی الحق بعد ما تبین کانما یساقون الی الموت" ولو تواعدتم لاختلفتم فی المیعاد"

کیا ہمارے سامنے غزوۂ تبوک (غزوۂ عسرت) کا نقشہ موجود نہیں ہے کہ دشمن کی تعداد لاکھوں تک پہنچی ہوئی ہے اور مشرکینِ مکہ جیسے غیر متمدن نہیں بلکہ متمدن عیسائی طاقت سے معاملہ ہے جو ہر قسم کے متمدن سازوسامانِ جنگ سے مسلح ہے اور پھر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ میں نہیں مدینہ کے قرب وجوار میں نہیں بلکہ خود دشمن کے گھر پر جا کر معرکۂ حق و باطل گرم کرنا چاہتے ہیں، لیکن ان تمام

باتوں کے باوجود ایک مسلمان بھی ہراساں نہیں، گراں خاطر نہیں بلکہ پروانہ وار نثار ہونے کو، ایک دوسرے پر بازی لیجانے کے لئے مدینہ سے تبوک کی جانب قدم بڑھا رہے ہیں۔

بات بالکل صاف ہے کہ مسلمان درحقیقت اس بے سروسامانی کے ساتھ لڑنے کے لئے نہیں بلکہ قافلہ پر قبضہ کرنے کے لئے نکلے تھے اور اس کے لئے یہ جمعیت اور یہ صورتِ حال کافی تھی لیکن بدر کے قریب پہنچ کر اچانک صورتِ حال تبدیل ہو گئی اور مسلمانوں کو دو باتوں کا ایک ساتھ علم ہوا، ابوجہل مکہ سے لشکر کشی کر کے آرہا ہے اور ابوسفیان کا قافلہ بدر سے گذر کر مکہ جارہا ہے، تب وہ سب کچھ پیش آیا جس کو تفصیل کے ساتھ سُن آئے ہو اور یہی وہ حالت تھی جس کا ذکر قرآن نے اس طرح کیا۔ "وان فریقا من المؤمنین لکارھون" اور "لو تواعدتم لاختلفتم فی المیعاد۔"

بہرحال اِن ہر دو مقامات کا تبادر، کلام الٰہی کا سیاق وسباق، اور آیات کی اندر موجود قرائن و دلائل؛ کے سامنے مصنف سیرت النبی کا "کما اخرجک ربک من بیتک" کے اجمال سے بے دلیل ایک دعویٰ کر دینا کسی طرح صحیح نہیں ہے اور آیت "وان فریقاً من المؤمنین لکارھون" میں 'و' حالیہ کے لئے بقاعدۂ عربیت ہرگز یہ ضروری نہیں کہ حال اور ذوالحال کا زمانہ اس طرح ایک ہو کہ دونوں آنِ واحد سے وابستہ ہوں بلکہ زمانہ کا امتداد نہ صرف ممکن الوقوع بلکہ اکثر الوقوع ہوتا ہے نیز "حال مقدرہ" کی مثالیں کلام عرب میں بیشتر موجود ہیں اور "حال مقدرہ" کا حاصل یہ ہے کہ جو واقعہ کسی ایک بات کی بنا پر آئندہ قریبی زمانہ میں پیش آنیوالا ہے اُس کو بر سبیل تقدیر

داو حالیہ کے ساتھ اس طرح بیان کر دیا جاتا ہے کہ گویا وہ اسی آن میں پیش آیا ہو کیونکہ اُس کا پیش آنا یقینی ہے اور اس صورت میں آیت کے معنی یہ ہوں گے کہ مدینہ سے خروج اس حالت میں ہوا کہ جب صورتِ حال نازک بن کر سامنے آئی تو مسلمانوں کے ایک گروہ پر گراں گذرنے لگا کہ اے کاش مدینہ سے کیوں نکلے جو اس صورت کے ساتھ دوچار ہونا پڑا۔

(۲) یہ بھی صحیح نہیں ہے کہ کاروانِ تجارت مسلمانوں کے ہاتھ سے اس طرح بچ کر نکل گیا تھا کہ مسلمان اُس کا تعاقب نہ کر سکیں اور اس کو قابو میں نہ لا سکیں، چنانچہ آیت "والرکب اسفل منکم" اس پر صاف دلالت کر رہی ہے البتہ مسلمانوں کو اپنے جاسوسوں کے ذریعہ جو کچھ قافلہ کے متعلق معلوم ہوا تھا اُس کے پیشِ نظر یہ خیال اب بھی تھا کہ ابو سفیان کا قافلہ بدر ہی کے راستہ سے گذریگا اور اس لئے وہ وادیٔ ذفران میں مشورہ کے وقت کاروانِ تجارت کی طالب تھے اور اسی لئے اللہ تعالیٰ نے یہ وعدہ کیا کہ دونوں میں سے کسی ایک گروہ پر تم کو ضرور مسلط کر دیں گے، درحقیقت حال کے پیشِ نظر ہی یہ بھی اپنے رسولؐ کو بتلا دیا کہ "عیر" سے نہیں بلکہ "نفیر" سے تم کو واسطہ پڑیگا اور تم کامیاب ہو گے۔

اس صورتِ حال کو اگرچہ بعض اصحابِ سیرت نے واضح نہیں کیا، مگر محققین اربابِ سیر نے اس حقیقت کو مستند روایات سے ثابت کیا ہے۔

چنانچہ ابن کثیر نے اپنی تفسیر اور تاریخ میں اور حافظ ابن حجر نے فتح الباری اور شیخ بدر الدین عینی نے عمدۃ القاری میں بسند اس واقعہ کو حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے، فرماتے ہیں:۔

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ونحن بالمدینۃ انی اخبرت عن عیر ابی سفیان انہا مقبلۃ فھل لکم ان نخرج قبل ھذہ العیر لعل اللہ یغنمناھا فقلنا نعم فخرج وخرجنا فلما سرنا یوما او یومین قال لنا ما ترون فی قتال القوم فانھم قد اخبروا بخروجکم فقلنا لا واللہ ما لنا طاقۃ بقتال العدو ولکنا اردنا العیر (الحدیث) [1]	ہم مدینہ میں تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مجھ ابھی معلوم ہوا کہ ابی سفیان کا کاروانِ تجارت شام سے آ رہا ہے کیا تم تیار ہو کہ اس سے قبل اس کی راہ گھیر لو کیا عجب کہ اللہ تعالیٰ اس بہانہ ہم کو مالِ غنیمت عطا کرے۔ ہم سب نے عرض کیا "ہاں" پس آپ بھی نکلے اور ہم بھی نکلے، ابھی ایک یا دو دن کی مسافت پر ہی پہنچے تھے کہ آپ نے فرمایا مجھے معلوم ہوا ہے کہ اہل مکہ فوج کشی کے ارادہ سے آ رہے ہیں، اب کیا ارادہ ہے؟ تب ہم نے عرض کیا: یا رسول اللہ! قسم بخدا اس حالت میں ہم میں دشمن کے مقابلہ کی طاقت نہیں ہے، البتہ قافلہ پر حملہ کا ارادہ ضرور ہے۔

یہ اور اسی قسم کی روایات بکثرت موجود ہیں جن میں صراحت ہے کہ مسلمان وادی ذفران میں کاروانِ تجارت پر حملہ آور ہونے کے متوقع تھے اور وجہ یہی تھی کہ اُن کے جاسوسوں نے بدر میں اُس کے آنے کی خبر دی تھی۔

(۳) آیت "تودون ان غیر ذات الشوکۃ تکون لکم (الآیہ) میں جمہور کے نزدیک نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اسی جانب ہیں جس جانب خدا ہے اور جب بعض مسلمانوں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے رُخ کو پہچان لیا تو پھر وہ بھی خدا اور خدا کے رسول کی مرضی

---

[1] تفسیر ابن کثیر برحاشیہ فتح الباری جلد ۴ ص ۲۶۱۔

کے ساتھ ہو گئے، اس لئے اس حقیقت کو ان جذباتی الفاظ سے بے حقیقت نہیں بنایا جا سکتا۔

ایک طرف وہ لوگ ہیں جو قافلہ تجارت پر حملہ کرنا چاہتے ہیں، دوسری طرف خدا ہے (جو چاہتا) ہے کہ حق کو قائم کرے اور کافروں کی جڑ کاٹ دے۔ اب سوال یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان دو میں سے کس کے ساتھ ہیں؟ عام روایتوں کے مطابق اس سوال کا کیا جواب ہوگا، میں اس تصور سے کانپ اٹھتا ہوں [1]

(۴) واقعہ کی نوعیت دراصل وہ نہیں ہے جس کو بزعم خود مصنف سیرۃ النبی نے گڑھ کر بیان کر دیا اور پھر اس پر سوالات قائم کر دیئے بلکہ نوعیت واقعہ وہی جس کو ہم بصراحت و بدلائل ابھی بیان کر آئے ہیں اور جس کو تسلیم کرنے کے بعد شبہ اور اعتراض کی گنجائش ہی نہیں رہتی۔

(۵) "لَا يَسْتَوِي الْقَاعِدُونَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ غَيْرُ أُولِي الضَّرَرِ وَالْمُجَاهِدُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ۔ مسلمانوں میں جو لوگ صحیح و تندرست ہوتے ہوئے بھی گھروں میں بیٹھے رہے تو وہ ان کے برابر ہرگز نہیں ہو سکتے جو اپنی جان و مال کے ذریعہ اللہ کی راہ میں جہاد کرتے ہیں۔"

بیشک صحیح بخاری میں اس آیت کے متعلق حضرت ابن عباس کا یہ قول نقل کیا ہے "کہ یعنی وہ لوگ جو بدر میں نہیں شریک ہوئے اور وہ جو شریک ہوئے دونوں برابر نہیں ہو سکتے اور یہ صحیح ہے کہ صحیح بخاری میں یہ بھی ہے کہ پہلے آیت میں "غیر اولی الضرر" کا جملہ نہیں نازل ہوا تھا تو آیت سن کر حضرت عبداللہ بن ام مکتوم رض

---

[1] سیرۃ النبی جلد ۱ ص ۲۳۱۔

خدمتِ اقدس میں حاضر ہوئے اور اپنے نابینا ہونے کا عذر کیا، اس پر وہیں یہ جملہ نازل ہوا "غیر اولی الضرر"

لیکن اس کے باوجود مصنف سیرت النبی کا اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا صحیح نہیں ہے۔

یہ صاف اس بات کی دلیل ہے کہ مدینہ ہی میں معلوم ہو گیا تھا کہ قافلہ پہ حملہ کرنا نہیں بلکہ لڑنا اور جان دینا ہے۔

یہ نتیجہ اخذ کرنا اس لئے درست نہیں ہے کہ اس آیت کے شانِ نزول کے متعلق تین صحابیوں سے روایات منقول ہیں ان میں سے دو صحابی زید بن ثابت اور براء بن عازب رضی اللہ عنہما تو غزوۂ بدر سے جدا اس کا نزول بیان کرتے ہیں، اور حضرت عبد اللہ بن عباس (رضی اللہ عنہ) بدر کے ساتھ اس کو وابستہ فرماتے ہیں لہذا اس اختلاف کو دیکھ کر مشہور اور محقق محدثین اور شارحینِ بخاری، ابن تین اور بدر الدین عینی (رحمہما اللہ) یہ فرماتے ہیں کہ صحابہ (رضی اللہ عنہم) کا یہ عام قاعدہ ہے کہ اگرچہ کسی آیت کا تاریخی اور حقیقی شانِ نزول ایک خاص واقعہ سے متعلق ہو لیکن اس آیت کے مفہوم و مصداق میں جس قدر واقعات و جزئیات داخل ہو سکتی ہیں اُن سب کے متعلق یہ کہہ دیا کرتے ہیں کہ اس آیت کا شانِ نزول یہ واقعہ ہے[1]

لہذا جبکہ تمام علماء تفسیر اس پر متفق ہیں کہ اس آیت کا تاریخی شان نزول بدر کا واقعہ نہیں ہے تو حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کا یہ ارشاد اسی عموم کے اعتبار سے ہے کہ جبکہ بدر کے معرکہ میں بھی مسلمان دو حصوں میں منقسم تھے، ایک شریکِ جنگ اور دوسرے مدینہ میں مقیم تو بلا شبہ فضیلت درجات میں دونوں برابر نہیں

[1] فتح الباری جلد ۸ ص ۲۱۱ مصری و عینی جلد ۸ ص ۵۶۴ -

ہو سکتے۔ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے بطریق تفسیر یہ فرمایا ہے "لا یستوی القاعدون من المؤمنین عن بدر والخارجون الی بدر" بطور واقعہ اس کو نقل نہیں کیا اور اسی لئے حضرت عبد اللہ ابن مکتوم کے واقعہ کا بھی ذکر نہیں فرمایا اور ترمذی میں اس قسم کی تفصیل اگر منقول ہے تو خود ترمذی نے یہ کہہ کر اس تفصیل کو کمزور کر دیا ہے "ہذا حدیث حسن غریب من ہذا الوجہ من حدیث ابن عباس" یہ حدیث اس تفصیلی طریقہ پر ابن عباس سے بسند حسن غریب ثابت ہوئی یعنی اس ایک راوی کے علاوہ دوسرا کوئی طریق سند موجود نہیں ہے جس میں حضرت عبد اللہ بن عباس (رضی اللہ عنہما کی روایت میں حضرت عبد اللہ بن ام مکتوم کا واقعہ منقول ہو اور اسی لئے امام بخاری نے اس تفصیل کو قابل ترک سمجھ کر فقط تفسیر کو ہی لیا ہے۔

پس اس آیت کو بھی اپنے دعوے کے لئے سند بنانا کسی طرح صحیح نہیں ہو سکتا۔

(۶)، کفار قریش جو مکہ سے لڑنے کے لئے بدر میں آئے اُن کی نسبت قرآن مجید میں ہے "وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ خَرَجُوا مِنْ دِيَارِهِمْ بَطَرًا وَرِئَاءَ النَّاسِ وَيَصُدُّونَ عَنْ سَبِيلِ اللهِ۔ اُن لوگوں کی طرح نہ بنو جو اپنے گھروں سے مغرورانہ نمائش اور خدا کی راہ سے روکے ہوئے نکلے۔ اگر قریش صرف قافلۂ تجارت کے بچانے کے لئے نکلتے تو خدا کیوں کہتا کہ وہ اظہار شان اور دکھاوے کے لئے خدا کی راہ سے لوگوں کو روکتے ہوئے نکلے۔ الخ

یہ بھی مصنف سیرت النبی کا ایک انوکھا استدلال ہے اس لئے کہ جن روایات

میں یہ ہے کہ کفار قریش قافلہ تجارت کے بچانے کے لئے نکلے، ان ہی میں یہ بھی بصراحت موجود ہے کہ جب ابوسفیان نے قاصد کے ہاتھ کہلا بھیجا کہ ہم مسلمانوں کی زد سے بچ گئے ہیں۔ تم اب واپس مکہ چلے جاؤ تو ابوجہل نے صاف انکار کر دیا اور کہا کہ اب تو ہم مسلمانوں کا قلع قمع کر کے ہی جائیں گے اور یہی وہ جذبہ تھا جس نے کفار قریش کو بدر کی جانب اُس نخوت کے ساتھ پیش قدمی کیلئے اُبھارا جس کا ذکر قرآنِ حکیم اس آیت میں کر رہا ہے،

اس کے بعد مولانائے مرحوم نے احادیث سے اپنے مقصد کی تائید چاہی ہے اور اس سلسلہ میں یہ دعویٰ کیا ہے کہ تمام ذخیرۂ حدیث میں کعب بن مالک کی روایت کے علاوہ کہیں یہ مذکور نہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بدر میں قریش کے قافلۂ تجارت پر حملہ آوری کے لئے نکلے نیز کعب بن مالک کی روایت مولانا کی نزدیک متعدد وجوہ سے قابل بحث ہے۔

حضرت کعب رضی اللہ کی روایت بخاری میں اس طرح منقول ہے،

عن عبد اللہ بن کعب قال کعب لم اتخلف عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی غزوۃ غزاھا الا غزوۃ تبوک غیر ان کنت تخلفت فی غزوۃ بدر ولم یعاتب احد تخلف عنہا انما خرج النبی صلی اللہ علیہ وسلم	کعب بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو چھوڑ کر کسی غزوہ میں پیچھے نہیں رہا بجز غزوۂ تبوک کے اور ہاں غزوۂ بدر میں بھی شریک نہیں تھا اور جو اسمیں شریک نہیں ہوا اُس پر کچھ عتاب نہیں کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم قریش کے قافلہ کے لئے نکلے تھے کہ خدا نے دونوں فریق کو اچانک مقابل کر دیا

یدیل عیر قریش حتی جمع اللہ

بینہ و بینہم علی غیر میعاد[1]

حضرت کعب کی اس روایت کی تائید ذخیرۂ حدیث میں دیگر روایات سے بھی ہوتی ہے چنانچہ گذشتہ صفحات میں ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ کی حدیث جس کو ابن مردویہ اور ابن ابی حاتم سے تمام محدثین و ارباب سیر نے نقل کیا ہے گذر چکی ہے اُسمیں صراحت کے ساتھ یہ کہا گیا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اول مدینہ سے ابو سفیان کے قافلہ کے لیے نکلے اور جب ایک یا دو دن کی مسافت پر پہنچے تو معلوم ہوا کہ کفار مکہ کا لشکر مقابلہ کے لئے آرہا ہے تب آپؐ نے پھر مشورہ کیا اور اسی مشورہ میں بعض مسلمانوں نے جنگ کے حق میں گرانی کا اظہار کیا اس لئے یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ ذخیرۂ حدیث میں کعب کی روایت کے علاوہ کوئی روایت اس کو ظاہر نہیں کرتی کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ سے ابو سفیان کے قافلے کے لئے نکلے تھے۔

رہا کعب کی حدیث کا معرض بحث ہونا تو یہ دعویٰ خود محل نظر ہے جو حسب ترتیب لائق توجہ ہے۔

(۱) فرماتے ہیں کہ حضرت کعب چونکہ غزوۂ بدر میں شریک نہیں تھے اس لئے انکی روایت اس موقعہ پر مشاہدہ و واقفیت کی روایت نہیں،

میدان استدلال میں یہ عجیب دلیل ہے اس لئے کہ جب مصنف سیرۃ النبی کا یہ دعویٰ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ سے شروع ہی میں کفار قریش سے جنگ

---

[1] جلد ثانی کتاب الغزوات۔

کے ارادے سے نکلے تھے اور مدینہ میں ہی مشہور تاریخی مشورہ فرمایا تھا تو کعب بن مالک خواہ غزوۂ بدر میں شریک نہ ہوئے ہوں، لیکن مدینہ میں بہرحال موجود تھے، اس لئے یہ کیسے ممکن ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم انصار و مہاجرین سے مشورہ فرمائیں اور موجودہ صحابہؓ شرکت نہ کریں لہذا، حضرت کعب کی روایت کو مشاہدہ و واقعیت کی روایت تسلیم نہ کرنا قطعاً بے سند ہے البتہ اگر یہ تسلیم کرلیا جائے کہ جنگ کے متعلق مشورہ مدینہ سے باہر کسی وادی میں ہوا تھا، تب یہ بیشک کہا جاسکتا ہے کہ کعب اگر اس مشورہ کے متعلق کچھ فرمائیں تو وہ مشاہدہ واقعیت کی روایت نہیں ہوگی کیونکہ وہ غزوۂ بدر میں شریک نہیں تھے۔

(۲) اس واقعہ کی روایت سے ان کا مقصود یہ ہے کہ غزوۂ بدر کی اہمیت کم ہوجائے تاکہ عدم شرکت سے اُن کا وزن کم نہ ہو الخ

مولانا کا ایک صحابی کے متعلق یہ سوءِ ظن بھی، قطعاً بے سند اور بے دلیل ہے اسلئے کہ حضرت کعب بدر کی اہمیت کو کم کرنا نہیں چاہتے بلکہ اُس کی اہمیت اور عظمت کا احساس ہی اُن کو اس پر مجبور کر رہا ہے کہ وہ اپنی عدم شرکت کے لئے یہ معذرت پیش کریں کہ اُن کو یہ سعادت اس لئے نصیب نہ ہوسکی کہ جب مسلمان مدینہ سے نکلے تھے تو چونکہ کاروانِ تجارت کے لئے نکلے تھے اس لیے سب کی شرکت ضروری نہیں تھی تاہم جو نکلے اُن کو وہ بے نظیر شرف ہاتھ آگیا جس سے ہم جیسے محروم رہ گئے۔

کعب بن مالکؓ کی اس روایت میں ایک اور باریک نکتہ مستور ہے جو مولانا کے دعوے کو یکسر باد ہوا بنا دیتا ہے وہ یہ کہ حضرت کعبؓ اس جانب بھی توجہ

لار ہے ہیں کہ اگر بدر کا معرکہ غزوہ تبوک کی طرح مدینہ کے اندر ہی طے شدہ ہوتا اور
نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ سے اس ہی غرض کے لئے نکلتے تو یہ ناممکن تھا کہ
اس قدر اہم اور عظیم الشان غزوہ کے لئے "نفیر عام" نہ ہوتا اور جو لوگ جی چرا کر یہاں
بیٹھ رہتے واپسی پر اُن سے باز پرس نہ کی جاتی، جبکہ غزوۂ تبوک میں اہی کعب اور
ان کے دو رفقا سے عدم شرکت پر اس قدر سخت باز پرس ہوئی تھی کہ ذات اقدس
صلی اللہ علیہ وسلم نے اِن کے مقاطعہ کا حکم صادر فرما دیا تھا اور جب تک اُن کی توبہ
کے قبول پر وحی الٰہی کا نزول نہیں ہوا تقریباً پچاس دن مقاطعہ کا سلسلہ جاری رہا
اس لئے یہ یقین کرنا چاہیئے کہ غزوۂ تبوک میں جو پر ناراضی کا اظہار اور مقاطعہ کا
اعلان اور بدر میں ان امور کا فقدان بلاشبہ اس لئے تھا کہ معرکۂ بدر ارادی نہیں تھا
بلکہ حسب اتفاق بالکل اچانک پیش آگیا اور در حقیقت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور
مسلمان مدینہ سے "عیر" کے ہی لئے نکلے تھے۔ غرض حضرت کعبؓ غزوۂ بدر کی حیثیت
کو کم کرنا نہیں چاہتے بلکہ اپنے عذر عدم شرکت کی معقولیت کو ظاہر کرنا اور واقعہ کی
نوعیت کو واشگاف کرنا چاہتے ہیں۔

پھر یہ عجیب بات ہے کہ مصنف سیرت النبی تو یہ معلوم کر سکیں کہ قرآن ناطق
ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ سے ہی کفار قریش کے مقابلہ میں نکلے اور اُن کی
بقول احادیث بھی یہی صراحت کر رہی ہیں، لیکن کعب بن مالک پر ساری عمر یہ حقیقت
آشکارا نہ ہو سکی، ہاں یہ حقیقت جُدا ہے کہ مولانا کے نزدیک کعب بن مالک اپنی اہمیت
کو برقرار رکھنے کے لئے جان بوجھ کر کذب بیانی تک پر آمادہ ہو گئے، مگر میں تو اس کی تصور
سے بھی کانپ اٹھتا ہوں۔

(۳) مولانا کے نزدیک بخاری میں مذکور کعب بن مالکؓ کی روایت حضرت انسؓ کی اُس روایت کے بھی خلاف ہے جو مسلم اور مصنف ابن ابی شیبہ میں منقول ہے

عن انس ان رسول اللہ صلعم	حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ
شاور حین بلغہ اقبال ابی	علیہ وسلم کو جب ابوسفیان کے آنیکی خبر معلوم ہوئی تو
سفیان قال فتکلم ابو بکر	آپ نے مشورہ طلب کیا حضرت ابوبکرؓ بولے تو آپ نے توجہ
فاعرض عنہ فتکلم عمر فاعرض	نہ فرمائی پھر حضرت عمرؓ بولے آپ نے اُنکی طرف بھی
عنہ فقام سعد بن عبادہ فقال	توجہ نہ کی، پھر سعد بن عبادہ کھڑے ہوئے اور کہا یا
ایانا ترید یا رسول اللہ والذی	رسول اللہ کیا آپ کا روئے خطاب ہم انصار کی
نفسی بیدہ لو امرتنا ان تخیضہا	طرف ہے خدا کی قسم اگر دریا میں سواری ڈالنی کا آپ
البحر لاخضناھا الخ	حکم دیں تو ہم ڈال دینگے الخ۔

یعنی اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ جب ابوسفیان کے آنے کا حال معلوم ہوا تو اُسی وقت آپؐ نے مہاجرین و انصار سے مشورہ کیا اور انصار سے اعانت کی خواہش کی اور ابوسفیان کی آمد کا حال مدینہ ہی میں معلوم ہو چکا ہے، اس بنا پر یہ محقق طور پر ثابت ہو گیا کہ اس غزوہ کی شرکت کے لئے آپ نے انصار سے مدینہ ہی میں خواہش کی تھی۔

مگر مولانا کا یہ استدلال بھی صحیح نہیں ہے اس لئے کہ اس روایت میں راویؒ نے ایک بہت بڑی غلطی کر دی ہے وہ یہ کہ اُس نے انصار مقررین میں سعد بن عبادؓ کا نام لیا ہے، حالانکہ تمام محدثین کا اس پر اتفاق ہے کہ حضرت سعد بن عبادہؓ غزوۂ بدر میں شریک نہیں تھے اور تمام ذخیرۂ حدیث میں اس تقریر کو حضرت مقدادؓ کی جانب

منسوب کیا گیا ہے اور یہی صحیح و درست ہے، البتہ سعد بن عبادہ نے اسی قسم کی تقریر
حدیبیہ کے موقع پر کی تھی جس کا ذکر روایات میں بکثرت موجود ہے تو ثابت ہوا کہ اس
روایت میں راوی نے واقعہ کو خلط ملط کر دیا ہے، پس حدیث انسؓ کے ابتدائی
جملوں میں بھی یا تو ابہام و اجمال ہے اور یا راوی کے وہم کی وجہ سے مدینہ کی ابتدائی
مشورہ اور وادی ذفران کے مشہور تاریخی مشورہ کے درمیان خلط ہو گیا ہے چنانچہ
مشہور محدث اور بخاری کے شارح حافظ ابن حجر بھی روایت انسؓ کا ذکر کرتے ہوئے
یہ فرماتے ہیں۔

ووقع في مسلم ان سعد بن عبادة
هو الذي قال ذلك وكذا اخرجه
ابن ابي شيبة من مرسل عكرمة
وفيه نظر لان سعد بن عبادة
لم يشهد بدرا ويمكن الجمع
بان النبي صلى الله عليه وسلم
استشارهم في غزوة بدر
مرتين الاولى وهو بالمدينة اول
ما بلغه خبر العير مع ابي سفيان
وذلك مبين في رواية مسلم
ووقع عند الطبراني ان سعد
بن عبادة قال ذلك بالحديبية

اور مسلم میں ہے کہ سعد بن عبادہؓ نے وہ تقریر کی جو مقدادؓ
کی جانب منسوب ہے، اور ابن ابی شیبہ نے بھی "مصنف"
میں اسی طرح عکرمہ کے مرسل کے ذریعہ نقل کیا ہے
اور اس پر اعتراض واقع ہوتا ہے اس لئے کہ سعد
بن عبادہ غزوہ بدر میں شریک نہیں ہوئے۔ ہاں
حدیث مسلم کی اس مضمون کو دوسری صحیح احادیث
کے ساتھ اسطرح جمع کیا جا سکتا ہے کہ دراصل بدر کے
معاملہ میں دو مشورے ہوئے ہیں، ایک مدینہ کے اندر
ہوا جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ابو سفیان کے
قافلہ کا حال معلوم ہوا مسلم کی روایت میں شاید اس
کا ذکر ہے اور دوسرا مشورہ راستہ میں وادی ذفران میں ہوا
جیسا کہ فتح الباری میں بصراحت مذکور ہے اور طبرانی

وهٰذا اولیٰ میں ہو گیٰ دراصل سعد بن عبادہؓ کی یہ تقریر حدیبیہ کے موقع پر ہوئی تھی

بالصواب (اور راوی نے اس جگہ خلط ملط کر دیا ہے) اور یہی صحیح اور درست ہے

غرض حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث سے بھی مولانا کا استدلال صحیح نہیں ہے۔ رہا یہ معاملہ کہ انصار جب قافلہ کے لئے مدینہ سے نکل چکے تھے تو پھر اس اہمیت کے ساتھ وادیِ ذفران میں اُن کی رائے معلوم کرنیکی ضرورت ہی کیا باقی رہ گئی تھی تو یہ شبہ بھی نادرست ہے، کیونکہ سابق میں یہ ثابت ہو چکا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ سے نکلتے وقت بھی ابوسفیان کے قافلہ پر قابض ہونے کیلئے مہاجرین وانصار سے مشورہ کیا تھا، وہ غالبًا اس لئے کیا ہوگا کہ انصار بھی شریک ہونا چاہتے ہیں اور جب اچانک جنگ کا یہ معاملہ بہت ہی شدید پیش آگیا اور صورت حال انتہائی نازک ہوگئی تو انصار سے دریافت کرنا ازبس ضروری تھا کہ اس حالتمیں بھی وہ مدینہ سے باہر معرکہ آرائی کیلئے تیار ہیں یا نہیں؟

بہرحال بخاری، نسائی، ترمذی اور دیگر کتب حدیث میں مذکور غزوہ بدر سے متعلق روایات کے خلاف مسلم کی روایت انسؓ کے آخری ٹکڑوں میں جو کچھ بھی مذکور ہے وہ سب اُسی مشورہ سے متعلق ہے جو وادی ذفران میں مدینہ سے باہر ہوا تھا اور تمام صحیح روایات کے خلاف یہ راوی کا وہم ہے کہ اُس نے پہلے ٹکڑے کے ساتھ دوسرے ٹکڑوں کو اس طرح خلط ملط کر دیا ہے کہ گویا یہ سب کچھ ابوسفیان کے قافلہ کے وقت ہی پیش آیا تھا اور اس پر بھی مستزاد یہ کہ اس روایت میں کفار قریش سے جنگ کا اشارہ تک بھی نہیں ہے کہ مولانا کے لئے دلیل ہو سکے، بلکہ ابوسفیان کے قافلہ ہی کا مذکور ہے اس لئے مولانا کو پھر اس روایت کے ٹکڑوں کو بھی اپنے موافق بنانے میں تکلفات

کرنے پڑتے ہیں۔

اسی طرح مولانائے مرحوم کا حضرت علی (رضی اللہ عنہ) کی اس روایت سے استناد بھی صحیح نہیں جس میں بدر کے واقعہ کا ان الفاظ میں ذکر ہے:۔

عن علی قال لما قدمنا المدینه	حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ جب ہم مدینہ آئے تو وہاں
اصبنا من ثمارها فاجتوینا و	ہمیں کھانے کو ملے جو ہماری ناموافق مزاج تھے۔
اصابنا بها وعك وكان النبی صلی	اس لئے ہم بیمار ہو گئے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم
اللہ علیه وسلم یتخبر عن بدر فلما	بدر کو پوچھا کرتے تھے، جب ہم کو خبر ملی مشرکین
بلغنا ان المشركین قد اقبلوا	آ رہے ہیں تو رسول اللہ بدر کو چلے۔ بدر ایک کنوئیں
سار رسول صلعم الی بدر و بدر	کا نام ہے، جہاں ہم مشرکین سے پہلے پہنچ گئے
بئر فسبقنا علی المشركین الیها۔ (الحدیث)	

یہ روایت طویل ہے مگر اس میں ابتدائی واقعات کو نظر انداز کر کے صرف معرکے کا تفصیل کے ساتھ ذکر ہے چنانچہ اس میں نہ مدینہ کے اندر مشورہ کا ذکر ہے نہ بعض مسلمانوں کی کراہت اور گرانی کا تذکرہ ہے اور نہ مہاجر و انصار کی ولولہ انگیز تقاریر مذکور ہیں، حتی کہ مسلمانوں کی تعداد اور بے سروسامانی تک کا بھی کوئی ذکر نہیں ہے اور اس پر طرہ یہ کہ مدینہ کی آمد کے وقت مہاجرین کی ناموافق آب و ہوا کے بعد ہی متصل بدر کے واقعہ کا ذکر شروع کر دیا گیا ہے، حالانکہ اس درمیان میں کتنے سرایا اور دوسرے اہم واقعات پیش آ چکے تھے جو کتب احادیث میں بسند صحیح منقول ہیں۔

پس اگر حضرت علیؓ کی یہ روایت اس بات کے لئے سند ہو سکتی ہے کہ اسمیں

قافلہ کے لئے نکلنے کا کوئی ذکر نہیں ہے بلکہ مشرکین مکہ سے جنگ کا ہی ذکر ہے تو بلا شبہ یہ روایت اُس شخص کے لئے ہی سند ہو سکتی ہے جو بدر کے معرکے سے متعلق اُن تمام ابتدائی واقعات کا انکار کر دے جس کا اس روایت میں ذکر موجود نہیں ہے حالانکہ قرآن اور دوسری روایات میں بصراحت وہ واقعات مذکور ہیں۔

روایت و درایت کا مسلمہ اصول ہے کہ جب ایک ہی واقعہ سے متعلق مفصل و مجمل دونوں قسم کی روایات بسند صحیح موجود ہوں تو ہمیشہ مجمل کی تفصیل و تشریح مفصل ہی کے ذریعہ کی جائیگی اور اگرچہ بہت سے مقامات پر مولانا بھی اس کو تسلیم فرماتے ہیں، مگر یہاں نہ معلوم کیوں نظرانداز کرنا چاہتے ہیں۔

تفصیل و اجمال کی اس حقیقت کے پیش نظر ابن جریر نے اپنی تاریخ میں امام احمد نے مسند میں، ابن ابی شیبہ نے مصنف میں اور بیہقی نے دلائل میں بدر کی مفصل و مجمل روایات کے ضمن میں اس روایت کو بھی نقل کر دیا ہے اور جن روایات میں قافلہ کا تذکرہ ہے اور جن میں نہیں ہے اُن سب کو بیان کر کے ایک دوسرے کے متضاد نہیں سمجھا ہے۔

مصنف سیرۃ النبی قرآن اور احادیث سے استشہاد کے بعد واقعہ کے بعض پہلوؤں سے عقلی استشہاد کرنا چاہتے ہیں جو قابل توجہ ہیں۔

(۱) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بدر سے قبل جس قدر سرایا بھی بھیجے ہیں اُن میں سے کسی ایک میں بھی انصار کو نہیں بھیجا، پس اگر مدینہ میں ہی مشورہ نہ ہوا ہوتا تو کاروان تجارت کے مقابلہ میں بھی انصار نہ نکلتے حالانکہ وہ مہاجرین سے زیادہ تعداد میں نکلے، یعنی کل فوج (۳۰۵) تھی جن میں (۶۰) مہاجرین تھے باقی سب انصار

لیکن یہ استشہاد بھی اس لئے درست نہیں ہے کہ کاروانِ تجارت کا یہ معاملہ چونکہ زیادہ اہم نہیں تھا اور دشمن میں مقابلہ کی طاقت نہیں تھی، اس لئے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ چاہا کہ اس سلسلہ میں جو مالِ غنیمت ہاتھ آئے اسمیں انصار کا بھی حصہ ہو، مگر عقبیٰ میں انصار کے معاہدہ کے پیشِ نظر ضرورت تھی اس بات کی کہ اُن سے مشورہ لیا جائے کہ وہ نکلنا چاہتے ہیں یا نہیں، چنانچہ کاروانِ تجارت کے سلسلہ میں مدینہ کے اندر ہی مشورہ کیا گیا تھا جس میں انصار نے بخوشی رفاقت کو منظور کیا تھا، چنانچہ ابن کثیر نے اپنی تاریخ میں ابن اسحٰق سے بسندیہ روایت کی ہے۔

لما سمع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بابی سفیان مقبلاً من الشام ندب المسلمین الیهم وقال هذه عیر قریش فیها اموالهم فاخرجوا الیها لعل اللہ ینفلکموها فانتدب الناس فخف بعضهم وثقل بعضهم ذالك انهم لم یظنوا ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یلقی حرباً	نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب ابوسفیان کی شام سے آمد کا حال سُنا تو مسلمانوں کو کاروانِ ابوسفیان کیلئے پکارا اور فرمایا: یہ قریش کا کاروان ہے اس میں اُنکا مالِ تجارت ہے پس اس کے لئے نکلو کیا تعجب ہے کہ اللہ تعالیٰ یہ مالِ غنیمت تمہارے ہاتھ لگا دے، پس لوگ تیار ہو گئے بعض نے تو اس مقابلہ کو پسند کیا اور بعض کو نکلنا شاق گذرا کیونکہ اُنکو یہ خیال ہی نہیں تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس سفر میں جنگ سے دوچار ہونگے

اس روایت کا جملہ "لعل اللہ ینفلکموھا" اور "لم یظنوا ان رسول اللہ لم یلقی حرباً" صاف پتہ دے رہے ہیں کہ انصار اس مرتبہ اسلیے مدینہ سے نکلے کہ جنگ کا اندیشہ

ا۔ جلد ۳ ص ۲۵۶

نہیں تھا اور کثیر مال غنیمت کی توقع تھی اور اسی بنا پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مرتبہ اُن کو ہمراہ لینے کا ارادہ فرمایا۔

(۲) ابوسفیان کا کاروانِ تجارت جب شام سے روانہ ہو کر حدود مدینہ و شام سے نکل گیا اور مکہ کی راہ پر پڑ گیا تب نبی اکرم صلی اللہ علیہ کو جاسوسوں نے اطلاع دی اس سے قبل اطلاع نہ ہو سکی، لہذا مولانائے مرحوم کا یہ عقلی استدلال واقعہ کی اصل حقیقت کو نہیں بدل سکتا کہ مکہ سے شام کو جو قافلہ تجارت جاتا تھا وہ مدینہ کے پاس سے ہو کر گذرتا تھا، اس لئے شام سے آنے والے قافلے کے لئے آپ کو شام کی جانب بڑھنا چاہیئے تھا نہ کہ مکہ کی جانب جہاں قریش کے اثرات زیادہ تھے۔

جب ارادۂ الٰہی یہ ہو چکا تھا کہ بدر میں معرکۂ حق و باطل اس طرح بپا ہو کہ بظاہر اسباب مسلمانوں کے سامنے اچانک بے سروسامانی کی حالت میں دشمن ساز و سامان کے ساتھ آدھمکے اور پھر خدا کی معجزانہ نصرت و یاری ظہور میں آئے تو پھر اس پر تعجب کیسا کہ مسلمانوں کو اُس وقت تک قافلہ کا علم نہ ہو سکا جب تک کہ وہ مکہ کی راہ پر نہ پہنچ گیا۔

اس کے بعد مولانا نے جمہور کے مسلک کو پیش نظر رکھ کر پانچ دفعات میں اپنی جانب سے واقعۂ بدر کے اسباب کی ایسی ترتیب دی ہے کہ جس پر مولانا کو آخر میں یہ کہنے کا موقع مل سکا۔

> کیا واقعات کا یہ نقشہ قریش کے جوشِ عداوت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شانِ نبوت کے موافق ہے [1]

[1] سیرت النبی جلد اول ص ۳۱۹

مولانائے مرحوم بہترین ادیب ہیں اور وہ خوب جانتے ہیں کہ کسی اچھے سے اچھے واقعہ کو بھی اگر مخالفانہ رنگ دینے کی کوشش کی جائے تو اُس کو الفاظ کی تعبیرات میں بھیانک سے بھیانک رنگ میں پیش کیا جا سکتا ہے، مسئلہ طلاق، نکاحِ بیوگان تعددِ ازدواج جیسے مسائل کے متعلق عیسائی پادریوں اور ہندو آریہ سماجیوں نے جن توہین آمیز اور مضحکہ خیز تعبیرات میں رنگ کر اپنے معتقدین کے سامنے پیش کیا ہے وہ نگاہوں سے اوجھل نہیں ہیں، مگر آج کی دنیا، تہذیب و تمدن میں جب اُنہی عیسائیوں اور ہندوؤں نے سیکڑوں اور ہزاروں سال کے تجربہ کے بعد یہ یقین کر لیا کہ سوسائٹی کا "معاشرتی نظام" رحمۃ للعلمین کے لائے ہوئے قانون کو اختیار کئے بغیر صحیح نہیں ہو سکتا تو آج وہ پارلیمنٹ، کونسل اور اسمبلیوں کے ذریعہ ان ہی قوانین طلاق، نکاح بیوگان وغیرہ کو اپنی معاشرت میں شامل اور ان امور کے جواز کیلئے بہتر سے بہتر عقلی دلائل وادبی تعبیرات اختیار کر رہے ہیں۔

پس غزوہ بدر کیوں پیش آیا؟ اس کے لئے جمہور نے باتفاق تاریخ و سیرت یہی کہا ہے کہ مسلمانوں کا مدینہ میں محفوظ رہ کر تبلیغ اسلام کرنا مشرکین کو کسی طرح برداشت نہ ہو سکا اور اُنھوں نے مسلمانوں کے ساتھ چھوٹی چھوٹی جھڑپیں شروع کر دیں تھیں کہ اس اثنا میں "سریۂ عبد اللہ بن جحش پیش آگیا، جس میں ان کا مشہور سردار عمرو بن حضرمی قتل ہو گیا اور عثمان بن عبد اللہ اور حکم بن کیسان جیسے بہادر سردار قید ہو گئے، اس بنا پر کفار مکہ کو اشتعال آ جانا ایک فطری بات تھی، چنانچہ مشہور محدث ابن کثیر نے اپنی تاریخ میں اس سریہ کا عنوان ہی یہ قائم کر دیا ہے،

"باب سریہ عبد اللہ بن جحش التی کانت سببًا لغزوۃ بدر العظمٰی وذلک یوم الفرقان

یوم التقی الجمعان واللہ علیٰ کل شیءٍ قدیر۔ ابھی یہ اشتعال بڑھ ہی رہا تھا کہ ابوسفیان کے کاروانِ تجارت کا قصہ مزید پیش آگیا جو در اصل کاروانِ تجارت نہیں تھا بلکہ مسلمانوں کے استیصال کا وہ "سرمایہ" تھا جس کے گھمنڈ پر قریش یقین کیے بیٹھے تھے کہ جونہی وہ مکہ میں بحفاظت تمام پہنچ جائیگا سمجھ لینا چاہیے کہ مسلمانوں کے خاتمہ کا سامان ہاتھ آگیا۔

تو اب خود ہی انصاف کیجیے کہ اس میں کونسی بات ایسی ہے جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شانِ نبوت کے خلاف اور قریش کے جوشِ عداوت کے منافی ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ مولانا شبلی مرحوم نے آرنلڈ[ع] کی راہنمائی کے لیے یا اُسکی تقلید میں اس واقعہ کے تمام نقشہ کو جمہور کے خلاف اس لئے پلٹنے کی سعی فرمائی ہے کہ وہ وقت کے عیسائی مستشرقین کے اس اعتراض سے مرعوب ہو گئے ہیں کہ قافلہ کا لوٹنا انتہائی معیوب بات ہے، لہٰذا جو شخص نبوت کا مدعی ہو وہ کیسے ایسا فعل کر سکتا ہے، حالانکہ یہ بات مرعوب ہونے کی نہیں تھی بلکہ ضرورت تھی اس امر کی کہ اُن تاریخی اسباب و وسائل کو روشنی میں لایا جائے جن کے پیشِ نظر مشرکین مکہ کے کاروانِ تجارت کو روکنا اور اُن پر قابض ہونا لوٹ کھسوٹ نہیں، بلکہ جنگی نقطۂ نظر اور مسلمانوں کی جماعتی بقاء و حفاظت کے اعتبار سے ازبس ضروری تھا۔

صورتِ حال یہ تھی کہ مکہ کے قیام میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں پر تیرہ سال مسلسل مشرکین مکہ نے جو مظالم کئے ان پر صبر و ضبط کے بعد جب مدینہ کو

لہ آرنلڈ نے بھی غزوہ بدر کے متعلق ان ہی خیالات کا اظہار کیا ہے۔

ہجرت کر گئے تب بھی ان مشرکین نے مسلمانوں کو چین سے نہ بیٹھنے دیا اور جنگ و جدل اور سازشی مکر و فریب میں لگے رہے چنانچہ ابوداؤد میں ہے۔

ان کفار قریش کتبوا الی ابن ابی ومن کان یعبد معہ الاوثان من الاوس والخزرج ورسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یومئذ بالمدینۃ قبل وقعۃ بدر انکم آویتم صاحبنا وانا نقسم باللہ لتقاتلنہ او لتخرجنہ او لنسیرن الیکم باجمعنا حتی نقتل مقاتلتکم ونستبیح نساءکم (الحدیث)[1]

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ میں تشریف لائے تھے کہ بدر کے واقعہ سے بہت پہلے کفار قریش نے عبداللہ بن ابی اور اس کے بت پرست ساتھیوں کو جو اوس و خزرج میں باقی رہ گئے تھے یہ لکھا کہ تم نے ہمارے صاحب کو پناہ دی ہے اور ہم خدا کی قسم کھا کر کہتے ہیں کہ یا تو تم اس سے لڑو یا اس کو نکال دو، ورنہ تو ہم سب تم پر چڑھ آئیں گے اور تمہارے جوانوں کو قتل کرینگے اور تمہاری عورتوں کو باندیاں بنالیں گے۔

پھر معاملہ دھمکیوں تک ہی نہیں رہا بلکہ کاروانِ تجارت کی آمد و رفت کی پردہ میں منافقین اور یہود مدینہ سے برابر مسلمانوں کے استیصال کے لئے مختلف تدابیر پر خط و کتابت کا سلسلہ برابر جاری رہا اور صرف یہی نہیں بلکہ اب کاروانِ تجارت کا مقصد محض تجارتی کاروبار تک ہی محدود نہیں رہا بلکہ نفع کے حصول کو مسلمانوں کے مقابلہ کی تیاریوں پر صرف کرنا نصب العین بنالیا گیا۔

ایسی حالت میں مسلمانوں کو کیا کرنا چاہیئے تھا؟ دشمن کو اپنے خلاف اور اپنی استیصال کیلئے سازش کرنے، مقابلہ کی تیاریوں میں مشغول رہنے، کاروانِ تجارت

[1] باب فی خبر النضیر۔

کے ذریعہ مدینہ میں مقیم دشمنوں کے ساتھ مشرکین مکہ کو معاندانہ خط وکتابت جاری رکھنے اور خود کاروانِ تجارت کے ذریعہ اپنے استیصال کے لئے سرمایہ فراہم کرنے دینے کیلئے آزاد چھوڑ دینا اور اس طرح ہمیشہ کیلئے اپنا خاتمہ کرا لینا یا اُن تمام ذرائع کا سد باب کرکے فتنہ کا سر کچل دینے کی کوشش کرنا؟

لہٰذا مسلمانوں نے وہی کیا جو عقل، تدبیر، سیاست، اخلاقِ مدن کے نزدیک نہ صرف جائز بلکہ واجب اور ضروری تھا۔ یہی وہ امور تھے جن کی جانب اربابِ سیر و تاریخ نے بھی توجہ دلائی ہے۔ چنانچہ سب سے پہلے سریہ "سریہ حمزہ" کے متعلق (جو کہ مشرکین کے کاروانِ تجارت کے روکنے کے لئے نکلا تھا) زرقانی شرح مواہب میں تحریر فرماتے ہیں۔

"فخرجوا لیتعرضون عیرًا لقریش	"پس وہ نکلے کہ قریش کے کاروانِ تجارت کے درپے
جاءت من الشام تريد مكة	تھے" جو شام سے مکہ جا رہا تھا یعنی وہ یہ چاہتے تھے
اى يتعرضون لها ليمنعوها من	کہ جس مقصد کیلئے یہ کاروانِ تجارت آ جا رہے ہیں
مقصدها باستيلائهم الخ [1]	اُن پر غلبہ کرکے اُس مقصد کو پورا نہ ہونے دیں

اور ابوسفیان کے جس کاروانِ تجارت کے واقعہ سے بدر کے معرکہ کا تعلق ہے اُس کے متعلق تو تمام اربابِ سیرہ تاریخ متفق ہیں کہ قریش کے اندر مسلمانوں کی استیصال کا جوش وخروش اس درجہ بڑھا ہوا تھا کہ جب ابوسفیان کا کاروانِ تجارت مکہ سے چلا ہے تو کوئی قریشی اور قریشیہ باقی نہیں رہی تھی جس کے پاس ایک مثقال بھی موجود تھا کہ اُس نے اپنا راس المال کاروان کے حوالہ نہ کر دیا ہو۔ زرقانی میں ہے:۔

[1] جلد ۱ ص ۳۹۷

کان فیہا خمسون الف دینار، کان لم یبق قرشی ولا قرشیۃ لہ مثقال الا بعث بہ فی العیر[۵]

کاروانِ تجارت کے ساتھ پچاس ہزار دینار سُرخ تھے اور کوئی قرشی و قرشیہ کہ جسکے پاس ایک مثقال بھی موجود تھا ایسے نہیں تھے کہ جس نے قافلہ میں اپنا راس المال نہ لگایا ہو،

ابوسفیان کا یہ کاروان صرف کاروانِ تجارت ہی نہ تھا بلکہ سامانِ حرب و ضرب کے لئے بنیاد کار تھا اس کا اندازہ ابوجہل کے اُس قول سے بھی ہوتا ہے جو قافلہ کے گھر جانے پر اُس نے قرشیوں کو مشتعل کرتے ہوئے کہا:۔

النجاء النجاء علی کل صعب و ذلول عیرکم اموالکم ان اصابہا محمد لم تفلحوا بعدھا ابداً،

نجات حاصل کرو، انتہائی مصیبت و ذلت سے نجات حاصل کرو، کاروانِ تجارت کاروان نہیں ہے تمہارے مال و دولت کا ذخیرہ ہے اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس پر قابض ہو گئے تو پھر تم ہمیشہ کیلئے ناکام و نامراد ہو کر رہ جاؤ گے

کیا ابوجہل کا یہ خطرہ محض کاروان تجارت کے لُٹ جانے پر ہو سکتا تھا؟ ہرگز نہیں، بلکہ وہ یہ سمجھتا تھا یہ تجارت کا کارواں نہیں ہے بلکہ سامانِ جنگ کی وہ ریڑھ کی ہڈی ہے جس کی حفاظت کی خاطر آج کی مہیب جنگوں میں فیصلہ کن لڑائیاں لڑی جاتی ہیں۔

تو اب انصاف فرمائیے کہ اس قسم کے کاروانِ تجارت پر حملہ کر کے دشمن کی تجارت کا سدباب کرنا کونسا گناہ تھا، جس کے لئے ہم دوسروں کی ہرزہ سرائی سے مرعوب ہو کر حقائق کا انکار کرنے لگیں۔

مولانا کو یہ بات بھی کھٹکتی ہے کہ زر و مال کے حاجتمند انصار سے زیادہ مہاجرین

تھے تو پھر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس رفاقت میں مہاجرین کے مقابلہ میں انصار کیوں زیادہ تعداد میں تھے، سو ان احتمالات عقلی کا باب تو اس درجہ وسیع ہے کہ جس قدر جی چاہے وسیع سے وسیع تر کرتے چلے جائیے ورنہ بات صاف ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے رجحان طبع نے صورت ہی ایسی پیدا کر دی کہ انصار کی تعداد مہاجرین سے زیادہ ہو گئی ورنہ شاید حالت برعکس ہوتی، البتہ مولانا کی توجیہ کی خلاف یہ سوال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ اگر مدینہ ہی میں جنگ کے لئے مشورہ ہوا تھا تو پھر وہ مہاجرین جو انصار کے بغیر بھی ابتک مختلف غزوات و سرایا میں سر بکف میدان جنگ میں جاتے رہے تھے۔ آج اس عظیم الشان غزوہ میں انصار کے مقابلہ میں کیوں پیچھے رہے اس موقع پر بار بار حضرت سعد بن عبادہ کی تقریر کا حوالہ دینا بھی اس لئے غیر موزوں ہے جبکہ ہم محدثین سے یہ نقل کر چکے کہ مسلم کی حدیث میں حضرت سعد بن عبادہؓ کا نام راوی کا وہم ہے اور دراصل اُن کی یہ تقریر حدیبیہ کے موقع پر ہوئی تھی نہ کہ معرکۂ بدر کے موقع پر۔

مولانائے مرحوم نے سیرۃ النبی میں طبری کے حوالہ سے اُس روایت کو نقل کرتے ہوئے "جس کو ہم گذشتہ صفحات میں نقل کر آئے ہیں اور جو یہ ثابت کرتی ہے کہ مدینہ میں ابو سفیان کے قافلہ سے متعلق جو مشورہ ہوا تھا اُس میں بعض مسلمان اس لئے نکلتے ہوئے کسمساتے رہے کہ جنگ کا معاملہ نہیں ہے صرف قافلہ کا معاملہ ہے" یہ تنقید فرمائی ہے۔

لیکن یہ واقعات صریح آیاتِ قرآن کے خلاف ہیں، قرآن مجید میں بہ تصریح موجود ہے کہ جو لوگ مدینہ سے نکلتے ہوئے کسمساتے تھے وہ عدم ضرورت کی

وجہ سے نہیں بلکہ اس وجہ سے کہ اُن کو یہ نظر آتا تھا کہ موت کے منہ میں جارہے ہیں۔

مگر تنقید فرماتے ہوئے مولانا کو یہ بات فراموش ہوگئی کہ انھوں نے جمہور کے خلاف کوئی دلیل نہیں پیش فرمائی بلکہ جو دعویٰ تھا وہی دلیل بنا کر پیش کردیا گیا اس لئے کہ جمہور کا دعویٰ مع دلیل تو یہ ہے کہ قرآنِ عزیز کی زیر بحث آیات مدینہ کی مشورہ سے متعلق ہی نہیں ہیں بلکہ وادی ذفران کے مشورہ سے متعلق ہیں جیسا کہ گذشتہ صفحات میں مدلل خود قرآن سے ہی ثابت کیا جاچکا ہے اور اس روایت میں جس مشورہ کا ذکر ہے وہ قرآن میں مذکور نہیں ہے البتہ احادیث و روایاتِ سیر میں بسند صحیح منقول ہے لہٰذا دونوں مواقع پر یکساں لئے کی وجوہ جُدا جُدا تھیں اور قرآن نے اس پورے واقعہ کے اُن ہی خاص اجزاء کو بیان کرنا مناسب سمجھا جو مسلمانوں کی بے سروسامانی، اور دشمن کی قوت اور پھر مسلمانوں پر خدا کی نصرت کے نزول سے تعلق رکھتے ہیں۔

طبقات ابن سعد میں ہے کہ جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ سے ایک میل پر پہنچے تو لشکر کا جائزہ لیا، ابن عمرؓ اُس زمانہ میں کمسن تھے لہٰذا اُن کو واپس کردیا[۱]

اس سے بھی مولانا یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ سے قافلہ کے مقابلے کے لئے نہیں بلکہ کفار مکہ سے جنگ کے لئے ہی نکلے تھے ورنہ تو ایسے نوخیز لڑکے قافلہ کو لوٹنے میں زیادہ مفید ثابت ہوسکتے تھے مگر یہ بھی مولانا کا محض قیاس ہی قیاس ہے اس لئے کہ قافلہ کے مقابلہ میں اگرچہ کسی بڑی جنگ کی توقع نہیں تھی، مگر بہرحال معمولی جنگ کا خطرہ تو موجود ہی تھا، کیا ابوسفیان اور اُس کے تیس چالیس بہادر قریشی، ایک ہزار اونٹ پر لدا ہوا سامان آسانی سے حوالہ کردیتے، یہ کیسے ہوسکتا تھا؟

---

[۱] جلد ا صفحہ ۳۳ [۲] اسد الغابہ میں بھی یہ واقعہ مذکور ہے جلد ۳ صفحہ ۲۲۷

پس اگر معمولی جنگ کا خطرہ بھی تھا تو نو عمر لڑکوں کو واپس کر دینا اس کے لئے کس طرح دلیل بن جا سکتا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم شروع ہی میں قافلہ کو مقابلہ کو نہیں بلکہ کفار مکہ سے فیصلہ کن جنگ کے لئے نکلے تھے!

اسی طرح استیعاب میں سعد بن خثیمہ کا جو واقعہ مذکور ہے اس سے بھی مؤلانا کا مقصد حل نہیں ہو سکتا اس لئے کہ اگر باپ کی فرمائش پر بیٹے نے یہ گوارا نہ کیا کہ اپنی بجائے باپ کو اس موقعہ پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نکلنے دی تو اس سے یہ کیسے لازم آگیا کہ اگر مسلمان مدینہ سے قافلہ پر حملہ کے لئے نکلے تو اس یقین کے ساتھ نکلے تھے کہ ان میں سے کسی ایک شخص کو بھی چشم زخم نہیں پہنچیگا اور سب ہی صحیح سالم واپس آجائیں گے یہ تو بدقسمتی ہے عیسائی مستشرقین سے مرعوب ہو کر ہم نے بزعم خود یہ تصور کر لیا کہ قافلہ پر حملہ کے معنی گویا ڈاکوؤں کا قافلہ لوٹنے کے مرادف ہے۔

مسلمان تو جب بھی دشمنوں کے مقابلہ کو نکلے خواہ وہ براہ راست جنگ کے ارادے سے نکلے ہوں یا دشمن کو دوسرے معاملات میں زک دینے، ہمیشہ جہاد اور شہادت ہی کے نقطۂ نظر سے نکلتے تھے اور مال غنیمت تو ان کے لئے خدا کا مزید فضل و احسان تھا، جو کبھی بغیر جنگ ہی ہاتھ آگیا، اور کبھی خون میں نہانے کے بعد حاصل ہوا۔

اب ہم مصنف سیرۃ النبی کے غزوۂ بدر کے متعلق ان تمام دعاوی و شبہات پر تحقیقی نظر ڈالنے کے بعد جو جمہور کے خلاف ان کی جانب سے پیش کئے گئے ہیں صرف ایک سوال پر اس بحث کو ختم کر دینا مناسب سمجھتے ہیں کہ اگر معرکۂ بدر میں ابتداہی

سے یہ بذریعہ وحی بتا دیا گیا تھا کہ خدا کی مرضی معرکۂ حق و باطل کی ہے اور قافلہ پر حملہ کرنے یا بقول مولانا کے "قافلہ لوٹنے" کا تصور و تخیل گناہ عظیم اور شانِ اسلام کے خلاف ہے، تو آخر جلیل القدر صحابہؓ نے ایسا تصور قائم ہی کیوں کیا اور اگر کیا بھی تھا تو قرآن نے "احدی الطائفتین" کا وعدہ کر کے اس گناہ عظیم کے تصور کی حوصلہ افزائی کیوں کی اور کیوں صاف صاف یہ نہیں کہہ دیا کہ خدائے تعالیٰ ایک لمحہ کے لئے بھی تم کو قافلہ پر قابو پانے کی اجازت نہیں دیتا، کیونکہ اس کا تصور بھی گناہِ عظیم ہے" البتہ اس کا وعدہ کرتا ہے کہ تم کو دشمنوں پر قابو دیگا اور تم کامیاب ہو گے تو کیا پھر قرآن عزیز کا "احدی الطائفتین" کا اس طرح ذکر کرنا اس امر کی صاف شہادت نہیں ہے کہ معرکۂ بدر سے قبل ضرور چند اکابرانِ اسلام کی یہ مٹھی بھر جماعت قافلہ کے لئے نکلی تھی مگر اچانک جب کفار مکہ سے سابقہ پڑ گیا اور مسلمانوں نے بے سر و سامانی کو دیکھ کر قافلہ پر قبضہ چاہا تو اللہ تعالیٰ نے اوّل یہ وعدہ دیا کہ ان دونوں "عیر و نفیر" میں سے ایک تم کو ضرور دیں گے اور پھر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بذریعہ وحی یہ اطلاع کر دی کہ خدا کی مرضی یہ ہے کہ وہ اب قافلہ کی بجائے معرکۂ حق و باطل میں مسلمانوں کو کامیابی عطا کرکے ہمیشہ کے لئے تاریخ ظلم کا رُخ عدل کی جانب پھیر دینے والا ہے،

الحاصل قرآن و حدیث اور تاریخی حقائق کی روشنی میں معرکۂ حق و باطل "غزوۂ بدر" کے متعلق جمہور علماءِ اسلام کا مسلک ہی صحیح ہے اور بلاشبہ واقعات کی صحیح و مستند تفصیلات کسی طرح بھی شانِ نبوت کے خلاف نہیں اور نہ علم الاخلاق و علم الاجتماع اور حق و صدق پر مبنی سیاسیاتِ مدن کے منافی ہیں۔ "هٰذا هو الحق والحق احق ان يُتَّبع"۔

غزوۂ اُحُد

اُحُد — اُحُد مدینہ کے ایک پہاڑ کا نام ہے، یہ مدینہ منورہ سے جانب جنوب تقریبًا دو میل (ایک فرسخ) پر واقع ہے۔

غزوۂ اُحد — یہی وہ مقام ہے جہاں شوال ۳ھ مطابق جنوری ۶۲۵ء میں مسلمانوں اور مشرکوں کے مقابلہ میں معرکۂ حق و باطل گرم ہوا، اس لئے اس کا نام غزوۂ "اُحد" ہے۔

غزوۂ اُحد بھی بہت اہم غزوہ ہے اور اپنی تفصیلات و جزئیات کے اعتبار سے اپنے دامن میں عبرت و موعظت کا بے شمار ذخیرہ رکھتا ہے، اس غزوہ کی تفصیلی حالات کتب حدیث و سیرت اور تفاسیر قرآن حکیم میں مکمل طور پر مذکور ہیں۔[۱]

ان حالات کا خلاصہ یہ ہے کہ بدر میں جو زخم قریش کو لگ چکا تھا اس نے ناسور کی شکل اختیار کر لی تھی، کیونکہ بدر کے واقعۂ ہائلہ سے قریش کا ہر گھر ماتم گسار اور عرب کے مشرک قبائل نوحہ خواں تھے، ابوسفیان نے تو قسم کھالی تھی کہ جبتک بدر کا انتقام نہ لے لونگا نہ غسل کرونگا، نہ تبدیل لباس، عکرمہ بن ابوجہل اور دوسرے نوجوانوں کی تقریریں اور عورتوں کی نوحہ خوانی قریشیوں اور قبائل عرب کو غیرت اور اشتعال دلا کر جنگ کے لئے آمادہ کر رہی تھیں اور اسطرح ابوسفیان کی سرکردگی میں تین ہزار نبرد آزما سورماؤں کا لشکر جرار مکہ سے مسلمانوں کو مٹانے کے لئے نکلا اور اُحد کے سامنے آکر خیمہ زن ہو گیا۔

---

[۱] ہمنے زیادہ حصہ فتح الباری جلد ۷ سے لیا ہے اور باقی سیرۃ حلبیہ اور زرقانی اور تاریخ کبیر سے۔

نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کو جب ابو سفیان کی تیاریوں کا حال معلوم ہوا تو صحابہ (رضی اللہ عنہم) سے مشورہ فرمایا، عمر رسیدہ اور تجربہ کار صحابہ نے یہ رائے دی کہ ہمکو باہر نکلکر جنگ کرنیکی ضرورت نہیں ہی بلکہ مفید طریقہ یہ ہے کہ ہم مدینہ کے اندر ہی دشمن کا انتظار کریں اور جب وہ مدینہ پر حملہ آور ہو تو اُس کا پُرزور مقابلہ کریں، ہمارے اس طرز عمل سے اول تو دشمن کو جرأت ہی نہ ہوگی کہ مدینہ پر حملہ آور ہو، اور اگر اُسنے اقدام کیا تو بلاشبہ شکستِ فاش اُٹھاکر راہِ فرار اختیار کریگا۔ مگر اُن صحابہؓ کو "جو بدر میں شریک نہیں ہوئے تھے اور بدر کی فضیلت کو اسوقت حاصل کرنا چاہتے تھے" یہ رائے پسند نہیں آئی اور نوجوانوں نے بھی اِنکا ساتھ دیا اور اکثریت کی رائے یہ قرار پائی کہ ہمکو دشمنوں کا مقابلہ میدان میں نکلکر ہی کرنا چاہیئے، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب اکثریت کا رجحان یہ پایا تو اس پر صاد فرماکر حجرۂ مبارک میں تشریف لے گئے تو تجربہ کار اور اکابر صحابہ نے اپنے اصاغر کو اُنکی رائے پر ملامت کی کہ اُنھوں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی رجحان کے خلاف کیوں اپنی آزادانہ رائے سے آپؐ کو پریشان کیا، چنانچہ جب آپؐ باہر تشریف لائے تو اِن نوجوانوں اور شمع اسلام کے پروانوں نے اپنی رائے پر اظہار ندامت کیا اور عرض کیا کہ آپؐ مدینہ ہی کے اندر دشمن کا مقابلہ کریں یہی مناسب ہی۔

یہ سُنکر حضور اقدس نے ارشاد فرمایا "نبی کی شان کے یہ خلاف ہی کہ جب خدا کی راہ میں ہتھیار سج کر طیار ہو جائے تو پھر معرکہ حق و باطل کے بغیر ہی اُن کو اُتار دے اب خدا کا نام لیکر میدان میں نکلو۔"

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ سے نکلے تو ایک ہزار کا لشکر جلو میں تھا، اِس لشکر میں تین سو منافقین عبداللہ بن اُبی کی سرکردگی میں ہمرکاب تھے، یہ مدینہ ہی میں

مشرکین مکہ کے ساتھ سازش کر چکے تھے کہ مخلص مسلمانوں کو بزدل بنانے کیلئے یہ طریقہ اختیار کرینگے کہ اوّل مسلمانوں کے لشکر کے ساتھ نکلینگے اور راہ سے ہی اُنسے کٹ کر مدینہ واپس آجائینگے، چنانچہ رأس المنافقین یہ بہانہ کر کے لشکرِ اسلام سے کٹ کر جُدا ہو گیا اور مدینہ واپس آگیا کہ جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم جیسے تجربہ کاروں کی بات نہ مان کر الھڑ نوجوانوں کی رائے کو ترجیح دی تو ہم کو کیا ضرورت ہے کہ خواہ مخواہ اپنی جانوں کو ہلاکت میں ڈالیں۔

مگر منافقین کا مقصد پورا نہ ہوا اور اُن فداکارانِ اسلام پر انکی مراجعت کا مطلق کوئی اثر نہ پڑا اور ایسے جانباز اور نثارانِ اسلام پر اثر ہی کیا پڑتا جن کے بچوں کی جانبازی اور اسلام پر فداکاری کا جذبہ اور ولولہ یہ ہو کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ سے باہر جب لشکرِ اسلام کا جائزہ لیا اور صغیر السن لڑکوں کو واپسی کا حکم دیا تو رافع بن خدیج جو ابھی نوعمر ہی تھے یہ دیکھ کر پنجوں کے بل کھڑے ہو گئے کہ دراز قد بن کر جنگ کے سپاہی رہ سکیں، چنانچہ اُن کی تدبیر کارگر ہو گئی، اسی طرح جب سمرہ بن جندب صغیر سن شمار کر لئے گئے تو رونے لگے اور عرض کیا یا رسول اللہ اگر رافع شریک جنگ ہو سکتا ہے تو میں کیوں خارج کیا جا رہا ہوں جبکہ میں رافع کو کشتی میں پچھاڑ دیا کرتا ہوں، آخر دونوں کی کشتی کرائی گئی اور سمرہ نے رافع کو پچھاڑ دیا اور وہ مجاہدین میں شامل کر لئے گئے،

البتہ مسلمانوں کے دو قبیلے بنو سلمہ بنو حارثہ میں کچھ بددلی سی پیدا ہو چلی تھی مگر فداکار مسلمانوں کے جوش و ولولہ کو دیکھ کر اُن کی ہمت بھی بلند ہو گئی۔

غرض اس ولولہ اور جذبہ کے ساتھ مجاہدین کا لشکر اُحد پہنچا اور دونوں صفیں ایک دوسرے کے مقابلہ میں صف آرا ہو گئیں:

بنی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے لشکر اسلام کو اسطرح صف آرا کیا کہ اُحد کو پس پشت لے لیا اور پچاس تیر اندازوں کو حضرت عبداللہ بن جبیر کی کمان میں پہاڑ کی ایک گھاٹی پر مقرر فرمادیا کہ فتح و شکست کسی حال میں بھی اپنی جگہ سے حرکت نہ کریں تاکہ پشت کی جانب سے دشمن حملہ آور نہ ہو سکے۔

اب جنگ شروع ہو گئی اور دونوں صفیں بالمقابل نبرد آزما ہو کر جوہر شجاعت دکھانے لگیں، ابھی جنگ کو کچھ زیادہ دیر نہیں لگی تھی کہ مسلمانوں کا پلّہ بھاری ہو گیا اور مشرکین مکہ کا لشکر درہم برہم ہو کر بھاگنے لگا، نبرد آزما مسلمانوں نے جب مالِ غنیمت جمع کرنیکا ارادہ کیا تو تیر اندازوں سے صبر نہ ہو سکا اور وہ گھاٹی چھوڑنے پر آمادہ ہو گئے، کمان افسر حضرت عبداللہ بن جُبیر رضی نے ہر چند روکا اور فرمایا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی خلاف ورزی نہ کرو، مگر اُنھوں نے یہ کہہ کر جگہ چھوڑ دی کہ آپ کا حکم جنگ تک محدود تھا اب جبکہ جنگ ختم ہو گئی تو خلاف ورزی کیسی؟

حصول غنیمت کے شوق نے ادھر مسلمان تیر اندازوں سے جگہ خالی کرادی اُدھر خالد بن ولید اپنے جنگی دستہ کے ساتھ (جو ابھی مسلمان نہیں ہوئے تھے) میدان خالی دیکھ کر گھاٹی کی جانب سے مسلمانوں پر ٹوٹ پڑے، اب مسلمان گھبرائے اور اس اچانک حملہ سے اُن کے پیر اکھڑ گئے اور اس طرح فتح و نصرت یک بیک شکست سے بدل گئی اگرچہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے گرد و پیش ابوبکر، عمر، علی، طلحہ، زبیر رضی اللہ عنہم جیسے فداکار موجود تھے، تاہم مسلمانوں کے فرار سے دشمنوں کو موقع مل گیا اور ایک شقی ازلی نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پتھر کھینچ کر مارا جس سے آپکا ایک دندان مبارک شہید ہو گیا، آپ پتھر کے صدمہ سے قریب کی ایک گھاٹی میں گر گئے، ابھی

آپ سنبھلے بھی نہ تھے کہ ایک مشرک نے پکار دیا "ان محمداً قد مات" محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا انتقال ہوگیا" اس آواز نے مسلمانوں میں اور زیادہ انتشار اور سخت بےچینی پیدا کر دی، مگر مسلمان فوراً سنبھلے اور ثابت قدم صحابہ نے للکارا کہ اگر یہ خبر صحیح ہے تو اب ہم زندہ رہ کر کیا کرینگے آؤ اور جنگ کا فیصلہ کرکے دم لو!

اس صدائے حق نے مسلمانوں کے دل میں غیرت کا جذبہ پیدا کر دیا، وہ سب پلٹ پڑے اور حملہ آور ہونیکی غرض سے سمٹ کر یکجا ہو گئے، مگر نقشہ جنگ بدل چکا تھا اور قریش اپنی کامیابی پر نازاں ہوکر میدان سے الگ ہو چکے تھے، مسلمانوں نے آنکھ اٹھا کر دیکھا تو جلوۂ جہاں آرا نظر پڑتے ہی اُن کے دل میں بھی سکون پیدا ہوگیا اور پروانہ وار آپ کے گرد جمع ہو گئے، غار میں گر جانے سے خود سر میں گھس رہ گیا اور زرہ کی کڑیوں کی زد سے چہرۂ مبارک اور بازوؤں پر بھی ہلکے زخم آگئے تھے حضرت علی (رضی اللہ عنہ) اور حضرت فاطمہ (رضی اللہ عنہا) نے خود کو سر سے نکالا اور زخموں کو دھویا اور بوریا جلا کر راکھ کو زخم کے اندر بھر دیا، جس سے خون بند ہوگیا۔

حضرت حمزہؓ کی شہادت

اس غزوہ میں ستر مسلمان شہید اور بہت سے زخمی ہوئے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حقیقی چچا، دودھ شریک بھائی بے تکلف دوست اور جاں نثار صحابی حضرت حمزہؓ کی شہادت اس واقعہ کا زبردست سانحہ ہے زبانِ وحی ترجمان نے انکو سید الشہداء کا لقب عطا فرمایا۔

مشرکین مکہ نے اس جنگ میں درندوں اور خونخوار حیوانوں کی طرح مردہ نعشوں تک کے ناک کان کاٹ ڈالے اور پیٹ چاک کرکے دل وجگر کو نیزوں کی اَنی سے چھید چھید کر دل کا بخار نکالا، ابوسفیان کی بیوی ہندؓ نے تو سید الشہداء کا جگر

چاک کرکے دانتوں سے چبا ڈالا۔ حضرت حمزہ کو ایک حبشی غلام وحشی نے شہید کیا تھا جس کی خوشی میں ہندہ نے اس کو اپنا سونے کا ہار عطا کیا۔

ابوسفیان اپنی کامیابی کی مسرت میں کہہ رہا تھا" اعل ھبل اُعل ھُبل ھُبل کی جے ہو، ہُبل کی جے ہو" نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے فرمایا، تم اس کے جواب میں یہ پکارو" اللہ اعلیٰ واجل، اللہ اعلیٰ واجل" اللہ ہی سب سے بلند و بالا اور بزرگ ہے"۔

ابوسفیان نے پھر طیش میں آکر کہا" لنا العُزّیٰ ولا عزیٰ لکم ہماری مددگار عُزّیٰ دیوی ہے اور تمھارے پاس عزّیٰ کا ہمسر نہیں ہے" حضور اقدس نے ارشاد فرمایا، اے عمر تم یہ جواب دو" اللہ مولانا ولا مولیٰ لکم۔ ہمارا والی و مددگار اللہ تعالیٰ ہے اور تمہارا کوئی بھی مددگار نہیں۔

بہرحال ابوسفیان یہ کہہ کر کہ آئندہ سال پھر بدر میں معرکہ آرائی ہوگی، اپنا لشکر لے کر مکہ واپس چلا گیا۔

قرآن عزیز اور غزوہ اُحد مسلمانوں کا غزوۂ اُحد کے لئے طیار ہونا، منافقین کا لشکر اسلام سے جدا ہوکر مسلمانوں میں انتشار پیدا کرنیکی سعی کرنا مسلمانوں کا اوّل خدا کی مدد سے کامیاب ہونا، اور پھر اپنی غلط کاری اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی خلاف ورزی کی پاداش میں شکست کھا جانا اور فتح کا شکست سے بدل جانا اور خدائے تعالیٰ کا مسلمانوں کی تسلی کرنا، ان تمام امور کو قرآن عزیز نے آل عمران میں قدرے تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے، چنانچہ محمد بن اسحٰق سے منقول ہے:۔

انزل اللہ فی شان احد ستین	اللہ تعالے نے غزوۂ احد کی شان میں آل عمران کی
آیۃ من آل عمران [1]	ساٹھ آیتیں نازل فرمائی ہیں۔
وروی ابن ابی حاتم من طریق	اور ابن ابی حاتم نے بطریق مسور بن مخرمہ روایت
المسور بن مخرمۃ قال قلت	کیا ہے کہ وہ کہتے تھے میں نے عبدالرحمن بن عوف
لعبد الرحمٰن بن عوف اخبرنی	سے عرض کیا، آپ غزوۂ اُحد کا اپنا قصہ بیان
عن قصتکم یوم احد قال	فرمائیں، اُنھوں نے فرمایا! تم آل عمران کی ایک
اقرأ العشرین ومائۃ من آل	سو بیس آیات پڑھو تو تم کو سارا واقعہ معلوم
عمران تجدھا واذ غدوت	ہوجائیگا یہ آیات یہاں سے شروع ہوکر اذ
من اھلک تبوئ المؤمنین	غدوت من اھلک تبوئ المؤمنین
مقاعد للقتال الی قولہ امنۃ	مقاعد للقتال امنۃ نعاسا الایۃ
نعاسا [2] (الایات)	پر ختم ہوتی ہیں
وَاِذْ غَدَوْتَ مِنْ اَهْلِكَ	اور (اے پیغمبر! قابل ذکر ہے وہ بات) جبکہ تم صبح سویرے اپنے
تُبَوِّئُ الْمُؤْمِنِيْنَ مَقَاعِدَ	گھر سے نکلے تھے (اور اُحد کے میدان میں) لڑائی کے لئے
لِلْقِتَالِ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ	مورچوں پر مسلمانوں کو بٹھا رہے تھے اور اللہ سب کچھ
اِذْ هَمَّتْ طَّآئِفَتٰنِ مِنْكُمْ	سُننے والا جاننے والا ہے۔ پھر جب ایسا ہوا تھا کہ تم میں
اَنْ تَفْشَلَا وَاللّٰهُ وَلِيُّهُمَا	سے دو جماعتوں نے ارادہ کیا تھا کہ ہمت ہار دیں (اور
وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ	واپس لوٹ چلیں، حالانکہ اللہ مددگار تھا اور جو ایمان رکھنے
الْمُؤْمِنُوْنَ ۝ (آل عمران)	والے ہیں، اُنکو چاہیئے کہ ہر حال میں اللہ ہی پر بھروسہ رکھیں)

[1] فتح الباری جلد ۷، ص ۲۷۸
[2] فتح الباری جلد ۷، ص ۲۷۸-

وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ اِنْ يَّمْسَسْكُمْ قَرْحٌ فَقَدْ مَسَّ الْقَوْمَ قَرْحٌ مِّثْلُهٗ وَتِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَيَتَّخِذَ مِنْكُمْ شُهَدَآءَ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ ۝ (آل عمران) (الآیات)	اور دیکھو! نہ تو ہمت ہارو، نہ غمگین ہو، تم ہی سب سے برتر و اعلیٰ ہو بشرطیکہ تم سچے مومن ہو! اگر تم نے (اُحد) میں زخم کھایا ہے تو دوسروں کو بھی ویسے ہی زخم (بدر میں) لگ چکے ہیں دراصل یہ ہار جیت کے اوقات ہیں جنہیں ہم انسانوں میں ادھر اُدھر پھیرتے رہتے ہیں، علاوہ بریں یہ اس لئے تھا تاکہ اس بات کی آزمائش ہو جائے، کون سچا ایمان رکھنے والا ہے کون نہیں اور اس لئے کہ تم میں سے ایک گروہ کو (ان وقائع اور ایام کے نتیجوں کا) شاہد حال بنا دے اور یہ ظاہر ہے کہ اللہ ظلم کرنیوالوں کو دوست نہیں رکھتا

غزوۂ احزاب (غزوۂ خندق)

غزوہ احزاب تمام غزوات میں خاص اہمیت رکھتا ہے اور اپنی نوعیت کے اعتبار سے نرالا ہے اس لئے کہ اس غزوہ میں مسلمانوں کو تمام کافر جماعتوں سے بیک وقت واسطہ پڑا اور قبائل عرب، یہود اور اُن کے حلیف سب کے سب جمع ہو کر مسلمانوں کو نیست و نابود کرنے نکلے تھے اور مدینہ کے اندر بھی منافقین کا گروہ خفیہ اُن کی مدد کر رہا تھا "حزب" کے معنی چونکہ "گروہ" کے ہیں اور "احزاب" اُس کی جمع ہے اس لئے یہ غزوہ احزاب کہلایا، اور چونکہ حضرت سلمان (رضی اللہ عنہ) کے مشورہ سے مسلمانوں نے پہلی مرتبہ خندق کھود کر مدینہ کو دشمن سے محفوظ رکھنے کی تدبیر اختیار کی، اس لیے اس کو غزوۂ خندق بھی کہتے ہیں۔

یہ غزوہ شوال ۵ھ مطابق فروری ۶۲۷ء میں پیش آیا جبکہ ابو سفیان دس ہزار پر مشتمل لشکر جرار کے ساتھ مدینہ پر چڑھائی کے لئے مکہ سے نکلا۔ اس واقعہ سے متعلق تاریخ و سیر کی کتابوں کے علاوہ صحیح بخاری میں بھی بہت کافی تفصیلات ملتی ہیں اور اس کے بہت سے اہم اجزاء پر روشنی پڑتی ہے۔

مختصر طور پر واقعات کی تفصیل یہ ہے کہ جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو دشمنوں کی نقل و حرکت کا علم ہوا تو حسب دستور آپ نے صحابہ (رضی اللہ عنہم) سے مشورہ فرمایا، حضرت سلمان فارسی نے عرض کیا! ہم اہلِ فارس کا دستور یہ ہے کہ ایسے موقع پر خندق کھود کر دشمن سے خود کو محفوظ کر لیتے اور اُس کو مجبور بنا دیتے ہیں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مشورہ کو قبول فرما کر خندق کھودنے کا حکم دیا اور کدال لے کر خود بھی بہ نفسِ نفیس شرکت فرمائی۔ کائناتِ انسانی کی تاریخ میں آقا اور غلام، حاکم اور محکوم، افسر اور ماتحت، مخدوم اور خادم کے درمیان یہ پہلا منظر تھا جو آنکھوں نے دیکھا اور کانوں نے سُنا کہ دو جہان کا سردار ہاتھ میں کدال لئے تین دن کے فاقہ سے پیٹ پر پتھر باندھے مہاجرین و انصار کے ساتھ خندق کھودنے میں برابر کا شریک نظر آتا ہے بلکہ ایک سخت پتھر کے حائل ہو جانے پر جب سب صحابہ نے زور دکایا اور اس نے اپنی جگہ سے حرکت نہ کی اور خدمتِ اقدس میں اس واقعہ کو پیش کیا تو آپ نے "بسم اللہ" کہہ کر کدال کی ایک ضرب سے اُس کو پارہ پارہ کر دیا۔[1]

آپؐ کے ساتھ صحابہؓ بھی تین شبانہ روز بھوک سے پیٹ پر پتھر باندھے دینِ حق کی حمایت اور اعلاءِ کلمۃ اللہ کی خاطر مصروف کار تھے۔

---

[1] بخاری باب غزوۂ احزاب۔

ایک جانب اگر لبثنا ثلثۃ ایام لا نذوق ذواقا کا مظاہرہ تھا تو دوسری جانب زبان وحی ترجمان پر یہ دعائیہ کلمہ جاری تھا " اللھم ان العیش عیش الاخرۃ فاغفر الانصار والمھاجرہ خدایا عیش تو آخرت کا عیش ہے پس تو انصار و مہاجرین کو مغفرت سے نواز " اور حب جاں نثاران توحید شمع نبوت سے یہ سنتے تو پروانوں کی طرح والہانہ جوش کے ساتھ یہ کہہ کہہ کر قربان ہونے لگتے۔

نحن الذین بایعوا محمدا   علی الجھاد ما بقینا ابدا

" ہم وہ ہیں جنھوں نے زندگی بھر کیلئے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر جہاد کی بیعت کی ہے "

اور جب شمع نبوت کے پروانوں سے آپ یہ والہانہ رجز سنتے ہیں تو مسرت و شادمانی کے ساتھ پھر ارشاد فرماتے ہیں۔

اللھم لا خیر الا خیر الاخرۃ   فبارك فی الانصار والمھاجرہ

" خدایا خیر و نیکی تو آخرت ہی کی ہے پس تو انصار و مہاجرین کے درمیان اپنی برکت کا نزول فرما[1] "

اور براء بن عازب فرماتے ہیں کہ غزوۂ خندق میں خدا کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی حالت یہ تھی کہ خندق سے مٹی اٹھا کر ادھر ادھر منتقل کر رہے تھے اور جسد مبارک گرد آلود ہو رہا تھا اور یہ رجز پڑھتے جاتے تھے۔

واللہ لولا اللہ ما اھتدینا   ولا تصدقنا ولا صلینا

قسم بخدا اگر خدا کی ہدایت رہنمائی نہ کرتی تو نہ ہم کو ہدایت نصیب ہوتی اور نہ صدقہ و نماز

فانزلن سکینۃ علینا   وثبت الاقدام ان لاقینا

پس اے خدا! تو ہم پر طمانیت نازل فرما اور میدان جنگ میں ہمکو ثابت قدم رکھ

---

[1] بخاری باب غزوۃ الاحزاب

انّ الاولی قد لغوا علینا　　اذا ارادو فتنۃ ابینا

اور جن لوگوں نے ہم پر سرکشی کرتے ہوئے چڑھائی کی ہے جب انھوں نے فتنہ کا ارادہ کیا تو

ہمنے انکار کر دیا (انکو ناکام کر دیا اور انتہار جوش کیساتھ) "ابینا" کو بلند آواز سے کہتے جاتے تھے

خندق کی کھدائی کا کام چند روز جاری رہا اور اس طرح دشمن سے حفاظت کا پوری طرح سامان ہوگیا، لیکن جب محاصرہ کو بیس روز ہو گئے تو یہود بنی قریظہ کی عہد شکنی اور مسلسل محاصرہ سے کچھ اکتانے اور مضطرب ہونے لگے، اُس وقت خدا کی نصرت نے نزول کیا اور مسلمانوں کی کامرانی کے اسباب مہیا ہو گئے، ہوا یہ کہ کفار کے لشکر میں ایک شخص نعیم بن مسعود نخعی تھا، یہ گو ابھی تک مسلمان نہیں ہوا تھا لیکن اس کے قلب میں صداقت اسلام گھر کر چکی تھی اس لئے اس نے اپنی ہوشیاری سے مشرکین مکہ اور یہود مدینہ کے درمیان بے اعتمادی پیدا کر دی اور جنگ کے معاملہ میں دونوں فریق میں ایسا اختلاف پیدا ہو گیا کہ ایک نے دوسرے کے ساتھ مل کر مسلمانوں کے ساتھ جنگ کرنے سے انکار کر دیا اور ابھی مشرکین مکہ واپس بھی نہ ہوئے تھے کہ قدرت کی جانب سے ہوائے تند کا ایسا طوفان اُٹھا کہ جس نے آن کی آن میں دشمن کے تمام لشکر کو زیر و زبر کر ڈالا، خیمے اُکھڑ کر گرنے لگے، چوپائے بھڑک بھڑک کر بھاگنے لگے اور سارے لشکر میں ابتری پھیل گئی اور دشمن نے محاصرہ چھوڑ کر راہِ فرار اختیار کی اور اس طرح اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو اُن کے فتنہ سے نجات دی۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی موقعہ پر ارشاد فرمایا "نصرت بالصبا و اُھلکت العاد بالدبور" اللہ تعالیٰ کی جانب سے مجھ کو پُروا ہوا کے ذریعہ فتح عطا کی گئی اور عاد پچھوا ہوا سے ہلاک کئے گئے تھے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو جب دشمن کی خبریں معلوم کرنیکی ضرورت پیش آئی تھی تو تین مرتبہ آپؐ نے دریافت کیا کہ اس خدمت کو کون انجام دیگا اور تینوں مرتبہ حضرت زبیر بن عوام نے پیش قدمی کر کے عرض کیا:- اس خدمت کیلئے میں حاضر ہوں تب آپؐ نے ارشاد فرمایا "ان لکل نبی حواریاً وان حواری الزبیر" ہر ایک نبی کے حواری ہوتے ہیں اور میرے حواری زبیر ہیں۔

اور اس موقعہ پر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دعا فرمائی" اللھم منزل الکتاب، سریع الحساب، اھزم الاحزاب، اللھم اھزمھم و زلزلھم۔ اے کتاب (قرآن) کے نازل کرنے والے خدا! اے جلد حساب لینے والے تو مشرکین کی جماعتوں کو شکست دیدے، الٰہی ان کو فرار کرا اور ان کو ڈگمگا دے"۔

لا الٰہ الا اللہ وحدہ، اعز جندہ، ونصر عبدہ، وغلب الاحزاب وحدہ فلا شیئ بعدہ - کوئی خدا نہیں اللہ کی ذات کے ماسوا جو یکتا و بے ہمتا ہے اُس نے اپنے لشکر (مسلمانوں) کو عزت بخشی اور اپنے بندہ (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کی مدد کی اور یکتا ذات احزاب (سب جماعتوں) پر غالب ہے، اور اُس کے ماسوا سب فانی ہیں

یہی وہ غزوہ ہے جس میں مشغولیتِ جہاد کی وجہ سے حضور اقدس اور صحابہ کی نماز عصر قضا ہوگئی اور آپ نے مغرب کے وقت دونوں نمازوں کو ادا کیا[۱]

قرآن عزیز اور غزوۂ احزاب حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں یہ آیت غزوۂ خندق ہی کے متعلق نازل ہوئی۔

اِذْ جَاءُوْكُمْ مِّنْ فَوْقِكُمْ وَمِنْ — اور جب چڑھ آئے (مشرکین) تم پر اوپر کی جانب سے

---

[۱] بخاری باب الجہاد

اَسْفَلَ مِنْكُمْ وَاِذْ زَاغَتِ الْاَبْصَارُ	اور نیچے کی جانب سے اور جب پھر گئیں (دہشت
وَبَلَغَتِ الْقُلُوْبُ الْحَنَاجِرَ[1]	کی وجہ سے) آنکھیں اور پہنچ گئے دل گلوں تک
(احزاب)	(یعنی کلیجے منہ کو آ گئے)

قرآنِ حکیم میں اسی غزوہ کی نسبت سے اس سورۃ کا نام ہی احزاب ہو گیا اس سورت کے دوسرے اور تیسرے رکوع میں اسی واقعہ کا تذکرہ ہے۔

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اذْکُرُوْا نِعْمَۃَ	اے ایمان والو! اللہ کی نعمت کو یاد کرو جو تم پر اس
اللّٰہِ عَلَیْکُمْ اِذْ جَآءَتْکُمْ جُنُوْدٌ	وقت کی گئی جب تم پر (مشرکین کے) لشکر چڑھ آئے تھے
فَاَرْسَلْنَا عَلَیْھِمْ رِیْحًا وَّجُنُوْدًا	پس ہم نے ان پر ہوا کو اور ایسے لشکروں کو بھیجا
لَّمْ تَرَوْھَا وَکَانَ اللّٰہُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ	جنکو تم نہیں دیکھ رہے تھے اور جو کام بھی تم کرتے
بَصِیْرًا ہ (الی) وَکَانَ اللّٰہُ عَلٰی	ہو اللہ تعالیٰ ان کاموں کا دیکھنے والا ہے "وَ
کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرًا ہ	کَانَ اللّٰہُ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرًا" تک۔

واقعۂ حدیبیہ

حدیبیہ، مکہ مکرمہ سے جدہ کی جانب ایک منزل پر واقع ہے اور آج کل شمیسیہ کے نام سے مشہور ہے، حدیبیہ دراصل کنویں کا نام ہے۔ یہی وہ مقام ہے جس کے ساتھ "فتح مبین" اور "بیعت رضوان" کی مقدس تاریخ وابستہ ہے۔

سنہ ۶ ہجری مطابق فروری سنہ ۶۲۸ء ماہ ذیقعدہ روز دوشنبہ وہ وقت سعید تھا کہ سرورِ دو عالم (صلی اللہ علیہ وسلم) چودہ سو صحابہ (رضی اللہ عنہم) کے جلو میں ادائے عمرہ کے

---

[1] بخاری باب غزوۂ احزاب

ارادہ سے مکہ معظمہ روانہ ہوئے[1] اور جب ذوالحلیفہ پہنچے تو قربانی کے جانوروں کے قلادہ ڈالا اور احرام باندھا اور بنی خزاعہ کے ایک شخص کو جاسوس بنا کر بھیجا کہ وہ قریش کے حالات کا اندازہ لگا کر خبر دے۔

حضور اقدس جب غدیر اشطاط[1] پہنچے تو جاسوس نے آکر خبر دی کہ قریش کو آپ کی آمد کی اطلاع ہو چکی ہے اور وہ قبائل کو جمع کر کے مقابلہ کی تیاریوں میں مصروف ہیں، اُن کا ارادہ ہے کہ آپ کو مکہ مکرمہ میں داخل نہ ہونے دیں۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سے مشورہ فرمایا تو صدیق اکبر نے عرض کیا "خدا کے رسول! ہم تو بیت اللہ کے قصد سے نکلے ہیں، جنگ یا قتل و قتال ہمارا مقصد نہیں ہے لہذا ہم بیت اللہ کی زیارت کو اپنا مقصد سمجھتے ہوئے ضرور آگے بڑھتے رہیں گے اور جو جماعت خواہ مخواہ سدِ راہ ہوگی اُس سے مجبوراً لڑنا پڑیگا"

مشورہ کے بعد ذاتِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا "امضوا علی اسم اللہ، اب خدا کا نام لیکر بڑھے چلو"[2]

زائرین بیت اللہ خدا کے عشق میں چور اور بیت اللہ کی زیارت میں مسرور مکہ کی جانب قدم بڑھائے چل رہے تھے کہ خدا کے رسول نے فرمایا! خالد بن ولید فوج کا دستہ لئے غمیم میں گھات لگائے تمہارا منتظر ہے اس لئے مناسب یہ ہے کہ اُس جانب سے کاوا کاٹ کر داہنی جانب چلیں اور اچانک بے خبری میں اُنکے مقابل پہنچ جائیں، جب مسلمان اچانک خالد بن ولید کے دستہ فوج کے سامنے آگئے تو اپنی گھات کو ناکام دیکھ کر خالد گھبرا گئے، دستہ فوج کو لے تیزی کیساتھ شہر کی

---

[1] مکہ کے قریب ایک مقام ہے۔ [2] بخاری باب غزوۃ الحدیبیہ

مکہ کے پاس جا پہنچے اور اُن کو مسلمانوں کی آمد سے مطلع کیا۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب اُس ٹیلہ پر پہنچے کہ اُس کے بعد وادی میں اُتر کر مکہ پہنچ جانا تھا تو اچانک آپؐ کی اونٹنی قصواء بیٹھ گئی، صحابہ نے یہ دیکھ کر اُس کو جھڑک دیے، بھڑکایا اور کوشش کی کہ کسی طرح وہ اُٹھ کھڑی ہو مگر وہ نہ اُٹھی۔ لوگ جب بار بار "حَل حَل"[1] کہہ کر تھک گئے تو کہنے لگے "خلأت القصواء" قصواء نافرمان ہو گئی

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سُنا تو فرمایا: "ما خلأت القصواء وما ذالک لها بخلق، ولکن حبسها حابس الفیل۔ قصواء ہرگز نافرمان نہیں ہوئی اور نہ یہ اس کی عادت ہی ہے بلکہ اس کو اُس خدا نے روک دیا تھا جس نے ہاتھی والوں کو روک دیا تھا یعنی قریش مکہ کی بیہودگی اور جنگی ذہنیت کی وجہ سے چونکہ جنگ کی صورت حال پیدا ہو گئی ہے اس لئے خدا کی مرضی یہ ہے کہ ہم اُس وقت تک آگے نہ بڑھیں جب تک کہ کعبہ کی حرمت کا عہد نہ کر لیں۔

چنانچہ اس ارشاد کے بعد ذاتِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: والذی نفسی بیدہٖ لا یسئلونی خطۃً یعظمون فیها حرمات اللہ الا اعطیتهم ایاها۔ اُس خدا کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے وہ مجھ سے جو بھی ایسی بات چاہیں گے کہ اُس میں حُرمات اللہ کی عظمت اُن کے پیشِ نظر ہو تو میں ضرور اس کو پورا کرونگا۔

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم جب یہ اعلان فرما چکے تو اب جو قصوا کو کھڑا ہونے کے لئے ڈپٹا وہ فوراً کھڑی ہو گئی اور چل پڑی اور حدیبیہ کے میدان میں جا پہنچی[2]

---

[1] اونٹنی کو اُٹھانے کے لئے بولتے ہیں۔ [2] البدایہ والنہایہ جلد ۴ ص ۱۶۷۔ ۱۶۸

جب زائرین بیت اللہ کا مقدس قافلہ حدیبیہ میں فروکش ہو گیا تو صلاح یہ قرار پائی کہ حضرت عثمان (رضی اللہ عنہ) کو مکہ بھیجا جائے تاکہ وہ مشرکین مکہ پر یہ واضح کریں کہ ہمارا ارادہ بجز زیارت بیت اللہ کے اور کچھ نہیں، لہذا ہمکو روکنا مناسب نہیں ہے۔

حضرت عثمان (رضی اللہ عنہ) جب مکہ میں داخل ہوئے اور ابو سفیان وغیرہ سے مل کر گفتگو کی تو انہوں نے ایک نہ سنی اور کہنے لگے کہ تم اگر چاہتے ہو کہ تنہا طواف بیت اللہ کر لو، تو کر لو، ورنہ ہم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اور اُن کے دوسرے رفقاء کو ہرگز مکہ میں داخل نہیں ہونے دیں گے۔

حضرت عثمانؓ نے فرمایا "یہ تو میں ہرگز نہیں کر سکتا کہ خدا کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کے بغیر طواف اور عمرہ کو ادا کر لوں" قریش نے جب حضرت عثمانؓ کا یہ اصرار دیکھا تو اُن کو واپس جانے سے روک لیا۔

بیعت رضوان یہ خبر مسلمانوں تک اس طرح پہنچی کہ عثمان قتل کر دیے گئے مسلمانوں کے لئے یہ خبر ایک بہت بڑا سانحہ تھا جس سے ہر شخص مضطرب اور بے قابو ہوا جا رہا تھا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اُسی وقت ایک درخت کے نیچے بیٹھ کر مسلمانوں سے اس بات پر بیعت لی کہ مر جائیں گے، مگر ہم میں سے کوئی ایک بھی راہ فرار اختیار نہیں کریگا، نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) جب سب مسلمانوں سے بیعت لے چکے تو اُن میں حیرت زا والہانہ جوش و خروش پیدا ہو گیا جس کی خبر شدہ شدہ مکہ بھی پہنچ گئی، مشرکین مکہ بہت گھبرائے اور خوف زدہ ہو کر مسلمانوں تک یہ خبر پہنچائی کہ قتل عثمانؓ کی خبر غلط ہے اور حضرت عثمانؓ صحیح و سلامت حدیبیہ

واپس تشریف لے آئے۔

چونکہ جہاد کی یہ بیعت بہت ہی نازک اور اہم موقع پر لی گئی اور مسلمانوں نے پورے ولولہ اور جذبۂ ایثار کے ساتھ اس بیعت کو کیا، اس لئے اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کی اس فداکاری کی قدر و منزلت فرمائی اور سورہ فتح میں اپنی رضا اور خوشنودی کا پروانہ مرحمت فرما کر ان کے اس کارنامہ کو زندۂ جاوید بنا دیا اور اسی حقیقت کے پیش نظر اسلامی تاریخ میں اس کا نام "بیعتِ رضوان" قرار پایا۔

لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ	بلاشبہ اللہ راضی ہوا ایمان والوں سے جبکہ وہ تیرے
يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ فَعَلِمَ	ہاتھ پر اس درخت کے نیچے بیعت کرنے لگے اور
مَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ فَاَنْزَلَ السَّكِيْنَةَ	جان لیا اللہ نے جو ان کے جی میں تھا، پس اتارا
عَلَيْهِمْ وَاَثَابَهُمْ فَتْحًا قَرِيْبًا ۝	ان پر اطمینان و سکون اور انعام میں دیا اُن کو
(الفتح)	ایک فتح قریب"[1]

مسلمانوں کے فداکارانہ جوش اور والہانہ جذبہ نے مشرکین مکہ پر ایسا اثر کیا کہ اب وہ خود صلح پر آمادہ ہو گئے اور پیش قدمی کر کے سہیل بن عمرو کو سفیر بنا کر بھیجا کہ وہ نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) سے شرائط صلح طے کرے تاکہ یہ قضیہ ختم ہو جائے مگر یہ شرط بہر صورت رہیگی کہ مسلمان اس سال نہیں بلکہ آئندہ سال عمرہ کر پائیں گے[2]

معاہدہ صلح | سہیل بن عمرو جب مسلمانوں کے کیمپ میں پہنچا تو حضور اقدس

---

[1] حافظ ابن حجر رح فرماتے ہیں "واثابہم فتحا قریبا" میں فتح قریب سے مراد "فتح خیبر" ہے جو حدیبیہ کے بعد پیش آیا اور مسلمانوں کو جسمیں بہت مال غنیمت ہاتھ آیا اور یہی صحیح قول ہے۔ جلد، ص ۳۵۵۔

[2] البدایہ والنہایہ جلد ۴ ص ۱۶۷ - ۱۶۸

صلی اللہ علیہ وسلم نے صلح کے نقطۂ خیال کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھا اور طویل گفت وشنید کے بعد حسب ذیل دفعات پر دونوں جانب سے معاہدہ کی تصدیق وتوثیق عمل میں آگئی۔

(۱) اس سال مسلمان مکہ میں داخل ہوئے بغیر ہی واپس چلے جائیں۔

(۲) آئندہ سال مسلمان مکہ میں بغرض عمرہ اس طرح داخل ہوں گے کہ معمولی حفاظتی ہتھیاروں کے علاوہ کوئی جنگی ہتھیار نہیں ہوگا اور تلواریں نیام کے اندر ہی رہینگی اور صرف تین دن قیام کریں گے اور جب تک وہ رہیں گے ہم مکہ چھوڑ کر پہاڑیوں پر چلے جائیں گے۔

(۳) معاہدہ کی مدت کے اندر دونوں جانب امن وعافیت کے ساتھ آمدورفت کا سلسلہ جاری رہیگا۔

(۴) اگر کوئی شخص مکہ سے اپنے ولی کی اجازت کے بغیر مسلمان ہوکر بھی مدینہ چلا جائیگا تو اُس کو مکہ واپس کرنا ہوگا اور اگر مدینہ سے کوئی شخص مکہ بھاگ آئیگا تو ہم اُس کو واپس نہیں کریں گے۔

(۵) تمام قبائل آزاد ہیں کہ ہردو فریق میں سے جو جس کا حلیف بننا پسند کرے اُس کا حلیف بن جائے۔

(۶) یہ معاہدہ دس سال تک قائم رہیگا اور کوئی فریق اس مدت کے اندر اسکی خلاف ورزی نہیں کریگا۔[۱]

معاہدہ کی تحریر کے وقت نام مبارک کے ساتھ "رسول اللہ" لکھنے پر سہیل

---

[۱] البدایہ والنہایہ جلد ۴ ص ۱۶۸ - ۱۶۹

نے اعتراض کیا تھا،

آپؐ نے فرمایا کہ ہو تو یہ واقعہ اور حقیقت جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا، لیکن ہم کو چونکہ صلح مقصود ہے اس لیے تم اگر یہ پسند نہیں کرتے تو مجھ کو اصرار نہیں اور یہ فرما کر آپؐ نے کاتب معاہدہ حضرت علی (رضی اللہ عنہ) کو حکم دیا کہ وہ اس جملہ کو محو کر دیں، حضرت علی (رضی اللہ عنہ) سے یہ کب ممکن تھا کہ وہ اس جملہ کو اپنے ہاتھ سے مٹائیں، جس کی نسبت نے ساری کائنات میں انقلاب پیدا کر کے ظلمت کو نور سے، شرک کو ایمان سے اور جہل کو علم سے بدل ڈالا۔ نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے جب یہ محسوس کیا تو مقام تحریر کو معلوم کر کے دست مبارک سے اُس جملہ کو محو کر دیا[1]

معاہدہ جب مکمل ہو گیا تو مسلمانوں نے یہ محسوس کیا کہ اس میں ہمارا پہلو کمزور رہا اور صورت حال یہ ہو گئی کہ گویا ہم نے دب کر صلح کی ہے حتیٰ کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ضبط نہ ہو سکا اور اعلائے کلمۃ اللہ اور اسلام کی سربلندی کے جذبہ نے مجبور کیا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں عرض کریں "یا رسول اللہ! کیا یہ حدیبیہ کا واقعہ "فتح" ہے؟ حضور اقدس نے ارشاد فرمایا "ہاں، قسم بخدا بلا شبہ یہ "فتح" ہے[2]

یہ واقعہ جو اپنی دفعاتِ معاہدہ کے لحاظ سے مسلمانوں کے حق میں بظاہر شکست اور ذلت کا باعث نظر آتا تھا "فتح مبین" کیسے تھا؟ تو اس کا جواب جلیل القدر محدثین کی زبانی سُنیے، امام حدیث و سیرت زُہری (رحمہ اللہ) فرماتے ہیں۔

"اسلام میں جو عظیم الشان فتوحات شمار کی گئی ہیں، ان میں سب سے پہلی

---

[1] تاریخ طبری جلد ۳ ص ۸۰ [2] فتح الباری جلد ۷ ص ۳۵۶

"فتح عظیم" صلح حدیبیہ ہے، اس لئے کہ اس سے قبل برابر کفار و مشرکین سے جنگ و پیکار کا سلسلہ جاری تھا اور جب یہ "صلح" عمل میں آگئی تو اس کی وجہ سے ہر دو فریق کو امن و اطمینان کے ساتھ ایک دوسرے سے ملنے اور گفتگو کرنے کا موقع میسر آیا اور تبادلۂ خیالات کی آزادی نصیب ہوئی نتیجہ یہ نکلا کہ جو شخص بھی اسلام کو اپنی عقلِ صحیح سے جانچتا اور اسکی حقیقت پر غور کرتا، اس کے لئے بجز اس کے کوئی چارہ باقی نہ رہتا تھا کہ وہ فوراً اسلام قبول کرلے، چنانچہ اِن دو سال میں (جب تک معاہدہ پر عمل رہا اور مشرکین نے اپنی جانب سے اُس کی خلاف ورزی نہیں کی) لوگ اس قدر مسلمان ہوئے کہ اس سے قبل کی پوری مدت میں اسی قدر یا اس سے بھی کم مسلمان ہوئے تھے[1]

اور حافظ ابن حجر عسقلانی رحؒ ارشاد فرماتے ہیں:۔

اس مقام پر "فتح مبین" سے مراد واقعہ حدیبیہ ہے صلح حدیبیہ نے درحقیقت "فتح مبین" "فتح مکہ" کے لئے راہ کھول دی یہ اس لئے کہ جب جنگ کا خطرہ درمیان سے جاتا رہا اور امن و اطمینان کی صورت پیدا ہو گئی تو مکہ اور مدینہ کے درمیان سلسلۂ آمد و رفت بے خوف خطر ہونے لگا اور حضرت خالد بن ولید (رضی اللہ عنہ) اور حضرت عمرو بن العاص (رضی اللہ عنہ) جیسے شجیع اور مدبر حضرات کا قبولِ اسلام اسی صلح کا کارنامہ ہے اور یہی اسبابِ ترقی آہستہ آہستہ "فتح" مکہ کا باعث بنے[2]

---

[1] فتح الباری جلد ۷، ص ۳۵۵ ؎

اور ابن ہشام، امام زہری کی توجیہ کی تائید کرتے ہوئے لکھتے ہیں

زہری کے قول کی تائید اس حقیقتِ حال سے بخوبی ہوجاتی ہے کہ واقعہ حدیبیہ میں جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نکلے ہیں تو چودہ سو مسلمان جلو میں تھے اور دو سال بعد جب فتح مکہ کے لئے نکلے ہیں تو دس ہزار کی تعداد تھی[۱]

الفتح الاعظم

رمضان المبارک ۸ھ ہجری مطابق جنوری ۶۳۰ء میں "فتح مکہ" کا عظیم الشان واقعہ پیش آیا۔ اس واقعہ کی تاریخی حیثیت یہ ہے کہ حدیبیہ کے معاہدہ میں یہ طے پاگیا تھا کہ قبائلِ عرب اس کے لئے آزاد ہوں گے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور قریش میں سے جس کے بھی حلیف بننا چاہیں، بن جائیں، جب معاہدہ پر دونوں جانب سے دستخط ہو گئے تو فوراً عرب کے قبیلہ خزاعہ نے اعلان کیا کہ ہم مسلمانوں کے حلیف ہونا پسند کرتے ہیں۔ اور قبیلہ بنو بکر نے کہا کہ ہم قریش کے حلیف بننا چاہتے ہیں اور دونوں قبائل اس طرح الگ الگ دو جماعتوں کے حلیف ہوگئے۔

تقریباً ڈیڑھ سال تو معاہدہ پر ہر دو جانب سے پوری طرح عمل ہوتا رہا لیکن ڈیڑھ سال کے بعد ایک نیا واقعہ پیش آیا وہ یہ کہ بنی خزاعہ اور بنی بکر کے درمیان عرصہ سے جنگ و پیکار کا سلسلہ جاری رہ چکا تھا جو اس درمیانی مدت میں اگرچہ

---

[۱] فتح الباری جلد ۷ ص ۳۵۵

بندر رہا مگر اچانک کسی بات پر پھر جنگ چھڑ گئی اور بنو بکر ایک شب کو مقام وتیرہ[1] میں بنو خزاعہ پر جا چڑھے، قریش کو جب یہ معلوم ہوا تو انھوں نے آپس میں مشورہ کیا اور کہنے لگے شب کا وقت ہے اور مسلمان یہاں سے بہت دور ہیں آج موقعہ ہے کہ بنی خزاعہ کو پیغمبر اسلام (صلی اللہ علیہ وسلم) کے حلیف ہونے کا مزہ چکھایا جائے چنانچہ انھوں نے بھی بنی بکر کا ساتھ دیتے ہوئے بنی خزاعہ کو تہ تیغ کرنا شروع کر دیا[2]

عمرو بن سالم نے جب یہ حال دیکھا تو ایک وفد لے کر دربار قدسی میں استغاثہ کیا اور بنی خزاعہ کی دردناک حالت کو پیش کرتے ہوئے طالب امداد ہوا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا واللہ لا منعکم مما امنع نفسی منہ۔ قسم بخدا میں جس چیز کو اپنی ذات سے روکوں گا تم کو بھی اس سے ضرور محفوظ رکھونگا۔

ادھر قریش کو جب یہ علم ہوا تو وہ ڈرے، اپنی حرکت بیجا پر نادم ہوئے اور انھوں نے ابو سفیان کو مامور کیا کہ وہ مدینہ جائے اور مسلمانوں کے اشتعال کو دور کرنیکی یہ تدبیر کرے کہ قریش چاہتے ہیں کہ سابق معاہدہ کی مدت میں مزید اضافہ اور از سرِ نو معاہدہ کی توثیق ہو جائے۔ ابو سفیان مدینہ پہنچ کر سب سے پہلے اپنی بیٹی ام حبیبہ (رضی اللہ عنہا) کے گھر میں داخل ہوا جو نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی رفیقہ حیات تھیں۔ ابو سفیان نے جونہی ارادہ کیا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم) کے بچھے ہوئے بستر پر بیٹھ جائے، ام حبیبہؓ نے فوراً اس کو سمیٹ دیا، اور کہنے لگیں "باپ! یہ خدا کے نبی کا بچھونا ہے۔ ابو سفیان نے کہا کہ "پھر کیا ہوا، میں تیرا باپ ہوں" ام حبیبہؓ نے کہا: "یہ صحیح ہے مگر تو مشرک ہے اور یہ پیغمبر خدا کا پاک بستر۔

---

[1] مکہ کے قریب ایک مقام ہے۔ [2] البدایہ والنہایہ جلد ۴ ص ۲۷۸۔

ابوسفیان اگرچہ اُس وقت بڑبڑاتا ہوا وہاں سے چلا گیا، مگر اس حیرت زا واقعہ نے اُس کی آنکھیں کھول دیں اور وہ سمجھا کہ حقیقتِ حال کیا ہے؟[1]

غرض وہ دربارِ اقدس میں حاضر ہوا اور عرض و معروض کرنے لگا، آپ نے دریافت فرمایا یہ تجدید و توثیق کی کیا حاجت ہے کیا کوئی نیا واقعہ پیش آگیا ہے؟ ابوسفیان نے عرض کیا" نہیں کوئی نئی بات نہیں ہے" تب آپ نے ارشاد فرمایا کہ:" تو مطمئن رہو کہ ہم اپنے عہد پر قائم ہیں"

ابوسفیان اس جواب کو سُن کر مطمئن نہ ہوا، اس لئے کہ وہ حقیقتِ حال کو چھپا کر جھوٹ بول چکا تھا اور چاہتا تھا کہ اس طرح نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کو دھوکا دیکر اپنا مقصد پورا کرلے، لیکن اس صاف اور سچے جواب نے اُوس ڈال دی اور اُس کا مقصد پورا نہ ہوسکا۔ تب اُس نے صدیق اکبرؓ فاروق اعظمؓ، علی حیدر (رضی اللہ عنہم) کی خدمت میں حاضر ہوکر جدا جدا گفتگو کی اور چاہا کہ معاملہ قریش کے حسب مراد طے ہوجائے لیکن اُس کی مراد بر نہ آسکی اور بے نیل و مرام مکہ واپس گیا۔

نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے صدیق اکبر (رضی اللہ عنہ) کو صورتِ حال سے آگاہ فرمایا، حضرت صدیقؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ! ہمارے اور قریش کے درمیان تو معاہدہ ہے" آپ نے ارشاد فرمایا:" تھا مگر قریش نے خود نقضِ عہد کردیا ہے"

اب جہاد کی تیاری شروع ہوئی مگر عام طور پر یہ کسی کو معلوم نہ ہوسکا کہ کس جانب ارادہ ہے، آپؐ نے اطرافِ مدینہ میں نفیرِ عام کرادیا کہ جو شخص بھی اللہ اور اس کے

---

[1] البدایہ والنہایہ جلد ۴ ص ۲۸۰

رسول پر ایمان رکھتا ہے وہ رمضان تک مدینہ پہنچ جائے، آپ پوری کوشش فرما رہے تھے کہ کسی طرح ہماری طیاری کا حال قریش کو نہ معلوم ہو جائے، کیونکہ آپکی دلی خواہش یہ تھی کہ مکہ میں جنگ بپا نہ ہونے پائے اور قریش مرعوب ہو کر منقاد و مطیع ہو جائیں کہ اسی اثنار میں ایک حادثہ پیش آگیا۔

حاطب بن بلتعہ کا واقعہ

حاطب بن بلتعہؓ ایک بدری صحابی تھے، اُن کے اہل و عیال مکہ ہی میں تھے کہ یہ صورت حال پیش آگئی، انھوں نے یہ خیال کرتے ہوئے کہ اس واقعہ کا حال بہرحال مشرکین کو معلوم ہو ہی جائیگا سو اگر میں بھی قریش مکہ کو اس کی اطلاع کر دوں تو ہمارا (مسلمانوں کا) کوئی نقصان بھی نہیں ہوگا اور میں اُن کی ہمدردی حاصل کر کے اپنے اہل و عیال کو اُن کی مضرت سے بھی محفوظ رکھ سکوں گا، مشرکین مکہ کے نام ایک مکتوب لکھ دیا، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم، کو بذریعہ وحی الٰہی یہ معلوم ہو گیا اور آپؐ نے حضرت علیؓ، مقدادؓ، زبیرؓ کو مامور فرمایا کہ روضۂ خاخ جاؤ، وہاں ناقہ سوار عورت ملیگی، وہ جاسوس ہے اُس کے پاس ایک خط ہے وہ اُس سے چھین لو، یہ حضرات روضۂ خاخ پہنچے تو عورت کو موجود پایا، انھوں نے خط کا مطالبہ کیا، عورت نے انکار کیا کہ میرے پاس کوئی خط نہیں ہے، مگر جب اُنھوں نے جامہ تلاشی کی دھمکی دی تو مجبور ہو کر اُس نے سر کے بالوں میں سے ایک پرچہ نکال کر دیا،

یہ پرچہ جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش ہوا تو وہ حضرت حاطب کا خط تھا، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم، نے اُن کی جانب مخاطب ہو کر ارشاد فرمایا:۔ حاطب یہ کیا؟ حاطب نے عرض کیا: یا رسول اللہ! عجلت نہ فرمائیں، یہ خط میں نے

اس لئے لکھا کہ میں جانتا ہوں کہ مدینہ میں مقیم سب مہاجرین کا مکہ کے قریشیوں کے ساتھ کسی نہ کسی قسم کا رشتہ اور تعلق ہے ایک میں ہی ایسا ہوں جس کا اُن کے ساتھ کوئی رشتہ نہیں ہے، تو میں نے یہ صرف اس یقین پر کیا ہے کہ مسلمانوں کو تو اس بات سے کوئی نقصان نہیں ہوگا اور میں اس طرح قریش کی ہمدردی حاصل کر کے اپنے اہل و عیال کو محفوظ کر سکوں گا، یارسول اللہ! بخدا میں نے ہرگز، ہرگز یہ کام ارتداد اور کفر پر رضا کی نیت سے نہیں کیا، میں اب بھی اسلام کا شیدائی اور فدائی ہوں۔

نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے یہ سب سُنکر ارشاد فرمایا "حاطب نے تمہارے سامنے سچ سچ بات کہہ دی" حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) نے عرض کیا:۔ یارسول اللہ! مجھ کو اجازت دیجئے کہ میں اس منافق کی گردن اُڑا دوں" نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا:" حاطب بدر کے مجاہد ہیں اور اللہ تعالیٰ نے شرکاءِ بدر کے لئے یہ ارشاد فرمایا ہے" اعملوا ما شئتم فقد غفرت لکم"۔ حاطب کے واقعہ پر ہی قرآن حکیم کی یہ آیت نازل ہوئی" یَاَیُّھَا الذین اٰمنوا لا تتخذ وا عدوی وعدوکم اولیاءَ (الی) فقد ضلّ سواءَ السبیل[1]"

بہرحال رمضان کی ابتدائی تاریخیں تھیں کہ ذات اقدس (صلی اللہ علیہ وسلم) دس ہزار جان نثاروں کے ساتھ مکہ کی جانب روانہ ہوئے، آپ جب قُدید اور عسفان کے درمیان کدید تک پہنچے تو دیکھا کہ مسلمانوں پر روزہ کی سختی حد سے متجاوز ہوتی جا رہی ہے، تب آپ نے پانی طلب فرمایا اور مجمع کے سامنے نوش فرمایا[2]

[1] بخاری۔ اے ایمان والو! میرے اور اپنے دشمنوں کو دوست نہ بناؤ [2] بخاری باب الغزوات۔

تاکہ صحابہؓ دیکھ لیں اور سمجھ لیں کہ مسافرت اور پھر جہاد کے موقعہ پر افطار کی اجازت ہی
اور قرآن کی دی ہوئی رخصت کا یہی مطلب ہے۔

اسی سفر میں ذاتِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم، کے چچا حضرت عباس رضی اللہ
عنہ، مسلمان ہو کر حاضر خدمت ہوئے، آپؐ نے حکم دیا کہ اہل و عیال کو مدینہ بھیجدو
اور تم ہمارے ساتھ رہو۔

اسلامی لشکر جب مکہ کے قریب پہنچا تو ابو سفیان چھپ کر لشکر کا صحیح اندازہ
کر رہے تھے کہ اچانک مسلمانوں نے گرفتار کر کے خدمت اقدس میں پیش کیا، آپؐ نے
ابو سفیان پر نگاہِ کرم ڈالتے ہوئے معاف کر دیا اور قید سے آزاد کر دیا، ابو سفیان نے
رحمۃ اللعالمین کا یہ خُلق دیکھا تو فوراً مشرف باسلام ہو گئے، اسی طرح عبد اللہ بن ابی
امیہ بھی اسلام کے والہ و شیدا بن کر حاضر خدمت ہوئے، آپ نے ان حضرات کے
کے قبول اسلام پر بہت مسرت کا اظہار فرمایا اور ارشاد فرمایا " لا تثریب علیکم الیوم
یغفر اللہ لکم وھو ارحم الراحمین " نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عباسؓ سے
فرمایا کہ ابو سفیان کو ابھی مکہ واپس نہ جانے دو اور سامنے کی پہاڑی پر لیجاؤ تاکہ وہ
مسلمانوں کی طاقت و شوکت کا اندازہ کر سکے۔

ابو سفیان اور حضرت عباس رضی اللہ عنہما، پہاڑی پر کھڑے ہوئے اسلامی
لشکر کا نظارہ کر رہے تھے اور مہاجرین و انصار قبائل کے جُدا جُدا لشکر اپنے پرچم لہراتے
ہوئے سامنے سے گذر رہے تھے اور ابو سفیان اُن کو دیکھ دیکھ کر متاثر ہو رہے تھے
کہ انصاری قبیلہ کا ایک لشکر پاس سے گذرا، اس لشکر کا پرچم حضرت سعد بن عبادہ
(رضی اللہ عنہ) کے ہاتھ میں تھا، انھوں نے ابو سفیان کو دیکھا تو جوش میں آ کر

کہنے لگے "الیوم یوم الملحمہ الیوم تستحل الکعبۃ۔ آج کا دن جنگ کا دن ہے، آج کعبہ میں بھی جنگ حلال ہے" ابوسفیان کی نسلی عصبیت بھڑک گئی اور کہنے لگا "یا عباس حبذا یوم الذمار۔ اے عباس جنگ کا دن مبارک ہو"

جب سب لشکر اسی طرح گذر گئے تو آخر میں ایک چھوٹی سی جماعت کے جلو میں سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سامنے سے گذرے، حضرت زبیر (رضی اللہ عنہ) کے ہاتھ میں پرچم تھا اور وہ آگے آگے چل رہے تھے، ابوسفیان کی نگاہ جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر پڑی تو اُس نے خدمت اقدس میں سعد اور اپنے درمیان مکالمہ کا حال سُنایا، یہ سُن کر ذات اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "سعد نے جھوٹ بولا، ھٰذا یوم یعظم اللہ فیہ الکعبۃ ویوم تکسی فیہ الکعبۃ۔ آج کا دن وہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس میں کعبہ کی عظمت کو بالا کریگا اور آج کعبہ پر غلاف چڑھایا جائے گا"، اور یہ فرما کر حضرت سعد کو برطرف کر کے پرچم اور لشکر کی سیادت حضرت سعد کے بیٹے کو عطا کر دی۔

اب نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے حضرت خالد بن ولید کو حکم فرمایا کہ تم مکہ کے زیریں حصہ کی جانب سے داخل ہونا اور کسی کو قتل نہ کرنا، ہاں اگر کوئی خود اقدام کرے تو دفاع کی اجازت ہے اور بنفس نفیس مکہ کے بلند حصے سے داخل ہوئے، حضرت خالدؓ سے بعض قبائل کے افراد نے مزاحمت کی، اس لئے اُن کے ہاتھوں چند مقتول ہو گئے، لیکن نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بغیر کسی مزاحمت کے مکہ میں داخل ہوئے۔[1]

---

[1] بخاری جلد ۲

جب مرّ الظہران میں حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے ابو سفیان (رضی اللہ عنہ) کو قبولِ اسلام کے لئے خدمت اقدس میں پیش کیا تھا تو یہ بھی عرض کیا تھا: یا رسول اللہ! ابو سفیان میں فخر کا مادہ ہے اس لئے اگر اس کو کوئی امتیازی حیثیت نصیب ہو جائے تو بہتر ہو، آپؐ نے ارشاد فرمایا: "من دخل دار ابی سفیان فھو آمن" جو شخص ابو سفیان کے مکان میں داخل ہو جائے گا اس کو امن ہے"۔

غرض جب آپ باعزت واجلال مکہ میں داخل ہوئے تو اُس وقت یہ اعلان کرا دیا (۱) جو مکان بند کرا کے بیٹھ جائے اُس کو امن ہے (۲) جو ابو سفیان کے مکان میں پناہ لے اُس کو امن ہے (۳) جو مسجد حرام میں پناہ لے اس کو امن ہے۔

البتہ اس امن عام اور عفوِ عظیم سے چند ایسی ہستیوں کو مستثنیٰ فرما دیا جنہوں نے اسلام کے خلاف بہت زہر چکانی کی تھی اور مسلمانوں کی ایذا رسانی میں بہت زیادہ حصہ لیا تھا مگر اُن میں سے اکثر اُس وقت چھپ گئے یا فرار ہو گئے اور آہستہ آہستہ عفو عام سے مستفیض ہو کر مشرف باسلام ہو گئے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں اس شان سے داخل ہوئے کہ آپؐ کا عَلَم سپید رنگ کا تھا اور آپ کا پرچم عقاب نامی سیاہ رنگ تھا، سر پر مغفر اوڑھے اور اُس پر سیاہ عمامہ باندھے ہوئے تھے اور سورہ "انا فتحنا" پڑھتے ہوئے آیات کو بلند آواز سے دُہراتے جاتے تھے، اور تواضع کا یہ عالم تھا کہ درگاہِ الہٰی میں خشوع وخضوع کے ساتھ ناقہ پر اس درجہ جُھکے ہوئے تھے کہ چہرۂ مبارک ناقہ

کی پیٹھ کو مس کر رہا تھا۔

بت شکنی جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مسجد حرام میں داخل ہوئے تو سب سے پہلے آپ نے حکم فرمایا کہ کعبہ سے تمام بت نکال کر پھینک دیے جائیں اور دیواروں پر جو تصاویر منقوش ہیں وہ مٹادی جائیں، چنانچہ جب تین سو ساٹھ بتوں کے سر نگوں ہونے کا وقت آیا تو دو مورتیاں حضرت ابراہیم و حضرت اسمٰعیل کی اس حالت میں سامنے آئیں کہ اُن کے ہاتھوں میں بانسوں کے تیر تھے، آپ نے دیکھ کر فرمایا خدا ان مشرکوں کو مارے، یہ خوب جانتے تھے کہ یہ دونوں مقدس ہستیاں اس ناپاک بات سے مقدس اور پاک تھے۔

نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے کعبہ کا طواف کیا اور پھر بتوں کے سامنے کھڑے ہو کر لکڑی سے اُن کو چرکا دیتے جاتے اور یہ پڑھتے جاتے تھے "جاء الحق وزھق الباطل وما یبدئ الباطل وما یعید۔ حق آپہنچا اور باطل اُڑ گیا۔ اور باطل نہ کسی شے کو پیدا کرے اور نہ پھیر کر لائے (یعنی باطل تو خود فنا ہونے کیلئے ہے)

رحمۃ اللعالمین کی شان کعبہ جب بتوں کی نجاست و تلویث سے پاک کر دیا گیا تو نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کعبہ میں داخل ہوئے اور اُس کی گوشوں میں گھومتے ہوئے بلند آواز سے تکبیرات کہتے رہے اور نماز نفل ادا کی باہر تشریف لائے تو مصلّی ابراہیمی پر جاکر نماز ادا کی، جب آپ اور صحابہ وضو فرمارہے تھے تو مشرکین انگشت بدنداں، و حیران تھے کہ با ایں فتح و کامرانی نہ جشن ہے نہ کبر و نخوت کا اظہار بلکہ درگاہِ الٰہی میں اظہارِ عبودیت کے لئے ہر ایک مجاہد بیتاب نظر آتا ہے، بلاشبہ یہ "بادشاہت" نہیں ہے بلکہ دوسرا ہی کوئی عالم

ہے۔[1]

آپ نماز سے فارغ ہوئے تو حضرت علی (رضی اللہ عنہ) نے عرض کیا:

یارسول اللہ! آپ ہمارے لئے دو خدمتیں "حجابہ اور سقایہ"[2] جمع فرما دیجئے اور کعبہ کی کنجی ہمارے حوالہ کر دیجئے۔ لیکن نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے حضرت علی (رضی اللہ عنہ) کے متعدد بار عرض کرنے کا کوئی جواب نہیں دیا اور بار بار یہی فرمایا "عثمان بن طلحہ کہاں ہیں"؟ جب عثمان حاضر ہوئے تو آپ نے کعبہ کی کلید اُنکو حوالہ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: هاك مفتاحك يا عثمان اليوم يوم برّ ووفاء۔ عثمان! لو یہ اپنی کُنجی، آج کا دن بھلائی اور وفاء عہد کا دن ہے"[3]

اب لوگ منتظر تھے کہ دیکھئے جن مشرکین نے برسوں تک آپؐ کو اور مسلمانوں کو ہر قسم کی ایذا دی، مصائب میں مبتلا کیا آج اُن کے ساتھ کیا معاملہ ہوتا ہے؟

آپؐ نے تمام قریشی قیدیوں کو حاضر ہونے کا حکم دیا اور جب سب خدمتِ اقدس میں پیش ہوئے تو آپؐ نے دریافت فرمایا: "اے قریشی گروہ! تمہارا کیا خیال ہے کہ میں تمہارے ساتھ کس طرح پیش آؤں"۔ اُنھوں نے جواب دیا "ہم آپ سے خیر کی امید رکھتے ہیں"۔

آپؐ نے یہ سن کر زبان وحی ترجمان سے یہ ارشاد فرمایا: اذھبوا فانتم

---

[1] تاریخ ابن کثیر ج ۴ ص ۳۰۰ [2] سقایہ یعنی حجاج کو پانی پلانے کی خدمت بنی ہاشم کے سپرد تھی اب وہ کلید برداری کا شرف بھی جمع کرنا چاہتے تھے [3] یہ وہی عثمان بن طلحہؓ ہیں جنھوں نے کلید کعبہ طلب کرنے پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو نہیں دی تھی لیکن رحمت عالمیاں کی درگاہ میں انتقام ذی حقیقت شئے تھی اس لیے آپؐ نے اُن ہی کے خاندان میں یہ سعادت باقی رہنے دی، یہی خاندان آج تک کعبہ کا مجاور اور شیبی کے لقب سے مشہور ہے کیونکہ حضرت عثمان بن طلحہ بنو شیبہ میں سے تھے۔

الطلقاء، جاؤ تم سب آزاد ہو" یہ سُننا تھا کہ نہ صرف قریش بلکہ ہر ایک صاحبِ بصیرت کے سامنے یہ حقیقت روشن ہو گئی کہ بادشاہ اور پیغمبر کی زندگی کا امتیازی نشان کیا ہے؟ پیغمبرانہ زندگی نہ ذاتی عداوت و کدورت کو کوئی وقعت دیتی ہے اور نہ اُسکا غیظ و غضب ہوا، نفس کے تابع ہوتا ہے، ایک نبی کو اگر صبر آزما حد تک ایذاء و تکلیف دی جائے اور پھر موذی شخص رحم کا طالب ہو تو وہ بلاشبہ "عفو و کرم" ہی پائیگا اور مکارم اخلاق کے ہر پہلو کا مظاہرہ دیکھیگا چنانچہ اس درمیان میں جب ایک شخص لرزتا، کانپتا آپ کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ نے شیریں گفتاری کے ساتھ ارشاد فرمایا "هوّن علیك فانّی لست بملك انما انا ابن امرأة من قریش کانت تاکل القدید" گھراؤ نہیں، میں کوئی بادشاہ نہیں ہوں میں تو خشک گوشت کھانے والی ایک قریشی عورت ہی کا بیٹا ہوں۔

اسی عفو و کرم کا یہ نتیجہ نکلا کہ زعماءِ قریش جوق در جوق حاضرِ خدمت ہوتے اور دولتِ اسلام سے مشرف ہو کر سعادتِ کبریٰ سے محظوظ ہوتے تھے، چنانچہ حضرت معاویہؓ حضرت عمرؓ کے والد ابو قحافہؓ جیسے حضرات اسی دن مسلمان ہوئے۔

خطبہ | نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس موقعہ پر ایک اہم خطبہ بھی دیا جو اسلام کے بہت سے احکام کی اساس و بنیاد ہے، اس خطبہ کے چند اہم اعلانات یہ ہیں

(۱) مسلم اور غیر مسلم ایک دوسرے کے وارث نہیں ہو سکتے۔

(۲) معاملات اور قضایا میں مدعی کے ذمہ گواہوں کا پیش کرنا اور گواہوں کی عدم موجودگی میں مدعی علیہ کے ذمہ حلف اُٹھانا ہے۔

(۳) کسی عورت کو تین دن کا سفر بغیر ذی رحم محرم کے درست نہیں ہے۔

(۴) صبح اور عصر کے بعد کوئی نفل نماز نہیں ہے اور عید الفطر اور عید الاضحیٰ کے دن روزہ جائز نہیں ہے۔

(۵) اے گروہ قریش! بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے تم سے نخوت جاہلیت اور باپ دادا کے نام و نسب پر فخر کا خاتمہ کر دیا ہے آگاہ رہو کہ تمام انسانی دنیا آدمؑ کی اولاد ہے اور آدم علیہ السلام کی تخلیق مٹی سے کی گئی ہے۔ "یٰاَیُّھَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰکُمْ مِّنْ ذَکَرٍ وَّ اُنْثٰی وَ جَعَلْنٰکُمْ شُعُوْبًا وَّ قَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ اِنَّ اللّٰہَ عَلِیْمٌ خَبِیْرٌ۔"

فتح مکہ اور قرآن عزیز

سورہ فتح، حدید، نصر ان تینوں سورتوں میں اللہ تعالیٰ نے فتح مکہ کے متعلق اشارات فرمائے ہیں۔ مثلاً سورۃ الفتح میں ہے:

وَیَنْصُرَکَ اللّٰہُ نَصْرًا عَزِیْزًا — اور خدا تجھ کو دے گا زبردست مدد

بعض مفسرین کہتے ہیں کہ یہ فتح مکہ کی جانب اشارہ ہے۔

اور سورۂ حدید میں ہے:

لَا یَسْتَوِیْ مِنْکُمْ مَّنْ اَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَ قٰتَلَ اُولٰٓئِکَ اَعْظَمُ دَرَجَةً مِّنَ الَّذِیْنَ اَنْفَقُوْا مِنْۢ بَعْدُ وَ قٰتَلُوْا وَ کُلًّا وَّعَدَ اللّٰہُ الْحُسْنٰی (حدید)	تم میں برابر نہیں ہیں وہ کہ جنہوں نے خرچ کیا فتح مکہ سے پہلے اور جہاد کیا، ان لوگوں کا درجہ بڑا ہے اُن سے جو کہ خرچ کریں فتح مکہ کے بعد اور جہاد کریں اور سب سے وعدہ کیا ہے اللہ نے خوبی کا۔

اور سورۂ نصر میں ہے۔

اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰہِ وَ الْفَتْحُ وَ رَاَیْتَ — جب آپہنچے اللہ کی مدد اور فتح (مکہ) اور تم دیکھو

النَّاسَ يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ	لوگوں کو کہ وہ اللہ کے دین میں فوج در فوج داخل
اَفْوَاجًاہ	ہونے لگیں۔

یہاں باجماع امت "الفتح" سے مراد فتح مکہ ہے۔

حافظ ابن حجرؒ امام شعبیؒ سے نقل فرماتے ہیں۔

"انا فتحنا لك فتحا مبینا" میں "فتح مبین" صلح حدیبیہ کی جانب اشارہ ہے اور "فجعل من دون ذلك فتحا قریبا" میں "فتح قریب" سے بھی صلح حدیبیہ کے ہی ثمرات و نتائج مراد ہیں اور سورۂ نصر کی آیت "اذا جاء نصر اللّٰہ والفتح" میں "نصر و فتح" سے باتفاق فتح مکہ مراد ہے[1]

اور اس نقل کے بعد تحریر فرماتے ہیں :۔

ان آیات کے مفہوم و مراد میں صلح حدیبیہ اور فتح مکہ سے متعلق جو مختلف اقوال پائے جاتے ہیں اور موجب اشکال بنتے ہیں، شعبی کی اس تقریر سے تمام اقوال میں مطابقت بھی ہو جاتی ہے اور اشکال بھی دور ہو جاتا ہے[2]

سورۂ الفتح، النصر اور الحدید کی مسطورۂ بالا آیات کا مصداق فتح مکہ ہے یا صلح حدیبیہ؟ اس بارہ میں مختلف اقوال و روایات اور امام شعبی کی توجیہ اور اس پر حافظ حدیث ابن حجر کی تائید و تصدیق کے مطالعہ کے بعد بھی ہم یہ کہنے کی جرأت کر سکتے ہیں کہ سورۂ فتح میں "فتح مبین" "نصر عزیز" اور "فتح قریب" کا ذکر اور پھر سورۂ حدید میں انفاق و جہاد فی سبیل اللہ کو "الفتح" کے قبل اور بعد کے ساتھ تقسیم درجات و فضائل کا تذکرہ اور پھر سورۂ نصر کی ایک آیت "نصر اللّٰہ والفتح" میں "نصر و فتح" کا

---

[1] فتح الباری جلد ۸ ص ۳۵۵ [2] ص ۳۵۵

اجتماعی ذکر صاف صاف اس حقیقت کا اعلان ہے کہ ان مقامات میں ایسے واقعہ کا تذکرہ ہے جس کی ابتدا جہاد و قتال سے شروع ہو کر ایک ایسی فتح و نصرت پر نتیجہ خیز ہوئی ہو جس کے بعد سرزمینِ حجاز ہمیشہ کے لئے شرک و بت پرستی کی تلویث سے پاک ہو جائے اور ظاہر ہے کہ یہ شرف بلاشبہ فتح مکہ کو ہی حاصل ہے البتہ اسمیں بھی شبہ نہیں کہ صلح حدیبیہ کے وقت سورۃ الفتح کا نزول اور "انا فتحنا لك فتحا مبینا" کا اسلوبِ بیان یہ بھی واضح کرتا ہے کہ صلح حدیبیہ چونکہ اپنے اسباب و عواقب اور نتائج و ثمرات کے لحاظ سے فتح مکہ کا پیش خیمہ اور اس کی تمہید ثابت ہوئی، اس لئے وہ بھی "فتح مبین" کہلانے کی مستحق ہے یعنی جو واقعہ "فتح قریب" "نصر عزیز" اور "الفتح" و "نصر" کا باعث ہو وہ یقیناً "فتح مبین" کہلانے کا حق رکھتا ہے۔

غزوۂ حُنین

"فتح عظیم" کے بعد مشرکینِ عرب کی شوکت و صولت کا قریب قریب خاتمہ ہو گیا اور اب عرب قبائل جوق در جوق اسلام میں داخل ہونے لگے یہ دیکھ کر دو قبائل کی حمیتِ جاہلیت بھڑک اٹھی اور وہ اسلام کی ترقی کو برداشت نہ کر سکے ہوازن اور ثقیف دونوں قبائل کے سرداروں کا اجتماع ہوا اور انھوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اپنی قوم قریش کو مغلوب کر کے مطمئن ہو گئے ہیں، لہٰذا اب ہماری باری ہے ہم کیوں نہ خود ہی پیش قدمی کر کے مسلمانوں پر حملہ آور ہو جائیں اور آپ کا قلع قمع کر سکیں، چنانچہ دونوں نے یہ منصوبہ باندھا اور

مالک بن عوف نضری کو اپنا بادشاہ تسلیم کرکے آتش حسد کو مسلمانوں کے خون سے بجھانے کی کوشش کی، مالک نے بہت سے قبائل کو اپنے ساتھ ملا کر جنگ کی تیاری شروع کردی۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو جب یہ حال معلوم ہوا تو صحابہ رضی اللہ عنہم کو جمع فرمایا اور بعد مشاورت مدافعت کے لئے آمادہ ہو کر حنین کو روانہ ہو گئے۔ اس وقت لشکر اسلامی میں بارہ ہزار جاں نثار موجود تھے، ان میں سے دس ہزار مہاجرین وانصار اور مدنی جاں نثار تھے اور دو ہزار وہ تھے جو فتح مکہ کے وقت مشرف باسلام ہوئے اور اسی وہ مشرکین (طلقاء) تھے جو اسلام قبول نہ کرنے کے باوجود رحمۃ للعالمین کے مظاہرے دیکھ کر خود اپنی خواہش سے مسلمانوں کی رفیقِ جنگ بن گئے تھے۔

۱۰ شوال ۸ھ ہجری مطابق فروری ۶۳۰ء کو ذاتِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے جلو میں مجاہدین اسلام کا لشکر حنین جا پہنچا، آپ نے دشمن کے مقابلہ میں جب اسلامی فوج کو صف آرا ہونے کا حکم دیا تو مہاجرین کا پرچم حضرت علی رضی اللہ عنہ کو مرحمت فرمایا اور انصار میں سے بنی خزرج کا پرچم خباب بن منذر کو بخشا اور اوس کا اُسید بن حضیر کو عنایت فرمایا۔ اور اسی طرح مختلف قبائل کے سرداروں کو اُن کی فوج کا پرچم عطا فرمایا۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بھی بنفس نفیس ہتھیار سجے، دو زرہ ملبوس کئے خود سر پر رکھے، اپنے مشہور خچر پر سوار اسلامی فوج کی کمان کر رہے تھے،

---

[۱] فتح الباری جلد ۸

ابھی جنگ نے قتل و قتال کی صورت نہیں دیکھی تھی کہ مسلمانوں کے دلوں میں اپنے لشکر کی اکثریت اور فوج کی فراوانی اس درجہ اثر کر گئی کہ بعض مسلمانوں کی زبان سے انشاء اللہ کہے بغیر ہی اپنی قوت کے گھمنڈ پر یہ نکل گیا کہ آج ہماری قوت کو کوئی شکست نہیں دے سکتا۔

مسلمان خدائے واحد کا پرستار مسلمان، اور خدائے قدوس پر بھروسہ کی بجائے اپنی عددی اکثریت پر گھمنڈ کرے، یہ اُس کی بھول ہے، اس لئے خدا کو مسلمانوں کا یہ فخر پسند نہیں آیا اور اس لئے اُن پر یہ تازیانہ عبرت لگا کہ جب جنگ کا افتتاح ہوا، اور مسلمانوں کے لشکر نے پیش قدمی کی تو اچانک دشمن کی اُن ٹولیوں نے جو گوریلا جنگ لڑنے کے لئے پہاڑ کی مختلف گھاٹیوں میں گھات لگائے بیٹھی تھی چہار جانب سے اسلامی لشکر پر بارش کی طرح تیر باری شروع کر دی۔

اسلامی لشکر اس بے محابا تیر باری کا متوقع نہ تھا اس لئے انکی صفوں میں تزلزل پیدا ہو گیا اور تھوڑی سی دیر میں مسلمانوں کے قدم اُکھڑ گئے اور نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) اور مشہور مہاجرین و انصار صحابہ رضی اللہ عنہم کے علاوہ تمام بدوی قبائل اور مدنی لشکر کی اکثریت نے راہِ فرار اختیار کی۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس حالت میں بھی یہ رجز پڑھتے اور شجاعانہ مظاہرہ فرماتے جاتے تھے "انا النبی لا کذب، انا ابن عبد المطلب"

غرض اسی وقت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اشارہ پر حضرت عباس رضؓ نے بلند آواز سے مفرور مسلمانوں کو للکارا "یا معشر الانصار" "یا اصحاب بیعۃ الرضوان"

حضرت عباس کی صدائے حق گونجی ہی تھی کہ ایک ایک مسلمان اپنی حالت

پر متاسف ہو کر پلٹ پڑا، اور فوراً ہی تمام جاں نثار نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے گرد جمع ہو کر داد شجاعت دینے لگے اور نتیجہ یہ نکلا کہ شکست مبدل بہ فتح و نصرت ہو گئی اور اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم نے ہزیمت کو "نصر عزیز" سے بدل دیا۔

مشرکین کی جماعت میں ایک مشہور ذی رائے درید بن صمہ نامی تھا، اس نے مالک کے اس طرز عمل کی سخت مخالفت کی تھی کہ میدان میں عورتوں، بچوں اور مال و دولت کے خزانوں کو ساتھ نہ لے جائے، مگر مالک نے اس کی رائے پر عمل نہ کیا اور سب کو ساتھ لے کر آیا تھا چنانچہ یہ سب مال غنیمت مسلمانوں کے ہاتھ لگا اور مشرکین کی رہی سہی طاقت کا بھی خاتمہ ہو گیا۔

بہت سے مشرکین اور اُن کے قبائل پر اگرچہ اسلام کی صداقت روشن ہو چکی تھی مگر پھر بھی وہ اپنے خیال میں مادی شوکت کو ہی مدار صداقت تسلیم کرتے تھے چنانچہ مسلمانوں پر خدائے تعالیٰ کے اس فضل و کرم کو جب اُنھوں نے اپنی آنکھوں سے اس طرح دیکھ لیا تو اب وہ بھی برضا و رغبت حلقہ بگوش اسلام ہو گئے۔

غزوہ حنین اور قرآن

غزوۂ حنین میں مسلمانوں کے اپنی کثرت پر عُجب و غرور اور اس کے انجام میں ابتداءً شکست اور پھر خدا کے فضل سے فتح و نصرت کا حال قرآن حکیم نے سورۂ توبہ میں اپنے معجزانہ اسلوب بیان کے ساتھ اس طرح کیا ہے۔

لَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ فِيْ مَوَاطِنَ كَثِيْرَةٍ وَّيَوْمَ حُنَيْنٍ اِذْ اَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنْكُمْ شَيْـًٔا	بلا شبہ اللہ بہت میدانوں میں تمہاری مدد کر چکا ہے اور حنین کے دن بھی جب تم اپنی کثرت پر اترا گئے تھے تو دیکھو وہ کثرت تمہارے کچھ کام نہ آئی

وَضَاقَتْ عَلَيْكُمُ الْأَرْضُ بِمَا
رَحُبَتْ ثُمَّ وَلَّيْتُمْ مُدْبِرِينَ ثُمَّ
أَنْزَلَ اللَّهُ سَكِينَتَهُ عَلَىٰ
رَسُولِهِ وَعَلَى الْمُؤْمِنِينَ وَ
أَنْزَلَ جُنُودًا لَمْ تَرَوْهَا وَ
عَذَّبَ الَّذِينَ كَفَرُوا وَ
ذَٰلِكَ جَزَاءُ الْكَافِرِينَ ۝
ثُمَّ يَتُوبُ اللَّهُ مِنْ بَعْدِ ذَٰلِكَ
عَلَىٰ مَنْ يَشَاءُ وَاللَّهُ غَفُورٌ
رَحِيمٌ ۝ (توبہ)

اور زمین اپنی پوری وسعت پر بھی تم پر تنگ ہوگئی
اور آخر کار یہ ہوا کہ تم میدان کو پیٹھ دکھا کر بھاگ گئے
پھر اللہ نے اپنے رسول پر اور مومنوں پر اپنی جانب سے
دل کا سکون و قرار نازل فرمایا اور ایسی فوجیں اُتار
دیں جو تمہیں نظر نہیں آتی تھیں اور اُن لوگوں کو عذاب
دیا جنہوں نے کفر کی راہ اختیار کی تھی اور جو کفر کی راہ
اختیار کرتے ہیں اُنکی جزا یہی ہے اس کے بعد اللہ
جس پر چاہیگا اپنی رحمت سے لوٹ آئیگا اور اللہ
بڑا ہی بخشنے والا رحمت والا ہے۔

غزوہ تبوک اور قبول توبہ کا عجیب واقعہ

(على الثلثة الذين خلفوا)

تبوک "شام" کا ایک مشہور شہر ہے سنہ ۹ ہجری میں سردار دو عالم (صلی اللہ علیہ وسلم) کو یہ اطلاع ملی کہ قیصر روم ہرقل ایک عظیم الشان لشکر مسلمانوں پر چڑھائی کے لیے طیار کر رہا ہے اور کئی لاکھ نبرد آزما والنٹیر اب تک بھرتی ہو چکے ہیں۔

مسلمانوں کے لیے یہ وقت بہت ہی کٹھن تھا، سرزمین حجاز میں قحط پڑا ہوا تھا، زمین پیداوار سے خالی، نہریں اور تالاب خشک، اور گرمی نہایت شدت کی پڑ رہی تھی اور تمام آدمی عسرت کے ساتھ بسر کر رہے تھے۔

اس کے باوجود موسم بہار تھا، باغوں میں کھجوریں پک رہی تھیں، کھجور کے پتوں سے سائبان تیار کیے جا رہے تھے اور عرب کے دستور کے مطابق لوگ باغوں میں خیمہ زن ہو کر موسم کی بہار لوٹنا چاہتے تھے کہ اچانک یہ خبر آئی۔ سخت آزمائش کا وقت تھا، سیکڑوں میل کی راہ، بادِ سموم اور تپتے ہوئے ریت سے واسطہ، مگر فدا کارانِ اسلام عیشِ دنیا اور مصائبِ موسم سے بے پروا اور بے خوف ہو کر پروانہ وار اسلام پر نثار ہونے کیلئے مدینہ میں جمع ہو رہے تھے۔

نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کا عموماً یہ دستور تھا کہ جب کسی غزوہ کا ارادہ فرماتے تو عام طریقہ سے یہ ظاہر نہ ہونے دیتے کہ کہاں کا قصد ہے تاکہ دشمن صحیح حالات نہ پا سکے، لیکن غزوۂ تبوک میں چونکہ سخت موسم تھا، حجاز میں قحط سالی، ناسازگاریٔ حالات اور دشمن کی زبردست قوت کا مقابلہ کرنا تھا، اس لئے اس کڑی آزمائش میں ذاتِ اقدس (صلی اللہ علیہ وسلم) نے تمام قبائل عرب میں اصل حقیقت کا اعلان کرا دیا تاکہ جو شخص بھی اس وادیٔ پرخار میں قدم رکھے سوچ سمجھ کر رکھے۔

مالی استعانت : مسطورۂ بالا نازک حالات کے پیشِ نظر یہ پہلا غزوہ ہے جس میں نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے مجاہدین کی مالی استعانت کے لئے ترغیب دی اور جلیل القدر جاں نثارانِ اسلام کو اپنی مالی فداکاری کا ثبوت دینے کے لئے موقعہ بہم پہونچایا، چنانچہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے دس ہزار دینار سرخ تین سو اونٹ اور پچاس گھوڑے پیش کئے اور ذاتِ اقدس (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اُن کے اس جذبۂ اخلاص پر یہ دعا فرمائی "اللھم ارض عن عثمان فانی راض عنہ" خدایا تو عثمان سے راضی ہو اس لئے کہ میں اُس سے راضی ہوں۔"

اور حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) نے اپنا نصف مال پیش کر دیا حضرت عبدالرحمٰن
بن عوف نے سو اوقیہ، اور حضرت عاصم بن عدی نے ساٹھ وسق کھجوریں پیش کیں
اور حضرت عباس و حضرت طلحہ (رضی اللہ عنہما) نے زرِ کثیر پیش کیا اور عورتوں نے
بھی اپنے حوصلہ سے زیادہ زیورات پیش کیے حتیٰ کہ حضرت ابوبکر (رضی اللہ عنہ)
نے تو اپنا کل مال ہی اسلام پر قربان کر دیا۔ صدیق اکبرؓ جب اپنا مال لے کر حاضر
خدمت ہوئے تو نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے دریافت کیا: ابوبکرؓ! تم اپنے
اہل و عیال کے لئے بھی کچھ چھوڑ کر آئے ہو؟ ابوبکر (رضی اللہ عنہ) نے عرض کیا
"ہاں یا رسول اللہ! میں اپنے گھر میں اللہ اور اس کے رسول کا نام چھوڑ
آیا ہوں"۔

غرض ان عظیم الشان تیاریوں کے بعد جب مسلمانوں کا لشکرِ جرار، اعلاءِ
کلمۃ اللہ کی فدا کارانہ ولولہ اور جوش کے ساتھ تبوک کی طرف بڑھا تو ہرقل کو بھی
جاسوسوں نے خبر کر دی۔ ہرقل یا تو کر و فر کے ساتھ جنگ کی تیاریوں میں مشغول
تھا اور یا یہ خبر سنتے ہی ہوش و حواس کھو بیٹھا اور "رومی" مسلمانوں کے عدیم النظیر
جذبۂ ایثار و فداکاری سے متاثر و خائف ہو کر تبوک میں مسلمانوں کے پہنچنے سے قبل ہی منتشر
ہو گئے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم راہ کے چند عیسائی امراء کو امن کا پروانہ دیتے
اور معاہدات کرتے ہوئے کامرانی کے ساتھ واپس آ گئے۔

عذر خواہی جب آپؐ مدینہ جلوہ افروز ہوئے تو منافقین نے اس عظیم الشان
آزمائش میں عدم شرکت کے لئے جھوٹے اعذار تراش کر خدمتِ اقدس میں عذر خواہی
کی اور ذاتِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کے جماعتی نظام کی مصالح کے پیش

نظر اُن سے درگذر فرمایا۔

مگر عذر خواہ جماعتوں میں تین اشخاص مخلصین اسلام میں سے بھی تھے اور وہ کعب بن مالک، ہلال بن اُمیہ اور مرارہ بن کعب تھے جنہوں نے منافقین کی طرح حاضر ہو کر دروغ بیانی سے کام نہیں لیا، اور صاف صاف عرض کر دیا کہ "اے خسروِ دین و دنیا! میں چاہتا تو منافقین کی طرح کوئی جھوٹا عذر پیش کر کے آپ کے مواخذہ سے بچ جاتا لیکن اگر کسی دنیادار سے ایسا معاملہ پیش آتا تو کر بھی لیتا، مگر خدا کے نبی کے ساتھ تو ایسا نہیں کر سکتا، سچ بات یہ ہے کہ میں محض اپنی کاہلی کی وجہ سے "محروم الجہاد" رہا، ہر دن یہ خیال کرتا رہا کہ آج اپنے باغوں کے لطف سے اور سیر ہو لوں، کل ضرور روانہ ہو جاؤں گا اور لشکرِ اسلام کو ایک دو منزل ہی پر جا پکڑوں گا، آخر کار اس کاہلی کا نتیجہ محرومی کی شکل میں ظاہر ہوا، اب جو حکم ہو اُس کے لیے سرِ تسلیم خم ہے" یہی ہلال اور مرارہ نے بھی کہا اور اس طرح تینوں مجرموں کی طرح حکمِ رسول سننے کے لیے گوش بر آواز ہو گئے۔

معاشرتی مقاطعہ یہ تینوں حضرات اسلام کے فدائی، اخلاص کے پیکر، اور عاشقانِ رسول تھے، اس لئے ان کا معاملہ منافقین کا سا نہیں ہو سکتا تھا کہ وہ نظامِ جماعت کی خلاف ورزی کر گذریں اور جہاد جیسے عظیم ترین رُکنِ ملت کو محض کاہلی اور سُستی پر قربان کر دیں اور پھر اُن کو معمولی معذرت پر معاف کر دیا جائے اس لئے ضرورت تھی کہ اس معاملہ میں ایسا فیصلہ دیا جائے کہ آئندہ کسی مخلص مسلمان کو ایسی غلط کاری اور نظام کی خلاف ورزی کی جرأت نہ ہو سکے، چنانچہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اَمَّا هٰذَا فَقَدْ صَدَقَ فَقُمْ حَتّٰى يَقْضِىَ اللّٰهُ فِيكَ۔ تم نے سچ

سچ بات کہہ دی، اب جاؤ اور خدا کے فیصلہ کا انتظار کرو"۔

تینوں اس حکم کے بعد گھر واپس آ گئے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام صحابہ کو حکم فرما دیا کہ ان تینوں سے کلام و سلام سب ترک کر دیا جائے، چنانچہ تمام مسلمانوں نے اُن کا معاشرتی مقاطعہ کر دیا۔

ضبط و نظم کی عدیم النظیر مثال

کعب خود فرماتے ہیں کہ اس واقعہ نے ہم تینوں پر جو کچھ اثر کیا اُس کا اندازہ دوسرا کوئی نہیں کر سکتا میرے دونوں رفیقوں پر تو اس درجہ اثر پڑا کہ اُنھوں نے باہر نکلنا ہی ترک کر دیا۔ مگر میں سخت جان تھا برابر نمازوں کے اوقات میں مسجد نبوی میں حاضر ہوتا رہا۔

جب میں مسجد میں حاضر ہوتا تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو سلام کرتا اور دیکھتا رہتا کہ لبِ مبارک کو حرکت ہوئی یا نہیں مگر بدقسمتی اور محرومی کے سوا کچھ نہ پاتا، البتہ یہ محسوس کرتا تھا کہ جب میں نماز میں مشغول ہوتا تو آپؐ میری جانب دیکھتے رہتے اور جب میں فارغ ہو کر آپؐ کی جانب متوجہ ہوتا تو میری جانب سے رُخِ مبارک پھیر لیتے۔

لیکن اس تمام واقعہ میں مسلمانوں کی اسلام دوستی اور امرِ رسول پر امتثال و والہانہ استقامت کا یہ حال تھا کہ جب میں لوگوں کی اس سختی سے اُکتا گیا تو ایک روز اپنے سب سے محبوب عزیز اور چچا زاد بھائی ابو قتادہ کے پاس گیا، اُس ابو قتادہ کے پاس جو اس سے قبل مجھ پر جان چھڑکتا تھا اور میرا عاشق و جان نثار تھا۔ میں نے اُس کو سلام کیا، مگر قسم بخدا کہ اُس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میں اس حالت کو دیکھ کر تڑپ گیا اور ابو قتادہ سے کہا! ابو قتادہ! میں خدا کی قسم دے کر تجھ سے دریافت

کرتا ہوں کیا تجھے معلوم نہیں کہ میں خدا اور اس کے رسول کو دوست رکھتا ہوں اور میں عاشقِ خدا و رسول ہوں؟ ابو قتادہ پھر بھی خاموش رہا اور کوئی جواب نہیں دیا۔ تب میں نے دوبارہ پھر اس بات کو دہرایا مگر اُس نے سکوت ہی اختیار کیا اور کوئی جواب نہ دیا۔ آخر جب تیسری مرتبہ کہا تو صرف یہ کہہ کر چپ ہو گیا "اللہ و رسولہ اعلم" خدا اور اس کا رسول ہی خوب جانتا ہے"۔

یہ سُن کر مجھ سے ضبط نہ ہو سکا اور میری آنکھیں ڈبڈبا آئیں کہ اللہ اکبر! یہ انقلاب اور صرف یہیں تک معاملہ ختم نہیں ہوا بلکہ چالیس دن گذرنے پر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم فرمایا کہ ان تینوں کی رفیقۂ حیات کو بھی چاہیے کہ شوہروں سے مقاطعہ کر کے الگ ہو جائیں چنانچہ ان اللہ کی بندیوں نے ہمارے ساتھ قلبی تعلق کے باوجود حکمِ رسولؐ کو مقدم سمجھا اور اپنے میکے چلی گئیں، البتہ ہلال بن امیہ کی رفیقۂ زندگی نے دربارِ رسالت میں جا کر عرض کیا: یا رسول اللہ! ہلال بہت بوڑھے ہیں، اُن کی خدمت گذار صرف میں ہوں، دوسرا کوئی نہیں، اگر وہ میری خدمت سے محروم ہو گئے تو اُن کی ہلاکت کا اندیشہ ہے، اب کیا حکم ہے؟ تب آپؐ نے فرمایا خدمت کرتی رہو، باقی تعلقات کو سر دست منقطع کر دو" یہ سُن کر اُس نے سرِ تسلیم خم کر دیا اور اس کے باوجود کہ شوہر اور بیوی یا عزیزوں اور رشتہ داروں کے درمیان دوسرا کوئی موجود نہیں ہوتا تھا۔ تب بھی کیا مجال کہ ایک لمحہ کے لئے بھی کسی نے امرِ رسول سے انحراف کرنے کی جرأت کی ہو۔ اللہ اللہ!

یہ ہے سچی شانِ عشق اور اطاعتِ خدا و رسول۔

کو چالیس دن سے مسلسل معاشرتی مقاطعہ و غیروں کا تو ذکر ہی کیا قریبی عزیز و رشتہ دار حتیٰ کہ رفیقۂ زندگی بھی اسلام اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم پر پروانہ وار نثار ہوتے ہوئے "کعب" کا مقاطعہ کئے ہوئے ہیں گویا اس طرح کعب پر خدا کی زمین تنگ ہو گئی ہے، وہ اسی مایوسی اور حیرانی کی حالت میں مدینہ کے بازار سے گزر رہے تھے کہ اچانک شام کا ایک نبطی پکارتا ہوا نظر آیا "من یدل علی کعب بن مالک" "مجھ کو کوئی کعب بن مالک تک پہنچا دے" لوگوں نے ہاتھ کے اشارے سے بتایا کہ کعبؓ وہ جا رہے ہیں، نبطی آگے بڑھا اور کعبؓ کی راہ روک کر اُن کی خدمت میں ایک خط پیش کیا، کعبؓ نے پڑھا تو شاہ غسان کا خط تھا، اُس میں لکھا تھا:

امابعد! فانہ قد بلغنی ان	اما بعد! مجھ کو معلوم ہوا ہے کہ تمہارے محمد (صلی اللہ علیہ
صاحبك قد جفاك ولم	وسلم) نے تم پر بڑا ظلم کر رکھا ہے، خدا نے تم جیسی ہستی کو
یجعلك اللہ بدار ھوان و	اس ذلت اور ضیاع کیلئے نہیں بنایا ہیں تم فوراً
لا مضیعۃ فالحق بنا نواسك	یہاں چلے آؤ، ہم تمہاری خاطر مدارت کریں گے

حضرت کعب (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں، خط پڑھتے ہی مجھ کو سخت رنج و ملال ہوا، اور میں نے دل میں کہا کہ یہ آزمائش و بلا پہلی آزمائش سے بھی زیادہ سخت ہے ہیں اور شاہ غسان کو میرے متعلق یہ گمان کہ اس امتحان سے گھبرا کر اس کے پاس بھاگ جاؤں اور خدا اور خدا کے رسول سے منہ موڑ لوں، آہ! یہ بہت ہی تکلیف دہ صورتِ حال ہے۔ بہرحال شاہ غسان کی اس ذہنی حرکت پر مجھے بیحد غصہ آیا اور میں ایک تنور کے سامنے پہنچا اور اُس کے خط کو اُس میں جھونک کر نبطی سے کہا: یہ ہے تیرے بادشاہ کے خط کا جواب اور میں خدمتِ اقدس میں حاضر ہو کر یہ بھی

کے ساتھ عرض رسا ہوا،" شاہدِ ہر دو سرا! آخر یہ اعراض کیوں اس درجہ کو پہنچ گیا کہ اب مشرکین تک مجھے پھسلانے کی جرأت کرنے لگے!

غرض اسی طرح پچاس راتیں گذر گئیں اور ہماری محرومی کی گرہ نہ کھلی اور ارشادِ خداوندی کے بموجب خدا کی زمین وسیع ہونے کے باوجود ہم پر تنگ ہو گئی اور اپنی جان وبال نظر آنے لگی کہ یک بیک صبح کی نماز کے بعد سلع[1] کی چوٹی پر سے زیک پکارنے والے نے پکارا: "اے کعب! بشارت ہو" میں تو انقلابِ حال کا منتظر ہی تھا، فوراً سمجھ گیا کہ درگاہِ الٰہی میں توبہ قبول ہو گئی، اب کیا تھا مسرت و خوشی سے پھولا نہ سمایا اور وہیں سجدہ میں گر گیا۔

اب جوق در جوق لوگ آرہے ہیں اور قبولِ توبہ کا مژدہ سنا رہے ہیں اور کل تک جو اجنبی نظر آتے تھے اس وقت جان نثار اور محب بن کر اظہارِ مسرت کر رہے ہیں اور رفیقۂ حیات کی جانب سے بھی مبارکبادیں کی جارہی ہیں، سب سے پہلے جس شخص نے مجھ کو قبولِ توبہ کی مفصل بشارت سنائی وہ ایک سوار تھا، میں نے انتہائے خوشی میں جو کپڑے پہنے ہوئے تھا اتار کر اس کو دیدیے، خدا کی شان کہ میرے پاس اور کپڑے نہیں تھے اسلیے مستعار مانگ کر پہنے اور بارگاہِ رسالت میں حاضر ہوا، راہ میں بھی لوگوں کا تانتا بندھا ہوا تھا اور مجھ پر مبارکبادیوں اور بشارتوں کے پھول برسائے جا رہے تھے دربارِ رسالت پہنچا تو آنحضرت ﷺ آگے بڑھے اور مجھ سے مصافحہ کیا اور مبارکباد پیش کی، اسی مسرت کیساتھ میں جلوۂ جہاں آرا کا طالب ہوا تو دیکھا کہ چہرۂ مبارک مسرت وشادمانی سے بجلی کی طرح چمک رہا ہے، مسکراتے ہوئے ارشاد فرمایا: "ابشر بخیر یوم

---

[1] فتح الباری جلد ۸ ص ۹۸

مژدہ لیک حسنی والی ذات اعلیٰ۔ اس مبارک دن میں بشارت حاصل کر تیری ولادت سے آج تک جس سے بہتر کوئی دن نہیں آیا" میں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! یہ قبول توبہ آپ کی جانب سے ہے یا خدا کی جانب سے؟ حضور نے فرمایا: میری جانب سے نہیں خدا کی جانب سے ہے"۔

آپؐ نے یہ جواب مرحمت فرمایا اور رُخِ انور قمر کی طرح روشن نظر آنے لگا۔ میں نے مسرت کے لہجہ میں عرض کیا: "اے خدا کے رسولؐ! میری قبولِ توبہ کا ایک جزو یہ بھی ہو جائے کہ میں اپنا کل مال خدا کی راہ میں تصدق کر دوں۔ آپؐ نے ارشاد فرمایا "بہتر یہ ہے کہ کچھ حصہ اپنے لئے رکھ لو" میں نے عرض کیا: بہتر تو خیبر کا جو حصہ میرے پاس ہے اُس کو روکے لیتا ہوں"۔ میں نے یہ بھی عرض کیا: "رسول اللہ! یہ سچائی کا صدقہ ہے کہ آج اس نعمتِ بیکراں سے مالا مال ہوں" اس لئے عہد کرتا ہوں کہ عمر بھر صدقِ مقال کے ماسوا میرا شعار کچھ نہ ہوگا۔

حضرت کعبؓ فرماتے ہیں میرے اس معاملہ میں رنج و غم کے ہمدرد رفقا کا بھی مسرت و بہجت سے یہی حال ہوا اور ہماری قبولِ توبہ پر جو آیات تفصیل نازل ہوئی تھیں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمارے سامنے ان کی تلاوت فرمائی:

قبول توبہ اور سورہ توبہ

لَقَدْ تَابَ اللّٰهُ عَلَى النَّبِيِّ	بیشک اللہ کی رحمت متوجہ ہوئی نبی پر اور
وَالْمُهَاجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ	مہاجرین اور انصار پر بھی جنہوں نے بڑی تنگی اور
الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ فِيْ سَاعَةِ الْعُسْرَةِ	بے سروسامانی کی حالت میں اس کا ساتھ دیا
مِنْۢ بَعْدِ مَا كَادَ يَزِيْغُ قُلُوْبُ	بعد اس کے کہ ان میں سے ایک گروہ
فَرِيْقٍ مِّنْهُمْ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ	کے دل ڈگمگا جانے کو تھے، پھر وہ ان پر

إِنَّهُ بِهِمْ رَءُوفٌ رَّحِيمٌ ۝ وَعَلَى الثَّلَاثَةِ الَّذِينَ خُلِّفُوا حَتَّىٰ إِذَا ضَاقَتْ عَلَيْهِمُ الْأَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ وَضَاقَتْ عَلَيْهِمْ أَنفُسُهُمْ وَظَنُّوا أَن لَّا مَلْجَأَ مِنَ اللَّهِ إِلَّا إِلَيْهِ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ لِيَتُوبُوا إِنَّ اللَّهَ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ ۝ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَكُونُوا مَعَ الصَّادِقِينَ ۝ (توبہ)

رحمت سو اُن سب پر متوجہ ہو گیا، بلا شبہ وہ شفقت رکھنے والا، رحمت کرنے والا ہے، اور اُن تین شخصوں پر بھی (اپنی رحمت کیساتھ رجوع ہوا) جو معلق حالت میں چھوڑ دیئے گئے تھے حتیٰ کہ نوبت یہ آگئی کہ زمین اپنی ساری وسعت کے باوجود اُن پر تنگ ہو گئی تھی اور وہ خود بھی اپنی جان سے تنگ آگئے تھے اور انھوں نے جان لیا تھا کہ اللہ سے بھاگ کر انھیں کوئی پناہ نہیں مل سکتی مگر خود اسی کے دامن میں، پس اللہ ان پر اپنی رحمت کیساتھ لوٹ آیا تاکہ وہ رجوع کریں، بلا شبہ اللہ ہی بڑا توبہ قبول کرنے والا ہے بڑا ہی رحمت والا۔

قرآن عزیز اور غزوۂ تبوک

قرآن عزیز نے صرف اسی واقعہ کا ذکر نہیں کیا بلکہ غزوۂ تبوک کی اہمیت کے پیش نظر اس کی بہت سی تفصیلات بیان کیں اور اس سلسلہ میں پند و موعظت کے ذریعہ مسلمانوں کی رشد و ہدایت کا سامان مہیا کیا ہے چنانچہ اس سورہ میں چھٹے رکوع سے لے کر آخر سورۃ تک اسی غزوہ اور غزوہ سے متعلق حالات و مواعظ کا تذکرہ ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا مَا لَكُمْ إِذَا قِيلَ لَكُمُ انفِرُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ اثَّاقَلْتُمْ إِلَى الْأَرْضِ (الى) فَإِن تَوَلَّوْا فَقُلْ حَسْبِيَ اللَّهُ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَهُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيمِ ۝

اہم غزوات اور نتائج و بصائر

بدر الکبریٰ (۱) عقائد اسلامی و افکار ملی کے بنیادی مسائل میں سے ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ فتح و شکست کا مدار عددی اکثریت و اقلیت پر نہیں ہے بلکہ صرف عنایتِ خداوندی اور اُس کے فضل و کرم پر ہے "کم من فئۃ قلیلۃ غلبت فئۃ کثیرۃ باذن اللّٰہ"

(۲) جو جماعت احساسِ فرض کے ساتھ عدل و نصفت کے لیئے میدان میں نکلتی ہے کبھی ناکام نہیں ہوتی اور انجام اُسی کے ہاتھ رہتا اور خدا کی نصرت کا پیغام اُسی کو نصیب ہوتا ہے۔" ولقد نصرکم اللّٰہ ببدر وانتم اذلۃ"

(۳) اگر قلب میں اخلاص اور صداقتِ حق کا جذبہ موجود، اور خدا اور اسکے رسول پاک (صلی اللّٰہ علیہ وسلم) کے حکم و ارشاد کے سامنے گردن خم ہے تو اسبابِ دنیوی بشری تقاضے کے پیش نظر اپنی جانب سے خوف و ہراس قابلِ ملامت نہیں ہے اور خدائے برتر ضرور اس کو ثبات و استقامت عطا فرماتا ہے۔

(۴) "صبر و استقامت" ایسے میٹھے پھل ہیں جن کی شیرینی دنیا و دین دونوں ہی میں لذت و سکون اور رفعت و سعادت سے ہمکنار کرتی ہے، چنانچہ غزوۂ بدرالکبریٰ اس حقیقت کے لئے زندہ جاوید شہادت ہے۔

(۵) باطل سے برسرِ پیکار حاملِ حق و صداقت جماعت اسبابِ دنیوی جسقدر زیادہ بے یار و مددگار ہوتی ہے خدا کی نصرت و حمایت اُسی قدر زیادہ معجزانہ کرشمے دکھا کر

حمایت حق کا ساتھ دیتی اور باطل کو ناکام بنا کر حق کو شاد کام کرتی ہے چنانچہ بدر میں ابرِ رحمت کا نزول، ملائکۃ اللہ کا ورود، نظرِ مسلم میں دشمن کی کثیر تعداد کا مشاہدہ قلیل اور مشرکین کی نگاہ میں مسلمانوں کی تعدادِ قلیل کا مشاہدہ کثیر یہ سب معجزانہ امور اسی قانونِ الٰہی کی کرشمہ سازیاں تھیں۔

اُحد (۱) "جہاد" مخلص و منافق کی معرفت کے لئے بےنظیر کسوٹی ہے چنانچہ غزوۂ اُحد اور غزوۂ تبوک میں یہ حقیقت نمایاں نظر آتی ہے چنانچہ اُحد کے موقعہ پر راس المنافقین عبداللہ بن اُبَیّ اپنی جماعت کے ساتھ لشکرِ اسلامی سے یہ کہہ کر جدا ہو گیا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے چونکہ ہمارا مشورہ نہیں مانا اس لئے ہم کیوں میدانِ جہاد میں جا کر ہلاکت میں پڑیں اور غزوۂ تبوک میں یہ کہہ کر لوگوں کو فداکاری و جاں نثاری سے روکتا رہا "لاتنفروا فی الحر۔ گرمی کی شدت میں جنگ کی آگ کے اندر نہ کودو" اور اس حقیقت کو فراموش کر دیا: "نار جھنم اشد حرًّا؛ جہنم کی آگ کی شدت دنیا کی گرمی کی شدت سے کہیں زیادہ سخت ہے۔

(۲) "امیر" "خلیفہ" اور اس کے نائبین کا فرض ہے کہ اہم امور میں مسلمانوں سے مشورہ کرے، اور باتفاقِ رائے یا بہ کثرتِ رائے جو فیصلہ ہو اُسی کو اپنا "عزم" بنائے۔

نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) پر نزولِ وحی ہوتا تھا اسلیے آپ اگر صحابہ (رضی اللہ عنہم) سے مشورہ نہ بھی فرماتے تو کوئی قباحت نہیں تھی تاہم "اسوۂ حسنہ" کو شعار بنانے کیلئے آپ اہم امور میں برابر مسلمانوں سے مشورہ فرماتے رہے، چنانچہ غزوۂ اُحد میں بھی مشورہ فرمایا اور اس مشورہ کی یہ خصوصیت ہے کہ خود ذاتِ اقدس (صلی اللہ علیہ وسلم) اور معمرد

تجربہ کار صحابہ کہ جن کی قوت و اصابتِ رائے پر آپ کو اعتماد تھا" کی رائے یہ تھی کہ غزوۂ احد کے موقعہ پر مسلمانوں کو مدینہ سے نکل کر جنگ نہیں کرنی چاہیے مگر اکثریت کے لحاظ سے اُن صحابہؓ کی تعداد بہت زیادہ تھی، جن کا اصرار تھا کہ ہم کو مدینہ سے باہر میدان میں نکل کر جنگ کرنی چاہیے تو آپ نے اکثریت کے فیصلہ کو برقرار رکھتے ہوئے باہر نکل کر جنگ کرنے کو ہی ترجیح دی اور اس عملی اُسوۂ حسنہ کو اپنے مسطورۂ ذیل ارشادِ مبارک سے محکم و مضبوط بنا دیا۔

حضرت علی (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ ایک صحابی نے یہ استفسار کیا "ما العزم یا رسول اللہ! اے خدا کے رسول! قرآن میں مذکور "فاذا عزمت" میں "عزم" سے کیا مراد ہے، آپؐ نے ارشاد فرمایا "مشاورۃ اھل الرائی ثم اتباعھم۔ اہل الرائے سے مشورہ کرنے کے بعد (امام و خلیفہ کا) اُن کی دی ہوئی رائے پر عمل پیرا ہونے کا نام "عزم" ہے۔[1]

(۳) تمام معاملات میں عموماً اور جہاد و میدانِ جنگ میں خصوصاً "ضبط و نظم" اہم امور میں سے ہے، اگر کسی جماعت میں اس کا فقدان ہے تو وہ جماعت حاملِ حق و صداقت ہی کیوں نہ ہو، کامیابی و کامرانی کا سہرا اُس کے سر نہیں ہو سکتا اور جس درجہ اس بنیادی حقیقت کار میں کمی ہوگی، اُسی قدر اُس جماعت پر اضمحلال اور ضعف غالب ہوگا غور کیجئے کہ غزوۂ اُحد میں مشرکین کے مقابلہ میں تیر بار مسلم جماعت کی نظم و ضبط کی خلاف ورزی نے کس طرح مسلمانوں کی فتح و نصرت کو اچانک شکست کے ساتھ بدل دیا، پیغمبرِ خدا ہادیٔ اعظم (صلی اللہ علیہ وسلم) شریک جنگ ہیں، مسلمان مشرکین

[1] تفسیر ابن کثیر و در منثور بسندِ صحیح "تفسیر آیت فاذا عزمت فتوکل علی اللہ"

پر غالب اور مشرکین ہزیمت سے دوچار ہو رہے ہیں کہ مال غنیمت کے شوق میں اپنے سردار کے منع کرنے کے باوجود جب تیر بار جماعت نے گھاٹی چھوڑ دی تو یک بیک فتح شکست سے بدل گئی اور صرف یہی نہیں بلکہ سردار دو عالم (صلی اللہ علیہ وسلم) کو بھی چشم زخم پہنچا اور دندان مبارک تک شہید ہو گیا۔ " فاعتبروا یا اولی الابصار "

(۴) یہ ضروری نہیں ہے کہ جب کبھی حق و باطل میں معرکہ آرائی ہو تو حق ضرور جیت جائے اور ابتدائے کار میں بھی اس کو کبھی شکست نہ ہو، اگر ایسا ضروری ہو تو حق و باطل کی آزمائش و امتحان کی کوئی سبیل باقی نہ رہے اور قبول حق و باطل اختیاری نہ رہے اضطراری بن جائے، یہی وہ حقیقت ہے جس کو ابو سفیان کے اس جواب پر " الحرب سجال " جنگ ان دو ڈولوں کی طرح ہے جو ایک رسی میں اس طرح بندھے ہوں کہ کبھی ایک نیچے پانی میں چلا جاتا ہے اور دوسرا ابھر آتا ہے اور کبھی پہلا ابھر آتا ہے۔ رومہ کے شہنشاہ ہرقل (ہرکلوس) نے کہا تھا کہ تیرا یہ قول سچ ہے کہ کبھی تم کو فتح ہو جاتی ہے اور کبھی اس مدعی رسالت (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کو، اور کبھی تم شکست کا منہ دیکھتے ہو اور کبھی وہ، تو اے سفیان! نبی و رسول کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ جنگ کے موقعہ پر کبھی بھی اس کو شکست نہ ہو، ہاں البتہ یہ ازبس ضروری ہے کہ اس معرکہ آرائی کا آخری انجام حق کی فتح اور باطل کی شکست پر جا کر ختم ہو جائیگا۔"

(۵) میدانِ جہاد میں منافق اور ضعیف اعضاء کا جدا رہنا ہی مفید اور کامیابی کے لیے ازبس ضروری ہے، اسی لئے جن غزوات میں منافقین نے مسلمانوں میں ضعف پیدا کرنے کے لئے شرکت جنگ سے پہلو تہی کی یا میدان میں نکل کر واپس گئے تو اُن کی یہ ناپاک حرکت مسلمانوں کو ذرہ برابر بھی نقصان نہ پہنچا سکی بلکہ اُس کے

برعکس مخلص فداکاروں اور جان نثاروں کی چھوٹی سی چھوٹی تعداد نے بھی وہ انقلاب پیدا کر دیا کہ باطل کا قلع قمع ہو کر رہ گیا۔

غزوۂ احزاب

(۱) کائنات انسانی پر خدا کا سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ اُس نے ذاتِ اقدس محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ذریعہ "اخوت و مساوات" کا وہ عظیم الشان علمی و عملی نقشہ پیش کیا کہ جس کی مثال عالم انسانی کی تاریخ پیش کرنے سے عاجز ہے۔

غزوۂ خندق میں سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے جان نثار رفقاء کے ساتھ بھوک سے پیٹ پر پتھر باندھ کر خندق کھودنے اور ٹوکری میں بھر کر اُسکی مٹی منتقل کرنے میں جس طرح برابر کا حصہ لیا وہ اگر ایک طرف یہ ظاہر کرتا ہے کہ دنیوی بادشاہ شہنشاہ اور ہادی اعظم (نبی و رسول) کے درمیان کس قدر عظیم فرق ہے، اُسی طرح یہ بھی روشن کر دیتا ہے کہ اسلام کے مقدس جھنڈے کے نیچے خدمتِ حق کے لیے خلیفہ و امام اور ہادی برحق تک بھی کس طرح ایک سپاہی کے دوش بدوش ادنیٰ سے ادنیٰ کام میں برابر کا شریک و سہیم بن جاتا ہے۔

(۲) کفار کی تمام جماعتوں کے متفقہ حملہ کے وقت حضرت سلمان فارسی کا مشورہ دینا کہ ایسے نازک وقت میں اہلِ فارس کا یہی دستور ہے اور نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کا اُن کے دیے ہوئے مشورہ کو قبول فرمانا دلیل ہے اس امر کی کہ ہر زمانہ میں وقت کے ترقی یافتہ وسائلِ دنیوی کو امرِ حق کی حمایت کے لئے اختیار کرنا اور اپنانا اسلام سے انحراف نہیں بلکہ بہترین اسلامی خدمت ہے بشرطیکہ وہ اسباب و وسائل اسلامی اصول و احکام سے متصادم نہ ہوں۔

(۳) "جہاد" اسلام کا اس درجہ عظیم الشان رکن اور اُس کی بقاء و حفاظت کیلیے ایسا اہم فریضہ ہے کہ اس ادا ءِ فرض و مشغولیت میں نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) اور صحابہ (رضی اللہ عنہم) کا نماز جیسا اہم فریضہ قضا ہوگیا اور آپ نے اور صحابہ نے عصر کی نماز مغرب کے وقت ادا فرمائی۔

اور نماز کیسا اہم سے اہم تر فریضہ ہے اس حقیقت سے واضح ہوتا ہے کہ جہاد جیسے عظیم الشان، فداکارانہ اور جان نثارانہ عمل کے وقت بھی جبکہ انسان میدان جہاد میں جان ہتھیلی پر لئے مشغولِ جنگ ہوتا ہے، عبادت الٰہی سے غافل نہیں رکھا گیا اور ایسے وقت میں نص قرآنی نے "صلوٰۃ خوف" کی طرح ڈال کر نماز کی اہمیت اور جلالتِ قدر پر مہر تصدیق ثبت کر دی۔

(۴) جنگ میں ایسے طریقے اختیار کرنا صحیح ہیں جنمیں کذب اور خلف وعد جیسے قبیح امور کا دخل نہوتے ہوئے دشمن کو بغیر جنگ ہی کے نقصان و ہزیمت کا مُنہ دیکھنا پڑجائے یا وہ یہ صحیح اندازہ نہ کر سکے کہ اسلامی لشکر کا رُخ کس جانب ہے اور اس طرح حقیقت حال مستور ہو کر وہ دھوکے میں پڑ جائے، چنانچہ غزوات اسلامی میں یہ دونوں پہلو عملی لباس میں صاف نظر آتے ہیں اور یہی مفہوم ہر ارشاد نبوی "الحرب خدعۃ" کا

صلح حُدیبیہ

(۱) اجتماعی مصالح اسلامیہ اگر متقاضی ہوں تو خلیفہ اور امیر المؤمنین کو اختیار ہے کہ وہ کفار مشرکین سے ایسی صلح کرلے جو اگرچہ بظاہر حال شکست خوردہ نظر آتی ہو، مگر وقتِ نظر اور فکر عمیق کا یہ فتویٰ ہو کہ ثمرہ اور نتیجہ کے لحاظ سے یہ مسلمانوں کے حق میں فتح مبین اور ظفر و نصر کا سبب ثابت ہو گی، جیسا کہ حدیبیہ کے صلح نامہ کی دفعہ سے ظاہر ہوتا ہے۔

(۲) بسا اوقات ہماری ظاہر بیں نظریں ایک معاملہ کو موجب توہین سمجھتی اور اُس کو کراہت سے دیکھتی ہیں لیکن وہ خدا کے نزدیک اسلام اور مسلمانوں کے حق میں بہتر اور موجب عزت بننے والی ہوتی ہے اسی طرح بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ جس شئے کو ہماری نظریں خیر اور موجبِ فلاح سمجھتی ہیں وہ ثمرہ اور نتیجہ کے اعتبار سے باعثِ شر اور موجبِ ذلت و رسوائی ہو جاتی ہے اس لئے مسلمان کا فرض ہے کہ وہ اللہ اور اس کے رسول کے احکام کو ہر معاملہ میں اُسوۂ حسنہ بنائے اور اپنی عقل و خرد پر اعتماد کر کے اُن کی خلاف ورزی پر آمادہ نہ ہو جائے" عسیٰ ان تحبوا شیئاً و ھو شر لکم و عسیٰ ان تکرھوا شیئاً و ھو خیر لکم"۔

(۳) معاہدات اقوام و امم میں اسلام کی امتیازی شان یہ ہے کہ "نقضِ عہد" کو "غدر" سمجھے اور یقین کرے کہ عہد کی خلاف ورزی کرنے والا نہ دنیا میں صاحبِ عزت ہو سکتا ہے اور نہ عالمِ آخرت میں اس کو فلاح نصیب ہو سکتی ہے بلکہ روزِ قیامت اس کے ہاتھ میں غداری کا جھنڈا ہو گا تاکہ کائنات انسانی کے سامنے اس کے غدر کا مظاہرہ ہو سکے" اوفوا بالعھد ان العھد کان مسئولا"

(۴) جو لوگ قلتِ تعداد اور فقدانِ اسباب ظاہری کے باوجود خدا کے رسول کے ہاتھ پر فداکاری اور جاں نثاری کے لئے حدیبیہ میں بیعت کر رہے تھے خدا نے ان کے اس ایثار و عقیدتِ حق کی جزاءِ عظیم یہ عطا فرمائی کہ قرآن حکیم میں بصراحت ان کو اپنی خوشنودی کی سند بخشی اور اسی مبارک استناد کی بنا پر وہ بیعت "بیعتِ رضوان" کے نام سے رہتی دنیا تک موسوم ہوئی، بس یہ واقعہ برہانِ قاطع ہے اس امر کیلئے کہ" ان اللہ لا یضیع اجر المحسنین"

(۵) اگر آزادیٔ ضمیر نصیب ہو اور تعصب راہ میں حائل نہ ہو تو اسلام ایسا دینِ فطرت ہے کہ خود بخود کائناتِ انسانی کو اپنے اندر جذب کرتا چلا جاتا ہے، چنانچہ "صلح حدیبیہ" نے اس لیے "فتح مبین" کا لقب پایا کہ جب مسلمانوں اور مشرکوں کے درمیان ایک معاہدہ کے ذریعہ جنگ کا التوا ہو گیا تو مشرکین کو امن و اطمینان کے ساتھ مسلمانوں میل جول کا موقعہ ملا اور نتیجہ یہ نکلا کہ دعوتِ اسلام کے وقت سے حدیبیہ کے وقت تک فداکارانِ اسلام کی جو تعداد تھی تقریباً اٹھارہ یا بائیس مہینوں کے اندر اندر اس سے زیادہ شمع اسلام کے پروانے نظر آنے لگے، ایسا کیوں ہوا؟ صرف اس لیے کہ مشرکین نے دیکھا کہ قومِ مسلم اپنے اخلاق و اعمال اور کردار و گفتار بلکہ زندگی کے ہر شعبہ میں صادق و عادل، حق پسند و حق آگاہ ہیں اور اُن کی جماعتی و انفرادی حیات کا پایہ وقت کی تمام اقوام و ملل سے بلند تر ہے۔

فتح مکہ

(۱) مسلمان جب کسی غیر مسلم طاقت سے معاہدہ کرلیں تو جس مدت کے لیے معاہدہ ہوا ہو اُن کا اسلامی فرض ہے کہ اس مدت کو اپنی جانب سے پورا کریں اور نقضِ عہد نہ کریں البتہ اگر معاہد طاقت کی جانب سے خلاف ورزی ہو تو پھر مسلمان بری الذمہ ہیں بلکہ بعض حالات میں نقضِ عہد کرنے والی طاقت کا استیصال از بس ضروری ہے جیسا کہ فتح مکہ کے اسباب سے ظاہر ہوتا ہے۔

(۲) فتح مکہ کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ عنوۃً (بزورِ طاقت) فتح ہونے کے باوجود خونریزی سے محفوظ رہا، اور نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے حرم کعبہ کے احترام و عظمت کے پیشِ نظر خالد بن ولید (رضی اللہ عنہ) کو ہدایت دیتے ہوئے ابتدا ہی میں ارشاد فرما دیا تھا کہ داخلۂ حرم کے وقت ہرگز کسی پر تلوار نہ اٹھائی جائے، اِلّا یہ کہ مشرکین میں سے کوئی از خود اقدام کرے اور اس لیے حضرت سعد بن عبادہ (رضی اللہ عنہ)

سے ذریعہ رجز کے خلاف "الیوم یوم المرحمہ" فرما کر اس حقیقت حال کو خوب روشن کر دیا۔

(۳) دنیوی شہنشاہ اور نبی الرحمہ کے درمیان اگر فرق و امتیاز معلوم کرنا ہو تو "فتح مکہ" اس کے لئے روشن برہان ہے، تاریخ سے دریافت کرو کہ جب کوئی بادشاہ شاہنشاہ کسی ملک کو فتح کرتا تو اس کے ساتھ کیا سلوک روا رکھتا تھا، یہی کہ مفتوح قوم پر مظالم کرے، قتل و غارت کر کے ان کو غلام بنائے یا تلوار کے گھاٹ اتارے، لیکن جب نبی الرحمہ کو اقتدار اعلیٰ نصیب ہوا اور فتح مکہ کی صورت میں مشرکین و کفار پر یہ ید قدرت حاصل ہوا تو اس مقدس ہستی نے کیا کیا؟ صرف یہ کہ ان کو جمع کیا اور اعلان کر دیا "لا تثریب علیکم الیوم اذھبوا انتم الطلقاء۔ آج تم پر گزشتہ بداعمالیوں اور سفاکیوں پر کوئی ملامت نہیں، جاؤ تم سب آزاد ہو۔"

ایک شخص عمر بھر نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) اور مسلمانوں کی مخالفت کے باوجود جب فتح مکہ کے وقت کانپتا، خوف کھاتا اور لرزتا ہوا، حاضر خدمت ہوتا ہے تو اس وقت بھی نبی الرحمہ کی زبان اقدس اس حقیقت کا اعلان کرتی جس سے آپؐ کی شان پیغمبری نمایاں نظر آتی ہے، آپ فرماتے ہیں:۔

> خوف نہ کر! میں کوئی بادشاہ نہیں ہوں بلکہ تمہاری طرح خشک گوشت کھانے والی ایک قریشی عورت کا بیٹا ہوں۔

(۴) کافر و مشرک گروہ اگر اسلامی طاقت کا حلیف بننا چاہے تو بہ تقاضائے مسلم مفاد اس کو حلیف بنایا جا سکتا ہے بلکہ بعض حالات میں حلیف بنانا از بس ضروری ہے اور یہ بھی ضروری ہے کہ حلیف کے مال اور اس کی جان و آبرو سب کو اپنے مال، جان، اور آبرو کی طرح سمجھے اور اسی قسم کا معاملہ کرے جو مسلمانوں کیساتھ

کیا جاتا ہے۔

حُنین (۱) ایک لمحہ کیلئے بھی کسی مسلمان کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ فتح و شکست کا مدار "کثرت تعداد" پر سمجھے بلکہ اُس کا یقین راسخ ہر حالت میں خدا کی نصرت کیساتھ وابستہ رہنا چاہیئے چنانچہ بدر میں اعتماد علی اللہ نے ذلت و قلت کو عزت و کثرت کے ساتھ بدل دیا اور حنین میں اپنی کثرتِ تعداد پر اعتماد نے کثرت و شوکت کو مبدل بہ ہزیمت بنا دیا" ومن یتوکل علی اللہ فھو حسبہٗ"

(۲) اگر اسلام اور مسلمانوں کے مصالح کا تقاضا ہو تو ایک غیر مسلم طاقت کے مقابلہ میں دوسری غیر مسلم طاقت یا غیر مسلم جماعت کا تعاون و اشتراک حاصل کرنا بلاشبہ درست اور مشروع ہے، اسی لئے حنین میں نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے "طلقا" کو شریک جنگ رکھا اور جنگ میں استعانت من المشرکین" کے مسئلہ میں بلحاظ دلائل اگرچہ قبول و عدم قبول دونوں قسم کے اقوال موجود ہیں، لیکن قرآن و حدیث کی روشنی میں جمہور کا مسلک جواز و قبول ہی کا ہے، چنانچہ محدثین و فقہائے امت نے کتاب الجہاد میں اس کی تصریح کردی ہے[1]

تبوک (۱) مفاد اسلامی کے پیشِ نظر جب خلیفۃ المومنین نفیر عام (جہاد عام) کا اعلان کردے تو ادائِ فرض کے مقابلہ میں ہر قسم کی مشکلات ہیچ در ہیچ ہو جانی چاہئیں اور اسباب و وسائل کی پریشانیاں ہرگز راہ میں حائل نہ رہنی چاہئیں، غزوۂ تبوک ہم کو اسی جانب رہنمائی کرتا ہے۔

(۲) جہاد اور نفیر عام کے موقعہ پر مالی اعانت بھی جہاد ہی کا اہم شعبہ ہے اور

---

[1] فتح الباری، کتاب الام امام شافعی، مبسوط، البدائع والصنائع۔

سے گر زر طلبی سخن درینیست :: گر جاں طلبی مضائقہ نیست۔ کے خلاف عزم عمل اور خلوص و صداقت کی روشن دلیل ہے، اس لئے جلیل القدر صحابہؓ نے غزوۂ تبوک میں مالی اعانت کی اپیل پر ایک دوسرے سے مسابقت کی اور ابوبکر صدیق (رضی اللہ عنہ) نے اپنا کل مال راہِ خدا میں دیکر صرف اللہ اور اُس کے رسولؐ کا نام گھر میں باقی چھوڑا۔

(۳) جماعتی زندگی میں جن لوگوں کے متعلق شروع سے ہی یہ معلوم ہو کہ جماعت میں اُن کی شرکت از رہِ خلوص نہیں بلکہ از رہِ نفاق ہے وہ اگر جہاد جیسے فداکارانہ عمل سے پہلو تہی کرنے کیلئے کوئی بہانہ کرکے میدانِ جہاد سے جی چرا جائیں تو اُن سے در گذر کیجا سکتی ہے کہ اُنکی عدم شرکت مفید ہی ہے نہ کہ مضرت رساں لیکن مخلص و ایثار پیشہ فردِ جماعت اگر ایسے نازک موقعہ پر کوتاہی کر جائے جیسا کہ غزوۂ تبوک کا اہم معاملہ تھا تو یہ کوتاہی ناقابلِ معافی جرم ہے، تاوقتیکہ ماضی پر ندامت اور مستقبل میں ایسی شنیع حرکت سے پرہیز کے عزم کیساتھ درگاہِ الٰہی میں عجز و نیاز سے تائب نہو جائے۔

(۴) اسلامی احکام کی کھلی خلاف ورزی پر مسلمانوں کا کسی فردِ مسلم یا جماعتِ مسلمہ کے خلاف سوشل اور معاشرتی مقاطعہ درست ہی بلکہ بعض اہم اور نازک حالات کے پیشِ نظر کبھی واجب اور ضروری ہوجاتا ہے تاکہ ایک جانب مسلمانوں میں ضبط و نظم کا صحیح جذبہ پیدا ہو جائے اور دوسری جانب مخلص و منافق کے درمیان بیّن تفاوت نظر آنے لگے۔

تبنّی

رسومِ جاہلیت میں سے ایک رسم تبنّی (گود لے کر بیٹا بنانا) بھی ہے۔ یہ رسم مشرکینِ عرب

وعجم میں یکساں رائج تھی، اس رسم قبیح کے ثمرات میں سے ایک یہ بھی ہو کہ بچہ اپنے حقیقی ماں باپ کے انتساب سے کٹ کر ایک اجنبی کیلئے صلبی بیٹے کی طرح ہو جاتا اور اس کے خاندان کے تمام محارم اُس کے محارم بنجاتے ہیں۔ نیز اس اجنبی کے حقیقی ورثار کو محروم وراثت بنا کر خود اُسکی تمام جائداد کا مالک بنجاتا ہے یا اپنی موت پر اپنے حقیقی ورثار کو محروم رکھ کر اجنبی کو اپنا وارث بناتا ہے، اس لیے بلاشبہ یہ "رسم" نسبی انتساب اور معاشرتی نظام دونوں لحاظ سے مذموم و قبیح اور خلاف فطرت ہے۔

اسلام جو کہ انسان کے ہر شعبہ حیات کو مکروہ جراثیم سے پاک کرنے اور ان میں انقلاب و اصلاح کی روح پھونک کر نظام کائنات کو بہتر و خوب تر بنانے آیا ہو، اس نے اس رسم بد کے انسداد پر بھی توجہ کی اور ایک خاص واقعہ کو سامنے رکھ کر ارادہ کیا کہ معاشرت میں گندھی ہوئی اس رسم پر ایسی ضرب کاری لگائے کہ مسلمانوں میں سے ہمیشہ کے لیے اس کا خاتمہ ہو جائے اور غیر مسلم بھی اس کی معقولیت پر سر تسلیم خم کرنے کے لئے مجبور ہو جائیں۔

انسداد تبنی کے لئے خدائے برتر نے جس واقعہ کو منتخب فرمایا اُس کی رُوداد حضرت زید بن حارثہ (رضی اللہ عنہ) کی زندگی سے وابستہ ہے۔

حضرت زید رضی اللہ عنہ

حضرت زیدؓ کا تعارف اُسد الغابہ میں ابن اثیر جزری نے اس طرح کرایا ہے زید بن حارثہ بن شراحیل رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے آزاد کردہ غلام (زید) ہیں اور بہت ہی محبوب صحابی ہیں، یہ عرب کے معزز قبیلہ بنی کلب کے ایک فرد تھے، مگر بچپن ہی میں ایک حادثہ کی وجہ سے غلام بنا لئے گئے، صورت یہ پیش آئی کہ ان کی والدہ ان کو ساتھ لئے اپنے خاندان بنی معن میں جارہی تھیں۔

راہ میں قبیلۂ بنی قین نے ان کو لوٹ لیا اور زید کو بھی لے گئے اور عکاظ کے بازار میں لاکر فروخت کر دیا۔ حضرت خدیجہؓ کے برادر زادہ حکیم بن حزام نے ان کو اپنی پھوپھی کے لئے خرید لیا۔ یہ ابھی آٹھ سال ہی کے تھے کہ حضرت خدیجہؓ کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی رفیقۂ حیات ہونے کا شرف حاصل ہو گیا اور انھوں نے زید کو حضور اقدس کی خدمت میں ہبہ کر دیا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو آزاد کر کے اپنا بٹیا بنا لیا۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ، فرماتے ہیں، ہم اُس دن سے زید کو ابن محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کہنے لگے اور اُس وقت تک کہتے رہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی " اُدْعُوْهُمْ لِاٰبَائِهِمْ۔ مسلمانوں! تم لے پالکوں کو اُن کے باپ دادا کی نسبت ہی سے پکارا کرو۔"

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے زید اور اپنے چچا حضرت حمزہ رضی اللہ عنہما کے کے درمیان بھائی چارہ کرا دیا اور وہ دونوں حقیقی بھائیوں کی طرح رہنے لگے، ادھر زید کی گم شدگی نے ان کے والد حارثہ کو غم سے نڈھال کر دیا تھا حسن اتفاق کہ بنی کلب کے چند آدمی حج کی نیت سے مکہ آئے تو زید کو دیکھا اور پہچان لیا، زید نے بھی اُن پہچانا اور اپنے قبیلہ کو اپنی موجودگی کا پیغام دیا، حارثہ اور ان کا بھائی کعبؓ دونوں نے جب یہ سنا تو فوراً بھاگے ہوئے مکہ آئے اور دربار قدسی میں حاضر ہو کر عرض کیا، اب زید کو ہمارے حوالہ کر دیجئے اور زر فدیہ لے لیجئے، حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: اس سے بہتر یہ بات ہو کہ زید آجائے اور اس کے سامنے دونوں صورتیں پیش کر دی جائیں، وہ تمھارے ساتھ جانا قبول کرتا ہے یا میری ساتھ رہنا چاہتا ہے، اور جو اُس کی مرضی ہو اس پر ہم بھی راضی ہو جائیں۔"

حارثہ بخوشی اس پر رضا مند ہو گئے کیونکہ وہ یقین رکھتے تھے کہ بیٹا بہر حال باپ کو ہی ترجیح دیگا۔ چنانچہ زید بلائے گئے ذات اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا' اِن کو پہچانتے ہو؟ زید نے کہا کیوں نہیں' یہ میرے والد ہیں اور یہ چچا ہیں! آپؐ نے فرمایا' یہ لینے آئے ہیں' اب تم مختار ہو' اِن کے ساتھ چلے جاؤ یا میرے پاس رہو! زید نے عرض کیا: میں آپ پر کسی کو ترجیح نہیں دے سکتا' میری باپ چچا جو کچھ بھی ہیں' آپ ہی ہیں' حارثہ نے یہ سُنا تو رنج و تکلیف کے ساتھ کہا: "زید! کسقدر افسوس ہی تجھ پر کہ غلامی کو آزادی پر اور باپ' دادا اور خاندان پر اجنبی کو ترجیح دیرہا ہے"۔ زید نے کہا: "اس ہستی کے ساتھ رہ کر میری آنکھوں نے جو کچھ مشاہدہ کیا ہے اُس کے بعد میں دنیا و مافیہا کو اس کے سامنے ہیچ سمجھتا ہوں" تب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم) نے حارثہ کو اور حاضرین کو بتلایا کہ میں نے زید کو آزاد کر دیا ہے۔ اب وہ میرا غلام نہیں بلکہ بیٹا ہی' حارثہ نے یہ سُنا تو بہت خوشی کا اظہار کیا اور باپ اور چچا دونوں مطمئن واپس گئے[1] اور گاہے گاہے آکر دیکھ جاتے اور آنکھیں ٹھنڈی کرجایا کرتے تھے۔

ترمذی کی ایک مختصر روایت میں حارثہ کی جگہ اُن کے دوسرے بیٹے جبلہ کی آمد اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھ مسطورۂ بالا گفتگو کا ذکر ہے'

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم) نے حضرت زید کی مزید قدر افزائی کیلئے اُنکا نکاح اپنی دودھ پلائی (حاضنہ) ام ایمن کے ساتھ کر دیا' جن کے بطن سے حضرت اُسامہ پیدا ہوئے' اور اس کے بعد ارادہ کیا کہ اُن کی شادی اپنی پھوپھی زاد بہن زینب بنت

---

[1] جلد ۲ صفحہ ۲۲۴ - ۲۲۵-

جحش کے ساتھ کردیں، یہ ہاشمی خاندان کی بیٹی اور آپ کی پھوپھی اُمیہ بنت عبد المطلب کی لختِ جگر تھیں، اس لئے زینبؓ اور زینب کے بھائی اس عقد پر راضی نہیں تھے تب وحی الٰہی نے نازل ہوکر یہ حکم دیا کہ جس بات کا حکم اللہ اور اُس کا رسول دے پھر اُس کی خلاف ورزی کسی کے لئے جائز نہیں ہے۔

مَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَلَا مُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَى اللَّهُ وَرَسُولُهُ أَمْرًا أَنْ يَكُونَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ وَمَنْ يَعْصِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ فَقَدْ ضَلَّ ضَلَالًا مُبِينًا	جب اللہ اور اُس کا رسول کوئی فیصلہ کردے تو پھر کسی مرد مومن اور عورت مومنہ کو انکے معاملہ میں کچھ بھی اختیار باقی نہیں رہتا اور جو شخص اللہ اور اسکے رسول کی نافرمانی کرے بلاشبہ وہ کُھلی گمراہی میں پڑگیا (احزاب)

وحی الٰہی کے نزول پر حضرت زینب (رضی اللہ عنہا) اور اُن کے بھائیوں نے آپؐ کے فیصلہ کے سامنے سر تسلیم خم کردیا اور اس طرح آپؐ نے خاندان سے ہی عملی طور پر فخر بالانساب کی جڑ کاٹ دی تاکہ آپؐ کا عمل اُسوۂ حسنہ بنے۔

حضرت زید کا سب سے بڑا شرف یہ ہے کہ قرآن میں اُن کا نام بصراحت مذکور ہے، یہ شرف کسی صحابیِ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کو نصیب نہیں ہوا۔

انسدادِ تبنی حضرت زید اور حضرت زینب اگرچہ حبالۂ عقد میں منسلک ہوگئے تھے لیکن حضرت زینب کا یہ فطری رجحان مٹ نہ سکا کہ وہ قریشی ہاشمی ہیں اور اُن کا شوہر آزاد شدہ غلام، اسی طرح حضرت زید کو یہ فخر حاصل تھا کہ وہ بہر حال عرب کے معزز قبیلہ کے فرد اور نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کے مُنہ بولے بیٹے ہیں اور زینبؓ کو ان پر قوام ہونیکا شرف حاصل ہے، چنانچہ ان دو متضاد ذہنیتوں نے اِنکے آپسمیں محبت کا رشتہ قائم نہ ہونے دیا اور آخر کار، زید اس پر آمادہ ہوگئے کہ حضرت زینب کو طلاق دیدیں، حضرت زید

نے متعدد مرتبہ اس ارادہ کا حضور اقدس سے تذکرہ کیا، مگر آپؐ نے یہ سمجھ کر کہ شاید دیرپا مدت ازدیاد محبت کا باعث ہوجائے، زید کو طلاق دینے سے روکا۔

حضرت زید اور حضرت زینب کی ناچاقی نے اب صورت حال بدل دی اور وحی الٰہی نے یہ فیصلہ کر دیا کہ وقت آگیا ہے کہ اب "تبنّی کی رسم بد" کا خاتمہ کر دیا جائے اور جس طرح آپؐ نے فخر بالانساب کے پہلو کو اپنے خاندان ہی میں سب سے پہلے شکست دی اسی طرح اس کی ابتدا بھی خود ذاتِ اقدس کے ہی عمل سے ہو اور یہ اس طرح کہ زید جب طلاق دیدیں تو پھر زینبؓ کا عقد آپؐ سے ہوجائے، کیونکہ اس سے ایک طرف زینبؓ اور اُن کے خاندان کو جو صدمہ پہنچے، اُس کا اندمال ہوسکے اور دوسری جانب تبنّی کی رسم بد کا انسداد ہوجائے۔

نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کو جب وحیٔ الٰہی نے یہ نقشہ تبلایا تو بر بنائے بشریت آپؐ کے قلب میں یہ جذبہ پیدا ہوا کہ زید اگر زینبؓ کو طلاق نہ دے تو اچھا ہے تاکہ زینبؓ کے خاندان کو بھی توہین محسوس نہ ہو اور ہم بھی منافقین اور مشرکین کے اس طعن وتشنیع سے محفوظ رہیں کہ وہ یہ کہیں گے "محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اپنے بیٹے کی بیوی کو اپنی بیوی بنالیا، حالانکہ دوسروں کے لئے بیٹے کی بیوی کو حرام بتاتے ہیں" چنانچہ آپؐ برابر زید کو طلاق سے باز رکھتے رہے، مگر جب کسی طرح باہم موافقت نہ ہوسکی تب زید نے طلاق دے ہی دی اور عدت گذرنے پر خدا کا حکم ہوا کہ اب زینبؓ کو آپؐ اپنی بیوی بنائیں تاکہ آئندہ مُنہ بولے بیٹے کی رسم کا خاتمہ ہو اور مسلمانوں کی معاشرت میں یہ تنگی نہ پیدا ہوسکے کہ مُنہ بولے بیٹے کی بیوی کے نکاح کو صلبی بیٹے کی بیوی کی طرح حرام سمجھا جائے اور ساتھ ہی اللہ تعالیٰ کی وحی نے یہ بھی واضح کر دیا کہ

خدا جو فیصلہ کر چکا ہے وہ تو ظاہر ہو کر ہی رہیگا اور تمھارے بشری خوف سے وہ ٹلنے والا نہیں ہے اور حقیقت بھی یہ ہے کہ حکم الہٰی کے مقابلہ میں سماج انسانی کا خوف ہیچ در ہیچ ہے۔

قرآن عزیز نے انسداد تبنّی کے معاملہ کو دو شقوں میں تقسیم کر دیا ہے ایک ذہنی و علمی انقلاب اور دوسرا عملی، چنانچہ ذہنی اصلاح و انقلاب کے لئے حسب ذیل آیات نازل فرمائیں:۔

وَمَا جَعَلَ اَدْعِيَآءَكُمْ اَبْنَآءَكُمْ	اور اللہ نے تمہارے منہ بولے بیٹوں کو تمہارا (حقیقی)
ذٰلِكُمْ قَوْلُكُمْ بِاَفْوَاهِكُمْ وَاللّٰهُ	بیٹا نہیں بنا دیا، یہ قول تمہارے اپنے منہ کی بات
يَقُوْلُ الْحَقَّ وَهُوَ يَهْدِى السَّبِيْلَ ۝	ہے اور اللہ سچ بات کہتا ہے اور وہی سیدھی راہ دکھاتا
اُدْعُوْهُمْ لِاٰبَآئِهِمْ هُوَ اَقْسَطُ	ہے تم ان منہ بولے بیٹوں کو انکے (حقیقی) باپوں کی
عِنْدَ اللّٰهِ ۚ فَاِنْ لَّمْ تَعْلَمُوْٓا اٰبَآءَهُمْ	نسبت سے پکارا کرو یہی اللہ کے نزدیک انصاف کا
فَاِخْوَانُكُمْ فِى الدِّيْنِ	طریقہ ہے اور اگر تمکو انکے باپ دادوں کا نام معلوم
(احزاب)	نہ ہو تو وہ تمہارے دینی بھائی ہیں۔

چنانچہ صحابہؓ تصریح کرتے ہیں کہ ہم نے اُسی وقت سے حضرت زید کو ابن محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کہنا چھوڑ دیا اور زید بن حارثہ کہنے لگے۔

اور انسداد تبنّی کے عملی پہلو کو روشن کرنے کے کیلئے ان آیات کا نزول ہوا۔

وَاِذْ تَقُوْلُ لِلَّذِىْٓ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ	اور اُو وہ وقت قابل ذکر ہے جب تم اُس شخص سے کہتے
وَاَنْعَمْتَ عَلَيْهِ اَمْسِكْ عَلَيْكَ	تھے جس پر اللہ نے اور تم نے انعام کیا کہ اپنی
زَوْجَكَ وَاتَّقِ اللّٰهَ وَتُخْفِىْ فِىْ	بیوی کو روکے رکھ اور طلاق نہ دے اور اللہ سے

نَفْسِكَ مَا اللّٰهُ مُبْدِيْهِ وَتَخْشَى	ڈرا اور صورت حال یہ تھی کہ تم اپنے جی میں اس بات
النَّاسَ وَاللّٰهُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشٰهُ	کو چھپائے ہوئے تھے جسکو اللہ ظاہر کرنیوالا تھا
فَلَمَّا قَضٰى زَيْدٌ مِّنْهَا وَطَرًا	اور تم لوگوں کے طعن و تشنیع، سے ڈرتے تھے اور
زَوَّجْنٰكَهَا لِكَيْ لَا يَكُوْنَ عَلَى	اللہ زیادہ مستحق ہے کہ اس سے خوف کیا جائے سو جب
الْمُؤْمِنِيْنَ حَرَجٌ فِيْٓ اَزْوَاجِ اَدْعِيَآئِهِمْ	زید اپنی حاجت پوری کر چکا اور اس نے طلاق دیدی
اِذَا قَضَوْا مِنْهُنَّ وَطَرًا وَكَانَ	تو ہمنے اس (زینب) کا تجھسے نکاح کر دیا تاکہ (آئندہ)
اَمْرُ اللّٰهِ مَفْعُوْلًا	مسلمانوں پر یہ تنگی نہ رہے کہ وہ اپنے منہ بولے بیٹوں کی
(احزاب)	بیویوں سے نکاح نہ کر سکیں جب انکو منہ بولے بیٹے اپنی حاجت
	پوری کرلیں (یعنی طلاق دیدیں) اور اللہ کا یہ حکم اٹل ہے

قرآنِ عزیز کی اِن آیات کا مفہوم اپنے متعلقہ مسئلہ کے ساتھ اس قدر صاف اور واضح ہے کہ اسمیں کسی دوسرے مفہوم کی گنجائش تک نہیں اور نہ کسی قسم کی کوئی پیچیدگی ہی ہے کہ جو معاملہ کے رُخ کو کسی دوسری جانب پھیرنے کا موجب ہو، مگر حیرت اور حیرت سے زیادہ رنج و ملال ہے اُن راویانِ روایت پر جنہوں نے روایت و درایت کی کسوٹی پر کسے بغیر ہی یہودِ بنی اسرائیل کی اسلام دشمنی اور رسول دشمنی میں گڑھی ہوئی خرافی داستان کو اِن آیات کی تفسیر کے ضمن میں درج کر دیا اور یہ قطعاً محسوس نہ کیا کہ جبکہ اِن بے سر و پا روایات کا نہ قرآن کی آیات سے جوڑ لگتا ہے اور نہ ذخیرۂ حدیث میں کوئی ایک صحیح روایت بھی اِسکی جانب اشارہ کرتی ہے تو پھر ہمارے لئے کس طرح یہ جائز ہو سکتا ہے کہ ہم ایسی روایات کو بیان یا نقل کر کے ایک جانب دشمنانِ اسلام کے لئے غلط اور بہتان نکتہ چینی کا سامان مہیا کریں اور دوسری طرف بے علم مسلمانوں کو دینی

و ذہنی انتشار کا باعث بنیں۔

خرافی داستان اگر یہ خرافی داستان کتبِ تفسیر میں نقل نہ ہوتی اور اُسکے مفاسد کا اثر موافق و مخالف دونوں جانب پر نہ پڑا ہوتا تو ایک لمحہ کیلئے بھی قلم اس کیلیے آمادہ نہ ہوتا کہ اس ہرزہ سرائی کو روایتاً کہہ کر پیش کرے، مگر اصل حقیقت کو واشگاف کرنیکے بعد محض اسیلیے اس داستان کو سپردِ قلم کیا جا رہا ہے کہ جب کبھی اس پر نگاہ پڑے تو فوراً ذہن میں آجائے کہ یہ ایک خرافی داستان سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتی اور اس لیے دشمنانِ اسلام کا اس کی سند لینا محض تعصب اور اسلام دشمنی پر مبنی ہے نہ کہ حقیقتِ حال کی طلب و جستجو کے پیشِ نظر۔

کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت زینبؓ کے یہاں تشریف لیگئے، اتفاق سے حضرت زید موجود نہیں تھے، حضرت زینبؓ پر اچانک نظر پڑی تو وہ بہت حسین نظر آئیں، آپ فوراً ہی یہ پڑھتے ہوئے "سبحان مقلب القلوب پاک ہے وہ ذات جو دلوں کو پھیر دینے پر قابو رکھتی ہے" واپس ہو گئے، جب زید آئے تو زینب نے اُن سے پورا واقعہ کہہ سنایا، زید یہ سُن کر خدمتِ اقدس میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ میں زینبؓ کو طلاق دینا چاہتا ہوں، حضور نے پوچھا ایسا کیوں کرتے ہو؟ تو کہنے لگے اور کوئی وجہ نہیں ہے وہ خود کو بہت بلند مرتبہ سمجھتی اور مجھ کو زبان سے ایذا پہنچاتی ہے، یہ سُنکر نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کے قلب میں (العیاذ باللہ) اگرچہ یہ آیا کہ زید طلاق دیدے مگر زبان سے منع کیا کہ خدا سے ڈر اور ایسا نہ کر، تب اللہ تعالیٰ نے نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) پر عتاب فرمایا اور کہا کہ تیرے دل میں جو بات تھی اُس کو تو نے چھپایا، مگر اللہ تعالیٰ اُس کو ظاہر کر کے رہیگا (اعاذنا

اللہ من ہذا الخرافات)

اس روایت کو ابن ابی حاتم اور طبری نے قتادہؒ اور ابن عباسؓ کی نسبت کے ساتھ روایت کیا ہے مگر قاضی عیاض نے شفاء میں، حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں، ابن کثیر، ابن حیان، سید محمود آلوسی نے اپنی تفاسیر میں اور خفاجی نے نسیم الریاض میں اس کو روایت و درایت دونوں اعتبار سے ساقط الاعتبار اور ناقابل قبول ثابت کیا ہے اور ان دونوں بزرگوں کی جانب اس روایت کے انتساب کو باطل اور غلط قرار دیا ہے۔ فتح الباری میں ہے:

و وردت آثار اخریٰ اخرجہا ابن ابی حاتم والطبری ونقلہا کثیر من المفسرین لا ینبغی التشاغل بہا والذی اوردتہ منہا ہو المعتمد [1]	اس سلسلہ میں اور بھی آثار بیان کئے جاتے ہیں جنکو ابن ابی حاتم اور طبری نے روایت کیا ہے اور بہت سے مفسرین نے اسکو نقل کر دیا ہے یہ آثار ہرگز اس قابل نہیں ہیں کہ انکی جانب کوئی توجہ بھی دیجائے اور قابل اعتماد آثار وہی ہیں جنکو ہمنے اس جگہ بیان کر دیا ہے۔

اور سید محمد آلوسی اس داستان کو نقل کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:۔

وللقصاص فی ھٰذہ القصۃ کلام لا ینبغی ان یجعل فی حیز القبول [2]	اور داستان سراؤں کے پاس اس واقعہ کے متعلق بھی گڑھی ہوئی باتیں ہیں جو ہرگز اس قابل نہیں کہ ان کو قبولیت کا درجہ دیا جائے۔

اور ابن کثیر نے تو اس داستان کو اپنی تفسیر میں نقل کرنا بھی پسند نہیں کیا اور

---

[1] جلد ۵ کتاب التفسیر صفحہ ۲۲۵ [2] جلد ۴ ص ۲۹۸ - ۲۹۴

اس کا حوالہ دیتے ہوئے اپنا یہ محققانہ فیصلہ صادر فرما دیا۔

ذكر ابن ابي حاتم وابن جرير ههنا آثارا عن بعض السلف رضي الله عنهم احببنا ان نضرب عنها صفحا لعدم صحتها فلا نوردها[1]

ابن ابی حاتم اور ابن جریر نے اس موقع پر بعض سلف رضی اللہ عنہم کی جانب منسوب چند آثار کو ذکر کیا ہے ہمنے یہ پسند کیا کہ انکی جانب مطلق التفات نکریں اسلئے کہ وہ قطعاً صحیح نہیں ہیں، اسلیے ہم انکا اس جگہ ذکر نہیں کریں گے۔

اور پھر یہ تمام اہل تحقیق اُن آثار کو نقل کرتے ہیں جو اس سلسلہ میں بسند صحیح ثابت ہیں اور جو آیات کی وہی تفسیر کرتے ہیں جس کو سطور بالا میں ہم بیان کر چکے ہیں،

حضرت زین العابدین رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ زید کے طلاق دینے سے قبل اللہ تعالیٰ نے بذریعہ وحی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ بتلا دیا تھا کہ انسداد تبنّی کے سلسلہ میں خدا کا یہ فیصلہ ہو چکا ہے کہ حضرت زینب رضؓ کو زید طلاق دیگا اور تمکو اس سے نکاح کرنا ہوگا، یہ بات تھی جس کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بر بنا ر بشریت دشمنوں کے طعن سے بچنے کی خاطر کہ "کہیں گے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے بیٹے کی بیوی سے نکاح کرلیا" اپنے دل میں چھپائے رکھا اور آپ کوشش کرتے رہے کہ کسی طرح زید زینب رضؓ کو طلاق نہ دے، اسی کو قرآن نے "تخفی فی نفسك" کہا ہے اور زید کا طلاق دینا اور پھر زینب کا حرم نبوی میں داخل ہونا اس حقیقت کا اعلان ہے جس کو "ما الله مبديه وتخشى الناس والله احق ان تخشىه" میں کہا گیا ہے[2]

اور عمرو بن فائد نے بھی امام زہری سے یہی تفسیر نقل کی ہے اور اسی پر تمام

---

[1] جلد ۲ ص ۱۳۲ [2] نسیم الریاض جلد ۵ ص ۲۹۹

محدثین و مفسرین کا اعتماد ہے اور یہی صحیح ہے۔

لیکن یہ صورت حال کیوں اختیار کی گئی اور معاملہ کو اس خاص رنگ میں کیوں رکھا گیا جو قرآن عزیز کی ان آیات سے ظاہر ہوتا ہے، حافظ ابن حجرؒ اس کی متعلق یہ حقیقت واضح فرماتے ہیں:۔

والحاصل ان الذی کان تخفیه
النبی هو اخبار الله ایاه انها
ستصیر زوجته الذی کان
تحمله علی اخفاء ذلك خشیة
قول الناس تزوج امراءة ابنه
واراد الله ابطال ما کان اهل
الجاهلیة علیه من احکام التبنی
بامر ابلغ فی الابطال منه
وهو تزوج امراءة الذی یدعی
ابنا ووقع ذلك من امام
المسلمین لیکون ادعی
لقبولهم وانما وقع الخبط
فی تاویل متعلق الخشیة
والله اعلم[1]

حاصل کلام یہ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم صرف
اس بات کو پوشیدہ رکھ رہے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے ازالۂ
تبنی کے سلسلہ میں یہ خبر دی ہے کہ زینب تمہارے نکاح میں
آئیگی اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلئے اس بات
کو پوشیدہ رکھا کہ آپ لوگوں کے اس طعن سے بچنا چاہتے
تھے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے بیٹے کی بیوی سے شادی
کرلی اور اللہ تعالیٰ یہ ارادہ کر چکا تھا کہ بے اصل رسم جو
احکام زمانۂ جاہلیت میں نافذ تھے اُنکو باطل کر دے اور اسکے
لیے اس طریقہ سے بہتر کوئی دوسرا طریقہ نہیں تھا کہ عملاً
کسی منہ بولے بیٹے کی بیوی سے شادی کرائی جائے اور
اُس کیلیے ذات اقدس کو اسلیے چنا گیا کہ آپ امام المسلمین
ہیں پس آپ کا عمل مسلمانوں کیلیے سب سے زیادہ اتباع
اور قبولیت کا داعی ہوگا اور مسلمان اچھی طرح اس مسئلہ کی
حقیقت کو سمجھ جائیں گے لہٰذا صورت حال یہ اختیار کی
گئی کہ پہلے زینبؓ کی آپؐ کے منہ بولے بیٹے زیدؓ سے شادی ہو اور پھر وہ طلاق

[1] جلد ۸ ص ۳۲۵

دے اور بحکم خداوندی پھر وہ آپؐ کے نکاح میں آئیں، یہ ہے وہ اصل بات جو اس لیے خبط میں پڑ گئی کہ تاویل کرنے والوں نے یہ قیاس آرائیاں کر ڈالیں کہ آیت میں خشیۃ کا متعلق کیا ہے۔

غرض اسرائیلی داستانوں میں سے یہ بھی ایک خرافی داستان تھی جس کا پردہ فاش ہونا ازبس ضروری تھا، ورنہ تو یہ روایت خرد و عقل کے نزدیک یوں بھی ناقابل اعتماد اور لغو ہے کہ زینب جبکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی پھوپھی زاد بہن تھیں اور بچپن پر جوانی تک مسلسل آپؐ کے سامنے رہیں اور شادی کے بعد بھی آپؐ سے پردہ نہیں کرتی تھیں تو اس واقعہ کے دن کون خاص بات تھی کہ زینبؓ آپ کی نگاہ میں اجنبی بن کر نظر آنے لگیں اور آپؐ نے اخلاق کریمانہ کے خلاف دل و زبان کی مطابقت بھی چھوڑ دی۔

اگر قرآن کی آیت کا یہ مطلب لے لیا جائے تو کیا پھر ایک لمحہ کیلیے بھی قرآن کو یہ حق ہے کہ ذات اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک نبی، رسول اولوالعزم پیغمبر کی حیثیت میں پیش کر سکے۔ "سبحٰنك ھٰذا بھتان عظیم"

بصائر (۱) باوجود اس امر کے کہ پیغمبر و رسول اس حقیقت سے آشنا ہوتے اور اس پر یقین رکھتے ہیں کہ خدا کا فیصلہ اٹل اور ناقابل رد ہوتا ہے تاہم اگر کوئی امر ایسا ہو جسمیں انکی ذات وقت کے خود ساختہ اخلاقی پہلو کی بنا پر مورد طعن و تشنیع بنتی ہو تو بہ تقاضائے بشریت وہ اسکی زد سے محفوظ رہنے کی کوشش کرتے ہیں اور متوقع رہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ جس مقصد خیر کیلیے اس صورت حال کو رونما کرنا چاہتا ہے، کاش کہ وہ کسی ایسی صورت میں نمودار ہو کہ انکی ذات اس طعن و تشنیع سے بچ جائے، لیکن جبکہ خدا کی مصلحت اسی خاص صورت حالات میں مضمر ہوتی ہے تو وقت آنے پر نبی و رسول اپنی خواہشات ذاتی

کو پسِ پشت ڈال کر خدا کے فیصلہ پر سر تسلیم خم کر دیتا ہے، قرآن عزیز نے زیر بحث واقعہ میں اسی حقیقت کو معجزانہ انداز بیان میں ادا کیا ہے۔

(۲) قرآنِ عزیز کی تفسیر خصوصاً واقعات پر مبنی آیات کی تفسیر میں اجمال اُس تفصیل سے بدرجہا بہتر ہے جو محض عقلی احتمالات کے پیش نظر آیات کے حقیقی مفہوم کو بھی بدل ڈالے اور لفظی تعبیرات کے اجمال سے غلط اور باطل عمارت طیار کرے' بلا شبہ ایسی تفصیل تفسیر نہیں بلکہ تحریف ہے اور اس لیے ہر مفسر کا فرض ہے کہ اُس سے اپنا دامن بچائے۔

قرآنی حقائق سے آگاہ محققین مفسرین اس حقیقت سے بخوبی واقف ہیں کہ تفسیر قرآن میں لفظی تعبیرات سے حقیقت کی جستجو کیے بغیر عقلی احتمالات بیان کر کے متضاد اقوال پیدا کر دینا تفسیر قرآن کی محمود خدمت نہیں ہے بلکہ قلوب میں تردد و اضطراب پیدا کر دینے کا موجب ہے۔

تفسیر قرآن کی بہترین خدمت یہ ہے کہ اول قرآنِ عزیز کی تفسیر خود قرآن سے ہی کیجائے "القرآن یفسر بعضہ بعضا" اور ساتھ ہی صحیح و مستند احادیث رسول سے اسکے اجمال کی شرح کرتا جائے، اور پھر اگر مزید تشریحات صحیح آثار صحابہ رضی اللہ عنہم سے حاصل ہو سکیں تو اُن سے بھی استفادہ کیا جائے اور اِن تمام تحقیقات کے بعد ایک مضبوط و مدلل اور محقق قولِ فیصل نقل کرتا جائے اور احتمالات کی کشاکش سے اضطراب اقوال کا شکار نہ بنے اور اگر لطائف و حکم اور نکات پر قلم اُٹھائے تو اُن میں بھی یہ پیش نظر رہے کہ آیت کی حقیقی روح سے جُدا نہ ہو جائے بلکہ اُس کے اندر محدود رہے نیز دور از کار لفظی اور تخمینی احتمالات کی راہنمائی میں بعید تاویلات سے اپنا دامن محفوظ رکھے اور غیر مستند روایات (احادیث و آثار) اور اسرائیلیات سے ہرگز ہرگز احتمال کے طور پر بھی استشہاد و استناد نہ کرے

بلکہ اس کا فرض ہو کہ حسب موقعہ ان کی تردید اور اُن کا ابطال کرتا جائے تاکہ اربابِ مطالعہ کو قرآنی ہدایات سے حصولِ سعادت اور اخذِ بصیرت و موعظت کیلئے آسانی ہو۔

بنو نضیر

یہ واقعہ ۴ھ ہجری میں پیش آیا، جو قبائل یہود یمن سے بھاگ کر حجاز (مدینہ) میں آبسے تھے، اُن میں سے یہ بھی مشہور قبیلہ ہو۔ نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) جب مدینہ تشریف فرما ہوئے تو آپؐ نے مدینہ اور اطرافِ مدینہ کے یہود سے عہد و پیمان کرکے "صلح و عہد" کی طرح ڈالی یہ انصار میں سے بنی خزرج کے حلیف بھی تھے۔

یہود نے اگرچہ ظاہراً اس صلح و عہد پر رضامندی کا اظہار کر دیا تھا لیکن اُن کے روایتی حسد و بغض اور تاریخی منافقت نے اس عہد پر ان کو تادیر قائم نہیں رہنے دیا اور انھوں نے نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) اور مسلمانوں کے خلاف اندرونی اور بیرونی سازشوں کا جال بچھانا شروع کر دیا، اسی اثنار میں بنو نضیر کے ذمہ دار افراد نے ایک روز یہ سازش کی کہ نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی خدمت میں جاکر عرض کریں کہ ہم کو ایک معاملہ میں آپؐ سے مشورہ کرنا ہے اور جب آپؐ تشریف لے آئیں تو دیوار کے قریب اُن کو بٹھایا جائے اور جب وہ گفتگو میں مصروف ہو جائیں تو اوپر سے ایک بھاری پتھر آپؐ پر گرا کر آپ کا خاتمہ کر دیا جائے۔

چنانچہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مدعو ہو کر تشریف لائے، ابھی آپؐ دیوار کے قریب بیٹھے ہی تھے کہ وحی الٰہی نے حقیقت حال سے مطلع کیا اور آپ فوراً خاموشی کے ساتھ واپس تشریف لے گئے اور وہاں جاکر محمد بن مسلمہ (رضی اللہ عنہ) کو بھیجا کہ وہ بنو نضیر تک

یہ پیغام پہنچا دیں کہ چونکہ تم نے غداری کی اور نقضِ عہد کیا ہے اس لیے تمکو حکم دیا جاتا ہے کہ حجازِ مقدس کی سرزمین سے جلد جلاوطن ہو جاؤ، منافقین نے یہ سُنا تو جمع ہو کر بنو نضیر کے پاس پہنچے اور کہنے لگے، تم (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کا فرمان ہرگز تسلیم نہ کرو اور یہاں سے ہرگز جلاوطن نہ ہو، ہم ہر طرح تمھارے شریک کار ہیں۔

بنو نضیر نے یہ پشت پناہی دیکھی تو حکم ماننے سے انکار کر دیا اور حالات کا انتظار کرنے لگے تب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاد کی طیاری کی اور حضرت عبداللہ بن ام مکتوم کو مدینہ کا امیر بنا کر بنو نضیر کی گڑھی (چھوٹا قلعہ) پر حملہ آوری کیلیے نکلے حضرت علی (رضی اللہ عنہ) کے ہاتھ میں اسلامی پرچم اور صحابہ جلو میں تھے۔

بنو نضیر نے یہ دیکھا تو قلعہ بند ہو گئے اور یقین کر لیا کہ اب مسلمان ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے، چنانچہ نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) چھ شبانہ روز اُن کا محاصرہ کیے رہے اور پھر حکم دیا کہ ان کے اُن درختوں کو کاٹ ڈالو جو اُن کے لیے پھل مہیا کرتے ہیں اور اُن کا وجود اُن رسد رسانی کے لئے تقویت کا باعث ہے۔ ان حالات کو دیکھ کر بنی نضیر کے دلوں میں رعب اور خوف طاری ہو گیا اور اُن کو منافقین کی جانب سے مایوسی اور رسوائی کے سوا اور کچھ ہاتھ نہ آیا۔ آخر مجبور ہو کر اُنھوں نے درخواست کی کہ ہم کو جلاوطن ہونے کا موقع دیا جائے، لہذا اُن کو اجازت دی گئی کہ سامان حرب کے علاوہ جس قدر سامان بھی وہ اونٹوں پر لاد کر لیجانا چاہتے ہیں لیجائیں۔

اجازت نامہ حاصل ہونے کے بعد یہ منظر بھی قابل دید تھا کہ کل کے باغی، سرکش اور فتنہ جو غدار آج اپنے ہاتھوں سے اپنے مکانات کو برباد کر کے اُس وطن کو خیرباد کہہ رہے تھے جس جگہ محفوظ و مامون رہنے کے لئے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود نفس

نفیس ایک عہدنامہ کے ذریعہ اُن کو دعوت دی تھی۔

بنو نضیر نے اپنے مکانات کو اس لئے برباد کردیا کہ وہ یہ برداشت نہیں کر سکتے تھے کہ اُن کے بعد مسلمان اِن کے گھروں میں آباد ہوں،

بہرحال بنو نضیر جلاوطن ہوکر جب چلے تو اُن میں سے بعض اکابر قوم مثلاً حُیَیّ بن اخطب اور ابی الحقیق تو خیبر میں مقیم ہوگئے اور اکثر شام کے نواح میں جا بسے اور دو سردار یامین بن عمرو اور ابوسعد مشرف باسلام ہوکر مدینہ ہی رہ گئے۔

قرآن عزیز اور بنو نضیر

اسی واقعہ کے سلسلہ میں قرآن عزیز کی سورۂ حشر نازل ہوئی ہے اور اس میں بنو نضیر کی غداری، منافقین کی فتنہ پردازی مسلمانوں پر خدا کا احسان وکرم اور جنگ کے موقعہ پر سبز درختوں کے کاٹنے کا حکم اور ایسی صورت میں جبکہ جنگ نہ پیش آئی ہو مالِ غنیمت کا مصرف اور فَیٔ کا حکم، ان تمام امور کا تفصیل کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔

بصیرت

(۱) "منافق" کا نفاق ایک خود فریبی ہوتی ہے جو انجام کے لحاظ سے نہ خود اپنے لئے مفید ثابت ہوتا ہے اور نہ منافقین پر اعتماد کرنے والا ہی اُس سے کوئی فائدہ اُٹھا سکتا ہے بلکہ بسا اوقات وہ اپنی اور اپنے حلیفوں کی ذلت و رسوائی اور ہلاکت و بربادی کا سامان مہیا کردیتا اور ابدی خسران کا سبب بنجاتا ہے چنانچہ منافقینِ مدینہ یہودِ بنی نضیر، بنی قریظہ اور بنی قینقاع کے حالات و واقعات تاریخی اس کے لئے زندۂ جاوید شہادت ہیں

(۲) جس قوم میں شر و فساد اور مکر و فریب "اخلاق" کا درجہ لے لیتے ہیں اُن کے قویٰ جسمانی و روحانی سے صلاح و خیر کی تمام استعداد فنا ہوجاتی ہے اور وہ نہ دنیا

میں کسی عزت و شوکت کی مالک رہتی ہے اور نہ آخرت میں اُس کے لئے کوئی حصۂ خیر باقی رہتا ہے، چنانچہ سامیتقی (سمیٹیک) اقوام میں سے اگر کسی قوم میں اس کو نمایاں دیکھنا ہو تو "یہود" کو دیکھ لینا کافی ہے،

(۴) عام طریقے پر جنگ میں سبز درختوں اور ہری کھیتیوں کو کاٹنا اور برباد کرنا اصلاحاتِ جنگ کے منافی اور ممنوع ہے لیکن جب یہ اشیاء زمانۂ جنگ میں دشمن کی مزید تقویت کا باعث ہو کر فساد و شر کے بقار میں معاون ہوں تو ایسی حالت عام حکم سے مستثنیٰ ہے جیسا کہ "بنو نضیر" کے واقعہ میں نصِ قرآنی ناطق ہے۔

واقعۂ افک

شعبان ۵ھ ہجری مطابق دسمبر ۶۲۶ء میں بنی مصطلق کے سردار حارث بن ضرار کی فتنہ سامانیوں کی وجہ سے غزوۂ بنی المصطلق پیش آیا، منافقین کا یہ دستور بن گیا تھا کہ جس غزوہ کے اسبابِ ظاہری سے غالب گمان فتح کا ہوتا، اُس میں مالِ غنیمت کے لالچ سے ضرور ساتھ ہو جاتے۔ چنانچہ اس غزوہ میں بھی منافقین کا گروہ مع اپنے سردار عبد اللہ بن اُبیّ کے موجود تھا، واپسی پر ایک معمولی حادثہ پیش آگیا اور عبد اللہ بن اُبیّ اور اُس کے منافق گروہ نے اُس پر افتراء اور بہتان کی ایک عمارت تیار کر لی مگر قرآن عزیز نے جلد ہی اِس افتراء کی حقیقت آشکارا کر دی اور مفتریوں کو ذلیل و رسوا ہو جانا پڑا۔ بخاری میں اس واقعہ کی جو تفصیلات مذکور ہیں، اُن کا حاصل یہ ہے کہ جب نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کامیابی کے ساتھ غزوۂ بنی المصطلق سے واپس ہوئے

تو مدینہ کے قریب ایک منزل پر پڑاؤ تھا کہ آخر شب میں کوچ کا اعلان ہوا۔

حضرت عائشہؓ اعلان سُن کر رفع حاجت کیلئے عجلت کے ساتھ قیامگاہ سے دور چلی گئیں، فارغ ہونے کے بعد واپس ہوئیں تو گلے میں جو ہار پہنے ہوئی تھیں وہ سینہ پر نہ پایا، وہ یہ سمجھ کر کہ ٹوٹ کر وہیں گرگیا ہوگا، جہاں رفع حاجت کے لئے گئی تھیں اُس کو تلاش کرنے کے لئے واپس گئیں اسی اثناء میں جو جماعت اُن کا ہودج کو اونٹ پر سوار کراتی تھی، اُس نے ہودج اُٹھا کر اونٹ پر کس دیا اور چونکہ اُس زمانہ میں کم خوری کی وجہ سے عورتیں عموماً فربہ اندام نہیں ہوتی تھیں اور اسلئے وہ بھی بہت لاغر تھیں، لہٰذا ہودج بر مامور جماعت نے اُنکی عدم موجودگی کا مطلق احساس نہیں کیا اور اونٹ پر ہودج رکھ کر روانہ ہو گئے حضرت عائشہؓ جب ہار کو تلاش کرتی ہوئی واپس ہوئیں تو قافلہ جا چکا تھا اور اب ہار بھی ہودج کے قریب ہی مل گیا، وہ سخت پریشان ہوئیں مگر پھر سوچا کہ جونہی مسلمانوں کو یہ محسوس ہوگا کہ میں ہودج میں نہیں ہوں تو فوراً نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اسی جگہ سواری بھیج دینگے اس لیے مناسب یہ ہے کہ قافلہ کا پیادہ پا پیچھا کرنے کی بجائے اسی جگہ انتظار کیا جائے رات آخر تھی، سپیدۂ صبح نمودار ہونے والا تھا کہ اُن کی آنکھ لگ گئی۔

ادھر صفوان بن معطل سہمی اس خدمت پر مامور تھے کہ وہ قافلہ سے بہت پیچھے رہ کر نگرانی کرتے ہوئے اور جو چیز بھی قافلہ کی رہ جائے اُس کو لیتے ہوئے آئیں، وہ پیچھے سے چلتے ہوئے جب اس مقام پر پہنچے تو انھوں نے محسوس کیا کہ یہاں کوئی انسان موجود ہے، قریب آئے تو اُن کو پہچان لیا کیونکہ آیت حجاب سے پہلے وہ اُن کو دیکھ چکے تھے۔

انھوں نے دیکھتے ہی فوراً بلند آواز سے "انا للہ وانا الیہ راجعون" پڑھا، حضرت عائشہؓ آواز سن کر بیدار ہو گئیں اور سمٹ کر بیٹھ گئیں، صفوان نے ایک لفظ کہے بغیر اونٹ کو بٹھا دیا اور وہ بھی خاموشی کے ساتھ اونٹ پر ہودج میں سوار ہو گئیں اور صفوان مہار پکڑے ہوئے روانہ ہو گئے اور دوپہر کے قریب لشکر میں جا پہنچے۔

جب یہ خبر عبد اللہ بن اُبَی کو معلوم ہوئی تو اُس نے اور اُس کی جماعت نے موقعہ کو غنیمت جانا اور تیزی کے ساتھ افترا اور بہتان کو لشکر میں پھیلا دیا، مگر مسلمانوں نے کسی طرح اس کو باور نہیں کیا، البتہ صرف تین مسلمان (دو مرد اور ایک عورت) حسّان بن ثابت، مسطح بن اُثاثہ اور حمنہ بنت جحش اپنی سادہ لوحی سے منافقین کے جال میں پھنس گئے۔

خدا کا کرم و فضل دیکھیے کہ زیادہ دن نہ گزرے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے وحی الٰہی (قرآن عزیز) کے ذریعہ منافقین کی خباثت کو آشکارا کر دیا اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی پاکدامنی اور عفت مآبی پر مہر تصدیق ثبت کر کے بہتان لگانے والوں پر کوڑوں کی سزا (حد قذف) جاری کرنے کا حکم دیا اور اس طرح کذاب اور مفتری کیفر کردار کو پہنچے۔

اس واقعہ پر بعض مستشرقین اور یورپین مورخین نے بہت جولانیِ طبع کا ثبوت دیا ہے اور خوب آب و نمک لگا کر اس کو بیان کیا ہے جس کو پڑھ کر اسلام اور داعیِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق اُن کے قلبی عناد کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔

بہرحال قرآنِ عزیز نے اس واقعہ پر مسلمانوں کو صاف طور سے یہ بتلا دیا کہ یہ کذب و افترا پر مبنی داستان سن کر تم نے خود ہی یہ کیوں نہ کہہ دیا کہ "یہ محض

جھوٹ اور بہتان ہے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ جَآءُوْ بِالْاِفْکِ عُصْبَۃٌ
مِّنْکُمْ لَا تَحْسَبُوْہُ شَرًّا لَّکُمْ بَلْ ھُوَ
خَیْرٌ لَّکُمْ لِکُلِّ امْرِئٍ مِّنْھُمْ مَّا اکْتَسَبَ
مِنَ الْاِثْمِ وَالَّذِیْ تَوَلّٰی کِبْرَہٗ
مِنْھُمْ لَہٗ عَذَابٌ عَظِیْمٌ لَوْلَآ اِذْ
سَمِعْتُمُوْہُ ظَنَّ الْمُؤْمِنُوْنَ وَ
الْمُؤْمِنٰتُ بِاَنْفُسِھِمْ خَیْرًا وَّقَالُوْا
ھٰذَآ اِفْکٌ مُّبِیْنٌ ۝ لَوْلَا جَآءُوْا
عَلَیْہِ بِاَرْبَعَۃِ شُھَدَآءَ فَاِذْ لَمْ یَاْتُوْا
بِالشُّھَدَآءِ فَاُولٰٓئِکَ عِنْدَ اللّٰہِ ھُمُ
الْکٰذِبُوْنَ ۝ وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰہِ
عَلَیْکُمْ وَرَحْمَتُہٗ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَۃِ
لَمَسَّکُمْ فِیْ مَآ اَفَضْتُمْ فِیْہِ عَذَابٌ
عَظِیْمٌ ۝ اِذْ تَلَقَّوْنَہٗ بِاَلْسِنَتِکُمْ
وَتَقُوْلُوْنَ بِاَفْوَاھِکُمْ مَّا لَیْسَ
لَکُمْ بِہٖ عِلْمٌ وَّتَحْسَبُوْنَہٗ ھَیِّنًا
وَّھُوَ عِنْدَ اللّٰہِ عَظِیْمٌ ۝ وَلَوْ
لَآ اِذْ سَمِعْتُمُوْہُ قُلْتُمْ مَّا یَکُوْنُ

جن لوگوں نے بہتان کا یہ طوفان اُٹھایا ہے وہ تم ہی میں
سے ایک جماعت (منافقین کی جماعت) ہیں (اے
پیغمبر!) تم اِسکو اپنے حق میں بُرا نہ سمجھو بلکہ یہ تمہارے
حق میں بہتر ہے (یعنی خدا کی مصلحت کہ) راز نے اس
میں تمہاری بہتری کا انجام پوشیدہ رکھا ہوا ہے ان میں سے
ہر ایک آدمی کیلیے وہ سب کچھ ہے جو اُس نے گناہ
کمایا ہے اور جس نے اس (گناہ) کا بڑا بوجھ اُٹھایا ہے
اس کیواسطے بہت بڑا عذاب ہے، جب تمنے اس
(بہتان) کو سنا تھا کیوں نہ ایمان والے مرد اور ایمان
والی عورتوں نے اپنے لوگوں پر نیک خیال قائم نہ
کرلیا اور کیوں یہ نہ کہہ دیا کہ یہ صریح بہتان کا طوفان
ہے، وہ طوفان اُٹھانیوالے اپنے بہتان پر کیوں
چار گواہ نہ لائے۔ پس جب وہ گواہ پیش نہ کر سکے تو
یہی لوگ اللہ کے یہاں سرتا سر جھوٹے ہیں اور اگر
اللہ کا فضل اور اسکی رحمت دنیا اور آخرت دونوں
میں تم پر نہ ہوتے تو پڑ جاتی، اس جھوٹ کا چرچا کرنے میں
تم پر کوئی بڑی آفت جبکہ تم اس (بہتان) کو اپنی
زبانوں پر جاری کرنے لگے اور ایسی بات منہ

لَنَآ اَنۡ نَّتَكَلَّمَ بِهٰذَا سُبۡحٰنَكَ
هٰذَا بُهۡتَانٌ عَظِيۡمٌ ۰ يَعِظُكُمُ
اللّٰهُ اَنۡ تَعُوۡدُوۡا لِمِثۡلِهٖۤ اَبَدًا اِنۡ
كُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِيۡنَ ۰ وَيُبَيِّنُ اللّٰهُ
لَكُمُ الۡاٰيٰتِ ط وَاللّٰهُ عَلِيۡمٌ حَكِيۡمٌ ۰
اِنَّ الَّذِيۡنَ يُحِبُّوۡنَ اَنۡ تَشِيۡعَ
الۡفَاحِشَةُ فِى الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا لَهُمۡ
عَذَابٌ اَلِيۡمٌ فِى الدُّنۡيَا وَ
الۡاٰخِرَةِ وَ اللّٰهُ يَعۡلَمُ وَاَنۡتُمۡ لَا
تَعۡلَمُوۡنَ ۰ وَلَوۡلَا فَضۡلُ اللّٰهِ
عَلَيۡكُمۡ وَرَحۡمَتُهٗ وَاَنَّ اللّٰهَ رَءُوۡفٌ
رَّحِيۡمٌ ۰

سے نکالنے لگے جس کی تم کو خبر تک نہیں اور تم
اس کو ہلکی بات سمجھتے ہو حالانکہ (بہتان اور افترا)
اللہ کے نزدیک بہت بڑی بات ہی، اور جب تم
نے اس کو سنا تھا تو کیوں نہ کہا ہمارے لئے زیبا
نہیں کہ ایسی جھوٹ بات منہ سے نکالیں "اللہ کے
لیے پاکی ہو" یہ تو بہت بڑا بہتان ہی، اللہ تمکو سمجھاتا ہی
کہ ایسا کام پھر کبھی نہ کر بیٹھنا، اگر تم واقعی سچے ایمان
والے ہو اور اللہ تعالیٰ تمہارے لیے یہ کی باتیں
واضح کرتا ہی اور اللہ خوب جاننے والا حکمت والا ہی جو لوگ
چاہتے ہیں کہ بدکاری کا چرچا ہو ایمان والوں میں
اُن چاہنے والوں کیلیے دردناک عذاب ہی دنیا میں
بھی اور آخرت میں بھی بلاشبہ اللہ حقیقت حال کا
جاننے والا ہی اور تم جاننے والے نہیں ہو اور اگر اللہ
کا فضل نہوتا، اُسکی رحمت نہوتی تم پر اور یہ بات
نہوتی کہ وہ نرمی کرنیوالا ہی اور مہربان تو کیا کچھ نہو جاتا

سورۂ نور کی اِن آیات نے عائشہ رض صدیقہ کی طہارت و پاکدامنی کا ہی صرف اعلان
نہیں کیا بلکہ مسلمانوں کو یہ تنبیہ بھی کی کہ اُن کو ایک لمحہ کا انتظار کئے بغیر اس قسم کے افترا
پردازوں کے افترا پر صاف صاف یہ کہہ دینا چاہیے تھا کہ "یہ محض افترا اور بہتان ہی۔
یہ آیات اس بنا پر "آیاتِ براۃ" بھی کہلاتی ہیں کہ ان میں حضرت عائشہ رض کی براۃ

کا اعلان ہو اور منافقین اور معاندین کی ذلت و خذلان کا اظہار۔

موعظت | اس واقعہ نے قرآن عزیز میں جن مواعظ و بصائر کا سامان مہیا کیا ہے اُن میں سے یہ خصوصیت کے ساتھ قابل توجہ ہیں۔

(۱) فاسق و فاجر یا بد باطن انسانوں کی دی ہوئی خبر خصوصًا جبکہ وہ با عصمت و عفت، اور صاحبِ تقویٰ و خیر افراد کے خلاف ہو ہرگز قابلِ توجہ نہیں اور اس کیلیے صرف اسی قدر کہہ دینا کافی ہو کہ یہ محض افترار ہے تا وقتیکہ خبر دینے والا اُس پر روشن دلیل و حجت قائم نہ کر دے۔

(۲) بے گناہ پر الزام اور تہمت لگانا بہت بڑا گناہ ہو اور چونکہ اس گناہ کا مرتکب حق العباد میں سے ایک اہم حق کا تہتک کرتا ہے، اس لئے نہ صرف اخلاق کی نگاہ میں بلکہ اجتماعی قانون کی نظر میں بھی حد درجہ مجرم ہے، قرآن عزیز کی نصوص نے اس لیے حد قذف (بے گناہ پر تہمت لگانے کی سزا) کے لیے اسی کوڑے تجویز کیے ہیں تاکہ آئندہ کسی کو کبھی یہ جرأت نہو سکے کہ وہ ایک پاکباز انسان پر بہتان لگائے یا بغیر شہادت کے اس کی تشہیر کرے۔

(۳) یہ واقعہ گو آغاز کے اعتبار سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کیلئے بہت سخت ایذا رکا باعث ہوا اور اہلِ بیت کو اُس نے بیحد پریشان خاطر بنایا، لیکن انجام کے پیشِ نظر اہلِ بیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے یہ سرتا سر خیر ثابت ہوا، کیونکہ اس سے ایک جانب منافقوں کی منافقت کا راز فاش ہو گیا اور دوسری جانب صدیقہ عائشہؓ اور اہلِ بیتِ رسول کی عظمتِ شان کا بے نظیر مظاہرہ عمل میں آگیا کہ قرآن کی دس آیات نے اُن کی براءۃ کے لیے نازل ہو کر اُن کی عصمت و عظمت پر دونوں پر عدیم النظیر

مہرِ تصدیق ثبت کردی۔

(۴) بعض مرتبہ اشرار اور خبیث النفس انسانوں کی ہفوات اس درجہ آب و رنگ رکھتی ہیں کہ سادہ لوح مسلمان اور نکوکار انسان بھی مغالطے اور دھوکے میں آجاتے ہیں اس لیے مسلمان کا فرض ہے کہ سُنی سُنائی بات پر اُس وقت تک ہرگز یقین نہ کرے جبتک کہ اسلامی اصولِ شہادت کے مطابق شنیدہ خبر کی تصدیق نہو جائے۔ قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایّاک والظن فان بعض الظن اثم

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ سوءِ ظن سے بچو اس لیے کہ بعض بدگمانیاں گناہ کا مرتکب بنادیتی ہیں"

(۵) حقوق العباد میں خدائے برتر نے جو حدود وقصاص اور تعزیرات مقرر فرمادیے ہیں، جرائم کے ارتکاب پر اُن میں مسلم اور غیر مسلم کا کوئی فرق نہیں ہے اور قانون اسلامی کی نگاہ میں اس حیثیت سے تمام مجرم یکساں قابلِ گرفت ہیں۔ اس لیے واقعہ اِفک میں منافق مفتریوں کے ساتھ تین مسلمان (مرد و عورت) حسّان، حضرت مسطح اور حضرت حمنہ بنت جحش کو بھی جھوٹی تہمت لگانے کے الزام میں کوڑے کھانے پڑے۔

نبأ فاسق

غزوۂ بنی المصطلق میں جب مسلمان فتح یاب ہوگئے اور صحابہ رضی اللہ عنہم کے مشورہ کی بنا پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سردار قبیلہ کی بیٹی حضرت جُویریہ

ہ فاسق کی دی ہوئی خبر۔

رضی اللہ عنہا) سے نکاح کر لیا تو نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کے رشتۂ مصاہرت کی وجہ سے تمام صحابہ (رضی اللہ عنہم) نے اسیرانِ جنگ کو رہا کر دیا اور مسلمانوں کے اس حسن سلوک و اخلاقِ کریمانہ اور اسلامی محاسن سے متاثر ہو کر تمام قبیلہ مشرف باسلام ہو گیا۔ تب نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ولید بن عقبہ کو اس لیے اُن کے پاس بھیجا کہ وہ قبیلہ کے دولتمندوں سے "زکوٰۃ" وصول کر کے اُن ہی کے فقراء و مساکین پر تقسیم کر دیں۔

اہلِ قبیلہ کو جب ولید کی اس آمد کا علم ہوا تو وہ عاملِ اسلام کے استقبال کے لیے تیاریاں کرنے لگے اور ایک معزز ترین ہستی کے استقبال کی طرح ساز و سامان کے ساتھ میدان میں نکلے۔

زمانۂ جاہلیت میں اس قبیلہ کے اور ولید کے درمیان کچھ ناچاقی رہ چکی تھی اور پرانی عداوت کا رشتہ چلا آتا تھا اس لیے استقبال کے اس اہتمام کو ولید نے دوسری نظر سے دیکھا اور سمجھا اور اپنی غلط رائے پر مجبور کر کے اہلِ قبیلہ سے معاملہ کیے بغیر ہی مدینہ واپس آ گئے اور دربارِ قدسی میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ بنی المصطلق تو مرتد ہو گئے اور انھوں نے زکوٰۃ دینے سے بھی انکار کر دیا اور وہ تو سرکشی پر آمادہ ہیں۔

نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کو یہ سُن کر بنی المصطلق کے طرزِ عمل سے رنجیدہ ہوئے اور مسلمان تو برافروختہ ہو گئے اور جہاد کی تیاریاں ہونے لگیں تاکہ مرتدین کا مقابلہ کیا جائے، حتی کہ وہ اسلام پر واپس آ جائیں یا کیفرِ کردار کو پہنچ جائیں۔

اِدھر بنی المصطلق کو ولید کے اس عجیب طرزِ عمل نے حیرت میں ڈال دیا اور

جب اُن کو معلوم ہوا کہ ولید نے کسی بیجا جسارت کے ساتھ اُن کے متعلق دربارِ نبوی میں غلط بیانی کی ہے تو وہ بیحد پریشان ہوئے کیونکہ اُن کے تو وہم و خیال میں بھی یہ نہیں تھا کہ اُن جیسے پختہ کار اور ثابت قدم مسلمانوں پر اس قسم کی تہمت بھی لگائی جا سکتی ہے چنانچہ اُنھوں نے فوراً خدمتِ اقدس (صلی اللہ علیہ وسلم) میں ایک مُوقر وفد بھیجا جس نے حاضر ہو کر کل ماجرا کہہ سُنایا۔

ایک جانب اپنے عامل (ولید) کا وہ بیان اور دوسری جانب حدیث العہد مسلم جماعت کا یہ بیان اس لیے نبی اکرم صلی علیہ وسلم نے خاموشی اختیار فرمائی اور وحی الٰہی کا انتظار کیا۔

آخر وحی الٰہی نے راہنمائی کی اور قرآن عزیز (سورۂ حجرات) کی اِن آیات نے نازل ہو کر نہ صرف زیرِ بحث معاملہ کی حقیقت ہی واضح کر دی بلکہ اس سلسلہ میں ایک مستقل قانون یا "معیارِ تحقیق" عطا فرما دیا

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنْ جَاءَكُمْ	اے ایمان والو! اگر تمہارے پاس کوئی فاسق (غلط
فَاسِقٌ بِنَبَإٍ فَتَبَيَّنُوا أَنْ تُصِيبُوا	کار) خبر لیکر آئے تو تحقیق کر لیا کرو، ایسا ہو کہ نادانی
قَوْمًا بِجَهَالَةٍ فَتُصْبِحُوا عَلَىٰ مَا فَعَلْتُمْ	کیوجہ سے کسی قوم پر (جہاد کے نام سے) حملہ آور ہو جاؤ
نَادِمِينَ ○ وَاعْلَمُوا أَنَّ فِيكُمْ	اور پھر کل کو اصل حال معلوم ہونے کے بعد اپنے
رَسُولَ اللَّهِ لَوْ يُطِيعُكُمْ فِي كَثِيرٍ	کیے پر پچھتانے لگو، اور جانو کہ تم میں اللہ کا رسول
مِنَ الْأَمْرِ لَعَنِتُّمْ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ حَبَّبَ	موجود ہے، اگر وہ تمہاری بات اکثر معاملات میں مان
إِلَيْكُمُ الْإِيمَانَ وَزَيَّنَهُ فِي قُلُوبِكُمْ	لیا کرے تو تم (اپنی غلط روی کیوجہ سے) مصیبت
وَكَرَّهَ إِلَيْكُمُ الْكُفْرَ وَالْفُسُوقَ	میں پڑ جاؤ، لیکن اللہ نے (اپنی فضل سے) تمہارے

وَالْعِصْيَانِ اُولٰٓئِكَ هُمُ الرّٰشِدُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَنِعْمَةً وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝	لیے ایمان کو محبوب بنا دیا ہو اور تمہارے دلوں میں اسکو زینت بخشی ہو اور تمہارے دلمیں کفر اور گناہ اور نافرمانی کیلئے نفرت پیدا کر دی ہے، اور درحقیقت یہی لوگ ہیں اللہ کے فضل اور احسان کی وجہ سے راہ یاب اور اللہ جاننے والا ہے، حکمتوں والا ہے۔

موعظت (۱) خبروں کے بیان کرنے میں عام طور پر سنجیدہ اور مہذب جماعت بھی اس کو معیوب نہیں سمجھتی کہ جو خبر بھی اُن کے کانوں تک پہنچے وہ اُس کو بے تکلف نقل کرتے رہیں اور حقیقت حال کی جستجو کی زحمت قطعاً گوارا نہ کریں، خواہ اس خبر سے کسی ناکردہ گناہ پر افترا کیا جا رہا ہو، یا کسی فرد و جماعت کو مضرت پہنچ رہی ہو، حالانکہ نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے پُر زور الفاظ میں یہ تنبیہ فرمائی ہے۔

عن ابی ھریرۃ رضی اللّٰہ عنہ عن النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم قال کفٰی بالمرءِ اِثمًا اَن یحدث بکلِ مَا سَمِعَ (ابو داؤد)	ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: انسان کیلئے یہ گناہ کافی ہے کہ ہر شنیدہ بات کو نقل کرتا رہے یعنی یہ بھی گناہ کی بات ہے کہ سُنی سنائی جھوٹی بات کی تشہیر کرے۔

(۲) جب کوئی ایسی خبر سُنی جائے جو بلحاظ مفاد یا مضرت خبر دینے والے پر یا دوسروں پر اثر انداز ہوتی ہو تو اسلامی آداب اجتماعی کا تقاضا ہے کہ پہلے اُس کی تحقیق ہونی چاہیے اور جب وہ پایہ ثبوت کو پہنچ جائے تب اُس سے متعلق نتائج و ثمرات کی جانب متوجہ ہونا چاہیے۔

"خبر" سے متعلق یہ حکم اخلاقی حیثیت رکھتا ہے اور معاشرتی زندگی میں روزمرہ کا باب

اصل ہے لیکن محاکم شرعیہ میں جب کوئی معاملہ جائے اور خبر "شہادت" کی حیثیت اختیار کرلے تو اس کے قبول وعدم قبول میں اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہوئے دوسرے مزید شرائط ہیں جو فقہ اسلامی کے "باب الشہادۃ" میں بہ تفصیل مذکور ہیں۔

مسجدِ ضرار

منافقین کو یہ جرأت ہوتی نہ تھی کہ علانیہ اسلام کی مخالفت کرکے اسکو نقصان پہنچائیں، البتہ ہر وقت اس کوشش میں لگے رہتے تھے کہ کسی طرح درپردہ مسلمانوں میں تفرقہ پیدا کرکے اُن کو ضعف وانحطاط کی راہ پر لگادیں، چنانچہ اس مقصد کی تکمیل کے لیے اُنہوں نے جہاں اور بہت سی فتنہ سامانیاں بپا کر رکھی تھیں اُن میں سے ایک واقعہ رجب ۹ سنہ ہجری میں بھی رونما ہوا۔

نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کو معلوم ہوا کہ تبوک کے میدان میں — جو کہ مدینہ سے چودہ منزل بر براہِ دمشق واقع تھا — ہرقل شاہ روم نے مسلمانوں کے مقابلہ کیلیے لشکر جرار جمع کرلیا ہے اور اُس کا مقدمۃ الجیش آگے بڑھ کر بلقار تک آپہنچا ہے، آپ نے عرب میں قحط اور گرمی کی شدت کے باوجود جہاد کے لئے منادی کردی اور مسلمان جوق درجوق شوق جہاد میں مدینہ میں جمع ہونے لگے۔

نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) ابھی تیاریوں ہی میں مصروف تھے کہ منافقین نے وقت سے فائدہ اُٹھاکر سوچا کہ مسجد قبار کے مقابلہ میں — جو ہجرت کے بعد سب سے پہلی مسجد تھی۔ اس حیلہ سے ایک مسجد تیار کریں کہ جو لوگ ضعف یا اور کسی

عذر کی وجہ سے مسجدِ نبوی میں نہ جاسکیں تو یہاں نماز پڑھ لیا کریں کیونکہ اس طرح مسلمانوں کو ورغلانے کا بھی موقعہ ہاتھ آئیگا اور ایک قسم کی تفریق بھی پیدا ہو جائیگی۔

یہ سوچ کر وہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئے اور کہنے لگے کہ ہم نے ضعیف و ناتواں، اور معذوروں کے لئے قریب ہی ایک مسجد بنائی ہے اب ہماری خواہش ہے کہ حضور وہاں چل کر ایک مرتبہ اُس میں نماز پڑھ دیں تو وہ عنداللہ مقبول ہو جائے۔ آپؐ نے فرمایا کہ اس وقت تو میں اہم غزوہ کے لیے جا رہا ہوں، واپسی پر دیکھا جائیگا۔

مگر آپؐ جب بخیر و کامرانی مراجعت فرما ہوئے تو وحی الٰہی کے ذریعہ اس مسجد کی تعمیر کے حقیقی سبب سے آگاہ ہو چکے تھے، چنانچہ واپس تشریف لا کر سب سے پہلے صحابہؓ کو حکم دیا کہ وہ جائیں اور اس "مسجد" کو آگ لگا کر خاک سیاہ کر دیں۔

چونکہ حقیقۃً اُس مسجد کی بنیاد "تقویٰ" اور "وجہ اللہ" کی جگہ "تفریق بین المسلمین" پر رکھی گئی تھی اس لیے بلا شبہ وہ اسی کی مستحق تھی اور اس کو "مسجد" کہنا حقیقت کے خلاف تھا، اس لئے قرآن عزیز نے اس بظاہر مسجد و بباطن بیت الشر کی تعمیر کے متعلق حقیقتِ حال کو روشن کرتے ہوئے بتلا دیا کہ یہ مسجد تقویٰ نہیں بلکہ مسجد ضرار کہلانے کی مستحق ہے۔

وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مَسْجِدًا ضِرَارًا	اور (منافقوں میں سے) وہ لوگ بھی ہیں جنہوں نے اس
وَّكُفْرًا وَّتَفْرِيْقًا بَيْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ	غرض سے ایک مسجد بنا کھڑی کی کہ نقصان پہنچائیں
وَاِرْصَادًا لِّمَنْ حَارَبَ اللّٰهَ وَ	کفر کریں، مومنوں میں تفرقہ ڈالیں اور اُن لوگوں کے
رَسُوْلَهٗ مِنْ قَبْلُ وَلَيَحْلِفُنَّ اِنْ	لئے ایک کمین گاہ پیدا کریں جو اس سے پہلے اللہ اور

اَرَدْنَا اِلَّا الْحُسْنٰی ط وَاللّٰهُ یَشْهَدُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ۰ لَا تَقُمْ فِيْهِ اَبَدًا لَمَسْجِدٌ اُسِّسَ عَلَی التَّقْوٰی مِنْ اَوَّلِ یَوْمٍ اَحَقُّ اَنْ تَقُوْمَ فِيْهِ ط فِيْهِ رِجَالٌ يُّحِبُّوْنَ اَنْ يَّتَطَهَّرُوْا وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِيْنَ

(توبہ)

اس کے رسول سے لڑ چکے ہیں وہ ضرور قسمیں کھا کر کہینگے کہ ہمارا مطلب اسکے سوا کچھ نہ تھا کہ بھلائی ہو لیکن اللہ کی گواہی یہ ہے کہ وہ اپنی قسموں میں قطعاً جھوٹے ہیں (اے پیغمبر!) تم کبھی اس مسجد میں کھڑے نہ ہونا، اس بات کی کہ تم اُسمیں کھڑے ہو (اور بندگان الٰہی تمہارے پیچھے نماز پڑھیں) وہی مسجد حقدار ہے جسکی بنیاد اول دن سے تقویٰ پر رکھی گئی ہے (یعنی مسجد قبا اور مسجد نبوی) اُسمیں ایسے لوگ آتے ہیں جو پسند کرتے ہیں کہ پاک صاف رہیں اور اللہ بھی پاک وصاف رہنے والوں کو ہی پسند کرتا ہے۔

موعظت | (۱) منافقت ایک ایسا مرض ہے جو انسان کی تمام خصائل حمیدہ اور اخلاقِ حسنہ کو تباہ و برباد کر کے اُس کی انسانیت کو حیوانیت سے بدل دیتا ہے اور اس کے افکار و اعمال میں مطابقتِ باہمی نہ رہنے سے اُس کی زندگی کو اسفل السافلین میں گرا دیتا ہے۔

(۲) ایک ہی "عمل" عامل کی نیت کے فرق سے "پاک" بھی ہو سکتا ہے اور "ناپاک" بھی "طیب" بن سکتا ہے اور "خبیث" بھی، تعمیر مسجد ایک عمل خیر ہے اور باعثِ اجر و ثواب! مگر جب کہ لوجہ اللہ ہو اور عبادتِ الٰہی کا حقیقی مقصد پیش نظر رہے۔

"انما یعمر مساجد اللّٰه من اٰمن باللّٰه والیوم الاٰخر واقام الصلوٰة واٰتی الزکوٰة ولم یخش الا اللّٰه (۹/۱) اللہ کی مسجدوں کو تو بس وہی آباد کرتا ہے جو اللہ پر اور

ل۔ حاشیہ صفحہ ۵۶۹ پر دیکھئے۔

آخرت کے دن پر ایمان لایا اور نماز ادا کی اور زکوٰۃ دی اور خدا کے سوا کسی سے نہ ڈرا۔

اور یہی عملِ خیر "عملِ شر" اور "لائق نفرت" بن جاتا ہے، جب کہ اس کا مقصد کارِ شیطان ہو یعنی تفریق بین المسلمین یا نماز کی آڑ میں اسلام کے خلاف کمین گاہ اور جاسوسی کا مرکز بنانا ہو، اسی لیے یہ عملِ خیر کافروں کے ہاتھ سے انجام پانا غیر مقبول اور مردود ہے۔

" ما کان للمشرکین ان یعمروا مساجد اللہ شٰہدین علٰی انفسہم (۹/۱۷) مشرکوں کا حق نہیں ہے کہ وہ اللہ کی مسجد کو آباد کریں، حالانکہ وہ اپنی جانوں پر کفر کی گواہی دیتے ہیں"۔[1]

وفات یا وصل بالرفیق الاعلیٰ

اِنَّکَ مَیِّتٌ وَّاِنَّھُمْ مَّیِّتُوْنَ

آخر وہ وقت بھی آپہنچا جس کے تصور کے لئے نہ صرف مسلمان بلکہ دنیا انسانیت بھی طیار نہ تھی، یہ وقت کائنات انسانی کے لئے مصیبتِ عظمیٰ اور المیہ کبریٰ ثابت ہوا۔ چاردانگ عالم پر حیرت طاری تھی کہ وہ کس طرح غیر متوقع طور پر ہادی اکبر مصلح اعظم کے فیض صحبت سے محروم ہو گئے! آنکھوں نے جو کچھ دیکھا، قلب اُس کے باور کرنے کو تیار نہ تھا اور قلب جو کچھ چاہتا تھا، آنکھیں اُس نظارہ کو واپس نہ لا سکتی تھیں، دل پاش پاش تھے، جگر شق ہو رہے تھے، چشم گریاں

---

[1] "تعمر مساجد اللہ" میں مساجد کی آبادی اور اس کی تعمیر دونوں کا مفہوم شامل ہے۔

اشک کے سیلاب بہا رہی تھی کیونکہ آج روحانیت کے آفتاب عالمتاب کے اور کائنات انسانی کے درمیان موت کا تکڑ ابر حائل ہو چکا تھا۔

اگر دنیا کا کرۂ آفتاب درحقیقت کبھی غروب نہیں ہوتا اور رہتی دنیا تک غروب نہیں ہوگا، بلکہ دیکھنے والوں کے اور اس کے درمیان پردۂ شب حائل ہو جاتا ہے تو کس کی مجال اور کس کی جرأت ہے کہ وہ آفتاب رسالت (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کے متعلق غروب ہونے کا دعویٰ کرے کیونکہ یہاں تو پردۂ شب کو بھی حائل ہونے کی اجازت نہیں ہے "الدین السمحۃ البیضاء لیلھا ونھارھا سواء۔ دین اسلام آسان و روشن دین ہے جس کے رات اور دن دونوں یکساں طور پر روشن ہیں۔ یعنی یہاں شب تاریک کا گذر ہی نہیں ہے، البتہ "موت" کل نفس ذائقۃ الموت کا پیغام بن کر اس آفتاب رسالت کے اور ہمارے درمیان تکۂ ابر بن کر حائل ہو گئی۔

اس لئے اس مصیبت کبریٰ میں بھی مسلمانوں کے زخمی قلوب کے لئے مرہم اور کشتگان فراق رسول اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کے لئے بہترین اکسیر تریاق موجود تھا، اور وہ یقین واذعان ہے جس کو قرآن عزیز نے یہ کہہ کر پہلے ہی قلب مسلم کو عطا کر دیا " اِنَّكَ مَيِّتٌ وَّاِنَّهُمْ مَّيِّتُوْنَ كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ " " مَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ، قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ اَفَاِن مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ

یعنی "موت" اس حقیقت کا نام ہے جو نبی مرسل بلکہ خاتم المرسلین کو بھی پیش آ کر رہے گی اور "بقاء حقیقی" تو ذات احدیت کا ہی بلا شرکت غیرے طغرائے امتیاز ہے۔

"اللہ اللہ"! وہ کیسا عجیب سماں تھا کہ جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے

"اللّٰہم الرفیق الاعلیٰ" فرماتے ہوئے جان جاں آفریں کے سپرد فرمادی تو تمام
صحابہ رنج وغم اور صدمۂ جانکاہ سے اس درجہ متحیر اور مصیبت زدہ ہو رہے تھے
کہ اُن کے ہوش وحواس تک بجانہ تھے، اسی عالم میں حضرت عمر (رضی اللہ عنہ)
نے فرطِ غم سے تلوار سونت کر یہ نعرہ لگایا کہ جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا انتقال ہو گیا کہے گا
تو اسی تلوار سے اس کی گردن اُڑا دونگا۔

اسی اضطراب انگیز عالم میں خدا کا ایک بندہ صدیق اکبر آتا ہوا نظر آتا ہے'
سب سے پہلے وہ حجرۂ عائشہ (رضی اللہ عنہا) میں پہنچتا اور دلِ بریاں وچشم پرنم
کے ساتھ سرور دو عالم کی جبینِ نور کو بوسہ دیتا اور فراق رسولؐ سے کرب وبے چینی
کا اظہار کرتا ہے اور اس فرض عشق سے فارغ ہو کر جب باہر آتا ہے تو صحابہ (رضی
اللہ عنہم) کی اس حالت کا جائزہ لیکر کہ جس میں جاہلیت واسلام دونوں ادوار کی
کی بے نظیر شخصیت عمر بن الخطاب بھی شامل ہے تو آگے بڑھ کر کہتا ہے "اے خطاب
کے بیٹے بیٹھ جا" حضرت عمرؓ وہیں بیٹھ جاتے اور انتہائے حزن وغم سے حضرت ابوبکرؓ
کا منہ تکنے لگتے ہیں۔

صدیق اکبرؓ اب منبر نبوی پر کھڑے ہو کر صدائے حق بلند کرتے ہوئے صحابہ
(رضی اللہ عنہم) کے مجمع کو یوں مخاطب کرتے ہیں :-

لوگو! جو شخص محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی پرستش کرتا تھا اس کو معلوم ہو جانا
چاہیے "ان محمداً قد مات" کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے ذائقہ موت چکھ لیا اور جو
خدائے واحد کا پرستار ہے تو بلا شبہ "ان اللہ حیّ لا یموت" اللہ تعالیٰ زندہ جاوید
ہے اور موت سے پاک اور بری" اس کو موت نہیں ہے" ابوبکر (رضی اللہ عنہ)

کی یہ صدائے حق جب فضا میں گونجی تو سب سے اول حضرت عمرؓ اور اُن کے بعد تمام صحابہ پر سکون و اطمینان طاری ہوگیا اور وہ سمجھ گئے کہ بلاشبہ سردارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم اپنا فرضِ رسالت پورا کر کے "رفیق اعلیٰ" سے جا ملے اور اب اسلام مکمل ہو چکا اس لیے اب ہمارا فرض ہے کہ رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ اور زندۂ جاوید معجزہ کلام اللہ "قرآن" کو پیشوا بنا کر خدمتِ اسلام کا فرض انجام دیں۔

حضرت عمر بن الخطاب کی کیفیت تو یہ ہوئی کہ فرمانے لگے قسم بخدا صدیق اکبر نے یہ صدائے حق بلند کرتے ہوئے جب یہ آیت تلاوت کی مَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِہِ الرُّسُلُ" (الآیہ) تو مجھے ایسا معلوم ہوا گویا ابھی اس آیت کا نزول ہو رہا ہے اور عشقِ رسولؐ نے فراقِ رسول سے جو مبہوت کر دیا تھا قرآن اور تعلیم رسولؐ کی روشنی میں جو کچھ رفیق محترم نے کہا وہ یک بیک مثل آفتاب میرے سامنے آگیا

تمام کتبِ احادیث و سیر کی روایات متفق ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ماہ ربیع الاول روز دوشنبہ کو ہوئی البتہ کس تاریخ کو ہوئی؟ اس بارہ میں متعدد اقوال پائے جاتے ہیں۔

واقدی اور ابن سعد صاحب طبقات الکبریٰ کی روایات ۱۲۔ ربیع الاول ظاہر کرتی ہیں اور یہی قول مشہور و معروف ہے اور بیہقی اور ابن کثیر میں منقول بعض روایات میں ہے کہ ۲۔ ربیع الاول تھی اور بعض میں ۱۰، ۱۴ اور یکم ربیع الاول بھی منقول ہے[۱]

[۱] تاریخ ابن کثیر جلد ۵ ص ۲۵۵

ابوالقاسم سُہیلی اپنی مشہور کتاب روض الاُنف میں دعویٰ کرتے ہیں کہ
سنہ ربیع الاول کا مہینہ اور دوشنبہ کا دن بالاتفاق متعین ہونے کے بعد حسابی
اعتبار سے وفات کی تاریخ کسی طرح ۱۲- ربیع الاول نہیں ہو سکتی، البتہ ۲- یا ۱۳
یا ۱۴- یا ۵، ربیع الاول میں سے کوئی تاریخ ہو سکتی ہے اور یہ اس لیے کہ جمہور
کا اس پر "اجماع" ہے کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع میں حج (وقوف
عرفہ) جمعہ کے دن کیا ہے، پس جبکہ ۹- ذی الحجہ کو جمعہ کا دن تھا تو خواہ بعد کے تمام
مہینے صرف انتیس دن کے مان لیجئے یا صرف تیس دن کے یا بعض انتیس کے اور
بعض تیس کے کسی صورت میں بھی دوشنبہ کو ۱۲- ربیع الاول نہیں ہوتی۔ اس لیے یہ
روایت صحیح نہیں ہے۔

البتہ ابن جریر طبری نے ابن کلبی اور ابو مخنف کی روایت سے ۲- ربیع الاول
نقل کی ہے، تو یہ اس صورت میں صحیح ہو سکتی ہے کہ محرم، صفر، ربیع الاول تینوں
مہینے انتیس کے تسلیم کر لیئے جائیں ورنہ تو قیاس صحیح سے قریب تر روایت خوارزمی
کی ہے جس میں تاریخ وفات یکم ربیع الاول منقول ہے کیونکہ یہ تاریخ تینوں مہینوں
میں انتیس اور تیس دن کے فرق سے بھی صحیح ہو جاتی ہے۔

ابن کثیرؒ نے سہیلی کے اعتراض کو اہم قرار دیتے ہوئے کہا کہ اگرچہ علماء
نے اس کے جوابات دیے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ تسکین بخش نہیں ہیں البتہ
جواب کی ایک ہی صورت ہے وہ یہ کہ "اختلاف مطالع" کا اعتبار کیا جائے، یعنی
یہ تسلیم کیا جائے کہ مکہ اور مدینہ میں رویت ہلال مختلف رہی ہو کیونکہ اگر یہ ثابت ہو جائے
کہ اہل مدینہ نے ذی الحجہ کا چاند جمعہ کے دن دیکھا اور مکہ میں جمعرات کو رویت ہوئی تو

پھر اگر باقی تینوں مہینوں کو تیس تیس کا ہی تسلیم کر لیا جائے، تب یہ کہا جا سکتا ہے کہ بلا شبہ دو شنبہ کو ۱۲- ربیع الاول تھی۔

تو کیا مدینہ میں ذی الحجہ کا چاند جمعہ کو دیکھا گیا! اس کی تصدیق و تائید حضرت عائشہ صدیقہ (رضی اللہ عنہا) کی اس روایت سے ہوتی ہے کہ آپ نے فرمایا "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حجۃ الوداع کے لیے جب مدینہ سے نکلے تو ذی قعدہ کے ختم ہونے میں پانچ دن باقی تھے اور حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ سے نکلنے لگے تو ظہر کی چار رکعات پڑھ کر نکلے اور ذوالحلیفہ پہنچ کر عصر کی دو رکعات پڑھیں، پس ان دونوں مستند روایات سے واضح ہوا کہ آپؐ کی روانگی نہ جمعرات کو ہوئی اور نہ جمعہ کو بلکہ سنیچر کے دن ہوئی تھی، لہٰذا اس صورت میں تسلیم کرنا پڑیگا کہ اہل مدینہ نے جمعہ کے دن ذی الحجہ کا چاند دیکھا۔

پس یہی ایک شکل بنتی ہے جس سے تاریخ وفات ۱۲- ربیع الاول سے متعلق مشہور روایت تسلیم کی جا سکتی ہے[۱]۔

عبرت و موعظت | (۱) قرآن عزیز سورۂ فاتحہ میں ہے "اھدنا الصراط المستقیم صراط الذین انعمت علیھم" اور دوسری جگہ سورۂ نساء میں "انعمت علیھم" کی تفسیر اس طرح مذکور ہے "فاولئک مع الذین انعم اللہ علیھم من النبین والصدیقین والشھداء والصلحین وحسن اولئک رفیقا" یہی وہ رفقاء ہیں جن کے متعلق نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے " اللھم الرفیق الاعلیٰ کہہ کر وقت

---

[۱] تاریخ ابن کثیر جلد ۵

آخر اشارہ فرمایا۔

سہیلی کہتے ہیں کہ چونکہ اہلِ جنت، جنت میں مختلف القلوب نہیں ہوں گے بلکہ ایک انسان کے قلب واحد کی طرح ہوں گے اس لیے "الرفقار العلیا" نہیں فرمایا "الرفیق الاعلیٰ" فرمایا تاکہ اہلِ جنت کی "وحدت قلبی" کی جانب اشارہ ہو جائے۔

(۲) "موت" خدائے برتر کا وہ اٹل فیصلہ ہے جس سے نبی و رسل اور خاتم الانبیاء والرسل بھی مستثنیٰ نہیں ہیں اور بقاء و حیات سرمدی و ابدی صرف ذات حق کے لیے ہی مخصوص ہے۔

(۳) صدیق اکبر کی عظمت شان جلالت مرتبہ کا اس ایک واقعہ سے بھی واضح اعلان ہو جاتا ہے کہ وفات النبی کے قریبی وقت میں نزاکت حالات نے صحابہ کے عقل و خرد پر جو اثر ڈالا اگر خدانخواستہ وہ دیرپا ہو جاتا تو اسلام اپنی حقیقت سے خالی ہو کر رہ جاتا (عیاذ باللہ)، مگر یہ سعادت ابوبکر کے ہی حصہ میں تھی کہ مسلمانوں کی اس ڈگمگاتی کشتی کو قرآن کی روشنی میں پار لگا دیا۔ اور "اسلام" کو ایک عظیم الشان فتنہ سے بچا لیا۔ وذٰلک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء واللہ ذو الفضل العظیم"